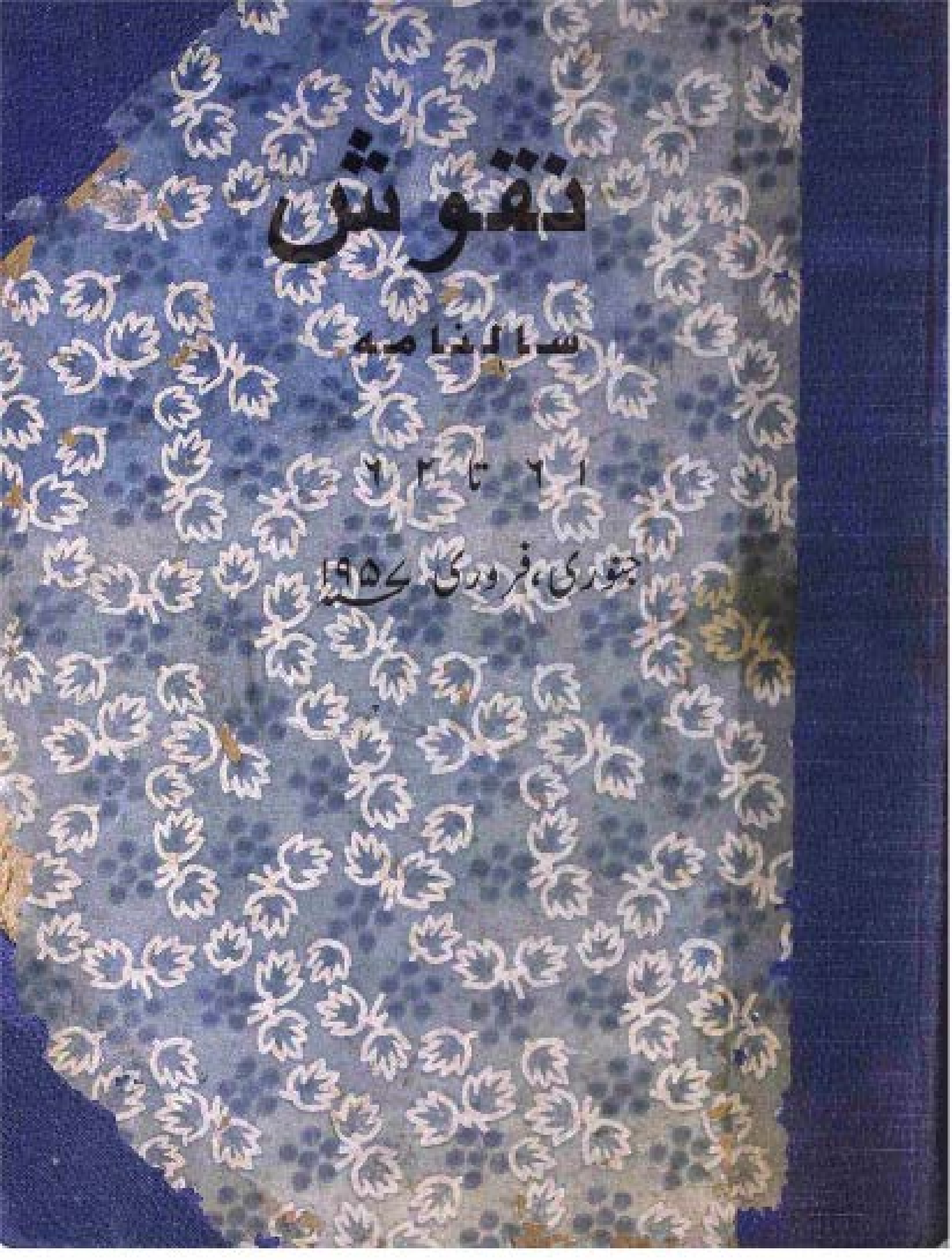

نقوش

سالنامہ

۶۱ تا ۶۲

جنوری، فروری ۱۹۵۷ء

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

سالنامہ

۶۱ ، ۶۲

جنوری ، فروری ۱۹۵۷ء

مدیر
محمد طفیل

فی پرچہ
۳ روپے

سالانہ قیمت
۲۰ روپے

ادارۂ فروغِ اُردو ، لاہور

ترتیب

افسانے

۱ — چور (غیر مطبوعہ) — سعادت حسن منٹو ، ۱۵۲
۲ — اصفہان کے گنبد — امتیاز علی تاج ، ۵
۳ — جاڑا حاتم طائی کا — کنہیا لال کپور ، ۱۹
۴ — رات، چور اور چاند — بلونت سنگھ ، ۲۲
۵ — ادن خرے کا سٹیشن — حجاب امتیاز علی ، ۵۶
۶ — ایک پھول، ایک کار — مہندر ناتھ ، ۶۵
۷ — سات دن کی بادشاہت — کشمیری لال ذاکر ، ۷۷
۸ — نرغہ — ابو سعید قریشی ، ۸۴
۹ — ایک انسان کی موت — فکر تونسوی ، ۹۳
۱۰ — پکی اینٹ — غلام علی چودھری ، ۱۰۰
۱۱ — بھتا — جمیل الزماں ، ۱۰۳
۱۲ — موتی کی واپسی — احمد حمید ، ۱۰۷
۱۳ — پردیس میں اجنبی — منظور الٰہی ، ۱۱۶
۱۴ — فردوس ایشیا ہندوستان — احمد جمال پاشا ، ۱۲۷
۱۵ — زندہ لاش — سیدہ ثریا سلطانہ ، ۱۳۲
۱۶ — پچیس اور ایک — انوار حسن ہاشمی ، ۱۴۱
—
—

نظمیں ، غزلیں

۱ — خط — جوش ملیح آبادی ، ۱۵۷
۲ — اک یہی جنس تھی تسکین جان و دل بھی — جگر مرادآبادی ، ۱۵۸
۳ — جو در پردہ انھیں جلوہ نمائی کی نہ سوجھتی — سیماب اکبرآبادی ، ۱۵۹
۴ — یہی فضا وقف تری محفل طرب کے لئے — عابد علی عابد ، ۱۶۰
۵ — تین مسلسل غزلیں — احمد ندیم قاسمی ، ۱۶۱
۶ — فطرت عشق گنہگار ہوئی جاتی ہے — سراج لکھنوی ، ۱۶۲
۷ — کتنی کرنیں جو افق پر نور کا بنتی تھیں جال — آنند نرائن ملا ، ۱۶۳
۸ — کچھ میں ادا وفا بھی تو پیار کریں — معین احسن جذبی ، ۱۶۴
۹ — ستاروں کی تلاش — اختر انصاری ، ۱۶۵
۱۰ — جہاں بھی اس مرے جیسے کے عہد شباب کی بات ہو رہی ہے — عدم ، ۱۶۶
۱۱ — بڑی صدا — عدم ، ۱۶۷
۱۲ — تقدیر تو قضا و قدر کی نظر میں ہے — فضل احمد کریم فضلی ، ۱۶۸
۱۳ — ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا — عرشی رامپوری ، ۱۶۹
۱۴ — ستمگر کو میں جلوہ گر کر رہا ہوں — شاد عارفی ، ۱۷۰
۱۵ — سرد مہری سے تری دل جو بہاں رکھتے ہیں — اشک رامپوری ، ۱۷۱
۱۶ — دیدہ و دانستہ دھوکا کھا گئے — شور علیگ ، ۱۷۲
۱۷ — ارہ باد — شور علیگ ، ۱۷۳
۱۸ — رباعیات — شمیم شفائی ، ۱۷۴
۱۹ — یاد — غلام ربانی تاباں ، ۱۷۵
۲۰ — ایک تو خود اپنی خلش ہی — حیرت شملوی ، ۱۷۶
۲۱ — دن ہو کر رات کٹی گلشن ہو کر بھی باغ — انجم رومانی ، ۱۷۷
۲۲ — دل سے خوش آتا ہے اب رات سے بھی جی ڈرتا ہے — جگن ناتھ آزاد ، ۱۷۸
۲۳ — بجلی میں آتش گل ہی نہیں دھواں بھی نہیں — ناز مرادآبادی ، ۱۷۹

۲۴ — رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی — ناصر کاظمی ، ۱۸۰
۲۵ — گھونگھٹ اوٹ — سوامی ناربروی ، ۱۸۱
۲۶ — ہر گھڑی اک قیامت تھی ، یہ نہ پوچھ کب گذری — ظہور نظر ، ۱۸۲
۲۷ — غروب — ظہور نظر ، ۱۸۳
۲۸ — اُن کا غم بھی نہ رہا پاس تو پھر کیا ہوگا — شاعر لکھنوی ، ۱۸۴
۲۹ — چھلکنے لگا ہے ترا غم بہت — نور بجنوری ، ۱۸۵
۳۰ — پرچھائیں — مصطفےٰ زیدی ، ۱۸۶
۳۱ — اشارے — منیر نیازی ، ۱۸۸
۳۲ — کوئی نہ چاہنے والا تھا میں رسوا کا — وحید قریشی ، ۱۸۹
۳۳ — تعبیر — کرامت علی شاعر ، ۱۹۰
۳۴ — پردے اُٹھے دریچے — احمد ریاض ، ۱۹۱
۳۵ — تعبیر — آغا صادق ، ۱۹۲
۳۶ — ہوگئی ہوں ہر طرف بدنام تیرے شہر میں — پریم وار برٹنی ، ۱۹۳
۳۷ — نگارِ شہر — مظہر امام ، ۱۹۴
۳۸ — بھلا بھلا سا ہر اک گام پر یقین دیکھا — جمیل ملک ، ۱۹۶
۳۹ — ہم سے پوچھو کہ ہے کیوں مٹے بھول — اختر ہوشیارپوری ، ۱۹۷
۴۰ — زنجیر کی جھنکار کو سنگیت میں ڈھالو — شکیب جلالی ، ۱۹۸
۴۱ — یوں تصور جب ترا زور آزما ہوتا ہے — مظہر امام ، ۱۹۹
۴۲ — جو تیری داستان سنو ، یہیں زندگی اُسے زندگی — جلیل قشقی ، ۲۰۰
۴۳ — کون بھلا یہ کہتا ہے خود آکے ہم کو منائیں آپ — باقر مہدی ، ۲۰۰

مقالات

۱ — قصہ ربط (غیر مطبوعہ) — مولانا محمد علی جوہر ، ۲۰۱
۲ — نذیر احمد کا ایک ناول — مولانا عبدالماجد دریابادی ، ۲۰۸
۳ — غالب کی مقبولیت کے اسباب — شیخ محمد اکرام ، ۲۱۱
۴ — احتشام حسین کی تنقید — کلیم الدین احمد ، ۲۱۵
۵ — مختصر ناٹک — قاضی عبدالودود ، ۲۲۷
۶ — فقرہ بندی — اختر اورینوی ، ۲۳۷
۷ — نئے ادبی رجحانات اور ان کا تجزیہ — راجندر ناتھ شیدا ، ۲۴۴
۸ — آزاد نظم ، غزل اور ترقی پسند شاعری — ڈاکٹر محمد حسن ، ۲۵۲
۹ — تذکرہ شعرائے اردو — ڈاکٹر وحید قریشی ، ۲۷۴
۱۰ — قدیم تماشے کی ادبی اہمیت — آفتاب احمد ، ۲۸۲
۱۱ — حیات ڈپٹی نذیر احمد — یسین علی خاں ، ۲۸۶

ضمیمہ شخصیات نمبر

۱ — علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی — سید ابوالخیر مودودی ، ۳۰۰
۲ — قاضی عبدالودود — ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو ، ۳۱۱
۳ — شفیق عماد پوری — حسن نذارتی ، ۳۲۶
۴ — مانی جائسی — میر کلب مصطفےٰ ، ۳۳۲
۵ — میرزا ادیب — جمیل ملک ، ۳۴۳
۶ — صالحہ عابد حسین — بیگم امین ندوائی ، ۳۴۸
۷ — قتیل شفائی — ابراہیم جلیس ، ۳۵۱
۸ — لاہور کی چند شخصیتیں — محمد طفیل ، ۳۵۶

کھلے خط

۱ — پہلا خط — اثر لکھنوی ، ۳۶۲
۲ — دوسرا خط — عبدالحمید عدم ، ۳۷۶

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نقوش نے دین محمدی پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کیا!

طلوع

نقوش اب کے خاصی تاخیر سے آ رہا ہے۔ اس کی یوں تو کئی وجوہ ہیں۔ اُن میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں پچھلے دنوں بیمار رہا۔ علالت بھی دل کے ڈوبنے کی جس میں رات کو سوتے وقت صبح زندہ اُٹھنے کی امید کم ہوا کرتی ہے۔ خیر یہ چیز سراسر ذاتی ہے۔ ممکن ہے اس سے آپ کو کوئی دلچسپی نہ ہو۔

دوسری بات یہ تھی کہ شخصیات نمبر جلد دوم میں کچھ زیادہ ہی خسارہ ہو گیا۔ میں اپنی دو برس کی محنت کو جب بازار میں لایا تو ادب کے پرستاروں کو نیند آ گئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میری وہ جانکاہی قارئین کے نزدیک تضییع اوقات کی حیثیت رکھتی ہو۔ میرے نزدیک تو وہ نمبر اُردو ادب کا ایک ضروری باب ہے۔

اب مکاتیب نمبر کو میری آرزوؤں کا حاصل سمجھئے جتنے بھی نمبر میں نے اب تک پیش کئے ہیں۔ اُن میں افادیت کے اعتبار سے شاید اسی کو اولیت کا درجہ حاصل ہو۔ اگر یہ نمبر میری آرزوؤں کے مطابق مرتب ہو گیا تو میری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

اس شمارے میں جتنی تخلیقات شامل ہیں، وہ سب کی سب معیار پر پوری نہیں اتریں گی۔ مگر اس میں ایسی چیزیں ضرور موجود ہیں، جن سے استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے اور ذہن کی گرہیں بھی کھولی جا سکتی ہیں۔ ہوتے ہوتے یہ عام شمارہ بھی سالنامہ بن گیا۔ نہ جانے آپ کے نزدیک یہ بات خوشی کی ہے یا افسوس کی۔

کلیم الدین احمد، اعجاز علی خان، شیخ محمد اکرام اور راجندر ناتھ شیدا پہلی بار بزم نقوش میں تشریف لائے ہیں۔ میں ان کے استقبال کے لئے اٹھتا ہوں۔

اتفاق سے ہمیں منٹو مرحوم کا ایک غیر مطبوعہ افسانہ مل گیا ہے۔ جسے آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ افسانہ اُس وقت ملا جب پرچے کا بہت سا حصہ چھپ چکا تھا۔ اس لئے ترتیب میں یہ اپنے صحیح مقام سے محروم رہا۔ یہ افسانہ کچھ مرحوم کے اپنے حالات پر بھی روشنی ڈالے گا۔ اس لئے بھی اس کی اپنی بڑی اہمیت ہے۔

ابھی کل کی بات ہے کہ منٹو ہم میں موجود تھا ــــ اُسے دُور گئے ابھی دو ہی برس ہوئے ہیں۔ اور یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے سب اُسے بھول گئے ہوں۔ پچھلے برس تو اس کی برسی پر کچھ حضرات اکٹھے ہو گئے تھے۔ اب کے تو اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

مولانا ظفر علی خاں بھی چل دیئے۔ ایک اور ستون گرا۔ یہ خلا بھی پُر ہونے والا نہیں ہے۔ یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ جتنے صاحب طرز اور زندہ رہنے والے ادیب تھے وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں۔ نئے لکھنے والوں سے کچھ زیادہ شاندار روایات کی امید رکھنا اپنے آپ کو فریب دینے کے مترادف نظر آ رہا ہے۔

سوچتا ہوں کہ مکاتیب نمبر سے پہلے اسی طرح کے ایک دو اور پرچے پیش کر دوں۔ تاکہ مکاتیب نمبر میں میرے نزدیک کوئی کسر نہ رہے۔

محمد طفیل

اصفہان کے گنبد

(ایک ریڈیائی تمثیل)

سید امتیاز علی تاج

حلاج : معزز سامعین! السلام علیکم! مزاج شریف؟ خالق ارض و سما نے جب سے یہ کائنات پیدا کی ہے، ابن آدم کو وہ مسرتیں کبھی نصیب نہیں ہوئیں جو آج اصفہان میں میسر ہیں۔ اس دیار حسن و عشق میں کسی شخص کا آئینۂ خاطر زنگ آلود نہیں۔ ہمیں اس قدر مسرتیں حاصل ہیں کہ اگر ہم تھوڑا سا غمگین ہونا چاہیں جب بھی نہیں ہو سکتے۔ اب مجھے دیکھئے آج ایک ایسی پریشانی کا سامنا ہے کہ میرے حواس مجھ سے رخصت طلب کرنے پر مصر ہیں۔ یہ کہتا ہوں، سوچنے اور دانے وانے کرنے سے کیا حاصل، حقیقت یہ ہے کہ میں ایک ایسی حسینہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں جس کے دیدار سے میری آنکھیں بہرہ یاب نہیں ہوئیں۔ آپ کو شاید یہ معلوم ہو گا کہ محبت کا مقدس جذبہ محض دیدار ہی سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ آگ کبھی کبھی گفتار سے بھی بھڑک اٹھا کرتی ہے۔ چنانچہ اگر ایک شاعر اپنی محبوبہ کی صورت دیکھے بغیر محض اس کے نام پر فدا ہو جائے تو آپ اس بیچارے کو قصوروار کیونکر ٹھہرا سکتے ہیں؟ رباعی تو میں نے کہہ ڈالی لیکن سوال اب صرف یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کے باپ کی دوسری شرط کیونکر پوری کی جائے؟ وہ آرزومند ہے ساتھ ہی یہ قید بھی لگا دی کہ جو شخص اس مقابلہ میں شریک ہونا چاہے رباعی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی پیش کرے۔ یہاں لے دے کے ساری پونجی صرف یہ ایک دینار ہے۔ افسوس کہ آپ اسے دیکھنے سے معذور ہیں بہرحال اب فکر ہے تو یہ کہ کیا افسوں پڑھ کر پھونکا جائے جو اسے ایک کے دس دینار نظر آنے لگیں؟ خیر ہمیشہ سے یہی ہوتی آئی ہے کچھ ہمیں پر موقوف نہیں۔ بڑے بڑے اہل کمال آشفتہ حال پھرتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ آج کل کاروبار مندا ہے۔ دکان پر اتنے گاہک نہیں آتے جن سے دس دینار کمانے کی امید ہو سکے۔ لیکن قسمت کا شکوہ کرنا احمقوں کا شیوہ ہے کاتب تقدیر نے جو کچھ لکھ دیا ہے ہو کر رہے گا۔

(موسیقی کے ساتھ شاہ کمال داخل ہوتا ہے)

حلاج : اخاہ آقائے شاہ کمال، خوش آمدید! اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ غریب خانے پر آپ قدم رنجہ فرمانے والے ہیں تو میں سارے فرش پر گلاب و یاسمن بکھیر دیتا۔ لیکن آپ نے اپنی تشریف آوری کی اطلاع ہی نہ بخشی۔ کہیے خیر ہے؟ آج تو حضور نے اپنا توڑا اس قدر جلد کیوں بند کر ڈالا؟

شاہ کمال : اے کوہ دانش! اے سلطان اعظم! ابھی ابھی بیٹھے بیٹھے میں نے سنا کہ اصفہان کے متمول سوداگر ابن تیم نے اپنی پری جمال دختر

کی شادی کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

حلاج : ماشاءاللہ! آپ کی سماعت میں اب تک کوئی عیب پیدا نہیں ہونے پایا۔

شہ کمال : یہ بھی سُنا کہ جو شخص اس کے جمالِ جہاں آرا کی تعریف میں بہترین رباعی کہہ کر لائے گا وہی اس کا شوہر قرار پائے گا۔

حلاج : لیکن میرے محسن اس کے ساتھ بعض شرطیں بہت کڑی بھی ہیں۔

شہ کمال : ہیں بھی تو سنوں وہ کیا ہیں؟ اگر چند اشعار کے عوض جوہری کی کافر ماجرا دختر ہاتھ آئے تو اور چاہئے کیا؟

حلاج : رباعی غروبِ آفتاب سے پہلے تیار ہو جانی چاہئے۔

شہ کمال : معمولی بات ہے۔ مجھے ایک گھنٹے کی فرصت ہے اتنی دیر میں چار مصرعے کہہ لینا کیا بڑی بات ہے۔ ارے برادر ایک مرتبہ شیخ کے ہاں ضیافت تھی۔ اس ناچیز نے ضیافت کا سارا کھانا گھنٹہ بھر میں تیار کر کے رکھ دیا تھا اور پھر لطف یہ کہ ہر کھاجے کی قطع اور رنگت کسی نہ کسی پھول سے مشابہ تھی۔ چنانچہ اس کارنامہ پر میں بجا طور پر فخر کر سکتا ہوں، یہاں تو صرف رباعی ہی کہنی ہے؟

حلاج : ایک شرط یہ بھی ہے کہ قافیہ میں مشک کا نام آئے اور اس طرح لایا جائے جس طرح جوہری زمرد کے نگینے کے ارد گرد سونے اور چاندی کے بیل بوٹے بنا دیتا ہے۔

شہ کمال : جیسی ویسی ہی نا جیسے سانچوں میں نان پاؤ تیار کئے جاتے ہیں۔ ارے تو مجھے تو شوہر سمجھے ہی گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دماغ کے تنور سے اشعار کے خستہ شیرمال نکلے آ رہے ہیں۔

حلاج : یہ بھی ضروری ہے کہ رباعی نہایت پاکیزہ خطِ نستعلیق میں لکھ کر پیش کی جائے۔

شہ کمال : یہ البتہ ٹیڑھی کھیر ہے تم جانتے ہو لکھنا مجھے آتا نہیں۔

حلاج : اس خدمت کے لئے میں جو حاضر ہوں۔

شہ کمال : دام کیا لو گے؟

حلاج : آقا اس خاکسار کو چاندی کا ایک دینار دے دیجئے۔ ایسے پاکیزہ خط میں نظم لکھ دوں کہ لوگوں میں ایک بار تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ہاں بھئی شہ کمال کی رباعی واقعی ماہ جبیں کی نظروں سے گزرنے کے قابل ہے۔

شہ کمال : منظور۔ یہ لو دینار۔ جو کچھ کہا سچ ہے تو یہ معاوضہ زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ تو گویا اب رباعی کی طرف توجہ کی جائے اور نہایت لطیف اشعار کہے جائیں۔ ذرا مجھے فکر کرنے دو۔ ہاں شروع کرنا چاہئے۔ تو شمع ہے میں پروانہ ہوں۔

حلاج : مگر ایک بات اور۔

شہ کمال : یار تم تو پریشان کئے دیتے ہو بڈھا اور کیا چاہتا ہے۔ کہہ بھی چکو۔

حلاج : رباعی کے ساتھ چاندی کے دس دینار بھی دینے ہیں۔

شہ کمال : ہوں! یہ بڑی قیامت۔ مگر پروا نہیں، دس دینار بھی سہی۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں شمع ہوں اور پروانہ ہے تو۔ ہوں! ہوں! ہوں! لاحول ولاقوة۔ غارت ہو گیا سارا خیال۔ کیسے تھا؟

(گھنٹی بجتی ہے)

حلاج : کون ہے؟

آواز (باہر سے) : میں ہوں علاؤالدین عطر فروش!

علاج : اندر تشریف لے آیئے۔

(علاؤالدین داخل ہوتا ہے)

علاج : آج تو میری قسمت کا ستارہ زوروں پر ہے اگرچہ آپ کے علم کے خزانوں سے گلاب کی بوئے دلآویز کے بھبکے اٹھتے ہیں لیکن مجھے اس وقت اس شخص کا خیر مقدم کرنے کی سعادت حاصل ہے جس کی باتیں عطر سے بھی زیادہ نکہت بیز ہیں۔

علاؤالدین : اگر یہ صحیح ہے تو یوں کہنا چاہئے کہ قدرت لطیف کاموں کے لئے ان ہی لوگوں کو منتخب کرتی ہے جنہیں لطافت ذوق کی نعمت عطا ہوتی ہے لیکن ذرا دیکھنا ان حضرت کو کیا ہو گیا؟ میرے خیال میں تو ان کی حالت اندیشناک سی ہے۔

علاج : یہ شکمال تابانی ہیں۔ آپ نے یقیناً انہیں بارہا دیکھا ہوگا۔

علاؤالدین : میں نے؟ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ میرا ان سے کیا واسطہ، لیکن یہ تو فرمایئے یہ ایسے وحشیانہ انداز میں کیوں گھوم رہے ہیں؟

علاج : یہ اس وقت بحر نظم میں غرق "قافیہ" کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔

علاؤالدین : کیا کہا، بحر نظم میں غرق؟ تابانی میں شاعر کی روح کہاں سے آ گئی۔ کہیں انہیں بھی تو یہ خبط نہیں ہوا کہ رباعی کہہ کر ماہ سیمیں پری جمال دوشیزہ کو حاصل کیا جائے؟ کیا خوب چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل۔

شکمال : ارے بھئی یہ کیا شور مچا رکھا ہے تم نے۔ اخاہ تم ہو میرے دوست علاؤالدین! وہ اس شیرمال کے دام آج تک ادا ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ یاد ہے نا؟ لاحول ولا قوۃ! مصرعہ ہی دماغ سے نکل گیا۔ کیا تھا۔ یہ گلہائے……

علاؤالدین : کتنا فرسودہ اور پامال خیال ہے۔ جیسے اس شخص کے شیرمال پھیکے اور بے مزا ہوتے ہیں ویسے ہی اشعار بھی بے کیف ہیں لیکن علاج پہلے میں اپنے یہاں آنے کی غرض وغایت بیان کر دوں۔ معلوم ہوتا ہے بڑھے جوہری کے عہد کا قصہ تم نے سن لیا ہے جانتے ہو کہ ابو حکیم خود تو بالکل کورا ہے لکھ پڑھ بھی نہیں سکتا لیکن بڑھے کو اس بات پر بڑا ناز ہے کہ اس کی بیٹی ماہ سیمیں……

علاج : میں جانتا ہوں یہ اشعار ماہ سیمیں پڑھے گی۔

علاؤالدین : بالکل ٹھیک۔ چنانچہ اگر اپنے اشعار میں تم سے لکھواؤں تو اس کا معاوضہ تم کیا لو گے؟

علاج : دو دینار!

علاؤالدین : دو نہیں بھائی ایک۔ کامیاب ہو گیا تو سارا بٹوہ تمہارا۔

علاج : منظور!

شکمال (جماہی لیتے ہوئے) : میرا قافیہ تنگ ہو گیا ہے۔ شعر سوجھتا نہیں۔

علاؤالدین : تو اب سوال یہ ہے کہ اشعار لطیف ہوں یا جذبات سے لبریز ہوں یا مشکل ہوں۔

علاج : تین دینار تو ہو گئے۔ شاید باقی سات بھی کہیں سے مل رہیں گے۔

شکمال : یہ گلہائے رنگا رنگیں۔ یہ گلہائے رنگا رنگیں۔

علاؤالدین : علاج! یہاں میرے لئے شعر کہنا ناممکن ہے۔ جب ایک ایسا عجیب و غریب انسان اس ہیئت کذائی کے ساتھ شاعری کا خون کر رہا ہو تو بھلا کوئی شریف آدمی شعر کیونکر کہہ سکتا ہے؟

علاج : آپ کہاں لکھنا پسند کریں گے؟

علاؤالدین : کوئی نرم اور گدگدی سی جگہ ہوتی یہاں گدیلے بھی تو نہیں ہیں۔ ارے میاں تم کیا آدمی ہو۔ درویشوں کی طرح زندگی بسر کرتے ہو۔

حلاج : آپ یہاں تشریف رکھئے نا۔

علاؤالدین : ہوں۔ خیر لیکن ایک بات سننا۔ اگر کوئی اور آئے تو اسے میرے قریب نہ پھٹکنے دینا۔ میرا دماغ بے حد حساس ہے اور اثر بڑی جلدی قبول کرتا ہے۔ پھر میرا ذوق بھی بے حد لطیف واقع ہوا ہے۔ کوئی غیر فصیح لفظ سن پاؤں تو ذہنی کوفت ہوتی ہے اور اگر کسی احمق کا منحوس چہرہ نظر آ جائے تو بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ ہفتہ بھر تک طبیعت مکدر رہتی ہے۔

حلاج : الٰہی تیری پناہ!

علاؤالدین : تو اب میں شعر کہتا ہوں۔

(گھنٹی کی آواز)

حلاج : کوئی اور صاحب تشریف لائے۔ ارے یہ تو حجامت مآب جناب سلیمان حجام ہیں۔

سلیمان : (بھاگتا ہوا آیا ہے اس لئے ہانپ رہا ہے) اماں حلاج سنا تم نے بوڑھے جوہری کا قصہ جب ڈھنڈورچی یہ خبر دے کر پھرے ہیں پہنچا تو میں خط بنا رہا تھا۔ اللہ کرے اس طرح بھاگا جیسے شیطان جسم سے نکل کر بھاگے۔ سارے شہر میں اس قصے کا چرچا ہو رہا ہے اور یہ دوشیزہ بھی تو حرم سرائے سلطانی کی زینت بننے کے قابل۔ ارے بھائی تمہارے وہم و گمان میں تو اس کی انگشتریوں کی صحیح قیمت بھی نہیں آ سکتی۔ ان کے نگینے اتنے بڑے ہیں کہ.....

حلاج : خدا کے لئے بات کرتے وقت اپنی قینچی کو یوں نہ گھمائیے آپ میری آنکھیں نکال ڈالیں گے۔

سلیمان : میں تو کہتا ہوں یا رب یہ بیداری کا عالم ہے یا خواب و خیال کی دنیا۔ میں اس قدر مسرور ہوں کہ بچپن کے زمانے کی طرح ناچنے کو جی چاہتا ہے۔ سنو! میں تم سے کچھ کام لینا چاہتا ہوں۔ معاوضہ نقد النقد جو جی چاہے مجھ سے لو اور اگر کہیں میں نے اس معرکہ میں فتح پائی اور ماہ جبین میرے ہاتھ آ گئی تو قسم کھاتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے اس حجامی کے پیشے سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ لو اب میں شعر کہتا ہوں اور تم فوراً انہیں لکھ لینا۔

گلی میں سے آواز : ارے بدمعاش نکل باہر، کہاں گھر میں چھپ بیٹھا ہے۔ حلاج سلیمان اندر ہے نا؟

سلیمان : (گھبرا کر) ارے یہ کم بخت یہاں آ پہنچا۔ جب ڈھنڈورچی آیا تو میں اس وقت اس کم بخت کی آدھی داڑھی تراش چکا تھا۔

(گلیش داخل ہوتا ہے)

حلاج : خوش آمدید گلیش!

گلیش : لیکن تم مسکرا کیوں رہے ہو؟

حلاج : کیونکہ آج بڑی مدت کے بعد آپ کی زیارت ہوئی ہے۔

گلیش : وہ را کم بخت حجام۔ کیوں بے بدمعاش یہ کیا حرکت تھی۔ آدھی داڑھی تراش کر اٹھ بھاگا۔ شہر کے ایک معزز آدمی کا اچھا خاصا مسخرہ بنا ڈالا۔ میں اس بلا کی گرمی میں سوانگ بنائے گلی کوچوں میں سے بھاگتا چلا آیا ہوں۔ ادھر تو آ۔ تجھے بھاگنا سکھاؤں۔

حلاج : اجی حضرت ایسا بھی کیا غصہ۔ ذرا بات تو سنئے۔ سلیمان برا آدمی نہیں۔ البتہ دل کے ہاتھوں مجبور ہے اور پھر اس وقت ذرا فکرِ شعر میں مصروف ہے۔

گلیش : کیا کہا شعر! ایک بار اس کی ناک میرے ہاتھ آ جائے تو اسے سکھاؤں شعر کہنا۔

علاؤالدین : ارے بھئی یہ کیا مصیبت ہے۔ رفع کرو اس جنگلی کو یہاں سے۔

شاہ کمال: اے ہو۔ اتنی دیر کے بعد ایک ہی لفظ سوچا تھا۔ وہ بھی بھول گیا۔

سلیمان: قبلہ آپ کی باقی ڈاڑھی میں پھر کسی دن تراش دوں گا۔ اس وقت آپ کو معلوم نہیں میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔ مجھے معاف فرمائیے۔

گلیش: ہیں؟ کیا کہا؟

حلاج: میں نے کہا حضرت ذرا بات تو سنئے۔ میں نے سنا ہے آپ بڑے کاروباری شخص واقع ہوئے ہیں۔

گلیش: تو پھر؟

حلاج: آپ بھی وہی کیجئے تاجر لوگ کر رہے ہیں۔

گلیش: کیا میں بھی شعر کہوں؟ میں اور شعر؟

حلاج: چار مصرعے ہی تو کہنے ہیں۔ خبر آپ نے سن ہی لی ہو گی۔

گلیش: وہی ابن حسیم کا قصہ۔ جی ہاں، یعنی کہ وہ اپنی لڑکی چند شعروں کے عوض بیچ ڈالنا چاہتا ہے۔ نا بھائی ان دنوں بیوپار پر بہت روپیہ صرف ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی استطاعت کہاں۔

حلاج: غالباً آپ نے یہ نہیں سنا کہ جہیز میں شتر و دولت بھی ہاتھ آئیں گے۔

گلیش: ہاہا! تم نے مجھے پہلے کیوں نہ کہا۔ یہ بات ہے تو میں اس لڑکی کو بیعت کر لوں گا۔

حلاج: بالکل بجا۔ لیکن رباعی لکھنی بھی تو پڑے گی۔

گلیش: لکھنے کی بات ٹیڑھی ہے۔

حلاج: ایک دینار صرف کیجئے تو ہر مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے۔

گلیش: اللہ! ایک دینار۔ یہ تو بہت ہے۔ نصف دینار لو۔ ہاں نصف دینار۔

حلاج: لیکن پاکیزہ اشعار اگر پاکیزہ خطوط میں نہ لکھے گئے تو حاصل کیا ہو گا۔

گلیش: اچھا تو پھر یوں ہی سہی۔ یہ لو دینار۔

حلاج: یہ خیال بھی تو کیجئے کہ لڑکی کے ساتھ دولت کتنی ہاتھ آئے گی۔

علاؤالدین: شکر ہے الٰہی کسی قدر سکون تو نصیب ہوا۔ تو اب حسین کا کوئی نیا اور شگفتہ قافیہ تلاش کریں۔ اب سے قافیہ کی تلاش شروع کرنی چاہئے۔ حسین آئیں۔ زبر، ہوا اور یہاں قافیہ ہے یا ئیں۔ رنگیں، سنگیں، شیریں، نمکیں۔ رنگین اور نمکین اچھے قافیے ہیں۔ پہلے قافیہ مقرر کر لینا چاہئے۔ خیال خواہ پست ہو اس کی پروا نہیں۔ شاعری کی جان الفاظ کا ترنم اور آہنگ ہے۔

گلیش (روتے ہوئے): اماں علاؤالدین تم نے تو مغز چاٹ ڈالا۔ جہاں کوئی موزوں ترکیب سوجھتی ہے۔ تم اسے غتر بود کر دیتے ہو۔

سلیمان: کہاں ہو شاہ کمال، گلیش میں اپنی رباعی دل ہی دل میں دہرا رہا ہوں۔

شاہ کمال: اگر کچھ ایسی ہے تو آپ حضرات کوئی اور شگفتہ سوچئے۔

علاؤالدین: یہ مصرع کیسا رہے گا ع ترانے بلبلیں گاتی ہیں تیرے روئے رنگیں کا۔

شاہ کمال: سوجھ گیا۔ بالکل سوجھ گیا ع نہیں ہے علم بلبل کو رہ الفت کے آئیں کا

علاؤالدین (اچھل کر): کیا کہا تم نے؟ نہیں ہے علم بلبل کو۔ یہ ہرگز نہ ہونے پائے گا۔ بلبل کا خیال میرا ہے۔

گلیش: اتنا جھگڑا تو ہو گیا۔ کہاں بلبل کہاں شعر۔

علاؤالدین: تم سب کے سب چور ہو۔ یہ ساری بلبل چوروں کی ٹولی ہے۔

حلاج: دوستو! یہ کیا ہوا نہیں۔ شاعر اور عاشق اور اس پر یہ کیفیت کہ مرغوں کی طرح لڑ رہے ہو۔ اس خشک اور سوختہ دنیا میں شاعر تو ابرِ رحمت کی طرح ہیں۔ جو خدا کی دنیا کو سیراب و شاداب بناتے ہیں۔ پھر شاعروں کا لڑنا جھگڑنا کیا معنی؟

سلیمان: (اچانک) حلاج، گلیش، شاہ کمال، علاؤالدین! میں نے رباعی کہی۔

علاؤالدین: نہیں نہیں پہلے اس قضیہ کا فیصلہ ہونا چاہئے۔

سلیمان: اماں چھوڑو اس قصے کو۔ (حلاج تم) میرے شعر قلمبند کرلو۔ دیر کی تو میں بھول جاؤں گا۔

کہیں خوشبو ہے ریحاں کی کہیں ہے رقص نسریں کا
کہیں بلبل کے
....

علاؤالدین: کیا کہا بلبل! یعنی تم نے بھی میرا ہی بلبل کا خیال چرا لیا۔ چچا جان کی ریش دراز کی قسم یہ دنیا ٹھگوں سے بھری ہوئی ہے۔

سلیمان: کیوں بلبل کے ٹھیکیدار آپ ہی بن بیٹھے؟

علاؤالدین: بلاشبہ پہلے مجھے سوجھا تھا۔

شاہ کمال: سنا آپ نے، واللہ کہ سوجھا مجھے پہلے تھا۔

گلیش: بکتے ہو جی۔ یہ لفظ میرا ہے۔

حلاج: یہ کس الجھن میں پڑ گئے آپ لوگ۔ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ یہ نہ بھولئے کہ آسمان کی بلندیوں پر چاند اگرچہ ایک ہی نکلتا ہے لیکن اس کا پرستار ہر باغ میں موجود ہوتا ہے جو راتوں کے سناٹے میں اس کی تعریف کے گیت گاتا ہے۔

سلیمان: واللہ کیا بات کہی ہے۔ آدمی عقلمند ہے۔ مجھ سے پوچھو تو سب کے سب بڑے شوق سے اس لفظ کا استعمال کریں۔ الفاظ پر کسی کے باپ کا اجارہ ہے؟

علاؤالدین: لیکن مجھے اس سے انکار ہے۔ میں یہ نہیں مان سکتا۔ ہر ایک جانتا ہے کہ الفاظ کے دہرانے اور ان کی تکرار سے حسنِ کلام کا خون ہو جاتا ہے۔

سلیمان: حلاج! اس معاملہ سے تمہارا کوئی ذاتی تعلق نہیں اس لئے تم ثالث بن کر یہ جھگڑا چکا دو۔

شاہ کمال: میں اس کی تائید کرتا ہوں۔

گلیش: اور میں بھی۔

علاؤالدین: اور میں بھی۔

حلاج: یہ تو بڑی سیدھی سی بات ہے۔ آپ کے اشعار خواہ دوپہر کی طرح روشن ہوں۔ خواہ شام کی تاریکی کی مانند مبہم اور لطیف یا تاروں بھری رات کی طرح پُرشکن آپ کی مرضی پر موقوف ہے۔ لیکن ان میں طلسم ایسے الفاظ کا باندھ دیجئے۔ جن میں سنبل و ریحان اور مشک و عنبر کی شمیم جاں نواز کا ذکر ہو اور کائنات گلہائے رنگا رنگ سے تختۂ گلزار نظر آئے۔ نرگس کی نگاہ بازی بھی اور سوسن کی زباں درازی بھی۔ اس میں جتنے خوش الحان کا نام بھی لائیے قمری، فاختہ، طوطی اور طاؤس کا ذکر بھی کیجئے لیکن بلبل ہزار داستان کا نام بھی نہ لیجئے۔

علاؤالدین: یعنی کوئی بھی بلبل کا ذکر نہ کرے۔ اس طرح تو میں خسارہ میں رہا۔ لیکن اچھا تم کہتے ہو تو یوں ہی سہی۔

سلیمان: تو یہ فیصلہ ہو گیا کہ بلبل کا نام اشعار میں نہ آئے گا۔ یوں ہی سہی۔

(پھر سب بیٹھ کر شعر کہنا شروع کر دیتے ہیں)

حلاج (دینار گنتے ہوئے): ایک، دو، تین، چار، پانچ! —— دنیا میں مجھ سا بدقسمت بھی کوئی نہ ہوگا۔ تاجروں سے سنا ہے کہ پانچ اور پانچ دس ہوتے ہیں۔ باقی رہے پانچ دینار۔ اب وہ کیونکر حاصل کیے جائیں۔ (ناظرین سے مخاطب ہو کر) اے سننے والو! معلوم نہیں میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی تعریف میں مجھ سے اچھا شعر کوئی نہیں کہہ سکتا لیکن افلاس بہت بڑی لعنت ہے۔ اب اتنا وقت بھی نہیں رہا کہ روپیہ کہیں سے چرا کر ہی لے آؤں۔ اچھا اگر میں اسے پا نہیں سکتا تو اس کی بھی کوئی پروا نہیں۔ اگر وہ میرے ہاتھ نہ آئی جب بھی یہ آفتاب کی روشنی، بادل اور یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، پھول اور شعر تو کہیں نہیں گئے۔

سلیمان (نہایت بلند آواز سے): ہو گئی ہو گئی رباعی۔ حلاج جلدی کرو۔ نکالو قلم اور کاغذ۔ اشعار سیلاب کی طرح بہے چلے آ رہے ہیں اور میری روح کے قفس کی تیلیاں توڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ جلدی کرو اور ان کے پاؤں میں حروف کی زنجیریں ڈال دو۔

حلاج: تیار ہوں، بولو!

سلیمان: ؎ تصور میں ترے دیکھا ہے میں نے محل پرویں کا
نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دیں کا
مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب

شاہ کمال: آہا ہا ہا! کیا خوب رباعی ہے۔ حلاج لکھنا میرا شعر جلدی سے۔ کیا تھا پہلا مصرع؟

سلیمان: مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب

حلاج: ارے بھائی ٹھہرو، میں دونوں ہاتھوں سے نہیں لکھ سکتا۔

گلیش: اے سبحان اللہ۔ "ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا"

علاؤ الدین: اماں جانے دو ان چوروں کو، ان کی مت سنو، میرے شعر لکھو۔

سلیمان: میں نے کہا تھا "مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب"

علاؤ الدین : ترا پیکر سہارا ہے مرے احساسِ رنگیں کا
گلیش : ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا
شاہ کمال : جہانِ عشق و مستی میں گزر کب ہے خلقِ تحسیں کا
سلیمان : مری آنکھوں پہ منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج: یارو ذرا بس کر کے ڈرتے ہو۔ مجھے تو پسینہ آنے لگا۔ اُف وہ کتنی گرمی ہے۔ سینوں میں شاعری کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ایک ایک کر کے کہو۔ سلیمان پہلے تم اپنی رباعی لکھواؤ۔

سلیمان: ؎ تصور میں ترے دیکھا ہے میں نے محل پرویں کا
نہ کچھ دل کو تسلی ہے نہ کچھ سامان ہے دیں کا
مجھے اس رفعتِ بے کیف و بے لذت سے کیا مطلب
مری آنکھوں پہ منڈلاتا ہے پرتو ماہِ سیمیں کا

حلاج: واہ واہ سبحان اللہ! کیا دلکش اشعار ہیں۔ اے کاش یہ اشعار میرے ہوتے۔

علاؤ الدین: اماں رہنے دو۔ تم انہیں دلکش کہتے ہو۔ خدا کی پناہ میں تو سمجھتا ہوں نہایت پھسپھسے شعر ہیں۔

سلیمان: کیوں بے پھسپھسے ہیں ہمارے اشعار؟

علاؤ الدین: ارے چھوڑ میرا کان۔

حلاج: شاہ کمال اب تم اپنی شاعری کے نمونے کا ڈھکنا اٹھاؤ۔ دیکھیں الفاظ کے گچھے تیار کرنے میں تمہیں کتنی مہارت ہے۔

شاہ کمال: عرض کرتا ہوں ؎

تخیل سے مرے کیا واسطہ شہباز و شاہیں کا　　جہانِ عشق و مستی میں گزر کیسا خلق و تمکیں کا
اسی دن زندگی کو زندگی کہہ کر پکاروں گا　　مرے ہاتھوں میں ہوگا ہاتھ جس دن ماہ جبیں کا

حلاج: کیا کہنے ہیں۔ واہ واہ، واہ!

علاؤ الدین: شاہ کمال ایک بات میری سن لو۔ اگر ماہ جبیں کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو چوتھا مصرعہ بدل ڈالو۔

حلاج: گلیش! آگے آؤ۔ اب تمہاری باری ہے۔

گلیش: کہتا ہوں کہ ؎

ترا جسم اک مرکب سنبل و ریحان و نسریں کا　　بیاں میں کیا کروں تیرے جمالِ لذت آگیں کا
میں سچ کہتا ہوں پانی کی طرح سونا بہا دوں گا　　بس اک پل کے لئے جلوہ دکھا دو ماہ جبیں کا

علاؤ الدین: ان اشعار میں دولت کا تذکرہ ضرورت سے زیادہ ہے۔

حلاج: اماں تم تو کسی کو بھی داد نہ دو گے۔ اچھا اپنے اشعار سناؤ۔

علاؤ الدین: تمہارا اصرار ہے تو انکار کیسے کر سکتا ہوں۔ لیکن واضح رہے کہ جو کچھ کہا ہے روا روی میں کہا ہے اور اس زمانہ کے تمام بلند پایہ شاعر ایک ایک مصرعہ پر پورا ہفتہ صرف کر دیتے ہیں۔ تو عرض کیا ہے کہ ؎

ترا پیکر سہارا ہے مرے احساسِ رنگیں کا　　ترا ماتھا ستارہ ہے مری شبہائے مشکیں کا
مجھے لوگوں نے کوٹھے کی پلک پر کر پکارا تھا　　ہوا میں اڑ رہا تھا بال میرے ماہ جبیں کا

شاہ کمال: چوہے کا سا تخیل ہے۔

سلیمان: الٹے استرے جیسا باریک خیال۔

گلیش: اماں تمہیں کیا پڑی ہے کہ نکتہ چینی کر کر کے دوسروں کے اشعار درست کر رہے ہو۔ رہنے دو یہی وقت تھوڑا ہے مجھے اب دس دینار لانے کے لئے جانا چاہئے۔

سلیمان: میں بھی جاتا ہوں۔ چلو سب اپنے اپنے گھر چلیں۔

شاہ کمال: خدا حافظ حلاج۔ ہم ابھی آتے ہیں۔

(سب جاتے ہیں)

حلاج: اب شمعیں روشن کر دوں؟ نہیں جب دن بھر کی گرمی کے بعد رات اپنے تاریک پنکھ پھیلا دیتی ہے تو ارمان بھرے دل کی حرکت مدھم پڑ جاتی ہے اور غم بھی شیریں معلوم ہوتا ہے شمعیں خاموش ہی رہنے دوں۔ لیکن حلاج اب ان خیالات کو چھوڑ۔ ہاتھ پاؤں ہلا اور اپنے حقیر جھونپڑے کو اپنی محبوب کی آمد کے لئے آراستہ کر۔ الٰہی فردوس اور جہنم میں کتنا کم فاصلہ ہے مٹھی بھر سونا ہے جو جنت کی رنگینیوں اور دوزخ

کی اڑچنوں کو پیدا کرتا ہے۔

شاہ کمال (دور سے آہستہ سے): حلاج!

حلاج: کون؟ آپ؟ دوسری بار کیسے تشریف لائے؟

شاہ کمال: ذرا آہستہ بولو۔ میں نے کہا کہ یہیں تمہارے سوا کوئی دوسرا تو نہیں؟

حلاج: نہیں۔ یقین نہ آئے تو شمع روشن کئے دیتا ہوں۔

شاہ کمال: نہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے فوراً کہے دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں ماہ سیمیں کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اب میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ میرے اشعار علاؤالدین کے اشعار کے سامنے تخیل کے اعتبار سے پست ہیں۔ وہ تو بڑا شاعر ٹھہرا، اور بھی شعر کہنا کون سا تیسرا سال دینار کرتا ہے۔ لیکن اگر تم چاہو تو مجھے کچھ امید ہو سکتی ہے۔ تمہارے قلم کی ایک جنبش اس کے اشعار کو کچھ کا کچھ بنا سکتی ہے۔

حلاج: ذرا دیکھوں تو اس کی رباعی یہ رہی۔ ایک دینار دو تو ہو سکتا ہے۔

شاہ کمال: بس تو میدان مار لیا میں نے۔ یہ لو ایک دینار۔ علاوہ ازیں شادی کے بعد ضیافت بھی دی جائے گی۔

(جاتا ہے)

حلاج: صرف ایک دینار...... اس سے کیا بن جائے گا؟

سلیمان (آہستہ سے): حلاج!

حلاج: کون ہے؟ سلیمان؟

سلیمان: ہاں میں ہوں۔ ارے بھیا! مجھے تو اپنی ناکامی کا پورا یقین ہو گیا۔ لیکن اگر اس آڑے وقت میں تم کام آؤ تو......

حلاج: کوئی فکر نہیں۔ میں سمجھ گیا تمہارا منشا۔

سلیمان: میں تمہیں بتا دوں کہ ابن حکیم کو فن شعر سے کچھ واسطہ نہیں۔ وہ تو صرف روپے کا بھوکا ہے چنانچہ مجھے اندیشہ ہے کہ گلیش کے اشعار اسے بہت پسند آ جائیں گے۔ اب تم مہربانی کر کے یہ ایک دینار لو اور مجھے اس پریشانی سے نجات دو۔ میں نے جو اشعار لکھے ہیں انہیں اسی طرح رہنے دو، اور......

حلاج: میں سمجھ گیا۔

سلیمان: گلیش کے اشعار کو مسخ کر دو۔

حلاج: ہو جائے گا بے فکر رہو۔

سلیمان: تو میں چل دیا۔ (جانے کے بعد)

حلاج: ایک دینار اور ہاتھ آیا۔ اگر اسی طرح آج......

علاؤالدین: حلاج!

گلیش: حلاج!

علاؤالدین: کون ہے؟

گلیش: ارے تم کہاں سے آن ٹپکے۔ میں تو ایک نہایت ضروری کام کے لئے آیا ہوں۔

علاؤالدین: خوب! لیکن جناب نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ مجھے ضروری کام نہیں ہے۔ جناب ہی کیوں نہیں ذرا سی دیر کے لئے رک جاتے؟

گلیش: مشکل ہے۔

علاؤالدین: تو جناب میرے لئے آسان نہیں۔

علاج: ارے لڑتے کیوں مرتے ہو۔ ادھر آؤ اور میری ایک بات سنو۔ مجھے ایک عجیب دل لگی سوجھی ہے۔ یقیناً تم دونوں اس معرکے میں کامیاب ہونا چاہتے ہو لیکن ایک آدمی تین کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اگر تم دونوں ایک ایک دینار صرف کر دو تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اپنا معاوضہ لیکر میں تمہارے حریفوں کے اشعار توڑ مروڑ کر بے حد مضحکہ خیز بنا دوں گا۔ میں بہ آسانی یہ کر سکتا ہوں۔ ایک نقطہ یا حرف یا لفظ سے معنی کچھ کے کچھ ہو جائیں گے۔ زیادہ معاوضہ تو نہیں ایک ایک دینار میں ایسی بڑی جاہ و شہرت ہاتھ آتی ہے۔

علاؤالدین: مجھے اپنے ابن عم کی ڈاڑھی کی قسم، تم میرے اندازہ سے زیادہ عقلمند ہو۔ مجھے منظور ہے، یہ لو ایک دینار۔

گلیش: نہ معلوم میرے سر پر کیا حماقت سوار ہے کہ اتنا کچھ خرچ کرنے پر تیار ہو رہا ہوں۔ بہر حال یہ رہا دینار۔

علاؤالدین: اب میں جب شکال کی صورت دیکھوں گا تو مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔ میں چل دیا۔ (جاتا ہے)

گلیش (جاتے ہوئے): اب میں خواہ کامیاب ہوں یا ناکام، سلیمان کی دال تو گلنے پائی نہیں۔

علاج (جلد جلد): ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھ، سات، آٹھ، نو۔ بس ایک دینار کی کسر ہے، میری سوئی ہوئی تقدیر اس وقت آنکھیں کھول رہی ہے۔

(جلدی سے دروازے کی طرف جاتے ہوئے)

اماں گلیش پلٹ آؤ۔ بات تو سنو، سچ کہتا ہوں کہ تم نے آج تک اس سے زیادہ منگا سودا کبھی نہ کیا ہوگا۔

گلیش: خود ہی تو دینار روپیہ چھینا اور بدمعاش خود ہی کہتا ہے کہ میں نے اتنا منگا سودا کبھی نہ کیا ہوگا۔

علاج: میں کہتا ہوں جس شخص کو عطر سازی آتی ہے۔ وہ بہ آسانی شعر بھی تصنیف کر سکتا ہے۔ یاد رکھو علاؤالدین شاعر ہے اور تمہارے اشعار کا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا۔

گلیش: تو اگل دے میرا سارے کا سارا روپیہ۔

علاج: تم بھی کس قدر احمق ہو۔ ارے سنا نہیں کہ دوڑ میں جو گھوڑا سب سے پیچھے ہو آخر میں وہی جیت جایا کرتا ہے چنانچہ اگر میدان مارنا چاہتے ہو تو ایک چھوٹا سا ہی اور دے ڈالو۔

گلیش: قسم کھا کے کہتے ہو کہ جس طرح دوسروں کے اشعار مسخ کئے ہیں اسی طرح علاؤالدین کے اشعار بھی مسخ کر دو گے؟

علاج: قسم ہے تمہاری ڈاڑھی کی۔ بلکہ میرے یار، میں نے اشعار میں ردوبدل کر بھی دیا۔

گلیش: بس صرف ایک لفظ کی تبدیلی؟

علاج: صبر کرو جب ماہ سیمیں تمہارے ہاتھ آ گئی اس وقت تمہیں میرے الفاظ کی صداقت معلوم ہو سکے گی۔

گلیش: مگر ایک دینار کی رقم بڑی بھاری ہے۔

علاج: تمہاری مرضی۔ میں جانتا ہوں روپے کے معاملے میں تم بڑے سیانے ہو پر اتنا خیال نہیں کرتے کہ اس کے ساتھ دولت کتنی ہاتھ آئے گی۔

ارے تم تو تذبذب میں پڑ گئے۔ پھر انکار ہے کیا؟ یوں ہی سہی۔ ماہ سیمیں تمہاری قسمت ہی میں نہیں۔

گلیش (آہ بھر کر): اچھا یہ بھی لے لو۔

علاج: دس پورے ہو گئے۔ آخر دس پورے ہو گئے۔

گلیش: [illegible]

حلاج: آپ کے دستِ کرم پر دس برکتوں کا نزول ہو۔ غم کی تیرگی دور ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاند نکل آیا۔ اگر انسانوں کی دنیا درحقیقت اس سے آدھی بھی حسین اور دل فریب بھی ہوتی جیسی آج نظر آ رہی ہے اور شباب اور محبت کا نور ہمارے سینوں کو یونہی جگمگاتا رہتا تو زندگی ایک ایسی لطیف و پاکیزہ نظم ہوتی کہ شاعر قلم ہاتھ سے رکھ دیتے۔

گلیش: تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو گویا ماہ سیمیں کو حاصل کرنے کا خواب تم بھی دیکھ رہے ہو۔

حلاج: ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں تخیل پرست ہوں لیکن حقیقت ہے کہ ہم اپنی زندگی کی تعمیر خود کرتے ہیں اور جب ہم شباب کو بھول جاتے ہیں تو زندگی ایک بیکار چیز رہ جاتی ہے۔ لیکن سنو آہٹ سن رہے ہو۔ اس کی پالکی کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ اس کوچے سے گزر کر ہماری جانب آ رہے ہیں۔

(ماہ سیمیں کے عاشق داخل ہوتے ہیں)

اس کے عاشق شاعر آ رہے ہیں۔ خوش آمدید۔

شہ کمال: حلاج ہم نے اسے مسجد کے قریب گزرتے دیکھا ہے۔

سلیمان: وہ حسین ہے بادام کے بھرے بھرے درخت سے زیادہ حسین۔

علاؤالدین: حلاج تمہارے ہاں آئینہ بھی نہیں؟

حلاج: نہیں بندہ پرور۔ اب ذرا سرک جائیے۔ اس کے لئے جگہ چھوڑ دیجئے۔ ماہ سیمیں کی سواری آتی ہے۔ ساتھ اس کا باپ ابن حکیم ہے۔

ابن حکیم: اے نیلے گنبدوں والے شہر اصفہان کے باشندو! میں تمہیں زیادہ دیر تک یہاں ٹھہرنے کی تکلیف نہیں دینا چاہتا۔ میں جو کچھ کہہ چکا ہوں تم سب نے سن لیا ہے۔ میں اب ایک ضعیف العمر اور سفید ریش انسان ہوں مجھے لے دے کے اب یہی ایک خواہش ہے کہ میرے جیتے جی میری لڑکی کی شادی ہو جائے۔ تم پوچھو گے کہ میں اپنی لڑکی کو شعر کے عوض کیوں دے دینا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہارے امتحان کے لئے سپاہ گری کا کوئی کرتب کیوں تجویز نہیں کیا۔ میرا جواب مختصر ہے۔ جو شخص شاعری سے جو درحقیقت زندگی کی ساری لطافت کا مجموعہ ہے محبت نہیں کرتا میں اسے فطرت کا باغی اور وحشی سمجھتا ہوں۔ وہ درحقیقت صرف نام کا انسان ہے۔ اسی طرح جس شخص کے دل نے عشق کے آگے سر جھکا دیا ہے اس نے خواہ کتنی ہی غلطیاں کیوں نہ کی ہوں وہ عام لوگوں کی نسبت بہت زیادہ شفیق ہوگا۔ اس لئے حضرات اب آپ میں سے ہر شخص باری باری آگے بڑھ کر شاعری کے جوہر دکھائے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ میں سے کون شاعری کے میدان میں گوئے سبقت لے جاتا ہے۔ اس معرکہ میں جو کامیاب ہوگا اسے حسن اور دولت کا انعام دیا جائے گا۔

حلاج: اے ماہ سیمیں! اے بہار کے چاند! اگرچہ ان اشعار کو ایک بے ہنر کے قلم نے لکھا ہے لیکن کیا آپ ان پر نظر ڈالنا گوارا فرمائیں گی؟

ماہ سیمیں: تم حلاج ہو۔ اہل قلم کے بادشاہ حلاج!

حلاج: بادشاہ جب، اگر میری خوشنویسی آپ کو پسند آ جائے۔

ماہ سیمیں: اس کاغذ کے نیچے شہ کمال کا نام لکھا ہے۔

شہ کمال: میں ہوں شہ کمال۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ اشعار تخیل کے اعتبار سے کسی قدر پست ہیں لیکن آپ جانتی ہیں کہ کام بلند پایہ شاعر۔۔۔

ابن حکیم: خاموش۔ ہم اشعار سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہیں۔

ماہ سیمیں: —

نہ جانے ان دنوں کیوں درد اٹھتا نہیں دل کا
تجھے دیکھا ہے میں نے پیش اس دنیا میں حسیں کا

چٹانوں سے بھی روکھی روٹیاں ان کو کھلاؤں گا
اگر مجھ کو میسر ہو خزانہ ماہ سیمیں کا

ابا جان: ظاہر ہے کہ شکمال خواہ کیسا ہی ہنرمند نابالغ مانا جائے پر شاعری سے اسے دور کا بھی تعلق نہیں۔

شکمال: لیکن۔ لیکن۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ ان اشعار کا ایک لفظ بھی میرا نہیں ہے۔ صلاح تم مجھ سے بدمعاش ہو۔ خدا نہ کرے کہ میں ایسے اشعار لکھوں۔

علاؤالدین اور گلیش: مگر یہ شعر تم ہی نے تو لکھے ہیں۔

شکمال (رکتا ہے): میں کہتا ہوں بس دل لگی کی حد ہو چکی۔ یہ اشعار ہرگز میرے نہیں۔

علاؤالدین: ہم کہتے ہیں یہ تمہارے ہیں تمہارے۔

شکمال: مجھ پر کسی نے جادو تو نہیں کر دیا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرات! للہ مجھے یقین ہے کہ یہ اشعار میں نے نہیں لکھے۔

ابن حسیم: اچھا اب دوسرے شاعر کی باری ہے۔

ماہ سیمیں: اس کاغذ پر سلیمان کا نام لکھا ہے۔ سلیمان کون ہیں؟

سلیمان: میں ہوں بندۂ ناچیز سلیمان۔

ماہ سیمیں: مری تخئیل نے موڑا......

سلیمان: نہیں نہیں تصوّر میں تو دیکھا......

ابن حسیم: کمبخت۔ ہاں بیٹی پڑھو کیا لکھا ہے۔

ماہ سیمیں: ؎

مری تخئیل نے موڑا ہے سر شہباز و شاہیں کا
فرشتے گیت گاتے ہیں مری محفل رنگیں کا
مرے دل میں ہزاروں اختر سے اب تک پرافشاں ہیں
کہ دیکھا ہے تصوّر میں ہیولیٰ ماہ سیمیں کا

سلیمان: جی ایسے اشعار لکھنے کی سزا میں ہم نے صلاح کا گلا نہ کاٹ ڈالا تو دیکھنا! بیٹا کس بھول میں ہو جو صابن کے جھاگ میں غوطہ نہ دیا تو میرا نام سلیمان نہیں۔

ابن حسیم: ظاہر ہے کہ ایسے بیہودہ گو شاعری کے اس معرکے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ دوسرے شاعروں کا کلام پڑھو۔

ماہ سیمیں: علاؤالدین۔

علاؤالدین: میں اتنا عرض کر دوں کہ میرے ٹوٹے پھوٹے اشعار کو پورے غور سے پڑھیے گا۔

ماہ سیمیں: بسا ہے میری نس نس میں معطر زلف مشکیں کا

علاؤالدین: نہیں نہیں یہ نہیں نہیں یہ کہاں تیرا پیکر سمایا ہے مرے......

ابن حسیم: کوئی اسے چپ کرائے ہاں بیٹی پڑھو۔

ماہ سیمیں: ؎

بسا ہے میری نس نس میں معطر زلف مشکیں کا — نہ دھوکا کھائیے غیروں کے احساسات رنگیں کا
میں بدصورت سہی بھونڈا سہی بدنام سہی لوگو — مگر خوشبو سے بھی بہلاؤں گا ماہ سیمیں کا

علاؤالدین: ہاں۔

ماہ سیمیں: ابا جان! کہیں اس خوشبودار بندے سے میری شادی نہ کر دیجئے گا بس اب ایک کا فقدان رہ گیا ہے گلیش۔

ابن حسیم: گلیش صاحب معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا انعام آپ کے حصے میں آئے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ کے اشعار ان لوگوں سے بھی بُرے ہوں۔ اس لئے انہیں پڑھنے کی زحمت کیوں اٹھائی جائے میں لڑکی آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔

ماہ سیمیں: لیکن ابا جان! یہ بھی دیکھئے کہ یہ شخص بھینگا ہے۔

گلیش: میری التجا ہے کہ آپ میری گھنٹہ بھر کی محنت کو یوں ضائع نہ کریں۔

ماہ سیمیں: میں شعر پڑھتی ہوں —

زمانہ میں بس اک ریشم ہی ہے سامانِ تسکیں کا
نہ مجھ کو ہوس خوشبو کی نہ لالچ جامِ شیریں کا
اگر میلے ہیں میرے ہاتھ تو کیا آپ یوں کیجئے
مری ڈاڑھی سے دامن باندھ دیجئے ماہ سیمیں کا

گلیش: حلاج! رکھ دے میرے تین دینار یہاں پر اسی وقت۔

سلیمان: اماں تین دیناروں کے پیچھے مرے کیوں جاتے ہو۔ دیکھئے تو یہ شادی کا معاملہ آخر طے کیونکر ہوتا ہے۔

حلاج: آہ ماہ سیمیں کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔

ماہ سیمیں: ان سب نے میری ہنسی اڑائی ہے۔

حلاج: نہیں ان بیچاروں کا کوئی قصور نہیں یہ سب کیا دھرا میرا ہے۔

ابن حسیم: تم ذرا صاف صاف کہو کیا بات ہے ورنہ آج خیر نہیں تمہاری۔

حلاج: پہلے ایک رباعی جو ابھی پڑھی نہیں گئی۔

ابن حسیم: یہ کس نے کہی ہے؟

حلاج: میں نے!

ابن حسیم: مجھے بتایا گیا ہے تم بے حد مفلس ہو۔ کیا دس دینار تمہارے پاس موجود ہیں؟

حلاج: یقیناً! یہ بھی سمجھا اور جو کچھ بھی میرے پاس ہے لے لیجئے میری طاقت میری جوانی میرا قلم میری طبیعت کی جودت اور حسن کی پرستش کا شاعرانہ جذبہ غرض جو کچھ آپ چاہتے ہوں میں پیش کر سکتا ہوں مجھ سے لے لیجئے۔

ابن حسیم: پڑھو۔

ماہ سیمیں: میں اس وقت تک اس کی نظم سنوں گی ہی نہیں جب تک کہ......

سلیمان: جب تک کہ حلاج خود اسے نہ پڑھے گا۔

ماہ سیمیں: ہاں!

حلاج: کیوں صاحب! شاعر اپنا کلام خود بھی پڑھ کر سنا سکتا ہے۔

ابن حسیم: تمہیں اجازت ہے۔

حلاج : ـــ
رُخِ پُرنور کعبہ ہے تری چشمِ جہاں بیں کا
فلک بس ایک سایہ ہے ترے گیسوئے مشکیں کا
اسے چھو لوں مگر ہاتھوں کو کوثر میں بھگو لاؤں
کہ تاروں سے بھی پاکیزہ ہے دامن ماہ سیمیں کا

ماہ سیمیں : کس قدر دلکش اشعار ہیں۔

سلیمان : نہایت دلفریب اور بے حد لطیف ہیں نا علاؤالدین ؟

علاؤالدین : واقعی پاکیزہ اشعار ہیں۔

ابن حکیم : شکر ہے الٰہی کہ میری امیدیں بر آئیں اور میں جو کچھ چاہتا تھا ویسا ہی ہوا۔ اب حلاج میرے بیٹے! یہ تحفہ جسے تم نے اپنی دانائی اور شاعری سے حاصل کیا ہے تمہارے حوالے ہے۔ خدا کرے کہ تم دونوں، حلاج اور ماہ سیمیں، شاعر اور اس کی بیوی، ایسی محبت میں منسلک رہو کہ جب ہماری حیات مستعار ماضی کی بھولی بسری بات بن جائے تو لوگ یاد رکھیں کہ روپیہ پیسہ بے اصل چیزیں ہیں۔ میں نے دس دینار اس لئے طلب نہ کئے تھے کہ روپیہ انسان کی ہنرمندی اور قابلیت کا معیار ہے ـــــ میں ان چاندی کے سکوں کو سونے کے سکوں میں تبدیل کر کے اپنے الفاظ کی صداقت کا ثبوت دے سکتا ہوں۔ یہ لو سونے کی تھیلی۔

حلاج : ایک بات مجھے بھی کہہ لینے دیجئے میرے دوستو مجھے معاف کر دو میں نے آپ سب کو دھوکا دیا میں ابھی اس کی تلافی کئے دیتا ہوں۔ گلیش! یہ سونے سے بھری ہوئی پوری تھیلی تم لے لو تمہیں اپنی رباعی کا معاوضہ مل گیا۔ علاؤالدین! تمہیں ساٹن کا ایک ایسا چغہ دیا جائے گا جو اصفہان بھر میں بے نظیر ہوگا۔ شکال! تمہیں شادی کے روز ضیافت دی جائے گی۔ باقی رہا سلیمان، سلیمان کے لئے بھی کوئی اعلیٰ نفیس چیز ہونی چاہئے۔

سلیمان : مجھے اپنی محبت بخشئے۔

حلاج : بخشی۔

ماہ سیمیں : اور میں نے بھی۔

جانا حاتم طائی کا اسنومین (SNOW MAN) کی تلاش میں

کنہیا لال کپور

حاتم طائی جب اپنے ساتویں سفر سے گھر لوٹا تو مسز حاتم طائی اسے دیکھ کر پہلے تو ہنسی اور پھر رونے لگی۔ یہ ماجرا دیکھ کر حاتم بہت حیران ہوا اور اپنی اہلیہ کو مخاطب کرکے کہنے لگا: "اے نیک بخت! سچ سچ بتا۔ دل کی بات زبان پر لا کر تو مجھے دیکھ کر ہنسی کس لئے اور روئی کیوں؟" مسز حاتم طائی نے جواب میں کہا: "ہنسی تو اس لئے کہ اتنی مدت کے بعد تمہاری شکل دیکھنا نصیب ہوئی اور روئی اس لئے کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے تم ایک دن میرے پاس نہیں رہے۔ ہمیشہ اغیار کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے رہے۔" حاتم نے جب بیوی کی یہ شکایت سنی تو پہلے تو خوب کھل کر ہنسا اور پھر یک لخت سنجیدہ ہوگیا۔ "اے نیک بخت!" حاتم نے روٹھی رانی کو مناتے ہوئے کہا "کیا تجھے معلوم نہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اسی میں ہے کہ جہاں تک ممکن ہو خاوند اور بیوی ایک دوسرے سے دور رہیں۔ نہیں تو نوبت گالی گلوچ اور روزانہ جھگڑے سے ہوتی ہوئی طلاق تک پہنچتی ہے۔ رہا تمہارا یہ وہم کہ میں ہمیشہ اپنوں کی بجائے دوسروں کے کام آیا ہوں تو اس ضمن میں ایک شعر سن اور ہو سکے تو اسے سمجھنے کی کوشش کر۔ وہ شعر ہے ـــ

پہلے تو فنا کا درجہ ہے اور بعد بقا بھی ملتی ہے
وہ جینے کا نام نہ لے جو مرنے کو تیار نہیں

مسز حاتم نے شعر سن کر برجستہ کہا: "سبحان اللہ! آفریں ہے تم پر۔ اگر یہ شعر تمہارا ہے اور اگر کسی اور کا ہے پھر بھی تم پر یہی کہ شاعر نے ضرور تمہیں دھیان میں رکھ کر یہ شعر کہا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم کب تک دوسروں کی خاطر یونہی فنا ہوتے رہو گے؟ میرا تو خیال ہے کہ تم عمر عزیز کا کافی حصہ برباد کر چکے ہو۔ اب عاقبت کا خیال چھوڑو اور دنیا کی فکر کرو۔"

حاتم طائی نے مسکرا کر کہا: "یہ ناممکن ہے۔ میرے خون میں ازل سے چلا ہے اور ابد تک رہے گا۔ میں اب اپنی زندگی کی سب سے کٹھن مہم پر روانہ ہونے والا ہوں۔"

"یہ آٹھواں سفر کس سلسلے میں ہے؟"

"اسنومین کی تلاش میں!"

حلاج : —
رُخِ پُر نور کسب ہے تری چشمِ جہاں بیں کا
فلک بس ایک سایہ ہے ترے گیسوئے مشکیں کا
اسے چھو لوں مگر ہاتھوں کو کوثر میں بھگو لاؤں
کہ تاروں سے بھی پاکیزہ ہے دامن ماہ سیمیں کا

ماہ سیمیں : کس قدر دلکش اشعار ہیں۔

سلیمان : نہایت دلفریب اور بے حد لطیف ہیں، نا علاؤ الدین؟

علاؤ الدین : واقعی پاکیزہ اشعار ہیں۔

ابن حکیم : شکر ہے الٰہی کہ میری امیدیں بر آئیں اور میں جو کچھ چاہتا تھا ویسا ہی ہوا۔ اب حلاج میرے بیٹے! یہ تحفہ جسے تم نے اپنی دانائی اور شاعری سے حاصل کیا ہے تمہارے حوالے ہے۔ خدا کرے کہ تم دونوں، حلاج اور ماہ سیمیں شاعر اور اس کی بیوی، ایسی محبت میں منسلک رہو کہ جب ہماری حیات مستعار ماضی کی بھولی بسری بات بن جائے تو لوگ یاد رکھیں کہ روپیہ پیسہ بے اصل چیزیں ہیں۔ میں نے دس دینار اس لئے طلب نہ کئے تھے کہ روپیہ انسان کی برتری اور قابلیت کا معیار ہے ——— میں ان چاندی کے سکوں کو سونے کے سکوں میں تبدیل کر کے اپنے الفاظ کی صداقت کا ثبوت دے سکتا ہوں۔ یہ لو سونے کی تھیلی۔

حلاج : ایک بات مجھے بھی کہہ لینے دیجئے میرے دوستو مجھے معاف کرو، میں نے آپ سب کو دھوکا دیا۔ میں ابھی اس کی تلافی کئے دیتا ہوں۔ گلیش! یہ سونے سے بھری ہوئی پوری تھیلی تم لے لو تمہیں اپنی رباعی کا معاوضہ مل گیا۔ علاؤ الدین! تمہیں ساٹن کا ایک ایسا جبہ دیا جائے گا جو اصفہان بھر میں بے نظیر ہوگا۔ شکال! تمہیں شادی کے روز ضیافت دی جائے گی۔ باقی رہا سلیمان، سلیمان کے لئے بھی کوئی اعلیٰ نفیس چیز ہونی چاہئے۔

سلیمان : مجھے اپنی محبت بخشئے۔

حلاج : بخشی۔

ماہ سیمیں : اور میں نے بھی۔

جانا حاتم طائی کا اسنومین (SNOW MAN) کی تلاش میں

کنہیا لال کپور

حاتم طائی جب اپنے ساتویں سفر سے گھر لوٹا تو مسز حاتم طائی اسے دیکھ کر پہلے تو ہنسی اور پھر رونے لگی۔ یہ ماجرا دیکھ کر حاتم بہت حیران ہوا اور اپنی اہلیہ کو مخاطب کرکے کہنے لگا: "اے نیک بخت! سچ سچ بتا۔ دل کی بات زبان پر لا کر مجھے دیکھ کر ہنسی کس لئے تھی اور روئی کیوں؟" مسز حاتم طائی نے جواب میں کہا: "ہنسی تو اس لئے کہ آج مدت کے بعد تمہاری شکل دیکھنا نصیب ہوئی اور روئی اس لئے کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے تم ایک دن بھی میرے پاس نہیں رہے۔ ہمیشہ اغیار کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے رہے۔" حاتم نے جب بیوی کی یہ شکایت سنی تو پہلے تو خوب کھل کر ہنسا اور پھر یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ "اے نیک بخت!" حاتم نے روٹھی رانی کو مناتے ہوئے کہا، "کیا تجھے معلوم نہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اسی میں ہے کہ جہاں تک ممکن ہو خاوند اور بیوی ایک دوسرے سے دور رہیں۔ نہیں تو نوبت گالی گلوچ اور روزانہ جھگڑے سے ہوتی ہوئی طلاق تک پہنچتی ہے۔ رہا تمہارا یہ وہم کہ میں ہمیشہ اجنبیوں کی بجائے دوسروں کے کام آیا ہوں تو اس ضمن میں ایک شعر سن اور ہو سکے تو اسے سمجھنے کی کوشش کر۔ وہ شعر ہے:

پہلے تو فنا کا درجہ ہے اور بعد بقا بھی ملتی ہے
وہ جینے کا نام نہ لے جو مرنے کو تیار نہیں

مسز حاتم نے شعر سن کر برجستہ کہا: "سبحان اللہ! آفریں ہے تم پر اگر یہ شعر تمہارا ہے اور اگر کسی اور کا ہے پھر بھی تم پر آفریں کہ شاعر نہ ہوتے ہوئے تمہیں دیوان ہی یاد کر رکھا ہو گا لیکن سوال یہ ہے کہ تم کب تک دوسروں کی خاطر یونہی خوار ہوتے رہو گے۔ میرا تو خیال ہے کہ تم عزیزوں کی خاطر عاقبت برباد کر کے پچھلے حاتم کا خیال چھوڑ دو اور دنیا کی فکر کرو۔"

حاتم طائی نے مسکرا کر کہا: "یہ ناممکن ہے۔ میرے پاؤں میں ازل سے چکر ہے اور ابد تک رہے گا۔ میں اب اپنی زندگی کی سب سے کٹھن مہم پر روانہ ہونے والا ہوں۔"

"یہ آٹھواں سفر کس سلسلے میں ہے؟"

"اسنومین کی تلاش میں!"

"اسنومین دراصل کیا بلا ہے؟"

"اے نیک بخت اسنومین بلا نہیں۔ ہماری تمہاری طرح گوشت پوست کا انسان ہے۔ فرق اس میں اور ہم سب میں صرف اتنا ہے کہ وہ اینٹ اور سیمنٹ کے مکانوں کی بجائے ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر قیام کرتا ہے۔"

"تم اس کی تلاش میں کس لئے جانا چاہتے ہو؟"

"میرے ایک سب ایڈیٹر (SUB EDITOR) کی ملازمت کا سوال ہے۔ اس کے باس (BOSS) نے اسے اخبار کے سالنامے میں ایک مضمون اسنومین پر لکھنے کے لئے کہا ہے۔ اگر اس نے یہ مضمون نہ لکھا تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا۔ اس بدنصیب کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں اگر اسے جواب مل گیا تو یقیناً وہ سب فاقوں سے مریں گے۔ لیکن اب خدا حافظ کہ وقت قلیل اور راستہ طویل ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد حاتم طائی اللہ کا نام لے کر اسنومین کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ کھیتوں، مرغزاروں سے گزرتا، جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا وہ ایک صحرائے لق و دق میں پہنچا جہاں اس کی ملاقات ایسے اشخاص سے ہوئی جنہوں نے اپنے چہروں پر عجیب خول چڑھا رکھے تھے اور جن کے پاس عجیب و غریب آلات اور مشینیں بکھری پڑی تھیں۔ حاتم طائی یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے ان کے قریب جا کر کہا: "اے صاحبو! یہ کیا مذاق ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ان میں سے ایک نے جواب میں کہا: "اے نووارد! تمہیں یقین آئے یا نہ آئے ہم آدم زاد ہیں اور ایک نئے ایٹم بم کو چلانے کا تجربہ کرنے کے لئے اس صحرا میں آئے ہیں۔" حاتم طائی نے لاحول پڑھتے ہوئے کہا: "اے صاحبو! میری مانو تو اس حماقت سے باز آؤ اور واپس اپنے ملک چلے جاؤ۔ ایٹم بم بنانے اور چلانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ انسان کسی کی بگڑی بنائے اور جہاں اچھی بات لگتی ہو وہاں سے اس کو آگے چلائے۔"

"معلوم ہوتا ہے کہ تم فلسفی ہو یا سر پھرے۔ ورنہ ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتے۔"

"خاموش! تم شاید نہیں جانتے کہ میرا نام حاتم اور پیشہ خدمتِ خلق ہے۔"

"تو جاؤ خدمتِ خلق کرو۔ ہم سے خواہ مخواہ کیوں الجھ رہے ہو؟"

حاتم نے اس شخص کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے ایک سرد آہ بھری اور وہاں سے آگے چلا۔ متواتر سات دن اور سات راتیں چلنے کے بعد وہ ایک شہر میں پہنچا۔ رات ایک ہوٹل میں بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل کے ایک بیرے نے اسے بتایا کہ رات کے وقت ایک اڑن طشتری شہر کے اوپر پرواز کرتی ہے کہ جس کی ہیبت اور رفتار دیکھ کر بچے چیخنے لگتے ہیں اور بزرگ لحافوں میں گھس جاتے ہیں۔ حاکم شہر نے دس ہزار روپے کا انعام اس شخص کو دینا منظور کیا ہے جو اس اڑن طشتری کا پتہ چلائے۔ حاتم نے پورے وثوق سے کہا: "میں اس طشتری کا راز طشت از بام کر سکتا ہوں۔" چنانچہ اسی رات ایک ہوائی جہاز میں بیٹھ کر حاتم اڑن طشتری کی کھوج لگانے کے لئے روانہ ہوا۔ کافی دیر فضا میں چکر کاٹنے کے بعد حاتم کو ایک چمکتی اور اڑتی ہوئی چیز نظر آئی۔ اس نے ہوائی جہاز کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ متواتر دو گھنٹے کے تعاقب کے بعد حاتم کو پتہ چلا کہ وہ چاند کا تعاقب کر رہا ہے۔ حاتم کو اپنی غلطی پر بہت افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔ وہ واپس ہو کر لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دفعتاً کوئی چیز اس کے جہاز میں گری۔ حاتم نے غور سے دیکھا۔ وہ ایک چکور تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اڑتے اڑتے تھک گیا ہے۔ حاتم نے چکور کو اپنے بڑے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور نیچے اترا۔ دوسرے دن اس نے حاکم شہر کی خدمت میں چکور پیش کرتے ہوئے کہا: "معاف کیجئے! جسے آپ غلطی سے اڑن طشتری سمجھتے رہے ہیں وہ دراصل چکور ہے کہ روزِ ازل سے چاند کا عاشق ہے۔" دس ہزار روپے اور دو سنہری تمغے انعام میں پائے اور وہاں سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔

چلتے چلتے حاتم کوہ ہمالیہ کی ترائی میں پہنچا۔ رات ایک درخت پر بیٹھ کر کاٹی۔ صبح اس کی ملاقات ایک شرپا سے ہوئی۔ شرپا نے حاتم طائی کو سمجھاتے ہوئے کہا: "اسنومین کی تلاش بے سود ہے۔ اس کا مقام ہمالیہ کی ان چوٹیوں پر ہے جہاں انسان کی رسائی ناممکن ہے۔ تم اس مہم سے باز آؤ اور واپس گھر چلے جاؤ۔"

"لیکن ثریا بہادر یہ ایک سب ایڈیٹر کی ملازمت کا سوال ہے۔ اگر اس نے اسنو مین پر مضمون نہ لکھا تو . . . ؟"

"کچھ بھی ہو اسنو مین کا سراغ لگانا ناممکن ہے۔"

حاتم طائی سے ادا کو دیکھا نہ گیا۔ جھٹ ثریا بہادر کو دس ہزار روپے کی تھیلی پیش کر دی۔ ثریا نے مسکرا کر کہا: "میں تمہاری مدد کرنے کیلئے تیار ہوں۔"

حاتم طائی اور ثریا نے تین کیمپ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلا دس ہزار فٹ، دوسرا بیس ہزار فٹ اور تیسرا پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر۔ انھوں نے آکسیجن سلنڈر، وائرلیس سیٹ، برف کو کاٹ کر راستہ بنانے کے کلہاڑے وغیرہ خریدے۔ وہ ایک دن دوسرے کیمپ میں آرام کرنے کے بعد وہ تیسرے کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی مشکل سے ایک ہزار فٹ کا فاصلہ طے کر پائے تھے کہ طوفان میں گھر گئے۔ برف پڑنے لگی۔ سرد ہوا کے تیز او تند جھونکوں نے ہوش و حواس خطا کر دیے۔ خون منجمد ہونے لگا۔ حاتم نے طوفان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اے قہر ہمالیہ! تو کیوں خواہ مخواہ ہم سے جنگ کرتا ہے اور ہمارا قافیہ تنگ کرتا ہے۔" ثریا نے ازراہِ مذاق حاتم سے کہا: "اے حاتم! یہ طوفان تمہارا قافیہ کیا تنگ کرے گا۔ تمہارا قافیہ تو پہلے ہی تنگ ہے کہ سوائے ماتم کے حاتم کا کوئی قافیہ ہی نہیں۔ تم نے غلطی یہ کی کہ موسم کی جانچ پڑتال کرنے والوں کی پیش گوئی پر یقین نہ کیا اور سوچے سمجھے بغیر دوسرے کیمپ سے چل نکلے۔"

ایک گھنٹے کے بعد طوفان تھما۔ حاتم اور ثریا تیسرے کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسرے دن حاتم نے وائرلیس پر یہ اعلان سنا کہ تین دن کے لئے موسم خوشگوار رہے گا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور ثریا کو ساتھ لیکر اسنو مین کی تلاش میں نکلا۔ چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ چرند پرند، آدم زاد و پری زاد کا کوسوں تک نشان نہ تھا۔ انھوں نے جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن اس بھلے مانس یا بن مانس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ آخر تھک ہار کر ثریا نے کہا: "اے حاتم! معلوم ہوتا ہے بیچارہ اسنو مین اللہ کو پیارا ہو گیا۔"

"تو پھر؟"

"ہمیں واپس چلنا چاہئے۔ اگر زیادہ عرصہ یہاں ٹھہرے تو ہم بھی اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔"

"لیکن اس سب ایڈیٹر کا کیا ہوگا؟"

"زیادہ سے زیادہ اسے ملازمت سے جواب مل جائے گا۔"

"حاتم! تم بڑے بے رحم ہو۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس کم بخت کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں۔"

"میں اپنی سات بیویوں اور ایک بچے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔"

"تم بڑے خود غرض ہو۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"تلاش جاری رکھی جائے۔"

دوسرے دن حاتم اور ثریا نے برف پر کسی عجیب و غریب جانور کے پنجوں کے نشانات دیکھے۔ حاتم نے خوشی سے چلا کر کہا: "مل گیا مل گیا۔"

ثریا نے پوچھا: "کیا؟" حاتم نے جواب دیا: "اسنو مین کا سراغ۔"

دونوں ان نشانات کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک غار کے قریب پہنچے۔ حاتم نے غار کے سامنے کھڑے ہو کر کہا: "اے عجیب و غریب مخلوق اپنے مسکن سے باہر نکل کر دیکھ کہ تجھے کون ملنے آیا ہے۔ خدا کے لئے اب زیادہ انتظار مت کرا اور جلدی سے غار سے باہر آ۔"

غار میں سے کوئی جواب نہ آیا۔ حاتم نے ایک بڑا سا پتھر لے کر غار کی طرف پھینکا۔ ایک خوفناک قسم کا جانور کہ جو ریچھ اور گینڈے کا مرکب

معلوم ہوتا تھا سونگھتا ہوا باہر نکلا اور حاتم اور ثریا کا تعاقب کرنے لگا۔ دونوں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے اور کیمپ میں جا کر دم لیا۔

تیسرے دن ناشتہ کرنے کے بعد حاتم نے آبدیدہ ہو کر کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ میری پہلی شکست ہوگی۔"

"مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ مالک کارساز ہے۔"

"مگر کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"ایک تدبیر میری سمجھ میں آئی ہے۔"

"کہو۔"

"میری رائے میں شراب انسان کی بلا ہے وہ اسنو مین ہی کیوں نہ ہو پہلی اور آخری کمزوری ہے۔ اگر ہم جگہ جگہ شراب کی بوتلیں رکھ دیں تو کام بن سکتا ہے۔"

"تجویز تو خاصی معقول ہے۔"

اس دوپہر کو حاتم اور ثریا نے جنگل میں مختلف جگہوں پر شراب کی بوتلیں رکھ دیں۔ شام کے وقت جب وہ چہل قدمی کرنے کو نکلے تو انہوں نے دور سے دیکھا کہ ایک لنگور نما انسان بوتل کو منہ سے لگا کر حلق میں شراب انڈیل رہا ہے۔ حاتم کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اور ثریا بھاگم بھاگ اس شخص کے پاس گئے لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے مخاطب کرتے اس نے بڑے تپاک سے کہا: "ہیلو حاتم طائی! تم یہاں کیسے؟"

حاتم طائی نے حیران ہوتے ہوئے جواب دیا: "ہیلو اسنو مین! تو گویا تم مجھے جانتے ہو۔"

اس شخص نے قہقہہ لگا کر کہا: "نہ صرف یہ بلکہ تم بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں ایس۔ ایکا سیم ابراہیم ہوں۔ اخبار "ہشیار کن" کا سب ایڈیٹر۔"

"لیکن یہ حلیہ تم نے کیا بنا رکھا ہے؟"

"تمہارا اشارہ شاید لنگور کی کھال کی طرف ہے جو میں نے پہن رکھی ہے یہ محض تو اسنو مین کو دھوکا دینے کے لئے کیا گیا ہے۔ اسنو مین انسان سے بدکتا ہے اس لئے میں لنگور کی کھال پہن کر اس کی تلاش میں نکلا ہوں کہ کہتے ہیں ع

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز"

"اچھا تو تم بھی اسنو مین کی تلاش کر رہے ہو؟"

"ہاں! بات دراصل یہ ہوئی کہ جب دو مہینے انتظار کرنے کے بعد تمہاری کوئی خبر نہ ملی تو میں نے سوچا کہ خود ہی چل کر اسنو مین کا سراغ لگایا جائے۔"

"تو کچھ پتہ چلا؟"

"ابھی تک تو کچھ سراغ نہیں ملا۔"

"تو پھر؟"

"ملازمت سے جواب مل جانا یقینی ہے۔"

"یہ تو بہت برا ہوگا۔"

"کیا کیا جائے، کوئی چارہ نہیں۔"

اس اثنا میں ثریا بالکل خاموش کھڑا رہا۔ یک لخت اس نے شری ایس۔ ایچ سبھراغیم اور حاتم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اے صاحبو! میری مانو تو کام اب بھی بن سکتا ہے۔"

حاتم نے پوچھا: "کیسے؟"

ثریا بولا: "لنگور کے بھیس میں شری ایس۔ ایچ سبھراغیم اچھے خاصے اسنومین نظر آتے ہیں۔ کیوں نہ اس لباس میں ان کی چند تصاویر لی جائیں اور انہیں اسنومین کے روپ میں پیش کیا جائے۔ باقی رہے پنجوں کے نشانات، وہ کسی بھی جنگلی جانور کے بنائے جا سکتے ہیں۔"

"واہ وا۔" حاتم نے خوشی سے ناچتے ہوئے کہا۔

"آفریں!" شری ایس۔ ایچ سبھراغیم نے نعرہ لگایا۔

چنانچہ لنگور کے بھیس میں شری ایس۔ ایچ سبھراغیم کی متعدد تصویریں کھینچی گئیں۔ ایک عجیب وغریب جنگلی جانور کے پنجوں کے نشانات کی ڈوڈ لی گئی اور تینوں خوشی خوشی اپنے اپنے گھر واپس آ گئے۔

بارِ خاطر

شوکت تھانوی کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف جس کا عرصے سے انتظار تھا چھپ گئی ہے۔

خطوط کا یہ مجموعہ ابوالکلام آزاد کے خطوط غبارِ خاطر کی دل نشین پیروڈی ہے۔ توقع ہے کہ شوکت صاحب کی یہ تصنیف، اردو ادب کی زندہ رہنے والی کتابوں میں شمار ہو گی۔

جس میں ادبی، سیاسی، فلمی اور دیگر معروف شخصیتوں کے نام خطوط درج ہیں۔

قیمت -/-/۴

یدِ بیضا

سید عابد علی عابد کے دل نشین ڈراموں کا مجموعہ، آغا حشر فنِ ڈرامانگاری کے امام تھے۔ ان کے ڈراموں میں الفاظ کی شان و شوکت اور قافیہ پیمائی کی معجزانہ کرامات تو تھیں مگر نرم و نازک احساسات کا فقدان تھا۔ عابد صاحب نے اپنے ڈراموں میں اس خامی کو نہ صرف دور کیا ہے بلکہ اردو ڈرامے کے فن کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اگر آغا حشر کے ڈرامے ماضی کی دلکش یادگار ہیں تو عابد صاحب کے ڈرامے حال اور مستقبل کا سرمایہ ہیں۔

اردو ادب میں اس سے بہتر ڈرامے آج تک پیش نہیں کیے جا سکے۔

قیمت -/-/۵

اِدارہ فروغِ اُردو۔ لاہور

رات چور اور چاند

(مسلسل)

بلونت سنگھ

(۴)

اپنے گاؤں میں واپس آجانے کے بعد چند روز تک پالا سنگھ کی حیثیت اکھڑی اکھڑی سی رہی۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ اسے گاؤں کے لوگ یہاں کی فضا پسند نہیں۔ بلکہ وہ چند دوستوں کے سبب بڑے شہر سے رخصت ہو کر پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں میں چلا آیا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ فضا کے انوکھے پن سے مانوس ہونے کے لئے کچھ مدت درکار تھی۔ گاؤں میں بھی وہ ایک معمولی محلے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا جو در حقیقت ایک ہی کمرے اور ایک چھوٹے سے دالان پر مشتمل تھا لیکن کم از کم دیکھنے میں تو تنگ، بوسیدہ عمارتیں موجود نہیں۔ ساتھ ہی ہری بھری کھیتیاں، سبزہ زار اور وسیع نیلگوں فضا ہر وقت نظر کے سامنے رہتی تھی۔ اس کے اپنے گھر کے صحن کے بیچ کی کوٹھڑی میں روشنی بھی کم آتی تھی لیکن گلیوں پر بہت قسموں کی چہل پہل ہوتی تھی۔ بھانت بھانت کے لوگ اور بھانت بھانت کی بولیاں۔ صبح سے شام تک زندگی کی ریل پیل اور شور و غل ایسا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایسی فضا میں پیشے کے لحاظ سے بظاہر وہ موٹر ڈرائیور تھا لیکن موٹر چلانا تو اس کا سائیڈ بزنس Side Business تھا۔ روپیہ کمانے کے اصل ذرائع تو قطعاً مختلف تھے۔ وہ فطرتاً ہوشیار آدمی تھا اور پھر آغاز ہی سے اسے چند کہنہ مشق استادوں کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس کمسنی میں ہی اس کا ہاتھ بہت صاف ہو گیا تھا۔

ہر بڑے شہر میں دو طرح کی زندگی ہوتی ہے۔ ایک تو روز روشن کی طرح ظاہر اور دوسری پوشیدہ۔ عوام جو معمولی طور پر روزی کما کر اپنے پیٹ پالتے اور زندگی کے دیگر جھمیلوں سے نپٹتے ہوئے اپنے دن گزارے چلے جاتے ہیں ان کے لئے زندگی کا یہ دوسرا پہلو بڑی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ وہ خود اس قسم کی زندگی پسند نہیں کر سکتے البتہ اگر وہ چاہیں تو اس سے روشناس ہو سکتے ہیں اور یہ اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر مشکل کہ عام طور پر وہ اسے سمجھتے ہیں۔

پالا سنگھ "پوشیدہ" زندگی کا باشندہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سڑک پر چلتے پھرتے لوگوں کے ذریعہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر ایک خوبصورت عورت حاصل کر سکتا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ کیسے بدمعاش کہاں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ بیچارے سیدھے سادے اور پڑھے لکھے شہری بھی ان آدمیوں کو جو پاجاموں کے نیفوں میں چاقو اڑسے پھرتے ہیں غنڈے اور بدمعاش سمجھ کر ان سے بری طرح خائف رہتے تھے۔ پالا سنگھ ایسے "بدمعاشوں" کی صورتیں دیکھ کر مسکرا دیا کرتا تھا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اول تو ان لوگوں کا بدمعاشی سے کوئی تعلق ہی نہیں اگر ہو بھی تو سمجھنا چاہئے کہ ابھی وہ اس فن کی پہلی جماعت میں پڑھتے ہیں۔

ان شراب خانوں، قحبہ خانوں اور خفیہ اڈوں کو بھی اچھی طرح جانتا تھا جو بدمعاشوں کے گڑھ تھے۔ آوارگی کے دوران میں ان لوگوں سے بھی اس کی واقفیت پیدا ہو گئی تھی، جو بمبئی کے گھوڑ دوڑ کے میدانوں کے باہر انعام پانے والے گھوڑوں کی پیش گوئیاں کیا کرتے تھے۔ اسی قسم کا ایک آدمی پر سنگھ اس کے بہت ہی گہرے دوستوں میں سے تھا۔ وہ بلا کا چلتا پرزہ تھا۔ بیرونی فوجیوں سے راہ و رسم پیدا کر لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اسی کے ذریعہ بالا سنگھ کا بھی کئی سپاہیوں سے دوستانہ ہو گیا۔ وہ لوگ اس کے ذریعے نت نئی عورتوں سے تعلقات قائم کرتے اور یہ ان سے جی بھر کر روپیہ بٹورتا۔ بالا سنگھ کا اصل منافع بخش کام تو بیرونی فوجیوں کی چھاؤنیوں سے ٹرک چلانا تھا۔ اس میں اسے کئی مرتبہ دست بدست لڑائی بھی کرنی پڑی۔ دو مرتبہ جبکہ وہ ٹرک لے کر فرار ہو جاتا تو قریب تھا پکڑا جانے پر اس کا بہت بری طرح تعاقب کیا گیا۔ اس پر بندوقوں کے فائر بھی کئے گئے۔ ایک مرتبہ وہ ٹرک سمیت بچ کر نکل گیا لیکن دوسری مرتبہ تعاقب کرنے والوں نے گولیوں سے اس کے ٹرک کے ٹائروں کا بھرکس اڑا دیا۔ خوش قسمتی سے رات کا وقت تھا، وہ ٹرک موڑ کر ایک دم جنگل میں گھس گیا۔ گولیاں سیٹیاں بجاتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئیں ——— لیکن وہ بچ نکلا۔

امریکی انگلش دوست سے اس نے دست بدست لڑائی کے کئی نئے گر سیکھے تھے۔ اس کا ٹیڑھا میڑھا نام اس کی زبان پر نہ چڑھ سکا اس لئے وہ اسے انگلش ہی کہا کرتا تھا۔

ان آٹھ دس برسوں میں اس نے کئی دوستیاں پیدا کیں۔ گاؤں واپس پہنچ کر صرف پرانی زندگی اور دوستوں کی یادیں ساتھ رہیں بلکہ گاؤں کی نسبتاً خاموش فضا، منتشر گلیاں، کچی مٹی کے بنے ہوئے بے ڈھب سادے مکانات، کچی اینٹوں جڑی تنگ گلیاں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور انہیں کریدتے ہوئے مرغ اور چوزے دیکھ کر وہ بعض اوقات اس جگہ سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا تھا ——— لیکن پیچھے ہی صرف ایک چیز کی کشش ——— بعض رشتوں کی موجودگی کے باعث اس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ نئے حالات کے مطابق ڈھل گیا۔

گھر میں اس کی بھابی تاباں تھی۔ تاباں بڑی ہنس مکھ، خوش مزاج اور دلکش عورت تھی۔ اسے بالا سنگھ کی آمد کا بڑا چاؤ تھا۔ ابھی نو عمر تھی دو بچوں کی ماں بن چکی تھی، لیکن عمر اور صحت کے تقاضے کے سبب وہ بڑا کر کیفیت کے لئے بیدار ہو سکتی تھی اور یہی مشکل تھا کہ وہ سارا دن گاؤں کی کنواری لڑکیوں کی صحبت میں انہی کی طرح ادھر ادھر بھی پھدکتی پھرے۔ وہ شاید ابھی اس کے دل میں کوئی حسرت تھی تو یہی۔ اس نے سوچا ان کی وجہ سے بچپن بھی بڑی بے کیفی سے گزرا۔ یہ شخص اس کی بھی خوش مزاجی تھی جس نے اسے بچائے رکھا ورنہ اب تک چڑچڑی ہو گئی ہوتی۔ ایک دیہاتی عورت کی حیثیت سے ذہنی طور پر وہ اپنے شوہر سے زیادہ مسرتوں کی طلبگار بھی بنی تھی۔ اور خصوصاً اس شوہر سے جو عمر میں بالکل نوجوان بھی نہیں تھا اور پھر زندگی کے جھمیلوں اور تفکرات نے اسے کافی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ سنجیدگی تو گویا تھی ہی اس کا شوہر خاصہ شرابی اور خوش مزاج تھا۔ بلکہ جب اس نے بیاہ میں قدم رکھا اس وقت بھی خاصہ دبنگ تھا لیکن طاقت ور تیس اس پر غالب آ گئی۔ جیسے ایک مرتبہ بھی تو میں پچھ گئی اور وہ خاصہ امن پسند طبیعت کا ہو گیا۔ مستقل تو خیر تاباں کو ایسی بھی نہیں تھی لیکن تاباں بہت حساس واقع ہوئی تھی۔ اس کی چنچل طبیعت دراصل اس کے جوش کے دم سے تھی۔ اور وہ مخالف حالات میں بھی دل گرفتہ نہ ہوتی۔ گھر میں ایک واحد مرد اور تند خو مرد کی کمی کی وجہ سے لوگوں سے مناسب احترام کروانا ناممکن تھا۔ اس قسم کے چھوٹے پن کے احساس سے بعض اوقات تاباں کے دل کو بہت ٹھیس لگتی تھی اس لئے وہ بالا سنگھ کی واپسی کے لئے سب سے زیادہ بے قرار تھی اور جب اس نے ایک نظر اپنے دیور کو دیکھا تو بہت نہال ہو گئی۔ چنچل وحشت اور قد و قامت، آواز اور تیور کے لحاظ سے بالکل اسی قسم کا ایک شخص وہ اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال درست بھی تھا کیونکہ جب سے بالا سنگھ آیا تھا لوگوں کے دلوں میں احترام کے جذبات کو اس نے بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ خصوصاً بالا سنگھ کو ہیبت سے دیکھنے لگے۔ اور نئے کے ساتھ پہلا جھٹکا تو گاؤں بھر میں مشہور ہو چکی تھی، اس لئے اس گھر پر کسی قسم کا شبہ کر کے گاؤں کا شاید ہی کوئی فرد بیٹھے بٹھائے مصیبت مول لینے پر تیار ہوتا۔

مختصر یہ کہ بالا سنگھ کا سب لوگوں سے برتاؤ بھی بہت اچھا تھا۔ اس کی طبیعت میں اوچھا پن نہیں تھا، صنف کی اکڑفوں اور بات بات پر جھگڑا کرنے والا مزاج کو اس نے اسے عزت بخشی تھی۔ بالا سنگھ کی اپنے بازوؤں اور اپنی عقل پر پورا اعتماد تھا۔ یہی وجہ تھی کہ [illegible] اس کے اندر [illegible]۔

لیکن صرف اسی اعتماد کے باعث اس کے دل میں پہنچے ہوئے درویشوں اور فقیروں کا سا اطمینان پیدا ہو چکا تھا۔ گاؤں کے وہ جوان جو پہلے اس کی جسمانی طاقت کی تعریف میں اپنی تضحیک کا پہلو پا کر دل ہی دل میں ناپسند اور شاید نفرت کرنے لگے تھے۔ اس کے برتاؤ سے خود ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ گاؤں کے چند جوانوں نے چاہا کہ کسی نہ کسی طرح پالا سنگھ سب سے جھگڑے اور [illegible] باز جوانوں سے لڑ پڑے لیکن وہ ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا اس نے اپنے فطری نیک دلی و صفائی کے ساتھ ان کی سب حرکتوں اور بے جا طعنوں کو نظر انداز کر دیا اور رفتہ رفتہ دوسروں کی نظروں کے سامنے اس کی سنجیدگی اور خاموشی زیادہ پروقار، زیادہ پائیدار اور زیادہ طاقتور نظر آنے لگی۔ خصوصاً جب وہ جوالا سنگھ کے اس بیل سے لڑ گیا جو علاقہ بھر میں دور دور تک مشہور تھا اور جسے خود جوالا سنگھ بڑے اہتمام کے ساتھ جنگل میں دو مرتبہ زمین سے اکھاڑ کر سر سے اوپر تان سکتا تھا۔ بڑے عاجزانہ انداز میں اور فقیرانہ بے نیازی سے زمین سے دس مرتبہ بالشت اٹھایا اور پھر رکھ کر اس انداز سے پیچھے ہٹ جاتا جیسے وہ گاؤں کے حقیر ترین آدمیوں میں سے ہو۔ لوگوں کے دلوں میں ایک نامعلوم سی وحشت بیٹھ جاتی۔ لیکن پالا سنگھ نے کبھی کسی پر ایک انگلی تک نہیں اٹھائی۔ وہ دل میں اپنی تضحیک کر کے بھی سمجھتا تھا قسم قسم کے لوگوں سے نپٹ چکا تھا اس لئے وہ ان کی عملی نفسیات سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ جس سے اس کے گاؤں والے نابلد تھے۔ اسے اگر کسی حد تک کچھ پتہ تھا تو وہ جوالا سنگھ تھا ان گرمیوں کے جھگڑے میں وہی ایک پرانا پاپی تھا دل میں وہ بھی پالا کو پورے طور پر سمجھ لینے کا دعویدار نہیں تھا لیکن دل ہی دل میں اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ پالا کوئی معمولی شخص نہیں اور وہ برملا کہہ دیتا تھا کہ اس گاؤں میں کیا علاقے بھر میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں جو پالا سنگھ کی طاقت کو پہنچ سکے۔

تاباں کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ پالا کوئی کام ہی کرے گا یا نہیں، بلکہ وہ اس کے آنے سے پہلے بھی دل ہی دل میں سمجھتی تھی کہ پالا کوئی کام نہیں کرے گا۔ وہ کیسی گذر کرے۔ گھر کے اخراجات زیادہ نہیں تھے۔ آخر جہاں کھیتے بھری روٹی پکتی ہو وہاں ایک آدمی اور کھانے میں شامل ہو جائے تو اس سے کچھ فرق تو نہیں پڑ جائے گا۔ اگر کوئی اور صورت ہوتی تو تاباں ایک دیسی بیکار بیوی کی طرح اسے خوشی سے بھی شکوہ کرتا۔ تاباں کی زندگی کا عمل ابھی تک روشن تھا۔ اسے مال مویشی کے تفکرات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے انہیں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور پھر جانے اس کے دل میں جو احساس کمتری پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور جو ایک خوف سا اس کے دل میں پیدا ہو چکا تھا اس کی اسے اب بھی پالا کی گھری موجودگی سے ہو جاتی تھی چند روز بعد جب تایا نے پالا کی بیکاری اور لفنگے پن پر دبی زبان میں بڑبڑانا بھی شروع کر دیا لیکن تاباں نے اس کی باتوں کو اہمیت دینا تو ایک طرف انہیں کان دھر کر سنا تک نہیں۔ بلکہ وہ شوہر کو غلط سمجھتی تھی یعنی اس کی یہ بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتی تھی کہ اگر کام دیا جائے تو وہ [illegible] سے آئے۔ وہ تو سادہ طور پر سمجھتی تھی کہ پالا کی موجودگی میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ باقی رہا سوال تو اسے پالا کا کچھ خرچ تو نہ تھا اس کے بس میں ہو تو وہ اسے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرے۔ اس نے کبھی بھولے منہ سے بھی پالا کو یہ نہیں کہا کہ ہمارے حالات بہت اچھے نہیں اور بس یہی ہے کہ کھانے پینے جا رہے ہیں۔ جاٹ کے ہاں ایک بھینس اور ایک گائے کوئی بڑی کائنات نہیں۔

بہرحیثیت گھر کے حالات پالا کے موافق تھے۔ لیکن اگر نہیں بھی ہوتے تو وہ ایک چڑھتے دریا کے مانند تھا۔ کوئی شے اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہ کر سکتی بلکہ خس و خاشاک کی طرح بہہ نکلتی تھی۔ اگر کوئی کام ایسا ہوتا جسے پالا بغیر کسی تحریک کے خود بخود کر دیتا تو وہ تھا تقریباً دونوں وقت بھینس اور گائے کے لئے سانی کرنا اور دودھ دوہنا۔ اس میں بھی شاید یہ لالچ شامل تھا کہ دودھ دوہنے کے بعد بھینس کا کم از کم ایک کٹورا دھاری پینے کے لئے بچا لیتا تھا۔

اس کام کے نام کو دیا گیا اس کی بھابی کے دل کی تسکین کا باعث ہوتا۔ اسے اس کی شخصیت سے محبت تھی۔ اس کی ہر حرکت ہی پیاری سی لگتی تھی۔ چنانچہ ان حالات میں پالا سنگھ کی بیکاری اس کی زندگی کا ایک باقاعدہ شروع ہوا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ علی الصبح حاجات ضروری سے فارغ ہونے کے لئے وہ گاؤں سے باہر چلا جاتا۔ واپس آتا تو سیدھے گھر میں بندھے ہوئے مویشیوں کے لئے سانی تیار کرتا۔ گاؤں سے باہر جا کر پانی لانے اور تفریح کا بہت کچھ زمانے میں خاصہ وقت لگ جاتا۔ واپس آتا تو دودھ دوہتا۔ پھر رات کی بچی ہوئی روٹی کھاتا اور دہی یا لسی یا مکھن یا اسی قسم کی اور کسی چیز کا ناشتہ کرتا پھر بڑے اہتمام سے کپڑے پہنتا، صافہ باندھتا اور اس کے شملے کو اٹھائے ہوئے گلی میں نکل جاتا۔ پھر گھر پیچھے سے کچھ بھی پوچھنے والا نہ تھا، بھابی کے مقابل [illegible] اور بڑے طمطراق سے فخر یا بے پرواہ انداز میں ہوتا تھا۔

"بھابی کوئی کام وام تو نہیں گھر کا؟"

اور بھابی اسے کبھی کوئی کام نہیں بتاتی تھی حالانکہ ہر روز ایک مرتبہ خواہ کچھ بھی ہو اگر وہ اس عشرہ سے کوئی کام کیوں نہیں بتاتی . . . .

علی تاباں شوہر کی سادہ دلی پر بعض اوقات ہنس دیتی اور بعض اوقات جھگڑا بڑھ جانے کے خوف سے چپ ہو رہتی۔ لیکن دیور کے سوال کے جواب میں جھاڑو چولھے میں پھونکیں مارتے مارتے دفعتاً سر اونچا اٹھاتی اور اس سے دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے آب آلود آنکھوں کو پلو سے پونچھتے ہوئے انہیں چھپا چھپا کر دیور کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگتی۔

اسے چپ چاپ مسکراتے دیکھ کر وہ اپنی حرکات سے کام کرنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے پھر کہتا "نہیں بھابی! کا کا —— کچھ تو کوئی کام وام ......؟"

تاباں کا منہ گھونگھٹ کے پیچھے پھول کی طرح کھل جاتا اور وہ ہنسی میں سر ہلاتے ہوئے کہتی "نہیں کوئی کام نہیں۔"

"واقعی (واقعی؟)"

"واقعی"

یہ سن کر یالی اطمینان کا سانس لیتا پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ادھر ادھر نہایت اہم "فکر" ظاہر کرتا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف بڑھتا۔ اور کبھی خیال آجاتا تو جاتے جاتے ٹوٹی ہوئی چارپائی کی پٹیاں چرائے جانے کے خوف سے باہر دروازے کے قریب سے اٹھا کر صحن کے کونے میں کھڑی کر دیتا ...... تاباں کی آنکھیں اسے تھم تھم کر ایک سمٹ کر ڈیوڑھی کے دروازے میں گم ہوتے ہوئے دیکھتی رہتی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اگر اس کا شوہر گھر میں موجود نہ ہوتا اور عام طور پر اس وقت وہ کھیتوں کو چلا جاتا تھا) تو اس کی پڑوسن جو اسی کی طرح جوان اور خوش مزاج تھی اور شاید یالی کو محبت کی نگاہوں سے بھی دیکھتی تھی۔ اچک کر اپنے گھر سے اس کے صحن کی طرف جھانکتی اور پھر کہنیاں درمیانی دیوار پر ٹیک کر پوچھتی۔ "چلے گئے "ڈھول" (محبوب) کمائی کرنے کے لئے؟"

اس پر تاباں کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

"ہائی ڈھول ہی تو ہے؟"

شکل و صورت سے یالی کو ڈھول (محبوب) سے کوئی مشابہت نہیں تھی۔ وہ گھر سے نکل کر عام طور پر دینو لوہار کی دکان پر چلا جاتا تھا۔ گو وہاں تک پہنچنے کے لئے اسے کوئی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ وہ راستے میں بھی گلی کے موڑ پر کھڑے ہوئے یا دکانوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے بات چیت کرتا اور ہنستا کھیلتا دکان تک چلا جاتا۔

گاؤں کی لڑکیوں میں سے صرف مہرو ہی سے اسے محبت تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسے دیگر لڑکیوں سے عداوت تھی۔ حسن صورت نہ بھی لیکن اس کے مزاج کی نرمی اور وجاہت ہی اس کے حق میں بڑی بھاری سفارش کا کام دیتی تھی۔ وہ بھی چھیڑ چھاڑ والی نظروں کا مسکراہٹ سے جواب دینا معیوب نہ سمجھتا تھا لیکن ان کاموں میں وہ جتنی پہل سے زیادہ دور اندیش تھا۔ کبھی کسی لڑکی سے خواہ مخواہ نظریں لڑانے کی کوشش نہ کرتا۔ گاؤں والوں میں منت کی بجائے اسے پسند نہیں تھی۔ اور سب سے زیادہ خوف اسے مہرو اور اس کے گھر والوں کا تھا۔ مہرو سے اس کی شادی کے امکانات بھی تھے۔ اس لئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کسی دوسری لڑکی کے متعلق افواہ اڑے اور اس کا بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ دیگر لڑکیوں کے معاملے میں جس قدر محتاط تھا اسی قدر مہرو کے معاملے میں دوسروں سے کام لیتا تھا۔ اس بات کا کہ دوسرے اسے مہرو سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے نہ دیکھ لیں خیال رکھتے ہوئے جب کبھی وہ اکیلی دکھائی مل جاتی تو وہ اس سے چھیڑ خانی کئے بغیر کبھی نہ رہتا۔ اس نے پہلے پہل مہرو کے ہاں بڑی پابندی سے جانا شروع کر دیا تھا لیکن بہت جلدی اپنے دیگر کے کنایوں سے اس نے دل کی بات بخوبی سمجھ کر احتیاط کرنی یعنی ان کے ہاں مناسب وقفے کے بعد جاتا۔ مہرو کے والدین کو بھی معلوم ہے اس کے ان دونوں میں بچپن ہی سے لگاؤ ہے اور کسی قسم کا شک پیدا نہیں ہوا۔ مہرو سے پہلے پہلے دیہات کی بہت سی لڑکیاں [illegible] اس کی کمر دوسری لڑکیوں بلکہ زیادہ تر [illegible]

سے پوری کر دیا کرتا تھا۔ شادی شدہ عورتوں میں ایسی عورتوں کی کمی نہیں تھی جو ابھی چوبیس پچیس برس سے زیادہ عمر کی نہیں تھیں۔ جن پر سے جوش ختم نہیں ہوا تھا خصوصی طور پر اپنے خاوندوں سے مطمئن نہیں تھیں۔ اور پھر بالا سنگھ جیسے منچلے جوان کی چٹپٹی گفتگو سے محظوظ ہوتے ہوئے کس کا دل نہ چاہے گا۔ وہ کنواری لڑکیوں کی نسبت زیادہ بے باک ہوتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جن میں کا ذرہ نہ چھوٹی موٹی چہل سے بھی پتہ نہ چلتا محرم کو کوئی خطرہ۔ ان سے سب باتیں اشاروں اور کنایوں یا دیگر بالواسطہ طریقوں سے ہوتی تھیں۔ کوئی بات کوئی چاہی کوئی بھائی بن بیٹھی ہے اس لئے ذو معنی گفتگو کے دوران میں رضامندی کے آثار نظر آئے تو راستے ہی سے پلٹ گئے اور اگر محض رنگین آنکھیں جھلک کر رہ گئیں تو پھر انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔

اگر چوپال گاؤں کے مردوں کے کلب گھر کا کام دیتی تھی تو ویرو لوہار کی دکان صرف نوجوان چھوکروں کے کلب گھر کا کام دیتی تھی۔

یوں ویرو مشہور تھا لوہار کے نام سے اس کے آباؤ اجداد لوہار رہے ہوں گے لیکن اب وہ خود بڑھئی کا کام کرتا تھا اور بڑھئی کا کام بھی بس برائے نام۔ محض بیلوں کی گاڑیوں کے ٹوٹے پہیے دو چار ہاتھ دن چڑھے رہتے۔ ویرو کی عمر ستائیس اٹھائیس برس کے قریب ہو گی لیکن اس کی صورت سے ایسی ملاحت اور آنکھوں سے ایسی سادگی ٹپکتی تھی کہ اس کی عمر بائیس برس سے اوپر تو کسی صورت میں بھی نہیں جانچی جا سکتی تھی۔ گھر میں اس کی ماں ———— جو بے حد بوڑھی تھی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور اس کی ماں تھی۔ باپ کی طرح اس کا باپ بھی بچپن ہی میں مر گیا تھا۔ ایک مرتبہ شادی بھی ہوئی تھی لیکن بیوی ایک بچی چھوڑ کر چل بسی۔ بچی اس کی ماں پال رہی تھی لیکن وہ خود ہمیشہ کی طرح بے فکری سے دن گزار رہا تھا۔ وہ کام چور نہیں تھا لیکن کام سے زیادہ اسے تاش کھیلنے اور گپ ہانکنے کا شوق تھا اگر کوئی نہ ہو تو چپ چاپ اپنے کام میں جٹا رہتا۔ چارپائیاں، ہل، ادوائن، جوئے کی معمولی، گھڑونچیاں غرض اس قسم کی چیزیں خاصی اچھی بنا لیتا تھا کچھ روز شہر میں رہ کر یہ کام سیکھ چکا تھا۔ نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ قریب کے دیگر گاؤں کے لوگ بھی اسے اچھا کاریگر سمجھتے تھے۔ ویسے اس کا بھولا بھالا سا چہرہ دوسروں کی باتیں سننے بے حد میٹھی۔ اس نے نہ کام کی کمی تھی نہ اجرت کی۔ لیکن اگر کسی بات کی کمی تھی تو فرصت کی۔ دو چار دوست اس کے پاس بیٹھے جو صبح آن بیٹھتے تھے تو پھر دن ڈھلے تک اپنے کام کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ یہاں ہر نوجوان اپنی من پسند لڑکی اور اس سے تعلقات کا اظہار کرنے سے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ ہر کسی کے دل کا راز یہاں محفوظ تھا۔ سبھی ایک دوسرے کے راز دان تھے۔ اس وجہ سے ان کے درمیان عجب یگانگی کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ بلکہ اگر ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ضرورت ہوتی تو وہ اس میں ہرگز کوتاہی سے کام نہ لیتے۔

بالا سنگھ کا دوپہر کی روٹی سے پہلے کا وقت زیادہ تر اسی دکان پر گزرتا تھا۔ ویرو کو بھی اس سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ پہلے اس کا اصول تھا کہ وہ ایک دوستوں کی موجودگی میں بھی تھوڑا بہت مزدوری کا کام کیے جاتا لیکن جب سے بالا سنگھ نے دکان پر آنا شروع کیا تھا وہ اسے دیکھتے ہی سب کام چھوڑ چھاڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا۔

وہ بالا سنگھ کو بڑی قدر کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں اس بات کی حسرت ہی رہی کہ وہ بھی گاؤں سے نکل کر شہر شہر گھومے۔ کبھی وہ دیس ہی جائے۔ خیر اب وہ خود نہیں جا سکتا تھا تو کم از کم ایک دوست تو اس کا ایسا تھا ہی جو آدھی دنیا میں کئی برس رہ چکا تھا۔ باقی باتوں کا چرچا تو تھا اور گاؤں والوں کا علم اس قدر محدود تھا کہ ان کے لئے نئی دنیا کا ہر چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی طلسم ہوشربا کی داستان سے کم نہ تھا۔ نوجوانوں کی زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں بالا سنگھ کی زندگی کے واقعات نہ صرف دلچسپ ہی بے شمار معلوم ہوتے بلکہ ویرو اور دیگر نوجوانوں کے لئے باعث رشک تھے۔

ویرو کی دکان پر چند اور بیکار بھی ڈیرہ جمائے رہتے تھے۔ ان میں سے سب کو کھانے کو وقت پر روٹی مل جاتی تھی۔ ماں باپ کا سایہ سر پر موجود تھا یوں بھی پنجاب کے دیہات میں روزانہ ضروریات کی چیزیں تھوڑا بہت کچھ کر کے مل جاتی تھیں جنگل سے لکڑی اور پیو کما کر دیا تھا۔ جو تھوڑا بہت کام کرتے تھے وہ بھی کچھ وقت نکال کر ادھر کا چکر ضرور لگاتے۔ وہ رات کے کھانے کے بعد جو محفل جمتی تھی۔ اس میں شامل ہونا تو ہر ایک نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔

بھاوا ویلے سے کر بچتے ویسے وہیں کی تمام رنگ پالی گئیں۔ دالان ہی ایسا ہے کہ بالا اسے آگے پیچھے کا کوئی ہوش نہ رہتا۔ بچاری اس کی ماں پہلے تو اس کی تلاش میں سارا گاؤں چھان مارا کرتی لیکن بعد ازاں جب سے اس کے اڈے کا پتہ چل گیا تو وہ سب سے پہلے ویرو کی دکان ہی پر آتی۔ یا کسی کو بھیج دیتی

دیکھ کر اسے بہت گہرے ہی پڑ جاتے لیکن پھر بھی ہونٹوں کی بانچھیں دل کی مسرت کو چھپا نہ سکتی تھیں۔ پہلے تو وہ زمین پر پاؤں جما کر ایستادہ ہو جاتی اور چپ چاپ بالی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی۔

بے تحاشہ باتیں کرتے کرتے وینو کا اشارہ پا کر یا خود بخود جب بالی ماں کو قریب کھڑی پاتا تو وہ فوراً چپ ہو جاتا اور کچھ دیر تک تو خاموشی طاری رہتی۔ پھر بالا سنگھ حسب عادت حقہ کی بچکاری چھوڑ دیتا۔

ماں کہتی "میں سمجھے گاؤں بھر میں ڈھونڈ کر ہلکان ہو گئی لیکن تو یہاں بیٹھا ہے......"

"ہو ہو —— ہو" بالی ہنس پڑتا اور اس کے اگلے دو دانتوں میں جڑی ہوئی سونے کی کیلیں چمکنے لگتیں۔ "ماں! تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں وینو کے پاس بیٹھا کرتا ہوں، پھر تو گاؤں بھر میں کیوں ہلکان ہوتی پھرتی ہے......"

"تو اور کسو کام کاج کو۔ میں کیا جانوں یہاں ہر روز کیا کھچڑی پکتی ہے۔ سارا سارا دن بیکار پھرتا رہتا ہے کام چور......"

کہنے کو سنداں اس کی بیکاری پر خفا ہوتی تھی لیکن دل ہی دل میں اپنے بیٹے کا یہ چین دیکھ کر وہ پھولی نہیں سماتی تھی۔

اس پر بالی کے منہ کا یہ چوڑا دہانہ کھل جاتا۔

"ری ماں تو لوگوں کے بہکانے میں آ جاتی ہے......"

"ارے تو نے صبح سے کون کام کئے ہیں......"

"میں نے بھائی سے پوچھا تھا کہ کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ اس نے کہا کوئی کام نہیں...... پھر میں کیا کرتا، بیٹھا؟ ادھر چلا آیا۔"

پھسن کر اسے مارنے کے انداز میں چلے سے ہاتھ اوپر کو اٹھاتی۔ "ہیں ہے...... اب ماں کو بھی آگے سے جواب دینے لگا ہے......"

حالانکہ سنداں کا یہ ہاتھ اٹھنا ابھی محض دھمکی کے طور پر ہوتا تھا۔ لیکن بالی کبھی اٹھتا اور سر بچا کر اپنے آپ کو اس طرح بچانے کی کوشش کرتا جیسے اس کی کمر ہی ٹوٹ جائے گی......

پھر سنداں طاقت سے دونوں بازوؤں میں اس کا چہرہ سمیٹ لیتی اور اس کے گال ہلکے ہلکے تھپتھپاتے ہوئے کہتی۔

"اچھا چل روٹی کھا لے...... تیری بھابی کب کی انتظار کر رہی ہے...... ہم پہ اتنی مہربانی تو کر یار۔"

بالا سنگھ گو غصہ بہت کم کرتا تھا۔ ہر ایک سے بڑی خوش مزاجی سے پیش آتا لیکن اپنی ماں پر تو وہ کبھی خفا ہو ہی نہیں سکتا تھا خواہ وہ کچھ کہے۔

اسی طرح سنداں ایک روز بڑی مشکل سے اپنے بیٹے کو گھسیٹ کر گھر تک لائی۔ اب گھر پر بھابی کے شکوے شروع ہوئے۔ وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

"نہ جانے باہر کیا رکھا ہے جو بالی ایک پل بھی تو گھر پر نہیں بیٹھتا......"

بالی چپ رہا —— ماں گھر سے باہر نکل گئی تو پھر کہا۔

"تو معلوم ہوا ہم سے کھٹکا ہے؟"

"ارے نہیں بھابی...... بھلا تم سے کھٹکا کیسی؟"

اس پر بھابی خوش ہو گئی۔

"تو گھر کیا چکر تیرے پاؤں میں ہے۔ ادھر روٹی کھائی ادھر تو نے انگوچھا کندھے پر پھینکا اور چل دیا......"

پہلی بار بالی خلاف معمول چپ رہا۔

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت بھابی کو کوئی شرارت سوجھ رہی تھی۔ اور پھر اس وقت گھر میں کوئی دوسرا بھی نہیں۔ چنانچہ پُر معنی نظروں سے دیکھ

کر بولی۔

"پہلے پہل جو آئی تو ہم سمجھے کوئی ہوگی......"

پالا سنگھ کے کان کھڑے ہو گئے بظاہر انجان بن کر بولا۔

"کون ہوگی؟"

بھابی نے مسکرا کر سکوت کیا۔

"یہی کہ کوئی نوکرانی ہوگی...... بھیجی تو......"

اب پالا سنگھ کو بھانڈا پھوٹنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

"بھابی تم تو بجھارتیں بجھا رہی ہو۔"

"اس میں بجھارت کیا ہے۔ اندھے کو بھی دکھ رہا ہے۔"

"کیا دکھ رہا ہے؟"

"یہی کہ شہر میں رہتے ہو کسی پر...... کبھی تو بھابی کے پاس بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی......"

"وہ بھی خواہ مخواہ......"

"خواہ مخواہ کیسی برخوردار میری آنکھیں چندھی نہ سمجھو......"

اب پالا سنگھ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اچھا بھابی تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"چل گیا۔" یہ کہہ کر تاباں نے نازک انگلی تنبیہ کے طور پر اٹھا کر شرارت سے کہا۔ "لیکن دیکھو پالی یہ راہ بڑی کٹھن ہوتی ہے"

پالی کچھ شرما رہا تھا اور پھر بھی جیسے جا رہا تھا۔ "کٹھن وٹھن کیا۔ جب تمہاری سی بھابی کا ہاتھ ہمارے سر پر ہے تو پھر سب راہیں آسان ہو جائیں گی۔"

"ناں بابا...... ہم ایسے پھیروں میں نہیں پڑتے۔"

پالی نے بڑھ کر خوشامدانہ انداز میں بھابی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ "نہیں بھابی تمہیں قسم ہے ہمارے......"

"واہ ری بھولی...... کیسے کالج کے سخت ہاتھ ہیں...... اور ابھی یہ قسموں وسموں سے کام نہ چلے گا۔"

پالی نے مزید اور تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر جو کہو گی؟"

"منہ سے کہو نا۔"

"تمہیں لکشمی کا گھی کھلا دوں گا۔"

اس پر تاباں کھل ہی تو گئی۔

"یہ گنگا وتا تو کسی کو کھلانا...... ہاں نہیں تو۔"

پالی نے شرارت سے تاباں کے پھولے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"پھر بھی تم ہی کہہ دو؟"

تاباں چپ۔

"تم بگڑ گئیں ...... دیکھو ہم خوشامد کر رہے ہیں"

"تو پھر میری ہنسی کیوں اڑاتے ہو"

"بائیگوڈ بائیگوڈ ...... کون ہنسی اڑا رہا ہے جی؟"

"اور نہیں تو کیا"

"تو ہم سچے دل سے وعدہ کرتے ہیں ...... جو تم کہو گی ...... بس وہی منظور ہو گا ہمیں"

"کہہ بھی دیا؟"

"کہہ بھی دیا"

"تو میں سوچ لوں گی"

"چلو منظور ......"

"کیا چیز ہو گی بھلا"

"پہلی چیز تو ہو گی انگوٹھی منظور؟"

"منظور —— اس کا مطلب کہ دوسری چیز بھی ہو گی؟"

"ہاں ضرور ہو گی"

"جو تم کہو گی"

"مت ستاؤ"

"یہ اچھی رہی ابھی سے سب کچھ کہلوا لو —— خود بھی تو کچھ کر کے دکھاؤ"

"وعدہ بھولتا نہیں"

"واہ مجال ہے ہماری ......"

"اچھا اب کچھ باتیں بتاؤ"

"کہو"

"مسرور ہی ہو نا؟"

"ہاں جی"

"ابھی تک کچھ بچا؟"

"کچھ نہیں"

"جھوٹ نہیں؟"

"بالکل سچ"

"اس کا کیا خیال ہے؟"

"خیال کیسا؟"

"میں تمہارے بارے میں"

"ابھی کچھ معلوم نہیں۔"

"اچھی طرح بولتی ہے"

"بہت اچھی طرح۔"

"اور ـــــ باقی کیسا برتاؤ ہے اس کا؟"

"بس ہنسے جاتی ہے"

"کچھ ہے اس کے دل میں بھی کچھ؟"

"کہہ نہیں سکتا ـــــ اس بات کا پتہ لگانا تو تمہارا کام ہے۔"

"اچھا میں پتہ لگاؤں گی۔"

"تمہارا بڑھاوا پا بھی ہے؟"

"میں نے خود ہی نہیں بڑھایا"

"تم بھابی دیکھتی کیا ہو ـــــ بڑھاؤ نا"

"یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"

"بس تو آج ہی سے کام شروع کر دو۔ ابھی جاؤ۔"

"ابھی کیا بھاگ گئی ہے۔ روٹی تو کھلا دوں تمہیں۔"

اس معاملے کے بعد بھابی اس کی ہمراز اور ہمدم بن گئی۔ وہ اسے ہمیشہ یہی نصیحت کرتی تھی کہ صبر سے کام لو۔ سچ پوچھئے تو میٹھا ہوتا ہے۔ بھابی کو ہمراز بنا لینے سے اسے بہت سی سہولتیں حاصل ہو گئیں۔ وہ اسے سروج کی بابت کل خبریں دیتی رہتیں۔ آج اس نے فلاں کپڑا پہنا تھا۔ اس کا مزاج در حقیقت کیسا ہے۔ وہ کن چیزوں کو پسند کرتی ہے اور کن سے نفرت کرتی۔ وہ کس وقت کہاں جاتی۔ پالا کو جب بھابی سے معلوم ہو جاتا کہ آج سروج فلاں وقت کہیں پر جائے گی تو اسے راستے ہی میں ٹکر ہو جانے میں آسانی ہو جاتی۔ بھابی کے مشورے اور اپنی عقل سے بھی اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کے گھر بہت کم جایا کرے گا۔ اور گلیوں میں یا تنگ گلیوں میں وہ اسے اس انداز سے ملتا جیسے ان کی یہ ملاقات بالکل اتفاقیہ ہو۔ جب موقع ہوتا وہ کوئی مناسب چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ اس کی شادی سروج سے ہو سکے گی اس لئے وہ ضرورت سے زیادہ حد سے آگے قدم نہ بڑھاتا تھا۔ بعض اوقات اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ایک بات بہت بری طرح کھٹکنے لگتی تھی اور وہ تھا سروج کا مذہب۔

سروج کے انداز گفتگو اور حرکات سکنات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے بھی پالا سنگھ سے لگاؤ ضرور ہے۔ لیکن وجدانی طور پر پالا کبھی یوں بھی محسوس کرنے لگتا جیسے ایک روز یہ سارا بھرم کھل جائے گا۔ جیسے سروج کی ہنسی کھوکھلی۔ اس کی باتیں بے معنی۔ اس کی خوش طبعی ظاہر داری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

پالا کو سروج کا ایک رنگ نہیں کئی رنگ نظر آتے تھے۔ روز بروز وہ اس کے لئے بجھارت بنتی چلی جا رہی تھی۔ جب کبھی راستے میں وہ اسے ملتی یا کسی مجلس میں وہ اس سے ملتا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ وہ اس کے لطیفوں اور ہنسی مذاق کی باتوں پر دل کھول کر کھلکھلا کر ہنستی۔ اس کے گلابی رخساروں کے اُبھار اور اس کی چمک میں جوانی کا لہو لہریں لیتا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک دم کو ساکن نہ رہتے تھے۔ خواہ وہ بولے نہ بولے مگر ہر دم ان ہونٹوں کی رگوں میں رس کی لہر کے رینگنے کی طرح آتا اور گم ہو جاتا۔ اسی طرح اس کے ہونٹ متحرک یا لرزاں رہتے تھے جیسے ہنسی کو چھیڑ رہی تھی۔ شاید سروج کو اس بات کا احساس بھی تھا وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو سنوار سنوار کر بند کرتی لیکن آنکھ جھپکتے میں وہ پھر کھل جاتے۔ ہونٹوں کے بگڑنے اور سنورنے کا عمل جاری رہتا اور ہر صورت میں وہ حسین دکھائی دیتے تھے۔ ان کی ہستی ہی عجیب معلوم ہوتی تھی۔ پالا سنگھ سوچتا شاید کسی روز یہ متحرک ہونٹ سواد ہونٹوں کے لمس اور گرمی سے کچھ دیر کے لئے ساکن ہو جائیں۔

جو شعبان میں اس قدر بے چینی اور تلملاہٹ پیدا کئے رکھتی ہے شاید اس کی تسکین ہو جائے۔

لیکن یہ باتیں ابھی اس طرف سے ہی کرتی رہی تھی۔ تھی جو شعبان کے لئے مخصوص ہو۔ مرزن کی چال بڑی بانکی اکھڑی اکھڑی سی ہوتی تھی۔ اس کی زبان میں بھی اکھڑاہٹ ہوتی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں کا بھی کچھ پتہ نہ ہوتا تھا کہ انہیں وہ کس انداز سے اٹھائے یا بڑھائے یا ہلائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل ہی کی متضاد جذبات نے گھر بنا لیا تھا اور انہی کے اثرات کے تحت اس کے اعضا کی حرکات میں تغیر پیدا ہوتا رہتا تھا —— لیکن جو بات پائی جاتی تھی وہ نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس سے خاص طور پر جھینپتی نہیں۔ اس کی چھیڑ چھاڑ پر بگڑتی نہیں تھی۔ بلکہ اس کی صورت سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ان کنایوں کا مطلب بھی سمجھتی ہو۔

ان باتوں سے پائی عجب ذہنی شکنجے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ مثلاً اگر وہ کہتا۔

"مرزن آج تو بہت خوبصورت دکھائی دے رہی ہو۔"

"مجھے شرم نہیں آتی کہ ایسی باتیں کرو" وہ کہہ کر وہ بجائے شرمانے کے ہنسنے لگتی۔ اگر وہ کہتا "مرزن تمہیں جس دن نہ دیکھوں تو دل کو نہ معلوم کیا ہونے لگتا ہے۔"

"دل ہی تم بہت بڑے ہیں سب کے سب ہو۔ مگر یہ تم نہیں۔ بھلا کے دن ہو گئے ہیں تمہیں . . . . . ."

وہ کہتا۔

"مرزن! ایک بار تم مجھے بھی کبھی یاد کرتی ہو؟"

"کبھی نہیں!" وہ ہنسنے لگتی۔

نہیں . . . . . نہیں . . . . . وہ اتنی بھولی نہیں تھی۔ وہ سب باتوں کو سمجھتی تھی۔ اتنا بھولپن تو آج کل زندگی میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیا اسے اپنے حسن اور شباب کا کچھ بھی علم نہیں۔ کیا اس نے سہیلیوں کی زبانی محبت کے گیت اور قصے تک نہ سنے ہوں گے اور جب سنسان راتوں کو ہیر گانے والوں کی تانیں ساری فضا میں گونجنے لگتی ہیں تو کیا مرزن نے انہیں سنا تک نہ ہوگا۔ کبھی وہ سوچتا ممکن ہے اس نے مجھے عاشق کی حیثیت سے دیکھا ہی نہ ہو کبھی۔ یا شاید دل ہی میں میری چھیڑ چھاڑ کو پسند کرتی ہو۔ لیکن اخلاقاً یہ بات زبان پر نہ آنے دیتی ہو۔ سمجھتی ہو کہ اتنے برس باہر رہنے کے بعد آیا ہے۔ رفتہ رفتہ خود ہی سمجھ جائے گا۔ یا مجھے جاہل مطلق سمجھ کر میری ہو کاروں کے کوئی اہمیت ہی نہ دیتی ہو۔

اسی قسم کے شکوک اور تفکرات اس کے ذہن کی گہرائیوں میں ابھرتے اور پھر کبھی مٹ جاتے کبھی دب جاتے۔ لیکن اس نے کسی سے بھی ان کا اظہار نہ کیا تھا۔ مرزن کا سلوک بظاہر اس قدر اچھا تھا کہ شکایت کا کوئی موقع ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ اس گورکھ دھندے سے نکلنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ کسی روز بھی چھیڑ چھاڑ کرے کہ مرزن واضح جذبات کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مثلاً وہ کسی روز اسے گلے سے لگا سکتا تھا یا اس کے ہونٹ چوم سکتا تھا۔ پھر تو مرزن کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار ہی نہ رہے گا کہ یا تو وہ شرما جائے اور منہ چھپا کر بھاگ جائے یا اس پر برس پڑے۔ لیکن یہ راستہ خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے والدین بھی اسے اپنا داماد بنانے کی سوچ رہے تھے اس لئے اس صورت میں سارا کھیل بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ اسی متضاد قسم کے خیالات میں گھرا رہتا تھا اور اس بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا۔

دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھانے کے لئے گھر آتا تو عموماً اس کی ماں بیٹھک کے لئے روٹی لے کر کھیتوں کو چلی جاتی۔ وہ بھاوج اور بچے گھر پہ رہ جاتے

بھاوج اور اس کی باتیں عموماً مرزن ہی کی بابت ہوا کرتی تھیں۔ اس نے اپنے تفکرات کا ذکر تو کبھی نہ کیا لیکن بھاوج کی باتوں سے اصل حقیقت کی ٹوہ میں رہتا۔

کھانے کے بعد اس کا معمول یہی تھا کہ تمباکو کا کش لگا کر تہ بند ہاتھ میں لئے اور حقہ لئے چوپال کی طرف چل کھڑا ہوتا۔ وہاں سورج کی حدت کم ہونے تک مختلف مشاغل میں مصروف رہتا۔ کبھی تاش کھیلی جاتی کبھی چوسر۔ شطرنج کی چالیں بھی اسے یاد نہ رہی تھیں۔ اگر کوئی کھیل کھیلنے کو جی نہ چاہتا تو بے سروپا باتیں شروع کر دیں۔ وہ دوسروں کے پیچھے بازو پر کہانی حقے پینے لگا۔

گاؤں والوں سے اس کے تعلقات بھی گہرے ہو گئے تھے۔ اس کے ہم عمر سب کے سب اس کے دوست بن گئے تھے۔ کسی کو اس کے خلاف کوئی شکایت

نہیں تھی۔ بڑے بوڑھوں میں اسے تایا ہر پرشاد کی باتیں بہت پسند تھیں۔ اس کا سنجیدہ اور عالمانہ انداز گفتگو اسے پسند تھا۔ وہ اسے بہت بڑا عالم فاضل سمجھتا تھا۔ تایا ہر پرشاد پڑھا لکھا تھا اور اس نے دوسروں کی بہ نسبت ادھر ادھر گھوم پھر کر دنیا بھی دیکھی تھی۔ یوں بھی وہ ذہین تھا۔ چنانچہ جب وہ سیدھے سادے دیہاتیوں کے دلائل کو اپنی منطق سے کاٹ کر رد کرتا تھا تو پالا سنگھ کو وہی لطف حاصل ہوتا جو دو پہلوانوں کی کشتی میں ایک پہلوان کے چاروں شانے چت گرنے پر آتا ہے۔

کرم دین بھی خاصہ دلچسپ آدمی تھا۔ پالا سنگھ کو ان دونوں کی نوک جھونک بہت پسند تھی۔ پچھلے دنوں ہی اس نے ان دونوں کا تماشہ دیکھا تھا۔ اور بعد ازاں جب انہیں میں ذرا بے تکلفی پیدا ہو گئی تو وہ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ وہ باری باری انہیں شہ دیتا اور وہ آپس میں بحث کرنے لگتے۔ پھر اصیل مرغوں کی طرح اپنی اپنی بات پر اڑ جاتے۔ کیا مجال جو ان میں سے کوئی اپنی ہار مان لے۔ تایا ہر پرشاد ذہین اور پھر اسے اپنے وقار کا بھی خیال تھا۔ بھلا وہ ہتھیار کیوں ڈالے اور ادھر کرم دین ٹھیٹ جاٹ۔ وہ بھی حقہ تازہ کر کے ہر پرشاد کے مقابل ڈٹ جاتا۔ اس کی دلیلیں بے شک ساری بودی ہوتیں لیکن اس کا بات کرنے کا ڈھنگ ہی ایسا تھا کہ دیکھنے سننے والے مارے ہنسی کے پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ آخر تنگ آ کر ہر پرشاد کہتا "بھئی تم ٹھہرے اڑیل جاٹ۔ تم سے سر کون کھپائے"۔

وہ دونوں ہم عمر تھے۔ ایک دوسرے کا لحاظ بہت کم کرتے تھے۔ ہر پرشاد کی اس بات پر کرم دین حقے کی نے کھینچ کر ماسٹر کے انداز سے اوپر اٹھا کر کہتا۔ "کرم ہو گئے بابو بھی رہا پنڈتا! بات نہیں سوجھی تو منہ چڑانے پر اتر آئے"؟

یہ کہہ کر کرم دین کھل کھلا کر ہنسنے لگتا اور ہر پرشاد ایک ہاتھ سے عینک سنبھالتا ہوا سمٹ کر چارپائی سے چپک کر رہ جاتا اور چلا چلا کر کہتا "واہ رے زمانے! ...... اوئے زمانہ ہی ایسا ہے مورکھ! اپنے باپ کی"۔

اس پر کرم دین واقعی چلّے بلّے ہو کر ہاتھ چھوڑ دیتا اسے اپنی نے کے ٹوٹ جانے کا ڈر بھی لگا رہتا تھا۔

پھر جب کرم دین اپنی جگہ پر جا بیٹھتا تو ہر پرشاد کہتا "یار کرم دین یہ قصہ صادق آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک گاؤں میں بڑا قابل پڑھا لکھا پنڈت گھومتا پھرتا آن نکلا۔

اس پر کرم دین جلدی جلدی حقے کے کش لینے لگا۔

"اس نے لوگوں سے کہا کہ میں پنڈت ہوں۔ اگر کوئی گیان دھیان کے مسائل پر بات چیت کرنا چاہے تو میں تیار ہوں۔ ...... اس پر کرم دین کی طرح کا کوئی جاٹ بھائی کہنے لگا۔ "اوئے اس پنڈت کو میں ابھی ہرائے دیتا ہوں۔ سارا گیان دھیان دھرا رہ جائے گا۔ سب لوگ حیران رہ گئے ......"

اس پر کرم دین گھور کر ہر پرشاد کی طرف دیکھتا۔ "بیٹا! معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اور مار کھانے کو جی چاہتا ہے تیرا؟"

ہر پرشاد سلسلۂ کلام جاری رکھتا "جب وہ پنڈت جی کے سامنے آیا تو پنڈت جی نے جٹ سے پوچھا "اچھو؟" یعنی فرمایئے۔ اس پر جاٹ کہنے لگا، "بچھو، پچھو، دبچھو"۔

حاضرین کی ایسی ہنسی چھوٹی کہ بعض زمین پر لوٹنے لگے۔

کرم دین قدرے کھسیا جاتا۔

ہر پرشاد کامیابی کے نشے میں خمار ہو کر کہتا "اور پھر پنڈت جی نے جاٹ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا "بھائی! تم جیتے اور میں ہارا۔"

پالا جوالا سنگھ کا بھی بڑا احترام کرتا تھا۔ صرف اس لئے نہیں کہ وہ اس کے باپ کا دوست تھا اور دونوں نے بڑے بڑے معرکوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا بلکہ جوالا سنگھ کے اپنے کارنامے ایسے تھے کہ پالا سنگھ جیسے انسان کے دل میں خواہ مخواہ اس کے لئے عزت پیدا ہو گئی۔ جوالا سنگھ کو بھی پالے سے انس ہو گیا تھا۔ اگر کبھی کھیت کی منڈیر پر یا گھر واپس آتے جاتے وقت ان دونوں کا میل ہو جاتا تو جوالا سنگھ گھنٹوں اسے اپنی زندگی کے واقعات سنایا کرتا۔ اس کی زندگی بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھی۔ بڑے بڑے خطروں میں پھنس چکا تھا۔ کئی مرتبہ جیل جا چکا تھا۔ پالے نے عجیب عجیب آدمیوں کی اس کے گھر میں آمد و رفت دیکھی تھی۔ وہ کئی مرتبہ دن کے وقت اس کے گھر میں بھی جا چکا تھا۔

جوالا سنگھ کی بیوی کی شخصیت پالی کے لیے اور زیادہ دلچسپ تھی۔

پالی دل ہی دل میں سوچتا کہ جوالا سنگھ کی بیوی کا نام چنتی کی بجائے بسنتی ہونا چاہیے کیونکہ اس نے آج تک اسے اداس نہ دیکھا تھا۔ وہ ہر دم تیار بتیار رہتی جیسے میدان جنگ کو جا رہی ہو۔ ہر وقت خوش، ہر وقت ہنسی، آنکھوں میں چمک، حرکات و سکنات میں چابک دستی، چہرے پر جلال، چال میں رفتار ——— جوالا سنگھ نے دبی زبان میں دو ایک مرتبہ اپنی بیوی کے خصائل بھی بیان کئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوالا سنگھ نے کسی خفیہ مقام پر ہتھیار بھی چھپا رکھے تھے کرپانیں، چھریاں، کلہاڑیاں، چاقو، چھرے اور برچھیاں اور غالباً پستول اور بندوقیں بھی۔ اس نے ان باتوں کا صاف صاف اعتراف کبھی نہ کیا تھا لیکن ایک روز اس نے پالی کو یہ حقیقت بتا دی تھی کہ چنتی کا پستول کا نشانہ بہت زبردست ہے۔ اگر دیوار پر مکھی بیٹھی ہو تو بھی اس کا نشانہ چوک نہیں سکتا۔ خود پالی نے زیادہ سوالات کرنا نامناسب سمجھا۔ اس طرح خواہ مخواہ جوالا سنگھ کے دل میں شک پیدا ہونے لگتا۔ پالی نے اتنا سمجھ لیا تھا کہ ممکن ہے کسی روز ان دونوں کو ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا پڑ جائے۔

باغیچی میں دوپہر کا وقت کاٹنے کے بعد وہ گھر جاتا۔ وہ کھٹی لسی میں نمک کی ڈلی اور کالی مرچ گھول کر صبح کی بچی ہوئی ایک آدھ روٹی کھا لیتا۔

شام کے وقت سب لوگوں کی مل جل محفل گاؤں سے پرے کھیتوں میں منعقد ہوتی۔ اس وقت عموماً گاؤں کے لڑکے بالے اور نوجوان علیحدہ علیحدہ ٹولیوں میں بٹ کر کبڈی کھیلا کرتے۔ پالا سنگھ ان کھیلوں میں حصہ نہ لیتا لیکن تماشائیوں میں شامل ضرور ہو جاتا۔ ہاں اگر کبھی طاقت آزمائی شروع ہو جاتی اور اسے بھی اصرار کے ساتھ شامل کر لیا جاتا تو وہ انکار نہ کرتا۔

رات کے کھانے کے بعد صرف نوجوانوں کی جو خفیہ محفل جمتی اس میں پالا سنگھ پیش پیش ہوتا۔ ایک دوسرے کی معشوقاؤں کی تعریفیں اور تنقیدیں کی جاتیں۔ پالا سنگھ نے اپنے عشق کا قصہ عام ہونے دیا تھا۔ دوسرے جانتے تھے کہ پالی نوعمر ہے ابھی کسی سے عشق لڑا بھی نہیں ہوگا۔ اور دیکھتے تھے کہ محفل میں کانسے داروں کے ساتھ بھرے ہوئے گیت سن کر ہو سکتا ہے کہ ایک روز اس کے دل میں بھی عشق کی آگ بھڑک اٹھے۔

لیکن وہاں تو آگ پہلے ہی بھڑک چکی تھی اور ایک روز یہ راز بھی افشا ہو گیا۔

شام کا وقت تھا۔ گاؤں کو واپس آنے والے مویشیوں کی اڑائی ہوئی گرد نے بڑھتی ہوئی تاریکی میں گھل مل کر فضا میں اور زیادہ دھندلاہٹ پیدا کر دی تھی۔ پالا سنگھ کبڈی کھیلنے والوں کو چھوڑ کر گھر واپس آ رہا تھا۔ اس کا دل کھویا کھویا سا تھا۔ جیسا کہ کبھی کبھار ہر انسان محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا بیٹھے بیٹھے مکانوں کی اور گاؤں کی تنگ گلیوں کی طرف دیکھا جہاں اس وقت نامعلوم سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ خصوصاً مکانوں کے درمیان جہاں کہیں کہیں درخت اگے ہوئے تھے وہاں تاریکی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ان کے پھیلتے ہوئے گہرے سائے فضا کو اور اداس بنا رہے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ حبس اور پسینے سے دم گھٹتا اور طبیعت بے چین ہوئی جاتی تھی۔ پالا سنگھ نے ڈھیلی پگڑی میں اپنی دو لمبی انگلیاں ڈالیں۔ پسینے سے تر بالوں میں سے ہوتی ہوئی انگلیاں آخر اس مقام تک پہنچ گئیں جہاں وہ کھجانا چاہتا تھا۔ پھر نہ معلوم فضا کی بے کیفی سے تنگ آ کر یا گرمی کی شدت سے گھبرا کر ایک لمبی سانس چھوڑ دی ———

کبڈی کے میدان سے تماشائیوں کے چیخنے کی بہت مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پالا سنگھ کی گردن کے کندھے پر پڑا ہوا انگوچھا بھاری معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے کندھے سے اتار کر کمر کے گرد لپیٹ لیا اور کس کر گرہ لگا دی۔ اس سے اس کی کمر کا گھیرا تنگ ہو گیا اور اس کی چھاتی کا پھیلاؤ بہت زیادہ دکھائی دینے لگا۔ سامنے نواب کا طویلہ دکھائی دے رہا تھا جس کے گرد اگرد چار دیواری اور نیچی دیوار بنا دی گئی تھی۔ اس دیوار کی اینٹیں بہت گھٹیا قسم کی استعمال کی گئی تھیں۔ اسے کبھی پلستر کرنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی۔ جا بجا پتے اور کھرے گھسیٹنے سے اس پر ابھر گئے تھے۔

اسے طویلے کے قریب ہی سے گزرنا تھا۔ جب وہ طویلے سے ادھر کے درخت تلے سے گزر رہا تھا تو دفعتاً گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔

قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سرداروں کی بہو ہے۔ وہ ایک بیل گاڑی کے پیچھے دبک گیا۔ جب اور قریب آ گئی تو اس نے دیکھا کہ اس کا خیال درست نکلا۔ چنانچہ وہ بھاگ کر چکر لگا آیا۔ طویلے کی دیوار کے پرلے کونے پر کھڑا ہو گیا۔

وہ قریب پہنچی تو وہ پیچھے سے دو قدم بڑھا کر اس کے قریب جا گیا۔ سرداں نے قدرے خوفزدہ نظروں سے اپنے شانے کے اوپر سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور وہ ہنسنے لگی۔

”اوہ میں تو ڈر ہی گئی!“

یہ کہہ کر ہنستے ہنستے اس نے غالباً سنجیدہ دکھائی دینے کے لئے ہونٹ بند کر لینے کی کوشش کی مگر حسب عادت دانت نکلے پڑتے تھے۔ لیکن اس کی اس کوشش کے دوران میں اس کی گول ٹھوڑی پر ننھے ننھے نشیب و فراز پیدا ہو کر غائب ہو گئے۔

دھندلائی ہوئی روشنی میں اس کے ڈھیلے ڈھالے بالوں کی لٹیں جن پر گرد کی نہایت ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں جو بالوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی، اس کے خوبصورت ہاتھوں کی جنبش جو شفاف پانی کی تہہ میں ایک ادا سے حرکت کرتے دکھائی دے رہے تھے اس کے رسیلے ہونٹوں سے نکلتے ہوئے الفاظ جو دور دیش کے کسی گوشے سے آتے ہوئے سنائی دے رہے تھے......

سرداں نے کئی مرتبہ بالی کو اپنی طرف اس انداز سے گھورتے پایا تھا اس لئے اب اس نے اس کی اس حرکت پر پریشان ہونا ترک کر دیا تھا......

”میں سمجھی قریب کا کوئی [illegible] گئی تھی شـــ“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”جولاہوں کو صورت دے دکھا رہے ہیں نے......“

بالا سنگھ نے ایک ہاتھ اٹھا کر سرداں کے مونڈھے پر رکھ دیا۔ اور قدرے آگے کو جھک کر آہستہ سے کہا، ”سرداں مجھ سے کب تک ڈرتی رہوگی......“

اور پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر طاقت سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ پہلے ہی اس کے قریب ہی کھڑی تھی لیکن اب شاید ایک طرف کو زیادہ بوجھ پڑ جانے سے وہ ایک قدم اور قریب آ گئی تھی۔ بالی نے محسوس کیا کہ وہ اس وقت اس قسم کی حرکت پر آمادہ نہیں تھی لیکن اب اسے خطرناک حد تک قریب لے آیا تھا۔ اس کی رنگین قمیص کے اوپر کے دو کھلے ہوئے بٹنوں کی وجہ سے اس کی نرم گردن کی اُجلی جلد قمیص کے کپڑے کے شوخ رنگین سائے میں گھل مل کر اور بھی زیادہ دلفریب ہو گئی تھی۔ اس کی چھاتیوں کا نچلا حصہ پسینہ کی وجہ سے قمیص سے چپک گیا تھا اور وہ مناسب گولائیاں اور بھی نمایاں ہو گئی تھیں۔ جذبات کے ہیجان میں سرداں زیر لب بے ترتیب الفاظ سے احتجاج کر رہی تھی۔ بالی کی عقل کہتی تھی کہ اسے یہ حرکت نہیں کرنی چاہئے لیکن اب جبکہ وہ اپنے سینہ پر سرداں کی سخت چھاتیوں کے لمس سے کلی مسحور ہو چکا تھا اس کے لئے پیچھے قدم ہٹانا ناممکن تھا......

لیکن اس وقت نامعلوم سا کھٹکا سنائی دیا۔ اس کے بازو فوراً ڈھیلے پڑ گئے۔ اور آنکھ جھپکنے میں سرداں اس کی گرفت سے باہر نکل گئی۔ اس نے سوچا اچھا ہوا کہ اس نے سوا بغلگیر ہونے کے اور کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید وہ پھر بھی ہنس رہی تھی۔ نجات کی خوشی منانے والی ہنسی...... شاید اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں پر کھلی ہوئی مسکراہٹ تھی...... اسے واضح طور پر کچھ بھی یاد نہ رہا...... اس نے دیکھا کہ وہ جلد جلد اپنے بے ترتیب کپڑوں کو درست کرتی ہوئی نہایت تیزی سے قدم اٹھاتی گلی کے موڑ پر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

کشمکش کے دوران میں بالی کے دل اور دماغ میں جنگ جاری رہی وہ اس اندرونی انتشار کی وجہ سے کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس لئے ایک لمحے کے لئے وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا...... پھر نہایت مدھم سروں میں مستانہ آواز سنائی دی۔

آ نی بجے کوڑے

جا نی بجے کوڑے

بھیڑی گلی وچ ہووے تارا

اوئے

بھیڑی گلی وچ ہووے تارا

بھائیاں تیریاں نوں خبر ہو جاوے

آ جا ویں سنگاں بچھڑ کے

نی بچھڑی کونج

بچھڑی کونج روندی اے گی، رو رو سانوں وا بچھڑ کے

پالی نے چونک کر سر گھمایا تو دیکھا نواب حمیدے کی دیوار پر دونوں کہنیاں ٹیکے شرارت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر گیت گا رہا ہے۔

نواب اس کا دوست تھا۔ بچپن کی یاری بھی اس کے دل میں کسی کے لئے جوان نہیں ہوئی تھی۔ پھر جب وہ دیوار پر سے کود کر گلی میں اترا تو اس کے سیاہ بالوں والے پٹے کانوں کے پیچھے سے نکل کر آنکھوں پر آن گرے۔ پالی نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا "دیکھ یار اور کسی کو خبر نہ ہو" وہ جانتا تھا کہ دوستوں میں تو یہ قصہ مشہور ہو ہی جائے گا، لیکن وہ بڑوں سے یہ بات چھپانا چاہتا تھا۔

پھر رات کو جب پالی کھانے کے بعد یاروں کی محفل میں پہنچا تو سب کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ پالی کو معلوم ہو گیا کہ ان سب کو اس کے عشق کا پتہ چل گیا ہے۔ اتنے میں نواب نے اپنی بے معنی بھینگی آنکھوں کو پر معنی بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹا عاشق کہو حال کیسے ہیں؟"

پالی ہلکی سی پچکاری چھوڑ کر مسکرانے لگا۔

اس وقت وہ گاؤں سے باہر ایک بہت پرانے کنوئیں کی ٹوٹی پھوٹی منڈیر پر بیٹھا تھا اور باقی لوگ نیچے زمین پر بیٹھے تھے۔ کبھی اس کنوئیں پر رونق بھی ہوا کرتی تھی لیکن اب اسے مٹی سے بھر دیا گیا تھا۔ یوں بھی یہ چھوٹا سا گڑھا رہ گیا تھا یا وہ بوسیدہ طرز کے ستونوں میں پرچھ کنوئیں کی بڑی رہتی تھی۔

سب لوگ نواب کو گانے کے لئے اکسانے لگے۔ نواب نے بڑی رسیلی آواز پائی تھی۔ اس کے مقابل جیراں بھی خوب گاتا تھا۔ لیکن سمجھا جاتا تھا کہ بہت عورتوں کی آواز اور حرکات کی بہت اچھی نقل اتارتا تھا۔ دوستوں کی محفل میں وہ اکثر سب سے زیادہ شور مچایا کرتا اور جی بھی ہو جاتے۔

نواب نے وہ سنگ اپنا خوبصورت مردانہ چہرہ اوپر اٹھایا اور کان پر ہاتھ رکھ کر گیت کے بول شروع کئے۔

ایس کولوں جے سی

ہائے نی نوں کیہ ہو گیا نی

میریئے نازک ہانڑے

جیراں نے پیچھے کرتے کی ڈانگ کو سر پہ اوڑھ لیا اور عورتوں کی طرح گھونگھٹ سا نکال کر اپنے بھنچے ہوئے ہونٹوں ہی سے باریک آواز نکالی۔

ایس کولوں دے

ہائے ساڈا وی لوڈ کی

میرا دیا ڈھولا!

حاضرین مارے خوشی کے ناچ اٹھے۔ بیٹھے نے ناک اور انگلیوں کی مدد سے گویا الغوزے بجانے شروع کر دیئے۔ اور چھجو نے زبان اور تالو کی مدد سے چس جیسا چمٹی کی آواز نکال کر گویا گھنگھروؤں کی آواز پیدا کی۔ نواب نے بڑھ کر پالی کی پگڑی جھپٹ کر سر پہ اوڑھنے کے لئے جیراں کی طرف پھینک دی۔ پالی نے اس پر وہ وہ تین گندی گالیاں دیں لیکن اس کے ہونٹوں پر بھی ہنسی کی دبی ہوئی لالی کے ڈھیں بھنوروں کی لرزش کے ساتھ نواب کی ترنم آواز گونجی۔

• کیہڑی گلوں بچھڑ گیوں

سانوں دس وے

میرے بانکے نازکے نارے"

واہ وا ...... بلہارے ......"

گجراتی نے کرلائی

"اوہ بدلی گھر چڑھی وے
ساون جھل گئی

میرا ماہیا ڈھولا"

محفل ایک مرتبہ پھر اچھل پڑی۔ "ہائے او ہائے .... اوہ گھر چڑھی۔
نواب نے اپنی مونچھوں کو سنوارتے ہوئے ہنس کر سب کی طرف دیکھا۔

"کیکری بجھری نی
کیکری بجھری نی
ساون برس وے

میرے بانکے نارے

گجراتی نے انگڑا کر بھونڈے طریقے سے رقص کرنا بھی شروع کر دیا تھا اب اس نے بڑے زور سے کرلائی۔

اوہ بجھری وے
اوہ بجھری وے
ساتھوں نچ پئی

میرا ماہیا ڈھولا!

اس پر سننے والوں کی مسرت اور وارفتگی کا ٹھکانا نہ رہا۔ بعض نے ہائے وائے کے نعرے بلند کر کے تہمند اٹھا کر پھینکے اور چاندنی کی چاندنی میں بلاتکلف ننگ دھڑنگ اچھل کود کرنے لگے۔

اب کے نواب نے اپنے پیٹ پہ تھپکی اور غبا کی اور ایک ہاتھ ہوا میں لہرا دیا۔

"اوہ کشمیری نی
اوہ کشمیری نی
ساون برس وے

میرے بانکے نارے"

اس پر گجراتی گھونگٹ اُلٹ کر نواب کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اپنے بدصورت چہرے کو اور بھی بھونڈا بنا کر تان اُڑائی۔

اوہ کشمیری وے
اوہ کشمیری وے
بالک سے گئے

میرا ماہیا ڈھولا

پالا سنگھ کے عشق کے انداز میں گایا جا رہا یہ گیت ختم ہوتے ہی محفل میں گویا جان آ گئی۔

(۵)

شام کو جب وہ گھر پہنچا تھا۔ اس نے چاہا کہ دوستوں کی محفل میں بیٹھ کر جی بہلائے [illegible] گاؤں کی باتوں اور لطیفوں سے لطف اندوز ہوتا رہا لیکن اس پر ایک نامعلوم سا اضطراب تھا۔ وہ اس رات کے بعد آنے والی صبح سے ڈرتا تھا۔

بدنامی اور دوسرے جھگڑوں سے وہ خوف کھانے والا نہیں تھا جیسا کہ گاؤں میں اس کے نزدیک کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ آخر ایک دن احساس کرنے کے بعد بھاگ تو نہیں جائے گا۔ کسی سے کوئی بات نہ کہو۔ اگر کوئی دیوانی کرے تو چپ رہو۔ [illegible] استری پر بڑی نگاہ رکھتا تھا۔ [illegible] بزرگوں اور عزیزوں [illegible] قسم کے کام کرنے پر ایک ہی کا تنبو مل جاتا ہے۔ باقی رہ گئے سرنوں کے بھائی۔ اگر سرنوں انہیں کچھ بھی دے اور وہ دشمنی کے مقابلہ پر اتر آئیں تو بھی اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔ خود ہی مار کھا کر بھاگ جائیں گے —— اسے خود سرنوں سے ڈر لگتا تھا کیونکہ اس کے دل میں سرنوں کی برتری کا احساس تھا [illegible] رہتی تھی۔ وہ صاف صاف کرتی تھی۔ آنکھوں میں شرم دکھاتی تھی۔ [illegible] کسی لڑکی سے [illegible] کام کرنے [illegible] نہیں۔ لیکن اس کا دل [illegible] وہ اس کا اظہار نہیں کر پاتا تھا۔ وہ سرنوں سے محبت کرتا تھا اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے وہ اس کے خلاف ہو جائے۔

لیکن شام کو وہ رک کے [illegible] کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ پھر اس واقعہ کی تفصیلات پر غور کرنے لگا۔ اس نے کیا حرکت کی تھی اور سرنی پر اس کا کیا رد عمل ہوا تھا۔ لیکن اسے واضح طور پر کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ جو کچھ اس نے کیا غلط تھا لیکن اس کے نتائج کیا ہو سکتے تھے وہ اس کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

دوستوں کی محفل برخاست ہونے کے بعد وہ گھر گیا۔ اس رات گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے لوگ زیادہ تر گھروں کی چھتوں پر سو رہے تھے۔ تھوڑی سی ہی دیر ہوئی جب وہ صحن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کی بھابی چکی کے گرد سے جھاڑو کر رہی ہے۔ اسے حیرت ہوئی تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ گھر کے باقی لوگ چھت پر جا چکے تھے۔ اس نے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مدھم روشنی میں بھابی کی طرف دیکھا جو اس وقت [illegible] ایک جھاڑن رکھے اچک اچک کر اوپر سے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے کو چولہے پر پھیرے جا رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لئے چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر بولا

”بھابی تم اس وقت صفائی کر رہی ہو۔ میں سمجھا سو گئی ہو گی۔ اور سب تو سو گئے ہیں نا؟“

تاباں نے حسب عادت ہنستے ہوئے کہا: ”لوگ کے ساتھ جب تک میں دیکھ نہ لوں وہ سوتا نہیں۔ آج تو وہ خود سیانا مجھے اپنے قریب سے اٹھنے دیا مشکل سے جب سو گیا تو ایک مرتبہ [illegible] بھی چاہا کہ سو جاؤں لیکن پھر صبح کو بھی ایسے ہی سب کام کرنا پڑتا۔“

پالا سنگھ کو اس مفصل جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بھابی کے فقرے دھیان سے نہ سنے تھے۔ وہ بے معنی نظروں سے صحن میں پڑی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چھکڑے کا ڈھانچہ لگا ہوا تھا۔ اس کے قریب ہی چارپائی، رسی اور [illegible] وغیرہ بے ترتیب پڑی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ [illegible] کی کیا ضرورت، جبکہ ہر چیز اندر سے نکال کر باہر ڈال دیتا ہے۔ پھر اسے پھینکنے والی کمان کو جو دروازے کے آگے گری پڑی تھی اٹھا کر اس نے صحن کی دیوار میں لگے ہوئے کھونٹی کے ساتھ لٹکا دیا۔ پڑوس والوں کے صحن میں پیپل کا ایک بھاری درخت کھڑا تھا جس کی شاخیں ان کے صحن تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پر بیٹھے ہوئے کوے اور طوطے دن بھر شور مچاتے تھے اور [illegible] کی بارش بھی کرتے جاتے۔ انہیں اڑانے کے لئے اس کے باپ نے وہ کمان ایجاد کی تھی۔ اس کمان کے [illegible] سوراخ [illegible] کی رسیاں ایک دوسرے کے متوازی [illegible] تھیں۔ [illegible] بیچ میں [illegible] کے لئے [illegible] ہوئی پٹی تھی۔ وہ اس پٹی کو دیکھتا رہا جس کے آگے گرہ پڑی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہ صحن کے اس گوشے کی طرف چلی گئی۔ جہاں بھیگی ہوئی [illegible] پڑی تھیں۔ [illegible] رہی تھیں۔ پھر وہ [illegible] کی طرف جا کر [illegible] تک [illegible] کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

تاباں نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اسے [illegible] کھڑا پا کر بولی۔

"تمہیں نیند نہیں آئی۔ جاؤ تمہارا بستر بچھا دیا ہے۔ میں نے کہا سو رہو۔ صبح اٹھ کر تمہیں سلائی بھی تو کرنی ہوگی۔"

پالی نے بھابی کی بات سنی ان سنی کر کے یونہی بات چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

"بھابی تمہیں بہت کام کرنا پڑتا ہے؟"

تاباں نے یہ بات سنی تو مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"اب تمہاری جورو آئے گی تو میرا ہاتھ بٹا دیا کرے گی۔ بھلا سوچو پھر میں آدھی آدھی رات تک چپاتی تپائی تھوڑے ہی کیا کروں گی۔"

یہ کہہ کر تاباں نے تھوڑے سکوت کیا اور پھر اپنی بات کا رد عمل جاننے کے لئے اس نے سر اوپر اٹھایا۔ اور پالی کی طرف دیکھا۔ پالی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور پھر معدوم ہو گئی۔ تاباں کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ اس نے ایک گول مول سا جملہ اس کی طرف لڑھکاتے ہوئے کہا۔

"اگر نیند نہیں آتی تو بیٹھو نا۔ کوئی مزیدار بات یا کوئی خبر ہی سنا دو۔"

پالی نے رکتے ہوئے موڑھے کو پاؤں سے سرکایا اور وہ آڑا ترچھا ہو کر باقاعدہ زمین پر آ کھڑا ہوا۔ پالی بغیر کچھ کہے اس پر بیٹھ گیا اور قریب پڑی ہوئی چھلی کے چھلکے کی چند ٹھیکریاں اٹھا کر انہیں ہوا میں اچھالتا اور پھر تھامنے لگا۔

"کیا طبیعت ٹھیک نہیں؟"

"کیا بات ہے ...... آج اکھڑی اکھڑی سی باتیں کر رہے ہو۔ چہرہ بھی کچھ اداس سا ہے ......"

"نہیں تو۔"

تاباں نے اپنی بات کی تردید کو قبول کر لینے کے خیال سے زیادہ دل نہ دیا۔ لیکن دل ہی دل میں کھٹک رہی تھی کہ کوئی بات ہے ضرور۔

تھوڑے سکوت کے بعد پالی نے ٹھیکریاں اچھالنے اور پکڑنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"آج تم گئی نہیں ——— وہاں؟"

"وہاں ——— کہاں؟"

پالی چپ رہا۔ اس نے سوچا بھابی خود ہی سمجھ جائے گی ...... اور دوسرے لمحے ہی وہ سمجھ بھی گئی۔

"اوہ اچھا سسرال کے بارے میں پوچھتے ہو؟ ...... ہاں گئی تھی۔"

"کب؟"

"دوپہر ڈھلے ...... لیکن وہ نہیں تھی گھر پہ ...... پھر روٹی کے بعد تو جیٹھانی کی کوٹھری دیکھے ...... اس وقت وہ گھر پر ہی تھی۔"

پالی کے ہاتھ رک گئے۔

لیکن تاباں کی صورت سے کسی غیر معمولی بات کا اظہار نہیں ہوا۔ پالی اس بات کا منتظر تھا کہ وہ آگے کچھ کہے لیکن اس کا مسلسل سکوت بھی اس کے ذہن پر بھاری ہو رہا تھا۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیا کر رہی تھی؟"

یہ کہہ کر پالی کو احساس ہوا کہ دراصل پوچھنا وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کا رویہ کیسا تھا لیکن ......

تاباں کے بالوں کی ایک لٹ آنکھ پر آن گری تھی۔ اس نے گوبر سے سنا ہوا ہاتھ اٹھایا اور کلائی کی پشت کی جانب سے اسے پیچھے کی طرف ہٹا دیا۔ اس کی اس حرکت سے جواب دینے میں اور دیر ہو گئی۔ پالی نے بے چینی سے انگلیوں میں ایک ٹھیکری کو دبا کر توڑ دیا۔ ٹھیکری توڑ دینے کے بعد خیال آیا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بے چارے بچے بڑی مشکل سے اچھی اچھی ٹھیکریاں چنتے ہیں۔ پھر انہیں بڑی محنت سے اینٹوں پر گھس گھس کر ہموار کرتے ہیں ......

بھابی کو بھی تو اس بات کا احساس نہ تھا کہ وہ اس کے جواب کا کس بے چینی سے انتظار کر رہا ہے۔ اور بیچاری کو احساس بھی کس طرح ہوتا اسے یہ تو معلوم ہی نہیں کہ آج کس قدر اہم واقعہ پیش آ چکا ہے۔

آخر تاباں بول ہی پڑی۔

"وہ دیر سے روٹی کھایا کرتے ہیں۔ اس لئے میں کل ذرا کھانے سے فارغ ہو کر ڈھینگری لے کر وہاں گئی تھی۔ مرزوں کے باپ کو ڈھینگری کا ساگ بہت پسند ہے۔ اس نے پوچھا 'کہو بیٹی اچھی تو ہو۔ آج تمہیں بہت دنوں کے بعد دیکھا ہے ......' میں نے جواب دیا 'میں تو آتی ہی رہتی ہوں آپ ہی نہیں کبھی دکھائی دیتے اور نہ کبھی ہمارے گھر آتے ہیں' پھر اسے جب معلوم ہوا کہ میں ڈھینگری کا ساگ لائی ہوں تو کہنے لگا۔ 'بیٹی ہم تو کھانا کھا چکے ...... عجیب کی بات ہے نا' یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ 'آپ لوگ تو کھانا بہت دیر سے کھاتے ہیں۔ اس لئے تو میں بے فکری سے اس وقت چلی آئی۔' اس پر وہ بول اٹھی۔ 'گرمی ہے نا آج اور پھر بھی گھر پر ہو رہے تھے سوچا ساری دوپہر اچھا بہت پڑے جاتی ہو گی کہیں رکھا ہی ہیں ...... اور دو دن لاؤ کٹوری یا تھالی میں رکھ دیتی ہوں بہت برتنوں میں پڑی رہے گی تو خراب نہ ہو گی ڈھینگری ......"

پالی کو بھابی کی یہ گفتگو سن کر از حد کوفت ہوئی اور بار بار ڈھینگری کا لفظ سن کر تو اس کے کان پک گئے۔ اس قدر طویل گفتگو میں کام کی بات ایک بھی نہیں۔ اس نے سر سے پگڑی اتار کر اپنے گھٹنے پر دھر دی۔ اور اس کے چہرے پر بکھرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"تو تم وہاں بیٹھی رہیں، جگ آئیں؟"

"ارے بیٹھی کہاں نہیں۔ بیٹھنے کے لئے تو گئی تھی۔ اب سارا کام ختم ہے ......"

پالی کا دل کچھ بجھ گیا۔ "ہاں بہت کام کرتی تھی بھابی۔" اور پھر اس نے اپنا لفظ ہی دہرایا۔

"بھابی تم بہت ہی کام کرتی ہو ایک ہم ہیں۔ نالائق نکمے ......"

اپنی تعریف سن کر تاباں خوش ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی بزرگانہ شفقت بھی جاگ اٹھی۔

"ارے کون کہتا ہے کہ تو نکما ہے؟"

"سبھی کہتے ہیں۔"

"زبان کھینچ لوں کہنے والے کی۔"

پالی خوش ہوا۔

"منہ سے نہ کہیں دل میں تو کہتے ہیں۔"

"کسی کا کیا بھلا ہوتا ہے۔ آخر تجھے یہ وہم کیسے ہوا؟"

"نہیں بھابی، میں کبھی کبھار سوچنے لگتا ہوں ...... تم اتنا کام کرتی ہو اور میں ہر روز 'تم سے پوچھ کر گھر سے باہر نکلتا ہوں۔'"

بھابی کو دیور کے "پوچھ کر گھر سے نکلنے" کی حقیقت معلوم تھی۔ تاہم اسے دیور کی یہ ادا پسند تھی۔

"ہاں ہاں پوچھ کے تو جاتے ہی ہو مجھ سے" یہ کہہ کر اس نے کن انکھیوں سے پالی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور ایک ہی خیال کے تحت دونوں کے منہ سے بے اختیار ہنسی نکل گئی ——— جیسے دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

تاباں لوگوں کے سامنے دب کر رہنے والی نہیں تھی۔ شوہر اور دیور کا احترام تھا۔ اسے صرف سہارے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب سے پالی گاؤں میں آیا تھا وہ دونوں نہایت سوکھے کی دنیا میں رہ رہی تھی۔ کام کرنے میں وہ تیز طرار تھی۔ لیکن گھر سے پھرنے کا شوق شروع ہی سے اس کے دماغ میں سما گیا تھا۔ کام دھام نمٹا کر وہ سارے گاؤں میں چرخی کی طرح گھوم جاتی۔ اسے سب محلوں کے بھید اور گھر کی ڈھکی چھپی باتوں کا علم تھا۔ اس لئے ذرا کسی سے لڑائی ہو جائے تو وہ اس کے

آباد اجاڑ اور سنگ کی تراشی ہوئی جالیاں لگا دیتی تھی۔ پاشا سنگھ گوردواروں کی ان دوشیزاؤں کی نیرنگ نہ بھولی تھی لیکن اس کے نام کا دبدبہ تو تھا۔ اور تایا نے اس کا جائز یا ناجائز فائدہ اٹھانے سے کبھی گریز نہ کیا۔

تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھنے کے بعد پالی نے ناک کے نتھنے میں انگلی پھیرتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھابی تو پھر تم وہاں بیٹھی رہیں؟"

"ہاں۔"

"چھت پر یا کمرے میں؟"

"پہلے کمرے میں پھر چھت پر۔"

گلاں کو معلوم تھا کہ پالی یہ سب کیوں کر رہا ہے۔ وہ آٹھ پھیر کر باتیں پوچھ رہا تھا۔ اور وہ رنگ کر چند ہی آنکھوں سے پُرسکون انداز میں ہاتھ روک دیوار کی طرف دیکھنے لگی .... پالی اس کی ہونٹوں کی مسکراہٹ سے سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھابی تم جان بوجھ کر مجھے ٹوک رہی ہو؟"

"ہے ہے یہ اپنی بیٹھے بٹھائے ——— ؟"

"دیکھو تو جان بوجھ کر ادھر ادھر کی ہانکے جا رہی ہو۔"

"تم بھی تو ادھر اُدھر کی ہانک رہے ہو۔ تمہیں جو بات پوچھنی ہو صاف صاف پوچھو۔"

اس کے دل میں شک گزرا کہ ضرور بھابی کو آج کی بات کا علم ہو گیا ہے۔

بھابی نے پھر کہا۔

"اب تم ہی سے کوئی پوچھے کہ روز تو باتیں ہوتی ہی رہتی ہیں پھر آج یہ گول گول باتیں کیوں؟"

بھابی کی یہ بات بھی درست ہی تو تھی۔ جب اس نے خود شرما کر اصل بات پوچھنے سے کترانا شروع کیا تو بھلا بھابی اس کی جھینپ کا تھوڑا بہت لطف کیوں نہ اٹھائے .... لیکن وہ خود بھی تو لاچار تھا۔ اس کے دل میں چور تھا۔ تاہم اس نے راز افشا کرنے سے پہلے بھابی کے دل کی ٹوہ لگانے میں چنداں حرج نہ سمجھا۔

اسی دوران میں اس نے اپنے جوتے پر سے جالی اتاری اور اسے ایک جھٹکے سے پکڑ کر گھماتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو بتاؤ"

"پوچھو"

"وہ کہاں تھی؟"

"وہ کون"

"بھلی رہی .... یہ کیا مذاق ہے؟"

"وہی کون؟"

"سرفو، سرفو، سرفو"

پالی نے جھنجھلا کر یہ الفاظ اتنی زور زور سے کہے کہ اس نے زمین پر پھرتا ہوا ہاتھ روک لیا۔ اسے ڈر لگا کہ ضرور گھر کا کوئی فرد چھت پر سے جھانک کر دیکھے گا کہ آخر یہ سرفو سرفو کی رٹ کیا لگا رکھی ہے۔

تھوڑی دیر تک وہاں ادھر کسی قسم کی کوئی آہٹ نہ پا کر اس نے قدرے ملامت آمیز نظروں سے پالی کی طرف دیکھا۔

پالی نے بچوں کی سی جھلاہٹ کے ساتھ دبی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"بھابی تمہارا بھی تو قصور ہے۔ مفت میں بات کا بتنگڑ بناتی ہو ...... پریشان کر دیا مجھے۔"

اس پر تاباں چپ ہو گئی اور منہ پھیر کر جلدی جلدی صفائی کرنے لگی۔

کچھ دیر تک تو پالی اس کی بات کا منتظر رہا۔ پھر اسے شک گزرا کہ مزید خفا ہو گئی ہے بھابی۔ چنانچہ وہ بچوں کی طرح دونوں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ دیکھا تو واقعی منہ پھولا ہوا تھا۔

تاباں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ وہ بھی اچک کر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالمقابل لے گیا۔ تاباں اپنے چہرے سے منہ کو ادھر اُدھر حرکت دیتی رہی۔ لیکن پالی کا چہرہ بھی ادھر اُدھر پہنچ جاتا ...... آخرکار تاباں کے منہ سے ہلکی سی ہنسی نکل گئی۔ یوں بڑے بھائی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ بزرگ ہی بن بیٹھی تھی مگر مزاج میں تو بچپن ہی تھا۔ "ہٹ پاگل" بولی۔

پالی نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ بڑھا کر انگلیاں اس کی ہلکی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دیں۔

"اچھا بھابی غصہ تھوک دو۔"

"پیچھے تو ہٹ .... آدھی رات کو کوئی بھی اس طرح دیکھ لے تو کیا معلوم کیا سمجھے ......"

یہ کہہ کر وقتی اس نے اپنا منہ بند کر لیا۔ اور پالی حسبِ عادت اضطراری انداز سے پیچھے ہٹ کر چھت کی بالشت بھر اونچی دیوار پر بیٹھ گیا۔

"تم ہی تو بات بے بات پر روٹھ جاتی ہو۔"

"تم چاہتے ہو ہنستی رہوں۔"

پالی نے انگلی سے ابروؤں کا پسینہ جھٹک کر کہا۔

"تم ہی تو ......"

"تو کیا اب ہنس کر جواب بھی دوں؟"

"تو بھابی میں نے کون سے پھول برسا دیئے؟"

"گلا پھاڑ کر جو چلاتے تم ......"

"اچھا بھابی دیکھو ادھر ......"

تاباں نے دیکھا کہ وہ بچوں کی طرح دونوں ہاتھ باندھے بڑی مسکین صورت بنائے بیٹھا ہے۔

بھابی نے دیور کی یہ صورت دیکھی تو مسکرا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

صلح ہو گئی تھی لیکن بات ازسرِ نو شروع کرنے کے لئے کسی گفتگو یا تمہید کی ضرورت تھی۔

تاباں نے چائے والے گڑ کی ہنڈیا اس کے گلے سے بندھی ہوئی رسی سے پکڑ کر اوپر اٹھایا۔ غالباً وہ چیونٹیوں سے اٹے ہوئے حصے پر پانی ڈالنے کے خیال سے اٹھی تھی۔ پالی فوراً تڑپ کر اٹھا اور جھپٹ کر ہانڈی اس سے پکڑ لی۔

"واہ بھابی بہت چلتی ہو۔"

تاباں نے چپ چاپ ہانڈی اس کے حوالے کر دی۔

پالی نے جلدی سے پہاڑی کوے کی طرح چونچ اونچی کر کے بھابی کی طرف دیکھا اور مصنوعی تفاخر سے بولا۔

”بھلا بھابی ہمارے ہوتے ہوئے تم گھر کی ذمہ داری اٹھاؤ گی .... اگر اٹھاؤ گی بھی تو کیا ہم اٹھانے دیں گے؟“

اب وہ کوٹھے کے سامنے صحن چاندنی میں آ گئے تھے۔ بانو بڑی حساس عورت تھی بچپن ہی سے وہ محبت کی بھوکی رہی تھی۔ اس لئے پیار اور اخلاص کی چھوٹی سی بات پر وہ موم کی طرح پگھل جاتی۔

چنانچہ پالی کی حرکتوں اور باتوں کا اس کے دل پر بہت ہی خوشگوار اثر ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ خفا ہی کب ہوئی تھی۔ وہ تو محبت کا روٹھنا تھا۔ اسے پیار کی چھیڑ چھاڑ کہیے اور اگر پالی اسے منانے کی کوشش نہ کرتا تو تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی اسے منا لیتی۔

وہ پیڑھی سے اٹھ کر بڑے سلیقے سے چٹائی کرنے لگی لیکن ایک دو ہاتھ مارنے کے بعد دیکھا کہ اینٹیں ابھی بھی کچی ہی ہیں اگر گرد کی تہہ نہ جمی تو اینٹیں ڈھیلی رہیں گی اور اس کی صورت ہی گھل ہی سکیں گی۔

پالی نے دیکھا تو بول اٹھا۔

”بھابی بیٹھو نا گھر چمک اٹھے گا“

”یہ تو مصیبت ہے کیا کروں۔ سوچا تھا جلدی سے اس پر بھی چٹائی کر دوں گی ....“

وہ بات ختم بھی نہ کر پائی تھی کہ پالی وہ ٹوکری جس کے تاریک کونے سے کھرپا اٹھا لایا اور اینٹیں کھرچنے لگا۔

”میں یوں ہی کھرچتا چلا جاؤں اور تم چٹائی کرتی چلی جاؤ .... دیکھو ابھی دم کے دم میں سب کام ہو جائے گا ....“

آج اس طرح پالی کا اس قدر انہماک سے کام کرنا بانو کو بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ چٹائی کرتے کرتے سوچ رہی تھی کہ اب پھر کسی نہ کسی طرح سرور کے گھر کی بات چیت شروع کر دینی چاہئے۔ محض پالی کی خاطر ہی۔

”اب تو سرور بھی بہت کام کرنے لگی ہے۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ آج وہ مدرسہ گاؤں میں گئی ہوئی تھی۔ پہلے تو بڑی مشکل سے اسے سمجھانا پڑتا تھا۔ اب وہ خود بخود ہی چلی جاتی ہے .... جب تم دونوں کی شادی ہو جائے گی تو پھر تم ادھر ادھر مارے مارے نہ پھرا کرو گے۔ بس جو روٹی وہ بنائے گی وہی کھاؤ گے بھاگ بھاگ کر ....“

اب گویا بانو نے پھر سے وہ باتیں کہہ کر دیور کا دل خوش کر دیا تھا۔

پالی کے چہرے پر ہنسی بکھر پڑی لیکن پھر اسے شام کی کوئی بات یاد آ گئی۔

”اچھا تو پھر باتیں وتیں ہوتی رہیں خوب؟“

”ہاں گھر کے سب لوگ تھے نا“

”اور سرور؟“

”وہ بھی بیٹھی رہی تھی .... لیکن ہم دونوں کو اکیلے میں بیٹھنے کا موقع نہیں ملا“

”پھر بھی ـــــ وہ باتیں تو کرتی ہوگی؟“

”ہاں ہاں .... تو کیا بات بھی نہ کرتی“

”میرا مطلب ہے تم سے بھی باتیں کرتی رہی تھی؟“

”ہاں کیوں نہیں بھئی“

پالی ابھی تک ذہنی تذبذب میں تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ بھابی کو شام کے قصے کا علم تھا یا نہیں۔

”کیا بات کہی تھی اس نے“

کی روہ سنو ...... میں پوچھ کر وہ ہنسنے لگی۔ "تو کیا اب مجھے اس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات یاد ہے .... گھر کے سبھی لوگ بیٹھے تھے۔ سو تیری سو بھی بیٹھے بھی سبھی اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اب میں کیا جانوں کس نے کیا کہا۔ ارے کوئی ہے بھی ایسا جو سب باتیں یاد رکھ سکے۔"

"بھیا سب کو تو نہیں ...... سرونی کی باتیں پوچھ رہا ہوں ......"

"ہائے ہائے ...... پگلا ہے پگلا۔"

بالی کھل کر ہنسنے لگا۔

"بس یہی کہ سب بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور سرونی بھی بولتی رہی ...... اور کیا کہوں۔"

"کیا باتیں ...... یہی بس گپ شپ۔"

"سرونی کی ماں کہنے لگی اب کے چلیں گے امرت سر صاحب دیوالی دیکھنے کے لئے۔"

"کب۔"

"اب کے ...... جب دیوالی آئے گی۔"

"کب ہوگی دیوالی۔"

"ابھی تو ڈھائی تین مہینے پڑے ہیں ......"

"تو تم بھی جاؤ گی۔"

"میں کیا ...... تم بھی چلو گے ماں کہہ رہی تھی ......"

"اچھا تو ......"

"ہم سب مل کر چلیں گے؟! ہر سال تو ہم جاتے ہیں۔ وہ کہتی تھی اب کے تو بالی بھی آ گیا ہے اور رونق رہے گی اس کے ساتھ ......"

"تو کیا اس نے یہ بات بھی کہی تھی۔"

"ہاں۔"

"نہیں ...... مجھے خوش کرنے کو کہتی ہو۔"

"نہ تو۔"

بالی خوش ہوا۔

"اور وہ یہ بھی کہتی تھی ...... ہاں بھئی وہ تو گلہ کرتی تھی کہ بالی ہمارے ہاں آتا نہیں ...... کچھ کھچا رہتا ہے۔ ہم تو اسے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں لیکن نہ معلوم اس کے دل میں کیا بات بیٹھ گئی ہے ......"

بالی نے خوش ہو کر بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کر لیں اور حیرت سے بھابی کی طرف دیکھنے لگا۔

"سچ بھابی ...... نہیں!"

"ہاں ہاں ہاں ...... اسے تو تیرا بہت ہی چاؤ ہے۔ مجھ سے کہنے لگی کہ اسے ہمارے گھر بھیجا کر ...... میں نے جواب دیا ...... پر بالی کو بھی آپ لوگوں سے بڑی محبت ہے نہ۔ مگر آپ ہی ہو آتا نہیں ...... گھر میں بیٹھا کر تم لوگوں کی بہت ہی آؤ بھگت کرتا ہے۔ کہتا ہے مجھے سرونی کی ماں بہت اچھی لگتی ہے ......"

سرونی کی ماں اچھی لگنے کی گپ سن کر بالی دل ہی دل میں بڑا شرمندہ ہوا اور اس نے جب سر اٹھا کر بھابی کو دیکھا تو وہ شرارت آمیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"دیکھو نا ...... میں نے اسے یہ نہیں کہا کہ اسے مرزی ابھی لگتی ہے بلکہ مرزی کی ماں ابھی لگتی ہے ......"

پالی بھابی کی سیاست دانی کا قائل ہو گیا۔

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"کہنا کیا تھا۔ جلدی جلدی پنکھا جھلتے ہوئے کہنے لگی" واری جاؤں میرا بیٹا جو ٹھہرا ___ تجھے کیا بتاؤں تاباں ___ ننھا سا تھا ...... ہے بس اتنا سا ...... ہم نے اسے کھلایا گود میں ...... اسے جانو نہ ہو۔ دل سے واسوں کرتا ہے نا! میں بھی تو اس کی ماں ہی ہوں۔ مقدور کی بیری ادھر ہیں۔ اور تاباں تو کیا جانے جب وہ کالکھے بھاگ گیا تو ہماری ستاں ایسی ستائی ہی روئی ہوں ...... یہ کہہ کر وہ آنچل سے ناک پونچھنے لگی ......"

پالی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اچھا! بھابی کچھ ......"

"اب میں تجھے کیسے لکھیں دکھاؤں؟"

"تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں میرا بہت خیال ہے ...... کیوں بھابی!"

"اور کیا! انہیں تیرا خیال ہے؟"

"اچھا تو دیوالی پر مجھے بھی ساتھ لے جاویں گے"

"ہم ہر سال جاتے ہیں؟"

"میرا مطلب ہے اس کے ساتھ؟"

"ہاں ...... چاہے جب کا ساتھ ساتھ؟"

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا معلوم ہوتا ہے ابھی مرزی نے اس کی شرارت کا ذکر ماں سے نہیں کیا۔ نہیں تو وہ ایسی پریم بھری باتیں نہ کرتی۔ شاید بیٹے سے ڈر ہو یا نہ ہو ...... یا اسے غصہ چڑھا ہوتا تو لڑنے پر تیار ہو جاتی۔ لیکن اگر اب بھی مرزی نے بتا دیا تو پھر سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ مفت میں بھیج دیا اس نے۔ آخر اتنی بے صبری کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اس نے کئی مرتبہ تہیہ کیا تھا کہ وہ مرزی کے ساتھ بات چیت کرتے وقت زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا لیکن جوانی غضب کی گھوڑی ہوا سے کون روک سکتا ہے۔ نہ معلوم اس کے سر پر کیا جنون سوار ہو گیا تھا۔ کاش آج کی شام وہ رک جاتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کا کام رفتہ رفتہ ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اگر وہ انکار کرتی حالات ہی ایسے پیدا کر دیئے تھے۔ وہ دونوں اتفاق سے مل گئے۔ گاؤں کا گوشہ سنسان۔ اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ عقل نہ ملکی دل قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اور پھر لمحہ بھر میں اس نے اسے پکڑ لیا۔ اسے کوئی سدھ بدھ نہ رہی۔ واقعی اس کے ہوش ٹھکانے نہ رہے تھے۔ اتنا دل سے وہ صبر کر جاتا تو اب کیا مشکل تھی۔ کاش وہ گلی میں نہ ملتے یا نزدیک کوئی آدمی شور مچا دیتا یا چھپتا چھپاتا دکھائی دیتا۔ تو بھی وہ ایسی جرأت نہ کرتا۔

پالی سنگھ کا چہرہ بھی اس ذہنی کشمکش کی وجہ سے اتر گیا۔ آنکھوں میں گھبراہٹ کی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ تاباں کو کچھ شبہ ہوا۔ پالی نے یہ دیکھتے ہی بات بدلنے کے لئے کہا۔

"اچھا تو مرزی بھی باتیں کرتی رہی؟"

"ہاں وہ بھی تھی؟"

"تو وہ بھی خوش ہوئی ہوگی؟"

"ہاں خوش تو تھی"

تاباں کی حیرت کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ پالی نے محسوس کیا کہ وہ دل کی کیفیت کو زیادہ عرصے تک نہیں چھپا سکے گا۔ اس نے نظریں ملاتے مسکراتے

ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے۔" اس نے ...... "اس کا مطلب کچھ گڑبڑ ہوا تو نہیں ...... تجھے کچھ بھی دکھائی دیا یا نہیں؟"

بھابی کو اپنی جانب مشکوک نظروں سے تاکتے دیکھ کر پالی نے پھر کھرپا سنبھالا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ تاباں بھانپ گئی کہ وہ جان بوجھ کر اس سے آنکھ ملانے سے کترا رہا ہے۔ ادھر پالی کا ہاتھ بھی رکا تھا ادھر تاباں کا ہاتھ چلتے چلتے رک گیا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔

"کیوں رے پالی! کیا بات ہے؟"

پالی نے سر اوپر اٹھایا۔

"بات؟" اس نے دلی جذبات کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھ میری آنکھوں میں دھول مت ڈال۔"

"وہ کیا کہتی ہو؟"

"دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔"

پالی چپ رہا۔

"مجھ سے چھپانے سے تمہیں کیا مل جائے گا؟"

پالی نے کھرپا ہاتھ سے رکھ دیا۔

"وہ تم تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔"

جواب میں تاباں کے لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔

اب پالی نے ہار مان لی۔

"اچھا اب بتا رے پالی! کیا بھید ہے؟"

"تو کیا بھابی تمہیں کچھ خبر نہیں؟"

"نہیں۔"

"دھرم سے کہتی ہو؟"

"ہاں بھئی دھرم سے کہتی ہوں۔"

پالی نے چونک کر بے یقینی سے بھابی کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال تھا تمہیں پتہ چل گیا ہوگا۔"

"بھلا وہ کیسے؟"

"سرداروں کی جھالی"

"نہیں مجھے کچھ نہیں بتایا اس نے۔"

پالی نے اچٹتی ہوئی ایک نظر بھابی پر ڈالی۔

"آج شام میں نے اسے چھیڑ دیا تھا نا؟"

کچھ دیر کے لئے سکوت طاری رہا۔ تاباں شاید اس بات کی منتظر تھی کہ وہ خود ہی سارا واقعہ کہہ سنائے گا۔

پالی مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا۔

"تو کیا کہہ دیا تو نے اسے"

"میں نے جناب کے طریقے کے مطابق اسے روک لیا تھا۔"

"پھر اور"

"اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔"

"بس؟"

"اسے اپنی طرف کھینچا"

"بس؟"

"میرا خیال ہے میں نے چوما!!!"

"کہو"

"جہاں کی جوا چھاتی سے لگایا تھا۔"

پالی زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ معلوم کرنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ اس کی بھابی کے چہرے پر اس کا کیا رد عمل ہوا ہے۔ لیکن اس نے سوچا اب چھپانے کی بات تو کوئی رہی نہیں کیوں نہ اس اہم واقعہ پر تبادلۂ خیال کر لیا جائے۔

"میں ڈر رہا تھا کہیں سرلا نے اپنی ماں کو نہ بتا دیا ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ نہیں تو کیا اب تک اس کی ماں تم سے ایسی پریم بھری باتیں کرتی بھلا"

تھوڑے سکوت کے بعد بولی۔

"نہ جانے ابھی کچھ سمجھتی ہی نہ ہو ...... شاید رات کو کہہ دے گی۔"

معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بھابی اس بات پر زیادہ فکر مند نہیں تھی۔

"کسی اور نے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں"

"تمہیں اچھی طرح یقین ہے؟"

"ہاں ...... لیکن وہ اپنا جناب ہے نا اسے پتہ چل گیا تھا۔"

"کیا سرلا کو بھی معلوم ہے کہ جناب نے تم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ لیا ہے؟"

"نہیں اسے کچھ معلوم نہیں .... وہ تو زینے کا کھٹکا سن کر بھاگ آئی تھی۔"

"پھر"

"اور پھر جب وہ چلی آئی تو جناب نے دیوار پر سے سر نکال کر میری طرف دیکھا۔"

"جناب کی فکر نہیں وہ بڑا شریف ہے کسی سے نہیں کہے گا۔"

"میرے دوستوں کو اس نے ہی تو بتایا ہے کہ ہم دونوں کا پریم ہے لیکن اصل بات نہیں بتائی۔"

"ہاں تو فکر کاہے کو کرتا ہے۔ یہ پریم ویم کا کیا تو سبھی کا چلتا ہے۔ اصل بات معلوم نہیں ہونی چاہئے۔ جناب بہت شریف آدمی ہے .... بیچارا کسی کی برائی نہیں کرتا اور پھر تیرا تو وہ استاد ہے اس سے ......"

بات بنتی دیکھ کر پالی کا حوصلہ استوار ہونے لگا۔

"لیکن بھابی پھر کباب کا نہیں .... مرغوں کا ہے وہ کمبخت ہی بنا دے بھابی ماں کو ...."

"وہ" تاباں نے ہاتھ کو جھٹکا جو دیا تو گھڑے کے چند چھینٹے پالی کے چہرے پر بھی آن گرے۔ "بھلا شیانی لڑکیاں بھی ایسی باتیں ماں باپ کو کہتی ہیں۔ بھولی بھالی لڑکیاں اپنے ڈھکے چھپے بھیدوں کا بھانڈا خود ہی نہیں پھوڑ دیا کرتیں۔"

"سچ بھابی؟"

پالی کی باچھیں مارے خوشی کے چرنے لگیں۔

"اور نہیں تو کیا؟"

پالی کے سینے پر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

"اچھا تو اس کی بات چیت کرنے کا ڈھنگ کیسا تھا؟"

"مردوں کی طرح"

"کوئی جھجک نہیں تھی؟"

"نہیں تو؟"

"بھابی کیا بتاؤں میں تو بہت ڈر گیا تھا۔ یہی سوچ رہا تھا کہیں نے کمبخت ہی اپنا بنا بنایا کام بگاڑ ڈالا ہے۔"

"پگلا جو ٹھہرا .... ارے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اتنی عقل بھی نہ آئی۔ اور یہ بچارے کو زندگی میں عورت کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا بھلا ایسی باتیں کیسے سمجھے گا؟"

بھابی کی اس غلط فہمی پر پالی نے دل ہی دل میں خوب ہنسیں بجائیں۔ وہ ہر جواں عورت کو تاک سکتا تھا۔ لیکن حریف مشکل سے پالا نہیں پڑا تھا اسے پہلے کسی عورت سے محبت نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو کام چلاؤ محبت کا قائل تھا لیکن مرغوں کا مسئلہ ٹیڑھا تھا اور پھر وہ اسے اپنی وہ گرگئی جنم ساتھی ابھی بنانا چاہتا تھا۔ کچھ ایسی پیچ در پیچ باتیں تھیں جو نا اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ ورنہ وہ کبھی کا اس جھنجھٹ سے چھوٹ گیا ہوتا۔

تاباں نے سمجھا کر دیر پھر فکرات میں ڈوب گیا ہے۔ بچارا جو اس نے بڑے ملائم انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مرغوں تو سمجھتی ہے کہ اس بھید کو دنیا میں کوئی نہیں جانتا بس ایک تم جانو یا وہ جانے۔ سب سے بڑا عقل سے سوچ کر وہ خواہ مخواہ اپنی بدنامی کیوں کرے۔ آئی میری بات سمجھ میں؟"

اس پر پالی چہک کر بولا۔

"سچ کہو بھابی! تو میں نے اس سے کیا پوچھا؟"

یہ کہہ کر وہ اس کے قریب کھسک آیا۔ اور اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ دئے۔ "تو بس دیکھیں میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ دھرے اور پھر جوا سا کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔"

"ہٹ رے" بھابی نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا پھر مسکرانے لگی۔ "دیکھو تو منہ پر داڑھی آگ آئی ہے اور .... اور یہ آدھی رات کے بالکل چوروں کی طرح ہم دونوں کو دیکھ لیتا تو پھر ......؟"

پالی پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھا تھا دھم سے گھاس پر لوٹ گیا اور بھابی کو یقین دلانے کے انداز میں بولا۔

"سچ بھابی! ایسی الٹی سیدھی بات تھی .... اب تم جو کہو میں نے زور سے ساتھ کھینچ مارا اسے ......"

"بیاہ کرنی تو ہے تیری؟"

"بیاہ کرنی کیسی"

"اور جو کوئی دیکھ ہی لیتا؟"

"کون دیکھ لیتا"

"کوئی بھی دیکھ لیتا"

"تو پھر کیا"

"سارے گاؤں میں تماشا ہو جاتی یہ بات"

"کیوں تماشا کیسے ہو جاتی میں بھاوج کو ہی دم نکال دیتا گلا گھونٹ کر ......"

کاماں آنچل میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔

"تم تو مر کے ہی مرو گے"

"اچھا بھابی تم ہمیں ہمیشہ مرکے ہی کہتی ہو ——— کیا میرے ڈیل ڈول میں بالکل ہی بھس بھری ہے؟"

"بھئی اب تم سے بحث کون کرے اب جاؤ سو جاؤ۔ دیکھو یہ ذرا سی بات کا جھگڑا بنایا۔ باتوں باتوں میں مجھے کام بھی ختم نہیں کرنے دیا ......"

"کام ہی کیا ...... ہم نے اتنا کام کر دیا۔ ایک تو رات جاگیں دوسرے گالیاں بھی کھائیں ......"

"اچھا بھئی اچھا ...... جا تیرا بھلا ہو ...... تیری کھاٹ بچھا دی ہے میں نے جا کر سو رہو۔ صبح تڑکے سارا سامان لادنا ہو گا پڑاؤ اٹھانا ہے گاؤں پہنچنا ہے؟"

"نہیں بھابی جی چاہتا ہے آج تو رات بھر باتیں ہی کرتے بیٹھے رہیں؟"

پاس کھسکتے ہوئے بولا۔

"اب سو جا بھی جا جو ماں کی آنکھ کھل گئی تو چلانے لگے گی گاؤں بھر کو خبر ہو جائے گی ......"

اتنے میں چوکیدار نے ایک ہانک لگائی "جاگتے رہیو ہو"

"نہیں بھابی ساتھ ساتھ چلیں گے اب ...... اب کام ہی کیا ہے ختم تو ہو گیا؟"

کاماں نے جب [illegible]۔

پالی نے ساری کی ساری ٹانگیں سمیٹیں اور بھابی کے قریب کھسکتے ہوئے بولا۔

"ہاں بھابی ایک اور بات سناؤ؟"

"کیا بات ...... سنا تو دی سب"

"اچھا تو اب کے امرتسر کی دیوالی دیکھنے کا ارادہ ہے؟"

"تو اب پھر سے لڑائی چھیڑ بیٹھے؟"

"نہیں بھابی جو آگے گئے تو گاؤں میں سے امرتسر کی دیوالی دیکھی ہی نہیں۔"

"ہائے اللہ! تو پھر بھول ہی گئی۔ ہاں ہاں تو تو چھوٹا سا ہو گا تجھے امرتسر کی دیوالی یاد ہی کیا ہو گی؟"

"ہاں دیکھی تو جب سا ہوں؟"

"تو نے امبرسر تو دیکھا ہی ہو گا؟"

"اب کے آیا تو دیکھا۔ پہلے کا مجھے بہت اچھی طرح یاد نہیں۔ تھا تو میں بہت چھوٹا تھا جب ماں مجھے ویساکھی پہ لے گئی تھی۔ پھر جب بڑا ہوا تو امبرسر دیکھا۔ امبرسر مجھے تھوڑا تھوڑا یاد تھا لیکن ویساکھی بالکل نہیں یاد......"

"ارے واہ پھر تو نے کیا دیکھا۔ کیا باتیں رہ جاتا ہے۔ ویساکھی دیکھے گا تو پھر کہے گا۔ ایسی رونق ہوتی ہے ایسی رونق ہوتی ہے کہ کیا بتاؤں؟"

"پھر ہو"

"بس رونق تو بیساکھی کی یا دیوالی کی دیکھے آدمی"

"اچھا...... بھائی میلوں کی باتیں تو یاد ہیں مجھے...... جب ماں زندہ تھی ہر سال لگن کی کرتا تھا۔ اب کے میرے پاس گھوڑا ہوتا تو میں بھی اسے کو دوڑاتا ہوا جاتا سنگ پر......"

"تو نے کلکتے میں دو کروڑ روپیہ بھی کمایا......"

"کیا تو بھائی!......"

"پھر؟"

"سب جھوٹ"

"تو گھوڑا کہاں سے آئے پھر" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔ "ماں سے کیا تو نے سرتوں کی ماں سے کہا تھا کہ اب میں یہیں گھر بساؤں گا؟"

پال سنگھ نے زمین پر زور ڈالا۔

"اور ماں کیا تو تھا پہلے روز جب گیا تو...... اچھا کیا کچھ کہتی تھی؟"

"یہ کہتی تھی کہ پالی تو یہیں گھر بسا لے کہیں۔"

"پھر تو نے کیا کہا"

"میں نے کہا گھر بسے گا......"

پال چپ سا ہو گیا۔

"کہنے لگی پاس والے گاؤں کے نمبردار کا لڑکا کمشنری ہو گیا ہے۔ بچپن کا ساتھی تھا وہ بھی گھر ماں کا تھا۔ پھر سب میں پڑھنے لگا پھر کمشنی ہو گیا اب سرکار میں بڑا عہدہ پایا ہے اور سرکار کا حکم و قتل دکھاتا ہے۔"

"پھر اس بات کا مطلب کیا......" پال نے ماتھے پر بل ڈالے۔

"کیا جانے کیا مطلب تھا......"

"اور یہ صدر نمبردار کا لڑکا کون ہے"

"وہ، وہ کیا بھلا سا نام ہے...... ہے...... پرتھی پال سنگھ"

"تو نے دیکھا ہے اسے"

"ہاں وہ ایک بار دیکھا ہے...... بڑا ہی خوب صورت ہے۔ کیا پیارا رنگ لگتا ہے جیسے صورت......"

پال کو پرتھی پال سنگھ کی یہ تعریف پسند نہ آئی۔

"پر بھائی میں نے تو سنا ہے یہ پرتھی پال سنگھ بڑا بدمعاش ہے...... عورتوں کو خراب کرتا ہے۔"

"بالکل ہی جانے ...... شکل سے بڑا بھولا دکھائی دیتا ہے اور جب بولتا ہے یا ہنستا ہے تو کیسی کی سی ہوتی ہے اس کی۔ اور وہ اس رات کو یہ پیچھے تھا پورے [illegible] گھر رہا تھا ...... اب جو آیا تو ترنگ آگے پیچھے گھومتے تھے ......"

"پھر تو بھابی اس حضور کی رہیں ......"

"اسے بیچاری اس سے کیا بیر ہے"

"بھابی تم ان پڑھے لکھوں کی باتیں نہیں جانتی۔ بڑے بدماش ہوتے ہیں یہ لوگ —— بس اوپر کی ٹیپ ٹاپ ہوتی ہے۔"

"جو ہو سو ہو ...... بیچارے نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا۔ ہر کسی سے ہنس کر بولتا ہے۔ ایک بار میں ان کے گاؤں میں گئی تو وہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھا اور رک گیا۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ اتنا جوان آدمی اور یہاں ہیں ...... دونوں ہاتھ جوڑ کر پہلے اس نے ست سری اکال کہی اور پھر ہنس کر بولا 'آپ کی دعا ہیں ...... ہم پہلے بھی مل چکے کہیں' اس مجھے جانا تھا ...... میں تو بالکل ہی نروس ہو گئی۔ میں چپ رہی۔ 'آپ سردار زیل سنگھ کے ہاں تھیں' —— اس ان مجھے ایسے یاد تھا ...... بیچارہ مجھے آپ کہہ کر بلاتا تھا؟"

"تو کیا وہ زیل سنگھ کے ہاں بھی جاتا رہتا ہے؟"

"ہم نے تو ایک ہی بار دیکھا ہے پر یہی کبھی کبھار آتا ہو گا۔ گاؤں میں جو کوئی نیا آدمی آئے تو پتہ چل ہی جاتا ہے نا"

"کیا اس نے بہت سی پڑھائی کی ہے؟"

"ہاں سنتے ہیں ڈیڑھ ہزار تنخواہ پاتا ہے۔"

"اجی اتنی تنخواہ تو لاٹ صاحب کی بھی نہیں ہوتی؟"

"اب جانے میں کیا جانوں ان باتوں کو۔"

پھٹی پال سنگھ کا راز جیٹھ نے پر بالی ذرا کچھ سوچ میں ڈوب گیا۔ مبہم سائے اس کے ذہن میں گھومنے لگے۔ اسے اس بات کا تو علم بھی نہیں تھا کہ وہ سرداروں کے ہاں بھی جاتا رہتا تھا اور نہ معلوم وہ بھی سرداروں سے شادی کرنا چاہتا ہو لیکن وہ شادی کیا کرے گا۔ پڑھا لکھا چھیلا تو کسی میم کو پھانس لے گا یا کسی پڑھی لکھی لڑکی سے بیاہ رچائے گا جو گٹ پٹ گٹ پٹ کرے گی۔ بھلا سرداروں میں کیا دھرا ہے۔ صورت اچھی بھی ہے تو آخر دیہاتی ہی تو ہیں۔

"کیا سوچ میں پڑ گئے ہو" بھابی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں"

"نہیں کچھ تو ہو گا"

بالی کھڑے سے ساری چیزیں کر چکا تھا اب وہ چوکے کی تختی کی دیوار پر جسے آرام سے ٹیک لگا کر بیٹھا پھر اس کے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

"اچھا تو تمہیں چھیلا پسند آگیا ہے؟"

کانو نے ماتھے پر بل ڈال کر اس کی طرف دیکھا اور شرارت بھانپ کر تاؤ میں آگئی۔

"مجھے کیوں پسند ہو؟"

"خود کہہ رہی تھی نا؟"

"میں کیا کہہ رہی تھی ......"

بالی نے بات ٹال دی

"دیکھو کیا ڈھب صورت ہے۔ جتنا ہنستا ہے تمہیں آپ کہتا ہے اور رستے میں کھڑا ہو کر تم سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے؟"

"تو مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا"

"بھئی دل چاہتا ہے"

"دل کی کیا بات"

"اس نے دیکھا ہو گا کیسی پیاری لڑکی ہے ......"

"ہوں"

"یہ ٹھوڑی بھی پیاری پیاری چندھی آنکھیں ......"

"ہائے ......"

"ہائے کیا"

"تو اپنی صورت تو دیکھ"

"میری صورت کو کیا ہے"

وہ دونوں کچھی والی بچیوں کی طرح لوٹنے لگتے تھے۔ جمیلہ نے منہ چڑا کر کہا۔

"یہ ہوا پاس"

"برائی کیا ہے"

"بڑے بڑے کان ہاتھی کے سے"

"تجھ سے بھی بڑے؟"

"یہ چوڑا منہ بیل کی طرح سر"

"اچھا جی؟"

"اور یہ بچے بہت ڈراؤنے"

"میری؟"

"کہاں سروپ اور کہاں تم چھچھوندر وتے"

"بڑی سروپ کی طرف داری ہو رہی ہے دل سے"

"ہاں نہیں تو میری سہیلی جو ہے"

"ہاں جی جیسا منہ ویسی چپیٹ"

"منہ سنبھال کر بولو"

"کیوں تیری سہیلی کی بے عزتی ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں"

"بڑی سہیلی تو دیکھو"

"کیسی پیاری ہے سروپ جیسے ریشم کا لچھا ...."

باجی نے منہ چڑایا۔

"ارے شرم کرو نامراد چڑاتے ہو اب"

"ارے میں پوچھتا نہیں کیا کسی کی"

"اچھا جی!"

"ہاں جی!"

"اور جو میری خوشامدیں کرتے رہتے ہو"

"کیا خوشامد کی میں نے"

"یہی کہ فلانی سے مت ملو — اس کا دل توڑ دو۔ تاکہ میری شادی ہو جائے اس سے"

"میرے جوتے سے"

"اچھا پھر یاد رکھنا"

"یاد رکھیں گے"

"پچھتاؤ گے"

"نہیں پچھتائیں گے"

"تم تو ناک رگڑو گے ناک"

"میں کسی سالے کے آگے ناک نہیں رگڑوں گا"

"اچھا یار اگر ہے تو پھر دیکھ لینا"

"کیا"

"میری بلا سے"

"بدبخت"

"اب تمہارے لئے کوئی کوشش نہیں کروں گی"

"ذرا دیکھیں ہم تو تمہارے لئے کریں گے"

"کیا منتیں"

"یہی سفارشیں کریں گے"

"تو"

"آنے دو چھٹیوں کو"

تاراں روہانسی ہو گئی۔

"کہنے لگا ——— بھولی بھالی صاحب آپ ہی اس عورت کے ماں باپ ہیں۔ اس کی چندھی آنکھوں کا کھیل نہ دیکھئے۔ چھاتی چیر کر دل دیکھئے آپ کے پر ہیں۔"

"ہٹ گئے بے شرم"

تاراں کی آواز بھرا گئی۔

"وہ کہنے لگا ——— مت رو رانی۔ مت رو میری گڑیا ——— میں یہیں کے جوتے بیچ کے اپنے گھر سے جاؤں؟"

تاباں نے اسے مارنے کے انداز میں ہاتھ اوپر اٹھایا۔ پالی شکاری کتے کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ "تم میری ایسی تیسی . . . . . . بچہ بچی . . . . . ."

تاباں آگے بڑھی۔ وہ پیچھے ہٹا۔ پھر جھگڑ پڑی گئی۔ پالی آگے ایک دروازے سے دوڑ کر میں جا گھسا اور دوسرے میں سے نکل آتا۔ اسی طرح آگے پیچھے انھوں نے تین چار چکر لگائے۔ پالی گھوڑے کی طرح ہنہنا کر ہنس رہا تھا اور تاباں کے منہ سے بڑے گندے گالیاں نکل رہی تھیں۔ آخر تھک کر وہ چولہے کی دیوار پر بیٹھ کر خوب زور زور سے رونے لگی۔

ستاراں جاگ اٹھی۔ اس نے کوٹھے پر سے پھاٹک کو دیکھا۔ "ارے کیا ہے"

پالی نے منہ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ "ماں بھابی کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے"

ستاراں نے نہ معلوم لیٹنے کو جانے کے بجائے یا کیوں جی نہ رہتے "یا مجرد یا مجرد" کا ورد کیا اور پھر سیڑھیاں اترنے لگی۔

اس کے آنے سے پہلے پہلے پالی نے جھک کر بھابی کے پاؤں کے قریب تک سے زمین پر تین چار لکیریں نکال دیں۔

چنانچہ تاباں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ اور پھر وہ اس کی دوا پھری کو جا اپنی پچھلے سے پھاٹک کر کے اوپر سے دو گھونٹ پانی پی لیا۔

سیاست الٰہیہ

امام ابن تیمیہ کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف اس سے پہلے بھی ایک بار اسی ادارے نے ہی پیش کی تھی اور یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی تھی کہ صرف دو مہینے کے اندر اندر پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔

اس کتاب میں قرآن اور احادیث کی روشنی میں زندگی کے ہر شعبہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ حاکمان وقت کے فرائض رعایا پر اور رعایا کے فرائض حاکم وقت پر، پوری تفصیل سے درج ہیں۔

قیمت -/۸/۲

ہماری داستانیں

اردو ادب کی سب سے دلچسپ صنف ہماری قدیم داستانیں ہی ہیں جو ہزاروں صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ان داستانوں سے ہر شخص لطف اندوز ہوا ہے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک نے اگر کوئی داستان شروع کر لی ہے تو دن رات لگا کر اسے ختم ہی کیا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی نے اسے بیچ میں چھوڑ دیا ہو۔ اتنی دلچسپ صنف ادب کے بارے میں اب تک کوئی کام کی تنقیدی کتاب نہ تھی۔ اس تصنیف سے نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں داستان کا خلاصہ کیا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس کا ادب میں کیا مقام ہے اور کیوں؟

قیمت -/-/۵

ادارہ فروغ اردو۔ لاہور

ہاون شرے کا سٹیشن

حجاب امتیاز علی

میں لندن سے کیمبرج جا رہی تھی کہ راستے میں ہاون شرے کے ویران سے سٹیشن پر گاڑی یکایک رک گئی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ انجن پٹری پر سے اتر گیا تھا، بارشوں کی وجہ سے مخدوش حالت میں ہے چنانچہ ٹرین یہاں تین چار گھنٹے ٹھہری رہے گی۔

وہ برسات کی ایک رات تھی۔ ابھی وقت بھی دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ بجلیاں خلاف معمول انداز سے کوند رہی تھیں۔ بادل وحشی مضطروں کی طرح گرج رہے تھے اور طوفانی ہوائیں کسی ناکام تمنا کی طرح سسکیاں بھر رہی تھیں۔ رات کے دو بجے تھے۔ اور ابھی کئی گھنٹے گاڑی کے چلنے کی امید نہ تھی۔ مسافر پریشانی کے عالم میں اپنی اپنی کھڑکیوں میں سے سر نکالے باہر کی شرابور تاریکی کو جھانک رہے تھے۔ بارش اکتا دینے والے تسلسل سے برسے جا رہی تھی اور رات کے سناٹے میں ہاون شرے کے چھوٹے سے ویران سٹیشن کی دیوانہ سی لالٹینیں تاریکی پر گیلی روشنیوں کے پھیلے ہوئے دھبے ڈال رہی تھیں۔ اس قسم کے حالات اور ماحول سے میرے اعصاب سخت متاثر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ [illegible] اعصاب کے لئے پہلے فرسٹ ایڈ سے ایک اعصابی گولی کھائی پھر بیٹھی کر دیر سوچا۔ اور سوچنے لگی کہ کیا کروں، زلفی کے ہاں جانے کا خیال دو ایک دفعہ ضرور آیا مگر طوفان باد و باراں بہت پست کر رہا تھا۔

جب بارش کی ٹپ ٹپ ذرا کم ہوئی تو مجھے پھر زلفی کا خیال آنے لگا اور سوچنے لگی کہ گاڑی تین چار گھنٹوں کے لئے ٹھہری ہے تو زلفی سے ضرور مل لینا چاہئے۔ اس کا گھر سٹیشن کے قریب ہی تھا کیونکہ اس کا شوہر ہاون شرے کے سٹیشن پر انجن ڈرائیور تھا۔ جی ہاں انجن ڈرائیور ——— ! شاید آپ چونک پڑیں مگر واقعہ یہ ہے کہ میری سہیلی کا میاں انجن ڈرائیور ہی تھا۔ یہ سب کچھ اس کے دل بیچارے کی کرتوت تھی۔ جی ہاں ——— کہ میری سہیلی زلفی ایک مشہور اور کامیاب مصورہ تھی۔ اس کے تصویر خانے میں اس کے کئی "ماڈل" آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ زلفی ایک نامعلوم شخص کو اچانک اپنا دل دے بیٹھی جو گزشتہ چند ہفتوں سے اس کا ماڈل بنا ہوا تھا۔ بعد میں تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ انجن ڈرائیور ہے۔ اب کیا ہو سکتا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ مرض لاعلاج ہو گیا تھا۔ اس لئے زلفی کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ صبر کی سل سینے پر رکھ لیں۔ تاہم اس عظیم طبقاتی اتحاد نے دوستوں اور زلفی میں تدریجاً ایک نامعلوم خلیج حائل کر دی۔ میں بحیثیت ایک آزاد خیال عورت ہونے کے اس سانحہ کو ذاتی طور پر دوسروں کے نقطہ نظر سے مختلف دیکھتی اور زلفی سے ملنا بھی پسند کرتی تھی

تاہم، زلفی جیسی اعلیٰ درجے کی مصنفہ خاتون کو ایک غیر شاعرانہ پیشے کے آدمی کے ساتھ وابستہ دیکھ کر مجھے سخت روحانی اذیت ہوئی تھی۔

اس واقعہ کو چھ سال گزر چکے تھے۔ پانچ سال تک ان صاحب (رقیب) نے زلفی کو خدائے محبت کے آگے مسلسل جھکائے رکھا مگر قریباً ایک سال پیشتر مجھے زلفی کا ایک خط ملا تھا جسے پڑھ کر میں انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔

میری پیاری

چھ سال گزر چکے۔ یہ خوابوں کا دور ہے۔ پانچ سال مسلسل دکھ کے بعد اب میں ادبی رسالوں کا چاند بننے کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ دو مہینوں کے غور و فکر کے بعد میں نے اور انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب ہمیں طلاق لے لینی چاہئے کیونکہ اب یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ یہ بات افسوسناک ضرور ہے مگر حقیقت یہی ہے۔ اس شادی پر زیادہ ماتم کرنا فضول ہے۔ ان سے جدا ہونے کے بعد کراچی میں اپنا نگار خانہ قائم کروں گی اور زندگی فنکاری کے جنون میں گزار دوں گی۔

تم مجھ پر ہنسو گی کہ پانچ سال کی کامیاب عشقیہ ازدواجی زندگی کے بعد یوں دفعتاً ایک دوسرے سے جدا ہونا کس قدر افسوسناک ہے جبکہ ہمارے دو بچے بھی ہیں۔ مگر موجودہ حالات نے ہمیں جدا ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔

محروم محبت زلفی۔

مکرر: ہماری طلاق کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ بلاوجہ ہم اس پر مجبور ہیں۔ ملاقات ہوئی تو تفصیل سے سناؤں گی۔

ز "

مجھے خط کا آخری حصہ بے حد پُراسرار اور پیچیدہ سا معلوم ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں انجن ڈرائیوری کے پیشے کو بددعائیں دینے لگی۔ کہاں محبت جیسی رنگین چمکیلی چیز۔ اور کہاں انجن کا کالا دھواں ——!

چھ سال پہلے ہم سب نے مل کر زلفی کو کتنا سمجھایا تھا کہ دیوانی! باز آ ——! اب اپنے کئے کی سزا بھگت رہی ہے۔ کہاں ادبی مضمونوں کی باذوق لڑکی اور کہاں —— " میں نے دانت پیستے ہوئے بڑبڑا کر اپنے آپ سے کہا۔

برسات کی اس بھیانک کالی رات میں جب میں اپنے رفیق سفر ایک سیاہ دوپٹہ اوڑھے [illegible] شال میں لپٹے ہوئے گاڑی سے [illegible] کے ویران سٹیشن پر اتری تو آسمان پر ساون کے موٹے موٹے بادلوں کے درمیان ابھرا ایک بہت بڑا ستارہ جھلمل کرنے لگا جیسے پکار پکار کر مسکرا رہا ہو کہ اب بارش کا زور ٹوٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اور سنسنی خیز حسینوں کی تعبیر بھی کم ہو گئی تھی۔

تھوڑی سی کاوش کے بعد جب میں زلفی کے دروازے پر پہنچی تو سوچنے لگی وہ یہاں ہو گی بھی! اگر ہوئی تو اتنی طویل مدت بعد —— میں اس سے کیونکر آنکھیں چار کر سکوں گی؟ میں نے اس کے خط کا جواب تک نہ دیا تھا اور وہ شادی کے بعد میرے کنارہ کش ہونے کو محسوس بھی کر رہی ہے!

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ بند دروازوں کے اندر سے نہایت مدھم آواز میں موسیقی کی لے مجھ تک پہنچی۔ اس دھن میں زلفی کی [illegible] آ رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید انجن ڈرائیور سے طلاق حاصل ہونے کے بعد تنہائی میں وہ یوں اپنی شب غم گزار رہی ہو گی۔ تو بے وقت راگ...... میں نے [illegible] کی خواہش کے دھوکے میں اندر سے کوئی میں چھوٹا سا لگا رکھا تھا۔ میں نے دروازے پر آہستہ سے اپنی دو انگلیاں بجائیں۔

موسیقی ختم ہو گئی۔ اور اندر سے آواز آئی "کون ہے؟"

میں نے ہمت کر کے کہا: "میں ہوں زلفی۔ میں —— [illegible]؟"

دروازہ کھل گیا۔ اور میں اندر داخل ہوئی۔ سب سے پہلے میری نظر ایک پالنے پر پڑی جس میں ایک شیر خوار بچہ عالم خواب میں مسکرا رہا تھا۔ بچے کی مسکراہٹ نے اندھیرے صحن پر ایک نور سا پھیلا رکھا تھا۔

زلفی مجھے دیکھ کر گزشتہ دنوں کی شکر رنجی بھول کر ہمیشہ کی طرح گلے سے لپٹ گئی۔ دیکھتے ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر [illegible] نہ جانے اسی طرح کتنی دیر

داستانیں، نامعلوم طور پر حافظے میں جاگزیں ہو گئی تھیں۔ وہ ہم کشتی کے سنہرے دن —— وہ کیپری کے چمکیلے ساحل —— وہ دن وہ راتیں!

پھر جب وہ بولی تو اس کی آواز میں ایک درد انگیز طنز تھا۔ "اس کال کوٹھڑی میں تم کیسے آ گئیں روحی؟"

گویا وہ ابھی بھولی نہ تھی کہ اس کی شادی کے موقع پر میں نے جل کر اس سے کہا تھا۔ "اس شخص سے محبت کر کے تمام عمر تم زندگی کے دھوئیں میں دم گھٹتی ہوئی رہو گی کسی کال کوٹھڑی میں —— !"

ابھی میں نے زبان بھی نہ کھولی تھی کہ اس نے دوسرا وار کیا۔ "میرے پاس تو تمہارے قابل کوئی نشست بھی نہ ہو گی میری پیاری!"

"کیا بکتی ہو —— " میں نے شرمندگی کے پیچھے ہو کر کہا۔ پھر اپنے سیاہ بیگ کو آگ کے پاس چوکی پر دھر دیا اور بولی: "کوئی بچھڑے سے بچھڑے دوست سے یوں سر کے ملتا ہے زلفی؟ تم نے رسم الفت ہی بھلا دی۔" زلفی نے ایک آہ سرد بھری اور بولی :—

سب سلیقے تھا مجھے گرہستی کا   وہ دل تنگیاں نہ گئیں

جو جگہ ہے تم صاحب بھی بیٹھ جاؤ روحی۔ یہ روشنی سے آتش دان کی وجہ سے بالکل خراب ہو گئی ہے۔"

اور جب زلفی موم بتی لینے اندر گئی تو میں خاموشی سے بیٹھے بیٹھے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

مختصر سا کمرہ —— سامان آسائش کا فقدان۔ اس کے باوجود حسن ذوق و سلیقہ برسر حال تھا۔ مثلاً خوبصورتی کی اور کوئی چیز نہ تھی تو کیا ہوا —— دریچے میں جو گلدان رکھا تھا اس میں ایک بیل تھا جس کی شاخیں اس انداز سے دیوار کی طرف لٹک رہی تھیں جیسے رخسار پر لمبے لمبے آنسو بہہ رہے ہوں۔ یہ طرز فکر ایک فنکار ہی کا ہو سکتا تھا۔ اور میرے سوا اسے دیکھ کر یوں شاید کوئی اور محسوس بھی نہ کرتا۔ مگر میں زلفی کے انقلاب زندگی سے کما حقہ واقف تھی۔ کمرے میں آگ جل رہی تھی۔ آتش دان کے اوپر عین درمیان میں ایک بڑی روغنی تصویر رکھی تھی جس میں ایک بے حد طرحدار حسینہ انگریزی طرز کے شکاری لباس میں کھڑی تھی ایک کتا اس کے ساتھ ہانپ رہا تھا۔ آپ کو علم ہے۔ میری تمام عمر کہانیاں سوچنے اور لکھنے میں گزر گئی۔ جہاں تک مصوری اور شکار جیسے مشاغل سے میرا دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ شکاری لباس مجھے ہمیشہ غیر شاعرانہ ہونے کی وجہ سے ناپسند رہا۔ مگر یہ تصویر اعلیٰ مصوری کا نمونہ تھی اور اس حسین مورت پر یہ لباس ایسے جچتا تھا جیسے چہرہ گل پر قطرات شبنم۔ لہٰذا میں بے حد متاثر ہو گئی اور بے اختیار اس حسن کی پرستش میں محو ہو گئی۔

زلفی کے واپس آتے ہی میں نے سوال کیا۔ "یہ تصویر حسن کس کی ہے؟ اس کی تابناک مسکراہٹ تو دیکھو، کتنے اس اندھیری رات کو روشن کر رکھا ہے؟"

زلفی نے نجانے کیوں مڑ کر مجھے دیکھا۔ پھر بولی "تمہیں پسند آئی روحی؟"

"کس بد مذاق کو پسند نہ آئے گا ایسا حسن! اگر تم دوزخ کے ڈرائنگ روم میں اس تصویر کو لگا دو تو وہ جگہ خلد بریں کہلانے لگی۔" میں نے تصویر کو مسلسل بار بار دیکھتے ہوئے کہا۔

زلفی بے حد متاثر نظر آنے لگی پھر بولی :— "یہ میرا تصوری آدمی ہے روحی! خواب کے جزیروں کی کاسنی کہانیوں میں —— اور شام کے گہرے شفق زاروں میں ہم ایک دوسرے سے ملتے اور محبت کرتے ہیں۔ یہ تصویر میں نے کھینچی تھی —— تاریخ تو یاد نہیں مگر اسے کئی سال ہو گئے ہیں۔"

میں محسوس کر رہی تھی بولی :— "نجانے بعض کوتاہ نظر یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ "فن برائے فن" نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ فن کا کوئی اور اعلیٰ مقصد ہونا چاہیے۔ فن کا سب سے بڑا اور پہلا مقصد یہی ہونا چاہیے کہ آدمی اسے دیکھ کر ایک سرور محسوس کرے۔ یہی فن برائے فن ہے کہ فن کے ذریعہ جس طرح انسان میں سکون اور اطمینان روح کا احساس پیدا ہو۔ تم اب تک تصویریں اتارتی ہو زلفی! وائے —— کہاں وہ تمہاری فنکارانہ زندگی۔ وہ مصوری کا عروج۔ وہ تمہارے شاہکار زمانے کی شہرت۔ اور کہاں یہ یہ —— لیکن لیکن —" میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

زلفی مسکرائی: "لیکن لیکن سے تمہارا مطلب ہے کہاں وہ شہرت و دولت اور کہاں یہ مختصر سا غریبانہ رہن سہن کا کمرہ؟ یہ جاننے کی پڑی ہے، ابھی شاید

کا بچہ ——— اور ———"

میں اس موضوع سے بے چین ہو گئی اور قطع کلام کر کے بولی۔ "تمہارا خط مجھے مل گیا تھا زلف ......"

مگر وہ بات کاٹ کر بولی: "مگر تم اپنے بچے کی خاطر ہی تھیں ——— ہزاروں مصروفیتیں ——— اور پھر تم آ گئیں اس فرنچ سٹیشن جیسی گمنام جگہ سے تھا ——— جہاں کوئی اعلیٰ عقلوں کی خاطر رہنا بھی پسند نہ کرے۔ ان صورت حالات میں بھلا تم کیسے جواب دے سکتی تھیں ورنہ؟"

میں شرمندہ سی ہو کر چونک گئی بولی: "مگر میں جواب بھی کیا دے سکتی تھی زلفی؟ تمہارا خط اتنا دردناک اور پیار سا دینے والا تھا ہم سب کو ——— یعنی ہماری تمام سہیلیوں کو بے حد صدمہ ہوا تھا۔ بھلا کون ایسی کوئی تمہاری مدد بھی بھلائی کر سکتا تھا؟ زبانی جمع خرچ کا کیا فائدہ؟ مگر زلف پیاری! مجھے علم تھا کہ ایک دن تم پر یہ کڑا وقت پڑے گا۔ کیونکہ طبقاتی امتیاز بہت بڑی چیز ہوتا ہے میری پیاری۔ تم جیسی اعلیٰ گھرانے کی لڑکی کسی مشہور شاعر، کسی نقاش، کسی مصنف کی بیگم ہی پر عاشق ہو جانا چاہئے تھا نہ کہ ———"

"ایک مفلس آدمی پر ——— جس پر عاشق ہونا تمہاری اونچی سوسائٹی میں ناقابلِ معافی گناہ سمجھا جاتا ہے" یہ کہہ کر زلفی عجیب تلخی سے ہنس پڑی۔ پھر بولی: "اگر میں چاہتی تو اب بھی کیا اس میں اپنے نگار خانے کے مقابل اسی قدیم عالیشان کوٹھی میں رہ سکتی تھی۔ مگر میں نے اس فرنچ کے ویران سٹیشن ہی کو اپنی سکونت کے لئے چنا یا اس لئے کہ پھر سے یہی تمہارا وہ جائے۔ محبت ہمارے نئے زمانے میں بھی کتنی منتقل ہو رہی ہے ورنہ؟"

میں قائل ہو کر بولی: "تمہارا خیال اور ہمارا یہ فقرہ قابلِ داد ہے زلف۔ تم نے بالکل سچ کہا۔" یہ کہتے کہتے میری نظریں بے اختیار اسی تصویرِ حسن پر جم گئیں جو اس طلاق رات کو بھی شام بہار بنا رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں زلفی کی مصورانہ تخیل پرستی اور جمیل خیال کی قائل ہو گئی۔ مگر تم اس بات کا تھا کہ واقعیت میں اس نے ایک غیر شاعرانہ آدمی سے محبت کر کے اپنی بوالہوسی کا ثبوت دیا تھا۔

"جمالِ حسن کو رنگ اور برش سے مزین کرنا آسان کام تھا زلف ———" میں پھر اس تصویر کی بے ساختہ تعریف کرنے لگی: "واقعی تم ایک عظیم فنکار ہو۔ پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم خود کو اور اپنا فن کیوں کھو بیٹھیں؟ ہم سب نے کتنا تمہیں سمجھایا تھا؟" (میرا غصہ بڑھنے لگا) "مگر تم ——— جانے تمہاری عقل کہاں چلی گئی تھی یا تم پر کیا افتاد پڑ گئی تھی ——— اب بتاؤ حالات کس منزل پر ہیں؟ آخر کیا اس وجہ کہ نگار خانہ کیوں نہیں دوبارہ کھول دیتیں؟ طلاق کے بعد کیسی گزر رہی ہے؟"

اسی وقت پردے کے پیچھے سے ایک ننھے بچے کے رونے کی آواز آئی اور وہ ادھر چلی گئی۔

میں چونک پڑی: "ارے یہ تم نے کہاں کہاں چھپا رکھے ہیں؟ تمہاری تصویر کشی کی مصروفیت میں یہ بچے کیا حارج نہیں ہوتے؟" ——— مگر میں نے مڑ کر دیکھا تو سامنے جھولے میں پڑا ہوا شیر خوار بچہ اپنے چھوٹے سے پیالی جیسے منہ سے بھی زیادہ پیارا معلوم ہونے لگا۔ اس وقت مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا کہ انسانی بچہ اور فطرت کی تصویر کشی کا بہترین شہ پارہ ہے۔

اتنے میں زلفی قہوے کی پیالی لے آئی اور کہنے لگی: "میرا جی تو چاہتا تھا کہ تمہیں ان اچھی بھلی سہیلیوں کی تصویروں میں قہوہ پلاؤں مگر کیا کروں اس میں بھی سلیقہ کی بچوں سے کام پڑا؟"

میں نے پیالی لوٹتے ہوئے اور اسے غور سے دیکھ کر کہا: "یہ بھی تمہاری مصوری کا ایک کمال ہے یہ پیالی۔ ہائے زلفی۔ تمہاری یہ صلاحیتیں دیکھ کر مجھے کس قدر صدمہ ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ تم نہیں لگا سکتیں۔ اچھا بتاؤ طلاق کے بعد تم پر کیا گزر رہی ہے؟"

وہ میرے قریب جھک کر ہنس کر بولی: "بڑے مزے سے گزر رہی ہے ورنہ؟"

میں جھنجلا گئی۔ "سنجیدگی سے اپنے مصائب بیان کرو۔ قہقہہ لگا کر اپنی مصیبتوں کا ذکر کرنا دماغی توازن کے خلل کی دلیل ہے۔ جو واقعہ بھی بیان کرو اس سے متعلق مجھے بڑے سکون کے ساتھ کرو۔ اگر میں کوئی لطیفہ سمجھ کر بیان کروں تب؟"

دراصل میں اس وقت دل ہی دل میں زہرا کی ایک دو دن کی واقفیت سے شادی کر بیٹھنے کی حرکت پر مشتعل ہو رہی تھی۔ میرے نزدیک اس کی یہ حرکت ناقابل معافی تھی۔ مجھے اپنی عمر کی سہیلی کی اس اچانک بے وقوفی سے کس قدر ذہنی دھچکا پہنچا تھا یہ میں ہی جانتی تھی۔ میں نے یہ خبر سنتے ہی کنپٹیوں پر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں رکھی تھیں اور نجانے یوڈی کلون کی کتنی شیشیاں سکون اعصاب کے لئے سونگھ سونگھ کر ختم کر ڈالی تھیں۔

وہ پھر ہنس پڑی: "میں خوب جانتی ہوں سعدی۔ تم مجھ سے سدا اپنا سوال سے متنفر ہو۔"

میں بولی: "تم سے نہیں۔ تمہاری بدذوقی اور غیر شاعرانہ حرکت سے۔ نجانے تمہاری جمالیاتی حس کو کیا ہو گیا تھا۔ دیمک چاٹ گئی تھی یا پالا لگ گیا تھا؟"

زہرا مسکرا کر بولی: "جمالیات تو عشق سے محبت کی ہوتی ہیں ——"

مجھے بہت ہی ناگوار معلوم ہوا۔ بولی: "یہ مریض مذاق جنون ہے۔ عقل و ہوش کے ناخن لو۔ تمہیں شادی یا محبت کرنا ہی تھی تو حسین آدمی موجود تھے۔ مثلاً وہ خوبصورت فوجی۔ کیا نام تھا اس کا —— شہباز یا منیر؟"

"منیر" اس نے یاد دلایا۔

"ہاں منیر۔ وہ محض فوجی نہ تھا۔ وہ انٹیلیکچول تھا ——"

وہ ہنس پڑی: "بے شک۔ یہ بات اس کی گفتگو اور اس کے چائے پینے کے انداز سے ظاہر ہوتی تھی کہ وہ انٹیلیکچول ——"

میں جھنجھلا کر بولی: "اور ہنسی میں ٹالو۔ میں کہتی ہوں منیر تمہارا ہم مرتبہ آدمی تھا۔ آج تم کس ٹھاٹھ کی زندگی کیا بسر کر رہی ہوتیں۔ یہ دور افتادہ شہر کے اسٹیشن پر تو نہ پڑی ہوتیں اس طرح۔"

وہ سنجیدگی سے بولی: "لیکن سعدی۔ اگر جنت جہنم میں ہی ہو تو وہ جنت ہی ہوتی ہے۔ اور شہر کا اسٹیشن ——"

مجھے غصہ آ گیا: "تمہاری ان منطق و بیری سمجھ میں آتی ہے نہ آئے گی۔ اب اپنے کئے کا نتیجہ دیکھ لیا یا نہیں؟"

"دیکھ رہی ہوں" ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی جیسے آگ لگ گئی: "یہ بے وقت کا مسکرانا بند کرو۔ زندگی برباد تمہیں ہو گیا ہے۔ جلد جلد اپنے حالات سناؤ۔ تمہاری بے وقت ہنسی اور دیوانگی سے مجھے تمہارے عقل و دماغ کا شبہ ہو رہا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے سکون اعصاب کے لئے یوڈی کلون سونگھنا شروع کر دیا۔

وہ بڑی سنجیدگی سے کہنے لگی: "تم نے اخباروں میں دریائے شور پر سے گرنے والی ایکسپریس کا حادثہ پڑھا تھا سعدی؟"

"کیا بے تعلق باتیں کر رہی ہو۔ ہاں پڑھا تھا۔ یہ بچنے کی پرانی بات ہے۔ ٹرین کا خوفناک حادثہ تھا۔ پر اس سے تمہارا کیا تعلق؟"

"یہ حادثے عجیب ہوتے ہیں سعدی ——" وہ مسکرا کر بولی۔

"افسوس تمہارے دماغ میں خلل واقع ہو چکا ہے —— ورنہ یہ وقت حادثات کی نفسیاتی وجہ بیان کرنے کا نہ تھا —— وہ گفتگو ہی میں رہ جائے گی اور میری گاڑی کا وقت ہو جائے گا۔" یہ کہتے کہتے میں مارے خوف و وحشت کے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

زہرا بولی: "میں تمہیں اپنے حالات سنا رہی ہوں اور تم مجھے مجنون سمجھتی ہو۔ بیٹھو تو ——"

"مگر اس حادثے سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے اکتا کر کہا۔ پھر سکون اعصاب کے لئے تصویر حیرت بن کر دیکھنے لگی۔ زہرا کی معصوم اور ذہنیت کا یہ حسین کلام برسات کی اس اندھیری رات کو کس قدر دہشت انگیز بنا رہا تھا۔

زہرا سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولی: "میں نے اپنے خط میں طلاق کا ذکر کیا تھا۔ اس خط میں میں نے مختصراً سب کچھ لکھ دیا تھا کہ پانچ سال ہم نے سرزمین عشق پر کس والہانہ طریق پر عشرت کی زندگی بسر کی تھی۔ جاڑوں میں میں کیمپ میں چلی جاتی اور تصویر کشی میں مصروف رہتی۔ ابتدائی گرماؤں میں راہی کے پاس اور شہر سے چلی آتی۔ زندگی کے دن عید اور راتیں شبراتیں تھیں مگر ایک سال کا عرصہ ہوا کہ کتاب زندگی کا ایک باب دفعتاً ختم ہو گیا؟"

میں انتہائی دلچسپی سے پوچھنے لگی: "کیسے اور کیونکر؟"

"اس کا مجھے خود علم نہیں ہو سکا۔ ایک دن وہ بارش میں شرابور گھر پہنچا۔ اسے انفلوئنزا ہو گیا شدید قسم کا۔ اور جب وہ تندرست ہوا تو وہ بالکل ایک نیا آدمی تھا۔ پھر وہ بتدریج بدلتا گیا۔ اپنی عادات، اپنے خیالات میں بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ مجھے ایک بالکل مختلف آدمی معلوم ہونے لگا۔ آخر وہ اس حد تک بدلا کہ اس کے ساتھ رہنا ناممکن نظر آنے لگا۔"

"وجہ کیا تھی ۔۔۔۔ ؟ کوئی دوسری عورت؟" میں بے چین ہو کر بولی۔

"نہیں۔ کام کی شدت۔"

میں بولی: "یہ تمہاری تشخیص غلط ہے۔ یہ بتاؤ اس کے بدلنے کی نوعیت کیا تھی؟"

"وہ چڑچڑا اور مایوس سا رہنے لگا۔ دن رات کی شدید محنت کی وجہ سے اس پر افسردگی و اضمحلال کے دورے پڑنے لگے اور وہ مجھ سے کھنچا چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ شب و روز کی محنت نے اسے پگھلا دیا تھا۔"

میں نے حقارت سے شانے سکوڑے: "محنت آدمی میں کام کرنے کی بے انتہا توانائی اور صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ اکتاہٹ یا افسردگی پیدا نہیں کرتی۔ یہ تمہارا خیال غیر علمی ہے۔ اس کی کشیدگی کی کوئی اور وجہ ڈھونڈو۔" میں سوالیہ انداز سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولی: "جو کچھ بھی تھا۔ بظاہر تو اس کی کشیدگی اور افسردگی کی یہی وجہ نظر آتی تھی۔ ورنہ ہم میں کوئی نیا اختلاف نہ پیدا ہوا تھا۔ روز بروز اس کی طبیعت کا انتشار بڑھتا گیا۔ جھنجھلاہٹ اور دائمی جھگڑے کا رجحان ۔۔۔۔"

"جس قسم کے ماحول میں وہ پلا اور بڑھا ہوگا ۔۔۔۔" میں فکرمندی کے ساتھ کچھ کہنے لگی۔

زلفی نے قطع کلام کیا: "نہیں نہیں ۔۔۔۔ اتنی دور جانے کی تکلیف نہ کرو۔ وہ بیچارہ ۔۔۔۔"

میں بولی: "میں اس پر کوئی آوازہ تو نہیں کس رہی تھی۔ میں اپنی عادت کے مطابق اس کے بچپن میں جا کر موجودہ حالات کی بے قاعدگیوں کی وجہ دریافت کرنا چاہتی تھی کہ شاید کوئی ذہنی کشمکش مل جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیر تم سناؤ۔" یہ کہہ کر میں نے جھک کر اپنے سیاہ جبے کے اونی کنٹوپ کے بند کھول دیئے۔ کیونکہ آگ کی تمازت زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ بلے نے ایک جمائی لی۔ ہم دونوں کو غور سے دیکھا پھر ایک دائرے کی شکل میں سمٹ کر بیٹھ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

زلفی نے اپنی داستان جاری رکھی: "اسے نہ بچوں سے پیار باقی رہا نہ مجھ سے دلچسپی۔ جنون تھا تو صرف انجن کھول کر پرزے دیکھنے کا تھا تمام وقت اسی میں لگا رہتا ۔۔۔۔"

میں بولی: "اس قسم کا جنون بعض ڈاکٹروں کو بھی ہو جاتا ہے ۔۔۔۔ وہ بھلے چنگے انسانوں کا پیٹ چیر کر اندر دیکھتے رہتے ہیں ۔۔۔۔ ان کے لئے انجن اور جسم انسانی ایک ہی چیز ہے۔"

وہ بولی: "آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہم نے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا روی۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" میں نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "تمہیں دراصل اپنے خوابوں کا ہیرو چاہئے تھا۔ اس قسم کا [illegible] ۔۔۔۔ ایسی۔"

زلفی نے نظر اٹھا کر تصویر کو دیکھا پھر ذرا مسکرا کر بولی: "اس قسم کا؟"

میں چونکی: "خیر، اتنا حسین اور ایسا بانکا نہ سہی۔ اس سے کچھ کم تو مل جاتا؟"

زلفی کہنے لگی: "علیحدگی کے تصفیے کے بعد بھی تعلقات میں کوئی خوشگواری پیدا نہیں ہوئی۔ زندگی کی وہ تاریک رات میں کبھی نہ بھول سکوں گی روی۔ اس یادگار رات کو میں اپنے سفر حیات کا انقلابی موڑ کہتی ہوں۔ وہ وہ رات تھی جس کی صبح ہمیں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونا تھا۔ اسی رات اسے ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اور مجھے اپنا سامان سفر تیار کرنا تھا اور زندگی کی ایک بالکل اجنبی منزل پر گامزن ہونا تھا۔ کیونکہ میرا ارادہ طلاق کے

جبکہ اس جاگیردار سے ملی تبدیلیوں کی سی زندگی گزارنے کا تھا خیر — راجہ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگا۔ وہ مطلق متاثر نہ تھا۔ جانتا تھا کہ آنے والی صبح ہمیں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے لئے اجنبی بنا دے گی۔ مگر وہ حسب معمول چڑچڑا اور متفکر ہی رہا۔ اسی وقت میں قائل ہو گئی کہ ہمارا فیصلہ درست تھا ہمیں ایک دوسرے سے فوراً جدا ہونا اور طلاق لے لینی چاہئے۔"

وہ یکایک چپ ہو گئی۔ شدت احساس نے شاید اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وفور جذبات نے شاید اسے مغلوب سا کر دیا تھا۔ میں خود متاثر ہو گئی اور یوڈی کولون سونگھنے اور اپنے اعصاب کو سکون دینے لگی۔

باہر طوفان باد و باراں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا ——— اور اندر کمرے میں جذبات و احساسات کی تند آندھیوں نے ہمیں کسی [illegible] کی طرح ویران اور مغموم بنا رکھا تھا۔ بارش پھر سے شروع ہو گئی تھی۔ بادل گرج رہے تھے اور سمندر پر [illegible] میں مصروف تھے۔

"پھر ——— ؟" میں نے دوبارہ یوڈی کولون سونگھتے ہوئے کہا۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: "نہ جانے میں اتنی متاثر کیوں ہو گئی۔ حالانکہ وہ وقت اب گزر چکا ہے۔ روحی تم زندگی کی یہی کہانیاں لکھنے کی شوقین ہو۔ اگر اس آخری رات کی اداسی کا ماحول پیدا کر سکو تو میں تمہاری سحر نگاری کا لوہا مان لوں ———"

"کوشش کروں گی۔ اچھا پھر؟"

"متفکر ہو کر اس نے سرد لہجے میں خدا حافظ کہا اور دروازہ کھول کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ گویا میری زندگی سے باہر نکل گیا ——— شاید تم اسے میری دیوانگی کہو۔ مگر روحی یہی بات ہے کہ باوجود اس طرز عمل کے مجھے اس سے محبت تھی اس کی جدائی کا صدمہ تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک طرح دیوار سے لپٹ کر رونے لگی۔ کیا کروں روحی، مجھے راجہ سے محبت ہو گئی تھی ———"

میں بڑی جذباتی سی ہو رہی تھی اس برسات کی اس پرشور خوفناک رات میں متاثر ہو گئی اور دردناک لہجے میں بولی: "آہ محبت۔ یہ کم بخت محبت! میں اس پر ایک اور جیسا مضمون لکھنے ہی والی ہوں زگی۔ اچھا پھر؟"

زگی بولی: "وہ شعر سنا ہے؟ ———

شب ہجراں کے جاگنے والے
کیا کرے گا اگر سحر ہوئی!

گو میں چاہتی تھی کہ سحر نہ ہو۔ کیونکہ یہ سحر میرے لئے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی طویل شب غم ثابت ہوتی۔ داستان کا وہ مرحلہ اب اہم اور دلچسپ ہے کہانی کی معراج یہی ہے۔ غور سے سنتی روحی۔ دوسرے دن راجہ کو صبح چھ بجے کی ڈیوٹی سے واپس آنا تھا۔ مگر وہ دن بجے تک نہ آیا۔ میں وفور مسرت سے بے خود ہو رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ راجہ محض اس لئے واپس نہیں آنا چاہتا کہ اسے میری طلاق منظور نہیں۔ میں سوچنے لگی کیا معلوم ——— وہ شام کو آئے اور تجدید محبت کرے۔ اپنی خطاؤں کی معافی مانگے۔ صبح کا گیا شام کو واپس آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ میں ان ہی خوشگوار خیالات میں مدہوش تھی کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ میں والہانہ شوق سے آگے بڑھی۔ وہاں راجہ کی بجائے ایک ریلوے کا چپراسی کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دریائے شور کے پل کے حادثے کی ہولناک خبر سنائی۔ میرے تمام ارمانوں پر بجلی گر پڑی۔ اخبار اٹھا کر دیکھا تو اس میں بہت بڑی سرخی کے نیچے لکھا تھا کہ رات کے ڈیڑھ بجے شور ایکسپریس دریائے شور کے پل پر سے گزر رہی تھی کہ پل ٹوٹ گیا اور گاڑی دریا میں گر پڑی۔ بہت سے مسافر اور ریلوے ملازم اور راجہ موت کے گھاٹ اتر گئے۔"

میں متاسف لہجے میں اچانک بولی: "آہ تو کیا راجہ کا انتقال ہو گیا؟"

وہ بولی: "دوسرے دن دوپہر کے وقت راجہ کی لاش گھر آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد میرا گھر لوگوں سے بھر گیا۔ حالانکہ میں ان چھوٹے درجے کے لوگوں سے کبھی نہیں ملتی تھی کیونکہ ہم میں کسی قسم کی ہم مذاقی نہ تھی مگر اس وقت ان لوگوں کے اخلاق و ہمدردی نے مجھے متاثر کیا۔ میں نے راجہ کی لاش ان لوگوں کے درمیان

چھوڑ دی اور خود احتیاطاً معالجوں کو بلانے کی فکر میں لگ گئی۔ روبی، میری کوششیں رائگاں نہ گئیں۔ ایک معالج نے مجھے بتایا کہ ابھی زندہ ہے۔ اس کا دماغ ہل گیا ہے اور اس پر قوما کی کیفیت طاری ہے۔ میری خوشی کا اندازہ بھلا تم لگا سکتی ہو روبی؟ سوکھے دھانوں پانی پڑا تھا اور گویا میں خود بھی [illegible] ڈاکٹروں کو اندیشہ تھا کہ راہی شام تک ختم نہ ہو جائے چنانچہ اسے ہسپتال میں فوری علاج کے لئے داخل کر دیا گیا۔ حالات درست ہوتے تو اسی آج شام کی ٹرین سے مجھے اس شہر کو چھوڑ کر کہیں روانہ ہو جانا تھا مگر صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔ لہٰذا میں نے چند دنوں کے لئے سامانِ سفر کھول دیا اس طرح ہماری ملاقات خود بخود چند دنوں کے لئے ملتوی ہو گئی۔"

اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر چپ رہی۔ میں ہمہ تن گوش ہو کر اشتیاق سے داستانِ حیات سن رہی تھی۔ اس کہانی کا انجام میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ البتہ [illegible] ——— ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ زبیدہ نے دوبارہ آغاز کیا: "دن پر دن گزرنے لگے۔ اضطراب و انتشار نے نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان جھولا جھولا جا رہا تھا۔ مگر یہ کھیل کب تک جاری رہتا؟ ——— آخر ایک شام ہسپتال سے اطلاع آ گئی کہ فوراً پہنچو۔ میں سمجھ گئی کہ آخری وقت آن پہنچا۔ احساس کی شدت اور واقعات کی بے ترتیبی نے ذہنی قوتوں کو مفلوج کر دیا تھا۔ اس زمانے میں میں سوچتی کم اور کڑھتی زیادہ تھی۔ بالکل ایک دیوانی کی طرح ——— جب میں ہسپتال پہنچی تو کمرے کے باہر ایک نرس اپنے کفن کے سے سفید براق کپڑوں میں ساکت کھڑی تھی مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی: "بیگم صاحبہ جلد اندر جائیے۔"

یہ سن کر میں ٹھٹک گئی: "کیا حال ہے مریض کا؟" لرزاں لہجے میں میں نے پوچھا۔

"وہ بار بار آپ کا نام لے رہے ہیں۔ بار بار ———"

"میرا نام؟؟ ———" متحیر ہو کر میں اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔

"جی ہاں ——— آپ کا نام بیگم صاحبہ۔ زکی زکی پکارے جا رہے ہیں۔"

میں حیران ہو کر نرس کو دیکھنے لگی۔ کیا وہ مجھ سے مذاق کر رہی تھی؟ یہ سوچتے ہوئے میں مریض کے کمرے میں داخل ہوئی۔

میں نے دیکھا راہی چپ چاپ بیٹھا ہوا چھت کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے ایک عرصے بعد آنکھیں کھولی تھیں اور ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ میں اس کے قریب جا کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ اسے اتنے دنوں بعد تندرست دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی تھی اس کا اظہار میں نہیں کر سکتی۔ مگر ساتھ ہی آنے والی جدائی کا خیال مجھے مغموم بنا رہا تھا۔ وفورِ جذبات سے میں بے تاب ہو گئی اور بے ساختہ میری زبان سے نکلا "راہی!"

یہ سنتے ہی اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا پھر عجیب بے ساختگی کے لہجے میں بولا: "زکی؟ تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

میں نے ضبط کر کے کہا: "تمہاری حالت کی وجہ سے میں رک گئی تھی۔ مگر ——— کل آج چلی جاؤں گی۔"

"کہاں؟"

"جہاں میرا جانا طے ہوا تھا"

"اکیلی؟"

میں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگی پھر بولی: "تم میرے ساتھ چلو گے تو سفر کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔"

"میں کچھ سمجھ نہیں سکا زکی ———" یہ کہہ کر وہ معصومانہ حیرانی کے ساتھ مجھے یوں تکنے لگا جیسے کوئی ننھا بچہ اپنی ماں سے گفتگو کر رہا ہو ——— پھر میں نے دیکھا راہی کی آنکھوں میں جذبات کا وہی عالم تھا؟ آواز میں [illegible] کی وہی لے اور حرکات میں نیاز مندی کی وہی ادائیں جھلک رہی تھیں جو آج سے ایک سال پہلے اسے قابلِ پرستش بنائے رکھتی تھیں۔

پھر اس نے التجا کے پیرائے میں کہا: "کیا تمہیں بہت ضروری کام سے کہیں جانا ہے زکی؟ چند روز انتظار کر لو تو میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

مجھے بعد میں معلوم ہو گیا کہ بعض موقعوں پر دماغ کا ہل جانا کس قدر مفید ہوتا ہے جب وہ ہسپتال سے واپس آ گئی تو وہ ویسی ہی تھی ویسی ہی محبت شعار ساہی جس کے لئے میں نے سب سے کنارہ کشی حاصل کر لی تھی۔ دماغی چوٹ نے محبت کی پرانی چوٹ کو تازہ کر دیا تھا۔ اس کی پیشانی پر زخم کا ایک نشان اس کے حسن میں چار چاند لگا رہا تھا۔

داستان کے ساتھ رات بھی ختم ہو رہی تھی۔ اور پو پھٹ رہی تھی۔ دور ساحل پر ایک سمندری چڑیا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

دروازہ کھلا۔ آفتاب کی ایک دھندلی کرن کے ساتھ ہی ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے آتش دان پر رکھی ہوئی تصویر جیتی زندہ ہو کر کمرے میں اتر آئی ہے میں حیران ہو کر آنے والے کو دیکھنے لگی اس وقت میری آنکھیں کھلیں اور مجھے معلوم ہوا کہ [illegible] وہ ابھی ابھی رات کی ڈیوٹی سے واپس آیا تھا اور مجھے عجیب حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں اسے دیکھ رہی تھی۔

مجھ سے رہا نہیں جاتا تھا مگر میری گاڑی کا وقت ہو گیا تھا چنانچہ میں اپنا سیاہ پرس ہاتھ میں لئے ہوئے سوئے ہوئے شہر کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔

بے قاعدہ

شوکت تھانوی کی یہ نئے انداز کی تصنیف اردو ادب میں بالکل انوکھی چیز ہو گی۔ اس قاعدے سے بچے بھی لطف اندوز ہوں گے اور بڑے بھی۔ بچے اسے دلچسپ تصنیف سمجھ کر پڑھیں گے اور بڑے اس سے زندگی کا شعور حاصل کریں گے۔ اس قاعدے کے حروف آپ کے تمام پسندیدہ ادیب ہیں۔ مثلاً اس قاعدہ میں آپ کو الف سے آلو نہیں پڑھایا گیا بلکہ الف سے امتیاز علی تاج پڑھایا گیا ہے۔

مصور —— قیمت ۲/-

نقوشِ لطیف

مرتبہ احمد ندیم قاسمی۔ یہ کتاب زندہ رہنے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں اردو کی تمام نامور افسانہ نگار خواتین کے منتخب افسانے ہیں۔ ہر خاتون افسانہ نگار نے اپنے حالاتِ زندگی بھی لکھے ہیں اور ادب کے بارے میں اپنے نظریات کا بھی اظہار کیا ہے۔ یہ مجموعہ اتنا دلچسپ اور اتنے کام کا ہے کہ کبھی بھلایا ہی نہیں جا سکتا۔

قریباً تمام افسانہ نگار خواتین کے فوٹو بھی شامل ہیں جس سے اس کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔

قیمت ۶/-

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

ایک پھول ایک کانٹا

مہندر ناتھ

سورج مغرب میں غروب ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے رات کی ایک قبا رنگین آسمان کو اپنے دامن میں سمیٹ رہی تھی۔ بڈھا دلشکار اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ماضی کے اوراق الٹ رہا تھا۔ اس کے سامنے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اور باغ کا ایک حصہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ رات اپنے سیاہ بال کھولے ہوئے ابھر رہی اور کلیوں سے کھیل رہی تھی۔ گزرے ہوئے واقعات اس کی نگاہوں کے سامنے رقصاں تھے۔ اس کی نگاہیں ایک خوف زدہ قیدی کی طرح ڈرائنگ روم کو دیکھ رہی تھیں۔ ہاں اسے یاد ہے۔ اور اچھی طرح یاد ہے کہ اس کا ماضی تلخیوں اور مشکلات کی ایک دھندلی چادر اوڑھے ہوئے تھا۔ روشنی کی کرن دور دور تک نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایک چھوٹے سے کمرے میں گزارا تھا اور جب شباب کا رنگین دور ختم ہو گیا تو اسے یہ حسین بنگلہ رہنے کے لئے ملا۔ سیلاب اس کی کیا ضرورت تھی۔ وہ اس عالیشان بنگلے میں اکیلا رہتا تھا۔ یہ بڑے بڑے کمرے، یہ پھیلا ہوا باغ، یہ روشندان، یہ روشنی، یہ دیواروں پر ٹنگی ہوئی تصویریں۔ یہ رنگ و روشنی اب کس کام کا تھا۔ اب ماضی کی بھیانک تصویریں ڈراؤنے پیر بن کر اسے ستاتی تھیں۔ اس کی روح کو کچوکے لگاتی تھیں۔ کبھی کبھی بہار آتی ہے۔ تو زندگی ہی بے معنی تھی۔ — ایسی بہار سے تو خزاں ہی اچھی۔ کیونکہ خزاں کے رنگ روپ کو جانتا تھا۔ وہ بہت عرصے سے آشنا تھا۔ وہ دلشکار کسیلیوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کی زندگی گلیوں اور کانٹوں کے درمیان پروان چڑھی تھی۔ یہ تو اس کی جانی پہچانی صورتیں تھیں۔ بہار اس کے لئے ایک اجنبی چیز تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ کیونکہ باہر اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ وہ اندر اس کی روح پر ایک نیم خنکی کا عالم طاری تھا۔ ایک دھندلا سا ستارہ اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھا۔ اور پیچھے سے دیوار کی طرف گیا اور بجلی کے بٹن کو دبایا۔ کمرہ روشنی سے منور ہو گیا۔ لیکن دل کے اندھیرے کو کون دور بھگا — اس کی بے قرار روح اس روشنی کے باوجود تڑپ رہی تھی۔ نہ جانے اس نے ساری زندگی کس چیز کی تلاش میں گزار دی تھی۔ ایک عجیب قسم کی یاسیت ایک عجیب قسم کی خشکی۔ ایک عجیب قسم کی بے حسی اس کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ اسے زندگی سے اتنی نفرت کیوں ہو گئی تھی۔ کاش وہ بیٹھا نہ ہوتا۔ تو وہ پھوٹ پھوٹ کر روتا۔ اس نے اپنے ڈرائنگ روم کو غور سے دیکھا۔ وہ اکیلا کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم روشنی سے جاگ اٹھا تھا۔ اور کمرے کی ہر چیز میں ایک زندگی دوڑ کر آ گئی تھی۔ لیکن باہر اندھیرا تھا۔ باغ میں گلاب کے پھول جس پر پتے تھے۔ ہوا میں ایک بھینی بھینی سی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں پھولوں سے لدی ہوئی

تھیں۔ اور پکے ہوئے آموں کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی تھی ——— اس کے برآمدے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ والا کمرہ خالی تھا۔ صرف باورچی خانے سے کسی کے گنگنانے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید اس کا نوکر کھانا پکا رہا تھا۔

نہ جانے یہ کیسی زندگی تھی؟ جوانی کی روح میں دیوانگی اور فرزانگی کا سمندر سا گیا تھا۔ وہ اس سے پہلے اتنا کبھی اداس نہ ہوا تھا۔ زندگی سے بیزاری کا احساس پورے شعور پر کبھی نہ ابھرا تھا۔ زندگی سے نفرت بے انتہا نفرت، لامحدود نفرت۔ جیسے نفرت کا کالا دھواں چاروں طرف سے بھونچال بنا آ رہا ہو، یہ ماضی یکایک زندگی تھی۔ وہ وقت کا لمحہ۔ کیسے بیٹھے۔ سونا۔ پھر کھانا، پھر سونا اور زندگی گزار دینا۔ یہ بھی کیا زندگی تھی۔ اس کی زندگی میں کبھی طوفان نہ آئے۔ اگر کوئی طوفان آیا بھی تو کنارے سے لوٹ گیا۔ نہایت سنجیدہ، پروقار، شام کی طرح ٹھہری ہوئی زندگی تھی اس کی۔ وہ اس اداسی سے بے خبر۔ اس نے اس غم کے سمندر میں جھانک کر دیکھا۔ نہایت ہی ڈراؤنے جانور شکست خوردہ ڈراؤنی صورتیں جانے ہوئے اسے گھور رہے تھے۔ بھوک۔ بیکاری۔ بیماری۔ غم۔ دھوکے۔ فریب۔ بے غیرتی۔ لامحدود اداسی۔ کیسی کیسی کریہہ المنظر صورتیں تھیں، جن کو دیکھ کر روح کانپ جاتی تھی۔ ان شکلوں کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ جانی پہچانی ہوئی شکلیں تھیں۔ اس کی کشتی انہی سخت چٹانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ہاں وہ دن دور نہیں، جب اس کی زندگی کی کشتی انہی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی اور وہ موت سے ہمیشہ کے لئے ہمکنار ہو جائے گا۔ اور پھر اس کی زندگی میں کوئی طوفان نہ آئے گا۔

وہ اس کربناک احساس سے جاگ اٹھا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کبھی اس کونے میں جاتا اور کبھی دوسرے کونے کی طرف۔ اسے باہر نکلنے کی ہمت نہ تھی۔ جیسے چاروں طرف سے اندھیرے نے گھیرا ڈال دیا ہو۔ اور وہ ایک شکست خوردہ جرنیل کی طرح اپنی شکست پر غور کر رہا ہو۔

اتنے میں کسی کے قدموں کی آہٹ آئی۔ اور وہ چونک پڑا۔ اس نے دروازے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا اور دوسرا بند تھا۔ کسی کے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ اونکار نے پوری قوت سے کہا۔ "اندر آؤ۔"

فوراً اس نے کہا۔ "نمستے۔"

ارے یہ تو اندر تھا۔ اس کے دوست کا بیٹا۔ ——— "آؤ بیٹا بیٹھو" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اندر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیسے آنا ہوا؟"

اندر نے اپنی گھبراہٹ ڈھیلی کی۔ جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ پہلے اونکار کو پیش کیا۔ اونکار نے سگریٹ لے لیا۔ اندر نے ماچس جلائی اور اونکار نے ماچس سے اپنے سگریٹ کو جلایا۔ اور بوڑھے اونکار نے کش لگاتے ہوئے کہا۔ "کیسے آنا ہوا اندر؟"

"بس یونہی چلا آیا تھا۔" اور اندر پھر خاموش ہو گیا۔

اس نے اندر کی طرف دیکھا۔ ایک خوبصورت نوجوان۔ عمر بیس سے اوپر۔ چوڑا چکلا سینہ۔ فراخ ماتھا، پیشانی پر بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے ذہانت اور ذکاوت جھلکتی تھی۔ لیکن اندر عالم اضطراب میں تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو اور کہہ نہ سکے۔ اس کے ہاتھوں میں سگریٹ کا ٹکڑا کانپ رہا تھا۔ اور جب کبھی اندر سگریٹ کا کش لگاتا تو اس کے موٹے موٹے ہونٹ کانپ کانپ جاتے۔ بوڑھے اونکار کو اپنے نوجوانی کے دن یاد آ گئے۔ ہائے وہ کیسے دن تھے۔ رگوں میں کتنی شادابی تھی۔ جسم میں سے آگ کے شعلے نکلتے تھے۔ دنیا دیکھنے کی کتنی تمنا تھی۔ خوبصورتی سے کتنا پیار تھا۔ عشق کی سرمستی۔ محبت کی مسکراہٹ۔ نگاہوں کی زبان، پینے کا انداز۔ چاندنی کی حسین گھڑیاں، یہ مرمریں پیار، بہتے جھرنے، سمندر کا پھیلا ہوا سینہ۔ یہ ناریل کے درخت ——— یہ گھاس۔ یہ سبزہ۔ یہ پہاڑ۔ آسمان۔ چاند تارے، آبشار، یہ ماتھے پر جھکی ہوئی زلف۔ جیسے بادلوں میں بجلی لہرا جائے۔ اُن دنوں یہ سب چیزیں کیسی اچھی لگتی تھیں۔ اب کیا ہو گیا تھا۔ کیا زندگی کی شام قریب آ رہی تھی۔ موت اپنے جال بچھائے ہوئے۔ زندگی کو آغوش میں لے رہی تھی۔ بوڑھے اونکار نے پھر اپنے آپ کو جھنجھوڑا۔ اور ماضی کی تاریک دیوار کو توڑتے ہوئے وہ بڑھاپے کی دہلیز پر آ گیا۔ اور اس کی نگاہیں اندر پر جم گئیں۔

ماں دیکھتے سے رہا جاتا ہے، ایک نگاہ جھجکتی ہے، دوسری نگاہ روشن ہوتی ہے

’’چاچا جی! ...... میں - میں ...... ‘‘ امجد پھر رک گیا۔

’’بیٹا - جو کچھ کہنا چاہتے ہو، بے دھڑک کہو - شرماؤ نہیں!‘‘

’’میں یہ کہنا چاہتا تھا - کہ مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے‘‘ ــــ وہ ایک ہی سانس میں سارا فقرہ کہہ گیا - اور پھر کہہ کر وہ کچھ شرما سا گیا اور پھر خاموش ہو گیا۔

بوڑھے اداکار نے کچھ جواب نہ دیا۔

’’میں یہ پوچھنے آیا تھا، کہ کیا کروں - لڑکی سے شادی کروں یا نہ کروں - پتا جی تو اس لڑکی سے شادی نہیں کرنے دیں گے - کیونکہ وہ لڑکی ایک ایکٹرس ہے‘‘

’’ایکٹرس‘‘ بوڑھے اداکار کے لب پھڑپھڑائے - جیسے وہ کسی خواب سے جاگا ہو - ایکٹرس اور محبت -

’’محبت‘‘ - وہ بڑبڑایا - نگاہوں کے سامنے دھندلے پردے سرسرانے لگے - وہ جھیل نے اپنا سفر چھیڑا، سمندر کے نشان سینے پر لہریں چلنے لگیں - نگاہیں شرابی ہو گئیں - سال بہ سال میں پڑنے لگے - اور بوڑھے اداکار نے کھانستے ہوئے کہا، ’’بیٹا امجد - محبت بڑی قیمتی چیز ہے - یہ انسان کو زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے - اس سے پہلے کہ میں تمہیں کوئی نصیحت کروں - تم میری محبت کی داستان سن لو - نہایت ٹوٹی پھوٹی داستان ہے شاید یہ داستان کسی طرح تمہاری سمجھ بوجھ میں کچھ اضافہ ہو۔‘‘

یہ اُن دنوں کی داستان ہے جب میری عمر ستائیس برس کی تھی - یہ عمر بڑی ہنگامہ خیز ہوتی ہے - امجد! میں نے زندگی میں خاموشی سے محبت کی ہے۔ بچپن میں پتھروں سے باتیں کیا کرتا تھا - اور جب جوان ہوا - تو انسان بھی پتھروں کی مانند دکھائی دینے لگے - بات تو آدمیوں کی صحبت سے اکتا جاتا ہوں - خاموشی سے دوسروں کی طرف دیکھنا، خاموشی سے دکھ سہنا، حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لاتا، یہ میری عادت سی ہو گئی ہے، لیکن دل کی یہ کیفیت نہ تھی - دل تو طوفانوں کا دل تھا - ہر لہر ایک نیا پیغام لاتی - اور میرے دل میں ایک طوفان برپا کر دیتی - میں چھوٹے چھوٹے واقعہ سے متاثر ہو جاتا ہوں (جیسے اور کوئی نہیں ہوتا)، کوئی چراغ دیکھتا تو رات بھر نیند نہ آتی - کوئی بے عزتی کرتا تو آنکھوں میں خون اتر آتا - کسی کو غم زدہ دیکھتا - تو خود بھی مایوس سا ہو جاتا، کسی تلاش آدمی کو دیکھتا تو اس کا وہ جھکا چہرہ، اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، اس کے چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، نگاہوں کے سامنے گھومتی رہتیں، اگر زندگی میں شکست کا احساس ہوتا تو ہفتوں اپنے آپ کو کوستا، کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی - تو منہ سے مانگنے کی جرأت نہ ہوتی - اگر دوسرے کو اس بات کا علم ہو گیا، تو شاید میری تکلیفوں میں کوئی کمی ہو جاتی۔ نہیں تو ــــ زندگی یونہی گزرتی رہتی سال رہتا - کسی کو ستانے یا جلانے کی کوشش نہ کرتا - وہ زہر چاروں طرف بکھرا ہوا تھا وہ خود پینے کی کوشش کرتا لیکن وہ زندگی کتنی پیاری تھی، وہ دن کتنے دلکش تھے وہ زندگی کتنی رنگین تھی - ظاہری طور پر خاموش رہتا - لیکن ذہن میں آگ کے شعلے رہا تھے - میں بھی اداکار سے کم نہ تھا مجھ پر مالکوں کی ایک نظر سی جم گئی ہو، جو ان دنوں ستار ہے - تم نے ایکٹرس کی محبت کا ذکر کیا - میں بھی ایک بار ایک ایکٹرس کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا - قصہ کافی دلچسپ ہے۔ تم ذرا ٹانگیں پھیلا کر بیٹھو - یوں اکڑوں بیٹھو گے تو تھک جاؤ گے اور میری داستان سے لطف حاصل نہ کر سکو گے -‘‘ بوڑھے اداکار نے امجد کی طرف دیکھا - امجد خاموش، چپ چاپ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا - اس کی آنکھیں جاگی ہوئی تھیں، اس کے ہونٹ جذبات کی فراوانی سے کانپ رہے تھے - ’’ہاں بالکل اسی طرح ہوا ہے - میرے ساتھ بھی اسی طرح ہوا تھا - ہر شخص کے ساتھ اسی طرح ہوتا ہے - اس نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا - ’’میں ایک فلم کمپنی میں نوکر تھا، اور میری تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار تھی - یوں کھانے پینے کے لئے روپے کافی تھے لیکن زندگی میں آگے بڑھنے کی تمنا تھی - لکھنے پڑھنے کا شوق تھا - ان دنوں میں نے ایک کہانی فلم کے لئے لکھی، اور ڈائریکٹر کو پسند آ گئی - یہ وہ دن تھا کہ شوٹنگ کے دوران میں مجھے سٹ پر رہنا پڑے گا ــــ یہیں میری ملاقات پرمیلا سے ہوئی - کیا زمانہ تھا پرمیلا کا - جدھر نکل جاتی، نگاہوں کی تھیں بچھ بچھ جاتی اور وہ بھی دیکھتا ایک ناصب کی طرح ان آنکھوں کو، رونق ہوتی آگے بڑھ جاتی، ایسی

بھلا کسی عورت پر جو آئے۔ میرا احساس خانہ گم کردہ سے۔ ایسی شفقت بھری رنگت، اور دیکھتے ہی دل چرا کر رکھ لیتے۔ ایسی کٹار کی طرح تیز آنکھیں اور جسم میں سے شعلے نکلنے لگیں۔ جب مسکرائے، تو بجلی اور گرج۔ جانے کیسی آفت، اس بار سے میرا سامنا ہوا تھا۔ اس دن ملاقات شاید زود سی تھی۔ میری [illegible] میں [illegible] تھی اور شام کا وقت تھا۔ روشنی ابھی شروع نہ ہوئی تھی۔ میں باہر گیا تھا جب ایک کار میرے قریب سے گزری۔ یہ پرمیلا کی کار تھی۔ پرمیلا اپنی کار سے اتری اور سیدھی میک روم میں چلی گئی۔ ان دنوں پرمیلا کی شہرت بام عروج پر تھی۔ نو وارد اس کے آگے پیچھے بھاگتے۔ اور پرمیلا منہ مانگے دام لیتی۔ میں نے پرمیلا کا نام سنا تھا۔ لیکن نہ قریب سے دیکھا تھا۔ اس کی تعریف میں کئی بچھے بچھے جاتے تھے۔ لیکن خود انہوں نے ان تعریفی تحریروں کی اصل حقیقت کو محسوس نہ کیا تھا۔ وہ کیا کرتا۔ وہ آسمان کا چاند تھی اور میں محض ایک تماشائی۔ میں نے اسے میک روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور پھر باہر کی طرف چلا گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اس حلقۂ جمال والے کے اندر داخل ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ میں باغ میں یونہی گھومتا رہا۔ پھولوں کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی پھولوں کو ہاتھ لگاتا۔ کبھی سرو، سمن۔ کبھی وہ پرمیلا کا سراپا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور سورج کی آخری کرنوں پر اندھیرے نے چادر پھیلا دی تھی اور ہلکا ہلکا سا اندھیرا پھولوں سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیوں دل میں ایک خوشی کا احساس جاگ رہا تھا۔ جوانی کے دن بھی خوب ہوتے ہیں۔ اندر دل ایک نامعلوم مسرت سے معمور رہتا ہے۔ مرنے کا کبھی خیال نہیں آتا۔ اس وقت کتنی تکلیفیں سامنے آئیں، انسان برداشت کر لیتا ہے۔ میں گہری سوچ میں مستغرق تھا کہ کسی نے پیچھے سے پکارا۔ "مس پرمیلا آپ کو بلا رہی ہیں۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا چپراسی کھڑا تھا۔ میں چپکے سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ قدم چل کر میں ایک کار کے قریب رک گیا۔ پرمیلا کار کی اگلی سیٹ پر تشریف رکھتی تھیں۔ ایک اور دوشیزہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

پرمیلا نے میری طرف دیکھا۔ ایک عجیب و غریب۔ سر سے پیر تک ایک نگاہ سے تولنے کی کوشش کی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار پرمیلا کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ کیا یہ وہی پرمیلا تھی، وہی قتالہ، وہی چنچل، جس کے چرچے ہر میک روم اور ہر سٹوڈیو میں ہوتے ہیں۔ ہاں، یہ وہی گول مٹول چہرہ، ماتھے پر ایک زلف لہراتی ہوئی۔ گلابی گلابی سا رنگ، آنکھیں بڑی بڑی لیکن نہایت چنچل ہیں۔ سینہ تنا ہوا ــــــ سب سے زیادہ مجھے پرمیلا کی جلد کی رنگت پسند آئی۔ نہایت ہی گوری گوری۔ نہ زیادہ سفید نہ زیادہ گندمی۔ ایک عجیب قسم کا نشہ تھا اس کی رنگت میں۔ باتوں باتوں میں وہ آنکھیں مٹکاتی۔ غزالی آنکھیں گھما پھرا کر بات کرتی۔ اس نے جلدی سے اپنے سر پر پلو ڈال لیا۔ اس کے بال اوڑھنی کے نیچے چھپ گئے اور چہرے کے باقی نقش اور ابھر گئے۔ آنکھیں اور حسین، نشیلی ہو گئیں، ہونٹ اور سرخ ہو گئے، ناک ستواں ہو گئی اور چہرے کی ہر دلکشی زیادہ واضح ہو گئی۔ کتنے وہ سنگ مرمر کی طرح بے داغ چہرہ، پتلے پتلے سرخ ہونٹ ــــ پرمیلا نے مجھے ایک جوہری کی طرح پرکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس فلم کی کہانی کے متعلق کچھ علم نہیں، میرا رول کیا ہے۔ کہانی میں میرا کردار کیا ہے۔ اور خاص کر مجھے کن سے مکالمے بولنے ہیں۔ سنا ہے، آپ نے کہانی لکھی ہے اور مکالمے بھی آپ کے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کہانی کا کیا پلاٹ ہے؟"

میں نے چاروں طرف دیکھا۔ کار کے ارد گرد کچھ لوگ کھڑے تھے۔ پرمیلا کو دیکھنے کے لئے۔ دوشیزہ اس طرح فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے شوفر کے پاس جا کر ٹوکا کیا اور اپنی پیشانی کو کھجانے لگی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ میں کہانی تو سنا دیتا۔ لیکن یہ جگہ کہانی سنانے کی نہ تھی۔ میں نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "کہانی کا پلاٹ پھر سنا دوں گا۔ اور جہاں تک آپ کے رول کا تعلق ہے، اس کے متعلق کیا عرض کروں۔ وہ بڑا اہم ہے۔"

"آپ کو تو فلمی دنیا میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟" پرمیلا نے گل جڑی چوڑی کو بازو پر کھسکاتے ہوئے کہا۔

میں کچھ شرما سا گیا۔ یہ سوال جواب مجھے پسند نہ آیا۔ میں اس قسم کی باتوں کا عادی نہیں ہوں کہ [illegible] مجھے کوئی پرکھنا شروع کر دے۔ [illegible] کسی کا حق حاصل نہیں، اور یہ دوسری [illegible] پوچھا ہے کہ آپ کون ہیں۔ اور کیا ہیں۔ اور آپ یہ کام کب سے کر رہے ہیں، میں اتنے عرصے کیوں جھک مار رہے ہیں۔

"کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔" میں نے فائل کو بغل میں دباتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کے پاس کار ہے؟" پرمیلا نے [illegible] کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا! اس سوال کی تہہ میں کیا تھا؟ میری شخصیت کی کار سے کیا نسبت تھی۔

"اُسی کی تلاش میں گم ہو رہا ہوں" میں نے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

اور وہ ہنس پڑی۔ اور موتیوں کی لڑی ایک لمحے کے لئے تاریکی میں چمکی۔ پرمیلا کی ہنسی مجھے پسند نہ آئی۔ اس ہنسی میں استہزا کا پہلو تھا۔ اُس کی ہنسی بھی مالدار سیٹھ کی طرح تھی جو ایک غریب کی مجبوریاں دیکھ کر قہقہہ مارے۔

پرمیلا نے شوفر کے پاس پہنچ کر اُسے جگایا۔ اندھیرا اور بڑھ گیا۔ بادل گھر گئے تھے اور جھیل کے جھروکوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی اور اوپر آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ کار کے ارد گرد ونگ بیچ تھے اور وہ لڑکی اُسی فرنٹ بورڈ پر بیٹھی تھی۔ ڈرائیور نے کہا۔ "پرمیلا جی میک اپ کر لیجئے گا؟" پرمیلا نے فوراً اُس سے چھلانگ لگائی۔ بالکل ایک ہرن کی طرح۔ شوفر کے دونوں ہاتھوں کو اُڑاتی ہوئی میک اپ روم کی طرف بھاگ گئی۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کی دو سفید ایڑیاں اندھیرے اور اُجالے کے سنگم پر چمکیں، اور پھر اُن دامنوں میں پرمیلا اُن ایڑیوں سمیت غائب ہو گئیں۔

یہ میری اور پرمیلا کی پہلی ملاقات تھی۔ نہ جانے مجھے پرمیلا کیوں اچھی لگی۔ لیکن ایک بات میرے ذہن میں صاف اور واضح تھی کہ پرمیلا کو پانا آسان نہیں۔ ایک فقرے میں پرمیلا نے اپنے کردار کو مجھ پر عیاں کر دیا تھا۔ وہ فقرہ کتنا پُر معنی تھا۔ کیا تمہارے پاس کار ہے؟ یعنی اگر کار ہوتی تو کیا بات تھی۔ یعنی میرے پاس کار ہے اور تمہارے پاس نہیں۔ یعنی میں جو ہوں وہ ہوں۔ تم بھی قبول صورت تو ہو، تم بھی ایک نئی زندگی پانے کیلئے اس میدان میں آئے ہو۔ ابھی میں نے کار حاصل کر لی ہے۔ تمہیں حاصل کرنا ہے۔ فرق زیادہ نہیں، لیکن بہت بڑا فرق ہے۔ یہ تو سمجھنے کی بات ہے۔ لیکن میں بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ بات سمجھنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ دل کے اندر کی کشمکش کیسے سکون حاصل ہو۔ پرمیلا نے یہ بات پوچھ کر اپنا راستہ صاف کر لیا۔ میں نے جواب دے کر اپنا بھی صاف کر لیا۔ لیکن بات وہیں کی وہیں تھی۔ پرمیلا میرے ذہن کے دروازے پر کسی طرح کھڑی تھی۔ وہ تو بھاگ کر نہیں گئی، وہ گورا گورا رنگ، وہ ذہین آنکھیں، وہ جادو بھری مسکراہٹ، وہ شوفر کے پاس پہنچ کر جگانا اور اس سے ہرنوں کی طرح چھلانگ لگا کر بھاگ جانا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ پر قائم تھیں۔ ان کی اپنی ہستی تھی، ان کو کوئی انسان اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی —— بھلا اس عورت کو ذہن میں رکھ کر تمہیں کیا ملے گا۔ وہ تو لالچی ہے، اس کے ساتھ ایک کار ہے، ایک کوٹھی ہے، ایک بینک بیلنس ہے۔ لیکن دل نہیں مانتا۔ یہ نہیں کہ میں بے لگام گھوڑے کی طرح محبت کے میدان میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ محبت کے میدان میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوں۔ بے عزتی کا مجھے سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ چاہے میری محبت کا جنازہ نکل جائے۔ چاہے دم گھٹ کر رہ جائے۔ بات کو نہ بڑھنے دینا۔ ملاقات بھی نصیب نہ ہو —— کوئی بات نہیں، کسی دوسرے کے آگے اپنے آپ کو گرانا پسند نہیں کرتا۔ اس لئے تو خاموش رہا۔ اور میری خاموش محبت اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ اور شوٹنگ کے دوران میں پرمیلا کو ایک اجنبی عورت کی طرح تکتا رہا۔

پرمیلا اُن عورتوں میں سے تھی، جو محبت کی شمع کو دل میں روشن کرتی ہیں، اور پھر پروانے کو جلتا ہوا دیکھ کر محظوظ ہوتی ہیں، اور زیر لب کہتی ہیں "تنکے ہو تو مجھ پر یونہی عاشق ہو گیا۔ میں نے تو ایسا نہیں چاہا تھا۔ میں تو یونہی مسکرائی تھی۔ بس یونہی، اپنی تو عادت ہے نا۔ بھلا حسن کو مرچ لگا کر اپنی انگلیوں کو گھما پھرا کر بات کرنے میں کیا برائی ہے۔ کسی کو میری ادا پسند آ جائے تو میں کیا کروں۔ میں ظلم کر کے جیتی ہوں۔ اور کوئی دلگیر محبت کی ٹھوکر کو اپنے سینے میں پیوست کرے، تو اس میں میرا کیا دوش۔ یہ مرد بیچارے، منچلے یوں دل سے ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں۔ اپنی زندگی میں ایک بار نہیں کئی بار گرتے ہیں، اور اپنی ہوتے ہوئے بھی مظلوم ہو جاتے ہیں۔" شاید پرمیلا کے دل میں یہی خیال کیا ہو، لیکن میں بذات خود۔ طوفانوں سے بہت گھبراتا ہوں، اپنی کشتی کو صحیح و سلامت کنارے پر لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن کنارہ ہے کدھر۔ وہ کشتی ہی کیا جو طوفانوں سے ٹکرائے۔ وہ کشتی ہی کیا جس کے بادبان تیز و تند جھونکوں سے تار تار ہو جائیں۔

کچھ ایسے ہی بیتا میرے ساتھ۔ شوٹنگ کے دوران میں میری اور پرمیلا کی ملاقات ہو جاتی۔ میں اکثر اُس کے میک اپ روم میں چلا جاتا۔ لیکن میک اپ روم میں جانے سے پہلے دروازہ کھٹکھٹا دیتا تھا۔ دروازہ کھلتا۔ تو پرمیلا تمام قدِ آدم آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی میک اپ کرتی ہوئی نظر آتی۔ وہ ہمیشہ مڑ کر میری طرف دیکھتی

"تو ذرا ڈائیلاگ پڑھ کر سنائیے"۔ وہ لپ اسٹک ہونٹوں پر لگاتے ہوئے کہتی۔

میں فائل کھولتا اور سین پڑھ کر سُناتا۔ وہ میک اپ کرتی رہتی۔ کبھی ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتی۔ کبھی چہرے پر برش سے بھویں ٹھیک کرتی اور کبھی بالوں کو پیشانی پر جمانے لگتی اور ساتھ ہی وہ مکالمے سنتی رہتی۔

جب سین ختم ہو جاتا، تو وہ چائے کا آرڈر دیتی۔ میک اپ مین جو اکثر کمرے میں ہوتا چائے کا آرڈر دینے کے لئے باہر چلا جاتا۔ اور میک اپ روم میں پرمیلا اور میں ہوتے۔ دوسرا کوئی نہ ہوتا۔ اس وقت دل میں کتنی بار خیال آیا کہ پرمیلا سے اظہارِ عشق کروں۔ مہینوں کا مدعا بیان کروں۔ اس سے ایک بار کہہ دوں کہ میرے دل میں تمہارے لئے کتنی محبت ہے۔ لیکن یہ الفاظ ہمیشہ میرے ہونٹوں پر آ کر رُک جاتے۔ صرف ایک خیال، وہ دوسرے باقی تمام خیالوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جاتا۔ اگر تمہاری محبت کا مذاق اُڑا دیا گیا۔ تو۔ اس خیال کے آتے ہی میرے چہرے کا رنگ پیلا پڑ جاتا۔ حلق میں آواز اٹک جاتی، اور میں دروازے کی طرف دیکھنے لگتا۔ کمبخت چائے والا ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

اتنے میں چائے آ جاتی اور میں اور پرمیلا چائے پینے لگتے۔ پرمیلا نمکین چیزیں کھانے کی بہت شوقین تھی۔ نمکین چیزوں کو اس چٹخارے سے کھاتی کہ اسے کھاتے دیکھ کر لطف آ جاتا۔ بھیل گاٹھیا۔ اور سیو کوئی کھانے کی چیزیں تھیں۔ لیکن کس مزے سے وہ کھاتی کہ دیکھ کر لطف آ جاتا اور انسان کا بے اختیار ان چیزوں کو کھانے کے لئے جی چاہتا۔ جب حلق سے آواز نہ نکل سکے۔ جب آنکھیں بے اختیار ایک ہی چیز کو دیکھنے پر مجبور ہو جائیں تو انسان کو کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں بھی گاٹھیا اور سیو کھانے لگتا اور پرمیلا کے چہرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا۔ یوں بار بار دیکھنا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ نہ جانے پرمیلا کو یہ بات اچھی نہ لگے۔ اور وہ کہہ دے، آپ ذرا باہر تشریف لے جائیے۔ یہ نمائش گاہ نہیں کہ آپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہماری طرف دیکھتے رہیں۔ میری نگاہیں فرش کی طرف جھک جاتیں۔ اور دل بیقرار ہو جاتا۔ نہ جانے اسے کیسے پتہ چل گیا کہ میں اسے چاہتا ہوں۔ کیا میری حرکتوں نے اس پر واضح کر دیا تھا۔ کیا میری آنکھوں کی تاک جھانک نے یہ راز اس پر آشکار کر دیا تھا۔ کیا میری خاموشی نے میری محبت کے راگ گائے تھے۔ کیا میرے لرزتے ہوئے ہونٹوں نے میری کہانی سُنائی تھی۔ کیا میری آواز جو نہایت ہی دھیمی اور دبی دبی سی تھی، اس نے یہ انمول نغمہ سنایا تھا کہ وہ پرمیلا کے کانوں میں جا کر کہہ دے کہ یہ نوجوان تم سے محبت کرتا ہے۔ یا پرمیلا کے دل میں خود بخود اس حسین جذبے نے جنم لیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کیا بات تھی لیکن چند دنوں کے بعد مجھ پر یہ بات آشکارا ہوئی کہ پرمیلا مجھ پر مہربان ہے۔ کیونکہ اس مہربانی کا اندازہ صرف میں ہی نہ کر سکا۔ بلکہ میرے ساتھیوں نے مجھے چھیڑنا شروع کر دیا۔ "میاں خوب ہاتھ مارا ہے۔ قسمت کے دھنی ہو۔ خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔" اس قسم کے فقرے اکثر میرے ساتھیوں کے لبوں سے نکلتے۔ اب سٹ پر جب کبھی پرمیلا سے ملاقات ہوتی۔ وہ ہمیشہ ایک دلنواز مسکراہٹ سے میرا سواگت کرتی۔ بات بات پر مسکراتی۔ اس کا گول مٹول چہرہ، ایک نئی روشنی سے منور ہو جاتا۔ اور آنکھوں کی پتلیاں رخساروں پر جھلمل ہو جاتیں اور مجھے سین کے مکالمے بار بار پڑھنے کو کہتی۔

"دیکھئے جی اب میں ٹھیک بولتی ہوں یا نہیں۔ جہاں غلطی کروں۔ فوراً ٹوک دیجئے" اور وہ مکالمے زبانی سُناتی۔ پرمیلا کا حافظہ بہت تیز تھا۔ ایک بار ڈائیلاگ سن لے تو دوسری بار اسے سُنانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

"پرمیلا جی آپ مجھ سے بہتر بولتی ہیں۔"

"ہائے جی۔ تم کتنا اچھا بولتے ہو جی۔ تو ذرا ٹھیک طرح پڑھو، شرماؤ نہیں جی۔" وہ جی کا لفظ بار بار دہراتی۔

میں پھر مکالمے پڑھتا۔ اور وہ غور سے سنتی۔ تلفظ کی طرف خاص طور پر دھیان دیتی۔ اور ہر لفظ کو اچھی طرح ادا کر سکتی۔ مجھ سے بار بار کہلواتی "اب بتاؤ، ماسٹر جی یہ لفظ ٹھیک نہیں، یوں بولو گا جی" —— "تم بڑے اچھے ماسٹر ہو جی۔" اتنے میں ڈائریکٹر آواز دیتا اور پرمیلا ناک کے نتھنوں کو پھلاتے ہوئے۔ زبان کو دانتوں سے باہر نکال کر مجھے چڑاتی ہوئی اور ہنستی ہوئی کیمرے کی طرف بھاگ جاتی۔ یہ سچ ہے۔ اور جو آپ کہیں گے کہ ان تمام حرکتوں کا جائزہ لیا جائے۔ تو بے اختیار یہ کہنا پڑے گا کہ ہم دونوں محبت کی آگ میں جل رہے تھے۔ ہماری ان چھوٹی چھوٹی حرکتوں، ان مسکراہٹوں، اور

چلبلی لڑکی کی جھلک نے سیٹ پر ایک عجیب سا ماحول پیدا کر دیا تھا کچھ لوگ خوش تھے کچھ حسد کی آگ میں جل رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا۔ اس میں جھگڑے کی کیا بات ہے۔ کوئی بات پر تو انسان جلے۔ یوں جلتا ہے تو خود جلو۔ اور جلو۔ دو رات کو مجھے نیند آتی ہے اور اگر آپ کو بھی نہیں آتی۔ تو میرا کیا قصور ——

اگر کسی دن سیٹ پر شوٹنگ کے لئے پرمیلا نہ آتی۔ تو مجھے اُسے لانے کے لئے کہا جاتا۔ ہاں ایک دن تو غضب ہی ہو گیا۔ پرمیلا کی ہمارے سیٹ پر شوٹنگ تھی، اور اُسے آنا چاہئے تھا۔ لیکن ہمیں موقعہ پر معلوم ہوا۔ کہ پرمیلا کسی اور سٹوڈیو میں شوٹنگ کر رہی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ڈائریکٹر صاحب گم ہو گئے۔ لگے ادھر ادھر کی ہانکنے "اگر پرمیلا آج نہ آئی تو میرا دیوالہ نکل جائے گا۔ ہزاروں روپوں کا نقصان ہو جائے گا۔" کانفرنس ہوئی، اور یہ طے پایا۔ کہ میں پرمیلا کو بلانے کے لئے جاؤں۔ ڈائریکٹر نے صاف کہہ دیا کہ آج قسمت کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

میں خود حیران تھا کہ اب کیا کروں۔ عجیب جھنجھٹ میں پھنسا دیا ان لوگوں نے۔ اس سے بہتر تو یہ تھا۔ کہ میں محبت نہ کرتا۔ بھلا ان مسکراہٹوں سے کیا فائدہ۔ یعنی محبت ہم کریں۔ رات کو ہمیں نیند نہ آئے۔ ایک ہمیں ہی نصیب نہ ہو۔ لیکن فائدہ دوسرے اٹھائیں۔ پرمیلا میری بات کیسے مانے گی۔ وہ میرے کہنے پر کیسے چلی آئے گی۔ عجیب چکر میں ہوں میں۔ کیوں میں اس محبت سے باز آیا۔ اگر وہ نہ آئی۔ تو میری کتنی بے عزتی ہو گی۔ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ اگر آ گئی۔ تو ۔ میں نے سوچا۔ ہاں آج شاید میری محبت کا امتحان تھا۔ بہر حال مجھے ہر حالت میں جانا پڑیگا۔ اور میں ڈائریکٹر کے کہنے کے مطابق چلا گیا۔ سٹوڈیو پہنچا۔ تو پرمیلا واقعی میک اپ کر کے کیمرہ کے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ شاٹ ختم ہو گیا۔ اور کیمرہ سے ہٹ کر میرے پاس آ گئی۔ "ارشاد؟"

"میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

"آپ کے ڈائریکٹر صاحب کہاں ہیں، وہ یہاں کیوں نہیں آئے؟"

"انہوں نے مجھے بھیج دیا۔"

"آپ کے آنے کی کیا ضرورت تھی جی، آپ کے ڈائریکٹر صاحب کیوں نہیں آئے جی؟"

میں اُسے کیا جواب دیتا۔ میں اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ پرمیلا اس وقت جوگن کے لباس میں تھی۔ ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں شرم و حیا کے ڈورے تھے۔ پرمیلا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نہ آتے جی۔ تو اچھی بات تھی۔ اب آئے ہو۔ تو —— جی۔"

اتنے میں ڈائریکٹر نے آواز دی۔ "مس پرمیلا۔ آپ کا شاٹ تیار ہے۔" وہ کچھ کہے بغیر کیمرے کی جانب چلی گئی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ ٹانگوں میں سکت نہ رہی۔ جاتا۔ تو کہاں جاتا۔ میں پرمیلا کے اس فقرے کو دہرا رہا تھا۔ "اگر تم نہ آتے۔ تو اچھی بات تھی۔" اب کیا کروں۔ واپس سٹوڈیو میں کونسا منہ لے کر جاؤں۔ ڈائریکٹر سے کیا کہوں گا۔ میرے یار دوست کیا کہیں گے۔ وہ خوش ہوں گے کہ میں شکست کھا کر آ رہا ہوں۔ تم لوگوں نے میرے متعلق نہ جانے کیا سوچا تھا۔ ہاں پرمیلا اور میرے متعلق۔ سب معلوم ہو گیا۔ اب تو کوئی شک بھی میرے اور پرمیلا کے درمیان کچھ نہ تھا۔ وہ ہنسی اور وہ مسکراہٹ بے معنی تھی۔ وہ چھیڑ چھاڑ۔ وہ نگاہوں کا لمحہ بھر مل جانا اور شرما کے جھک جانا۔ محض زندگی کے دن بتانے کا ایک بہانہ تھا۔ پرمیلا کی مسکراہٹ ایک حسین فریب تھا۔ وہ اپنے ارد گرد پروانوں کی ایک لمبی قطار لگانے کی شیدائی ہے۔ اور میں اس کی محفل میں آخری نمبر پر ہوں۔ اس بے وقوف سے کیا فائدہ۔ کیوں میری خاموشی اور پر خلوص محبت کا مذاق اڑاتی ہو۔ کیوں مجھے آگ کے دریا میں چھلانگ لگانے کے لئے کہتی ہو۔ میں نے آج تک اپنے آپ کو سنبھال رکھا ہے مجھے اپنی جگہ پر رہنے دو۔ مجھے مت ستاؤ۔ میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔ لیکن پرمیلا سے یہ نہ کہوں گا۔ کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ سن کر وہ قہقہہ لگانے لگے گی۔ وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جائے گی۔ ہائے اُس کی ہنسی، وہ فتح اور کامرانی کی ہنسی، اُف نہ دیکھ سکے گا۔ جب وہ میری شکست پر کھلکھلا کر ہنسے گی تو مجھے اس دن وحشت ہو سکے گا۔ یہ چھوٹ کا قد، یہ بھرا بھرا گٹھا ہوا جسم —— یہ کھلا کھلا چہرہ، یہ ذہین آنکھیں، یہ گمبھیر آواز۔ یہ عزت یہ وقار۔ یہ رعب داب سب کچھ خاک میں مل جائے گا۔ اور پرمیلا اپنی سہیلیوں سے ہنس ہنس کر کہے گی۔ کم بخت وہ بھی مجھ پر مرتا ہے۔ اس دن سیٹ پر آیا۔ اور اپنی محبت کا جنازہ نکال کر چلا گیا۔ یہ مرد۔ بیچارے مرد —— عورت کی مسکراہٹ کی تاب نہیں لا سکتے۔ بڑے بنے پھرتے ہیں نا۔ یہ بے وقوف مرد، جاہل، نامعقول مرد۔ بالکل بچے ہو تم بھی

محض مسکراؤ — تو پیچھے پڑ جائیں گے۔ ہنسو — تو لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔ آنکھیں مٹکاؤ ایک — دو — تین — کرو۔ بس آہیں بھریں گے۔ روئیں گے۔ تھپتھپا کر پیار کو ٹھکرا دیں گے۔ تخت و تاج چھوڑ دیں گے۔ جنگ کرائیں گے۔ ملکوں، انسانوں کا خون کرائیں گے۔ بس ایک مسکراہٹ کی خاطر۔ ارے سمیر زادہ ہو گے۔ الو ہی ہو گے ——

نہیں۔ نہیں۔ میں نے سوچا آج میں نے پہلی بار اپنی خاموش محبت کی توہین کی ہے۔ میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کیا کوئی میری ہنسی تو نہیں اڑا رہا تھا۔

شاٹ ختم ہو گیا۔ پرمیلا پھر میرے قریب آ گئی۔ "آخری بار مسکرا کر میری محبت کو ہمیشہ کے لئے دفنا دو پرمیلا" میں نے یہ فقرہ پرمیلا کو کہنے کے لئے دل ہی دل میں سوچا اور پھر خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ورگن نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اب تم اپنا فیصلہ سنا دو۔ میرے لب خاموش تھے۔ لیکن لرزتے ہوئے ہونٹوں نے یہ فریاد اس تک پہنچا دی۔

"شوٹنگ کے بعد، تمہارے ساتھ چلوں گی" یہ کہہ کر وہ سیدھی سیٹ پر چلی گئی۔

ہاں آج میں رسوائی سے بچ گیا۔ محبت کی کشتی چٹانوں سے ٹکرانے لگی تھی۔ کہ پرمیلا نے کشتی کا رخ بدل دیا۔ اب کشتی گہرے پانیوں میں تھی۔ امکان گہرے پانیوں سے کون نکال کر ساحل تک لے جائے گا۔ یہ کسی نے نہیں سوچا۔ میں نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا اور پیک اپ کا انتظار کرنے لگا۔

پیک اپ ہوا۔ پرمیلا کار میں بیٹھ کر ہمارے سٹ پر آ گئی۔ جب ورگن نے پرمیلا کو میرے ساتھ سٹ پر آتے ہوئے دیکھا تو ایک عجیب مسکراہٹ سب کے چہروں پر پھیل گئی۔ جیسے سب لوگ کہہ رہے تھے: "ارے آج تمہاری فتح کا دن ہے۔ آج تم دونوں ملاقات کر رہے ہو۔ تم نے فتح اور کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے ہیں۔ تم محبت کی اس کشتی میں کامیاب ثابت ہوئے ہو۔" میں دل ہی دل میں خوش ہوا۔ اور زیر لب کہا "ہاں چلو —— اور چلو —— خوب چلو ——"

لیکن اپنی جگہ پر کتنا نادم تھا۔ کتنا پریشان تھا۔ کتنا مضمحل اور افسردہ تھا۔ اس بات کا کسی کو علم نہ تھا۔ شاید پرمیلا بھی میری پریشانی سے ناواقف تھی۔ اس کا یہ احسان مجھ پر ایک آہنی کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ مجھ پر یہ احسان کرنے کی کیا ضرورت۔ تمہارے لئے کارواں ہے وفاؤں۔ اور ہاں دوسرے دن سے جھگڑا کیسے مول لوں —— تم سے اظہار محبت کر کے اپنی بے عزتی کیسے کراؤں۔ اپنی انا کو کیسے پاش پاش کر دوں۔ بے حیائی کا لبادہ کیسے اوڑھ لوں۔ میں اپنی جگہ خاموش رہا۔ چپ رہا۔ اپنے آپ سے لڑتا رہا۔ مرجھا رہا۔ گھلتا رہا —— لیکن دوسرے دن یہ حقیقت کبھی آشکارا نہ ہونے دی۔

پھر وہ دن آ ہی گیا۔ آج فلم کی آخری شوٹنگ تھی۔ وہ صبح مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ بڑی پیاری صبح تھی۔ ہوا چنچل لڑکی کی طرح دامنوں سے پھولوں سے کھیل رہی تھی۔ آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ اور دھوپ چمکیلی اور نشیلی —— میں کسی طرح ناکامی ہی دبائے ہوئے پرمیلا کے میک اپ روم کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا کہ دروازہ کھلا۔ اور میں اندر داخل ہوا۔ پرمیلا نے میک اپ کر لیا تھا۔ اور وہ خوبصورت کپڑوں سے آراستہ ہو کر کرسی پر بیٹھی تھی۔ ہوا میں عطر کی خوشبو تھی۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ میک اپ مین باہر چلا گیا۔

میں نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔

"آج کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت کچھ سن چکی ہوں جی۔" پرمیلا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور کرسی سے اٹھ کر میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ بالکل ایک دوست کی طرح۔ میں اسے اپنے اتنا قریب دیکھ کر ذرا جھینپ سا گیا۔ سامنے کی ڈریسنگ ٹیبل پر سبز رنگ کا گلدان رکھا ہوا تھا۔ گلدان میں گلاب کے تازہ پھول لگے ہوئے تھے۔ وہ آنکھیں جھکائے ہوئے گلدان کو دیکھ رہی تھی۔ میں بالکل خاموش ہو گیا۔ وہ گلدان کی طرف جھکی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے ایک پھول توڑا۔ میں بے اختیار اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں بہت کچھ سوچتا رہا۔ کن انکھیوں سے اس کی مرمریں جلد کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بالوں کی طرف۔ اس کی بیضوی گردن کی طرف۔ اس کا بلاؤز آج زیادہ کھلا ہوا تھا۔ گردن کے پیچھے کا حصہ نظر کے سامنے تھا اور ہلکا زردی رنگ کا بلاؤز اسے چوم رہا تھا۔ پرمیلا نے جھک کر گلدان سے ایک پھول توڑ لیا۔ وہ پھول توڑتے وقت ضرورت سے زیادہ جھکی۔ میری نگاہیں بھی زیادہ جھکیں۔ وہ مجھے اتنا

زیادہ مچلنا چاہیے تھا۔ دیری آنکھوں کو۔ میری نگاہیں اُس کے بیٹھنے کی طرف پھیل سی گئیں۔ آنکھوں میں ایک نشہ سا آگیا۔ اسکے وہ سہمے سہمے سا بیٹھنا۔ شاید کامیابی سینے کسی کا دم ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا۔ اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ لیکن اُس کا جسم میرے ساتھ ٹکرا نہ جائے۔ میں ذرا اور کھسک گیا۔ اُس نے گلاب کے پھول کو ایک بار سونگھا اور پھر مجھے دیا۔ میں نے خاموشی سے کانپتے ہوئے لبوں سے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس پھول کو پکڑ لیا۔ پھول کو ایک بار دیکھا اور پھر دیکھا کہ کہیں کانٹا نہ تھا۔ سب کانٹے صاف تھے۔ وہ آتشیں پھول اور اُس کی سرخ سرخ پتیاں میری طرف جھانک رہی تھیں۔ فضا میں ایک غنودگی سی طاری تھی۔ رنگین کلیوں کی سرسراہٹ تھی۔ کانچ کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ تھی۔ کسی کے بال کندھوں پر پریشان تھے۔ لب لرزاں تھے۔ گورا گورا رنگ حیا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ پردہ نشین ہو گیا تھا۔ لیکن میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس احساس سے مسحور ہوا۔ ایک قیدی کی طرح اُس پھول کو پکڑے ہوئے صوفے پر الگ تھلگ بیٹھا رہا۔ اور کسی کی آنکھیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ اتنے میں بیگ ایک دم داخل ہوا اور پرمیلا صوفے سے اٹھ کر کرسی پر جا بیٹھی۔ اور میں پھول پکڑے باہر نکل گیا۔

کالج میں آیا۔ کرسٹ پر جا کر سب کو یہ گلاب کا پھول دکھا دوں اور کہوں، بجو ——— اور جو ——— دیکھو، یہ میرے ضبط اور خلوص کا صلہ ہے۔ دیکھو، یہ میری محبت کی یادگار ہے۔ دیکھو۔ اس پھول کی سرخ رنگت میں میرے دل کا خون ہے۔ دیکھو۔ اس پھول کی خوشبو میں میرے حسین خوابوں کی رنگت ہے۔ دیکھو۔ میں پرمیلا کو چاہتا ہوں۔ میں اُسے پیار کرتا ہوں۔ میں اُس کے لئے مارا مارا پھرتا ہوں مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ دن کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ پھول میرے پاس ہے۔ یہ میری جوانی کا شاہکار ہے۔ یہ میری محبت کا تاج محل ہے۔ یہ میرا اجر رہا ہے۔ اجنتا ہے۔ لیکن میں نے پھول جیب میں ڈال لیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ کچھ نہیں کہا۔ کسی کو پھول نہیں دکھایا۔ اپنی محبت کی منزل کا حال کسی سے نہ کہہ سکا۔ کسی کے آگے جو جا رہا۔ تیج اور کاروان کے گیت نہ گا سکے۔ کہیں بیٹھ نہ گیا۔ ـــــ تک شہنائی کی آواز نہ آئی۔

غم بڑھ گیا۔

پانچ سال گزر گئے۔

میں پرمیلا سے نہ مل سکا۔ کئی بار سوچا کہ پرمیلا سے ملنے کے لئے اُس کے گھر جاؤں گا اور اپنے دل کا حال کہوں گا۔ لیکن دل کا حال نہ کہہ سکا۔ دل میں کہتا پہلے ایک کام سے ہو۔ میں نے پانچ سال کاروبار کرنے کی جدوجہد میں گزار دیئے۔ میں نے دن رات کام کیا۔ محنت اور خلوص کا پرچم بلند کیا۔ لیکن ہاتھ کچھ نہ آیا۔ جس شخص سے ملنے کے لئے میں دن رات چاہتا تھا اُس سے ملا۔ جس کام سے نفرت تھی، اُس کام کو کیا۔ لوگوں کو دھوکا دیا، فریب دیا۔ اکثر جھوٹ بولا۔ لوگوں کی گالیاں سنیں۔ جا بجا میں گڑگڑایا۔ جس بات کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس کو برداشت کیا۔ لیکن کاروبار چلا۔ اگر اتنی محنت پرمیلا کے لئے کی ہوتی تو شاید میری محبت بار آور ہو جاتی۔ لیکن کاروبار بھی کیا چیز ہے؟ اس کی آنکھیں ہوتی ہیں، وہ جلتی ہے، پھرتی ہے، رکتی ہے، روٹھتی ہے، اُس کا دل ہے، رگیں ہیں۔ لیکن خون کی جگہ پیٹرول ہوتا ہے۔ اُسے میری چاہت پر ترس نہ آیا۔ وقت کے کوڑوں نے میری پیٹھ کو زخمی کر دیا۔ اب مجھ میں وہ دم خم نہ تھا۔ پانچ سال گزر چکے تھے۔ اب پرمیلا مجھے بھول چکی ہوگی۔ کوئی اور کاروبار والا آنکھ پی گیا آہستہ آہستہ میرے دل و دماغ میں ایک سکون سا آگیا۔ میں نے اپنے آپ کو وقت کے مطابق ڈھال لیا۔ ہاں اب کیا ہو سکتا تھا۔ ہاں اب پرمیلا کو بھول جاؤں گا۔ کافی عرصہ کسی کی یاد میں گزر گیا۔ لیکن پرمیلا کی یاد دل سے نہ گئی۔ دل ویران ہو گیا۔ لیکن کھنڈر بدستور ہے۔ کوئی ایسی آندھی نہ آئی۔ کوئی ایسا طوفان نہ آیا۔ کوئی ایسا زلزلہ نہ آیا۔ جو ان کھنڈروں کو صاف کر دیتا۔ اور یہ زخم ہمیشہ کے لئے مندمل ہو جاتے۔

پانچ سال بعد کی بات ہے۔ مجھے ایک کہانی سنانے کے لئے پرمیلا کے پاس پھر جانا پڑا۔ پانچ سال بعد میں پرمیلا کا استاد دوبارہ ہوا تھا۔ پرمیلا ریڈیو پر ڈرامہ سے تھا۔ اور پرمیلا نے اس ڈرامہ پر کام کرنے کے لئے رضامندی ظاہر کی تھی۔ اگر کہانی اُسے پسند آجائے۔ تو وہ فلم میں کام کرنے کے لئے تیار ہوگی۔ پروڈیوسر نے یہ خیال مجھ پر ظاہر کیا۔ اور ساتھ ہی مجھ کو رہا کر پرمیلا اس پیشہ کے جتنے کا اور عادی ہے۔

میں پرمیلا سے ملنے کے لئے گھر گیا تھا۔ اگر اس نے میری کہانی ناپسند کر دی تو۔ نہ جانے پرمیلا کیوں زندگی کے ساتھ کھیل رہی ہے۔ زندگی کے پردے

پیار گھڑی ہو جاتی ہے۔ کیا اب وہ اس حالت میں پہچان سکے گی۔ میں نے ابھی تک قربت کے بارے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، اور وہ غبار وہ اب زیادہ تاریک ہو چکا تھا۔ کبھی یوں لگتا کہ یہ وقفہ بہت صاف صاف کچھ روز کو جھاڑیں جائے تمہاری علم —— میں پرمیلا کو کہانی نہیں سنا سکتا۔ کاش پرمیلا کی جگہ کوئی اور ہیروئن ہوتی۔ تو کم سے کم اس بے عزتی سے تو بچ جاتا۔ لیکن پیٹ کا مسئلہ اتنا ٹیڑھا تھا کہ مجھے اس بے عزتی کو برداشت کرنا پڑا۔

رات بھر کہانی کی ریہرسل کرتا رہا۔ کہیں کہانی سناتے وقت واقعات نہ بھول جاؤں۔ خوبصورت مکالمے یاد کر لئے۔ ایک دو مزاحیہ فقرے بھی طرح ذہن نشین کر لئے۔ کلائمکس کے سین کو ابھارا۔ دو مشکل سینوں کی نوک پلک کو درست کیا۔ اور دوسرے دن پرمیلا سے ملنے کے لئے چلا گیا۔

پرمیلا سٹ پر تھی۔ لنچ ہونے والا تھا۔ میں نے سوچا — لنچ ہو جائے — تو پھر پرمیلا سے ملوں گا۔

لنچ ہو گیا۔ میں سیدھا میک اپ روم میں چلا گیا۔

پانچ منٹ کے بعد پرمیلا میک اپ روم میں آئی۔ اس کے ساتھ ایک اور لڑکی تھی۔ میں نے کالا سا فراک پہنا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر پرمیلا کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو اڑ گیا۔ لیکن چہرہ سنبھل گئی۔ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پانچ سال گزر چکے تھے لیکن اس کی آنکھوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ وہ اب بھی ویسا ہی تھا جیسا اس نے ایک لمحے میں دیکھا —— اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی پھیل گئی۔ آدھے پاؤں میں بوٹ کی جگہ چپل تھی۔ بش شرٹ کی جگہ قمیص تھی۔ میں کا کالر ذرا پھٹا ہوا تھا۔ کنپٹیوں کے قریب بال سفید تھے۔ میں نے پرمیلا کو دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ موٹی نظر آئی۔ چہرہ زیادہ گول مٹول ہو گیا تھا۔

کہنے لگی: "کیا ابھی تک کام نہیں ملا؟"

چوٹ کاری تھی۔ لیکن اب تو چوٹیں سہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ میں آخری وار بھی برداشت کر گیا۔

"ابھی تک نہیں جی۔" میں نے زہریلا سا جواب دیا —— اور جی کے لفظ کا اضافہ کر دیا۔

کچھ دن ہوئے۔ ایک پروڈیوسر آیا تھا۔ انہوں نے کہانی کے متعلق ذکر کیا آپ کا نام تو نہیں لیا۔ کہانی سنانے آئے ہیں نا آپ —— بہرحال آپ کہانی سنا دیجئے۔ اگر آپ اس کام کے لئے آئے ہیں۔ کیا پئیں گے۔ چائے یا کوئی ٹھنڈی چیز؟"

"کچھ نہیں پیوں گا۔" ——

پرمیلا نے لڑکی کو آرڈر دیا۔ اور کہنے لگی: "تو اب کہانی سنا دیجئے۔"

میں نے کہانی سنا دی۔ نہایت ہی بے ربط سی کہانی۔ وہ بھی پھیکی سی، بے جان اور بے لذت۔ کہانی کے اختتام پر مجھے خود شرم سی محسوس ہونے لگی کہ میں نے کیا سنا دیا۔ کہانی سناتے وقت واقعات کچھ ایسے گڈ مڈ ہوئے۔ کہ بڑی کوشش کرنے کے بعد بھی کہانی کا مطلب میرے ذہن میں نہ آیا۔ پرمیلا بیچاری کیا سمجھی ہوگی۔ میں بے کار یہاں چلا آیا۔ مفت میں اپنی توہین کرائی۔ لیکن اب تو آ گیا تھا اب کیا ہو سکتا تھا۔ میں پرمیلا کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کوکا کولا پیش کی۔

"پیجئے۔ گرمی بہت ہے۔"

میں کوکا کولا غٹا غٹ پی گیا۔

"کہانی کے متعلق کیا رائے ہے آپ کی؟" میں نے ذرا ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کہانی مجھے پسند ہے۔ بہت اچھی ہے۔ میں اس فلم میں کام کروں گی۔ ضرور کام کروں گی۔" پرمیلا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا —— شاید وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ لیکن نہ کہہ سکی۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھی۔ پانچ سال گزر گئے اور تم کار نہ خرید سکے۔ میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ کار کو اور میں چھوڑ کر آگے اور میں تمہارے ساتھ چلی گئی —— وہ میں انتظار کرتی رہی —— بھولی نہیں تھی۔ لیکن تم بھی تو نہیں آئے۔ اتنا بہت انتظار کیا۔ انتظار کی حد ہوتی ہے نا۔ وہ کہنا چاہتی تھی یا نہیں —— لیکن میں نے اسی طرح سوچا —— اس کی نگاہوں سے میں کیا —— اس کی گوری گوری بانہوں نے بار بار بھی کہا۔ اس کی مسکراہٹ نے بھی پیغام دیا۔

اتنے میں ایک خوبصورت سا نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ یہ اس فلم کا ہیرو تھا۔ پرمیلا نے کن انکھیوں سے اس نوجوان کی طرف دیکھا اور کہنے لگی: "آج تمہاری

کار میں تمہارے ساتھ چلوں گی ڈیئر" - میری جان کا ڈرائیور ہے، اور بندہ تو آپ کا بے دام غلام ہے،" ہیرو نے جھک کر پرمیلا کو سلام کیا۔ اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ "اور میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" پرمیلا نے میرا تعارف کرایا۔ میں نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ پانچ سال گزر چکے تھے۔ جوانی کسی کا انتظار نہیں کرتی ——— میں نے سوچا ———

اس واقعے کے بعد میں سب کچھ سمجھ گیا۔ یعنی اب کار کا لینا بے سود ہے۔ لیکن ڈیڈی ——— محبت بڑی چیز ہے۔ تم نے جب مجھ سے کہا، کہ تمہیں ایک ایکٹرس سے محبت ہو گئی ہے تو مجھے زیادہ حیرانی نہ ہوئی۔ ایکٹرس ایک عورت ہوتی ہے۔ محض ایک عورت۔ مجھے تمہاری شادی اور بیاہ سے کوئی غرض نہیں، اور نصیحت کرنا عقلمندوں کا کام نہیں، تم سے اگر میں یہ کہوں کہ تم اپنی محبوبہ کو بھول جاؤ۔ کیونکہ وہ ایک ایکٹرس ہے۔ تو یہ میری بیوقوفی ہوگی ——— اگر میں کہہ بھی دوں جب بھی تم نہ مانو گے ——— محبت میں کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ عقل اور محبت کا کوئی میل نہیں۔ تمہاری محبت کا انجام کیا ہوگا ——— کوئی بڑی بات نہیں ——— دراصل سب سے بڑی بات تو یہ ہے، کہ تم محبت کر رہے ہو۔ یہ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا لمحہ ہے، تم ایک دوسرے سے ملتے ہو، اکٹھے سیر کرنے جاتے ہو۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نگاہوں سے نگاہیں ملائے بیٹھے ہوتے اور گھنٹے ہوتے؛ اور جو نے ہوتے بھی صرف ایک محسوس کرتے ہو، تم ایک دوسرے سے لڑتے ہو، جھگڑتے ہو، آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں، تم منا لیتے ہو۔ وہ ہنس دیتی ہے، اور تمہارے بازو پر اپنا سر رکھ دیتی ہے۔ تم اُسے اٹھا کر پیار کرتے ہو۔ وہ کہتی ہے، تمہارا ایسا ساتھی کبھی پیدا نہ ہوگا اور تم کہتے ہو، تمہاری ایسی لڑکی کبھی نہ ملے گی۔ سچے دل سے کہتے ہو۔ واقعی یقین کر کے کہتے ہو۔ وہ ہر لحظہ تمہیں چاہتی ہے، تمہیں پیار کرتی ہے، تمہیں دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ تمہارے لئے زندہ ہے، تمہارے لئے آہیں بھرتی ہے، تمہارے لئے مسکراتی ہے۔ تمہارے بالوں میں پھول لگاتی ہے۔ تمہارے لئے ہی سنور کر نکلتی ہے۔ تمہارے لئے ہنستی ہے، تمہارے لئے اچھے کپڑے پہنتی ہے۔ اور تم اپنی جگہ پر خوش ہو، یہ خوشی اچھی نہیں ہے، یہ خواب ہے، اور دور ہے جب اس دور سے جاگو گے تو زندگی نہایت ہی پھیکی پھیکی اور بے مزا لگے گی۔ سب سے زیادہ اہمیت تجربات کو دو ——— اپنے جذبات کی قدر کرو۔ تم جو کرتے ہو، تم جو کرو گے، تم جو دیکھو گے ——— تم جو دیکھ رہے ہو، محسوس کر رہے ہو، وہ سب سے زیادہ اہم ہے۔ اور انہی یادوں کے سہارے زندہ رہ سکو گے۔ میں تو اب بہت بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے ہاتھ اور پاؤں میں لرزہ ہے، بینائی کمزور ہو چکی ہے۔ تم ذرا میز کے دراز کے خانے کو کھولو اور ایک کتاب نکالو۔ اور اُس کتاب کا پندرھواں صفحہ دیکھو ———

اور میں اپنی جگہ سے اُٹھا۔ دراز کھولی اور کتاب نکالی۔ اور پندرھواں صفحہ دیکھا ——— اُس صفحے کے ساتھ گلاب کا پھول چپکا ہوا تھا۔ اُس کی پتیاں سوکھ گئی تھیں، خزاں نے سارا رس نچوڑ لیا تھا ——— "ارے یہ وہی پھول ہے۔ جو پرمیلا نے آج سے تیس برس پہلے مجھے دیا تھا۔ مجھے اس بات کا رنج نہیں، کہ میں پرمیلا سے شادی نہ کر سکا۔ اور وہ کسی ایک دوسرے نوجوان کے ساتھ چلی گئی، جس کے پاس ایک کار تھی ——— نہیں تو۔ مجھے اس بات کا ملال نہیں، بلکہ مجھے اس پھول نے بڑھاپے میں بہت ڈھارس دی ہے۔ جب موت ہر لحظہ میرے دروازے پر دستک دیتی ہے اور میں اسی کرسی پر بیٹھا اس موت کو جانے کی کوشش کرتا ہوں، تو یہ پھول برسوں کی یادوں کو تر و تازہ کر دیتا ہے ——— پرمیلا کا چہرہ ——— اُس کی مسکراہٹیں، اُس کی گوری گوری رنگت۔ اُس کی دلنواز ہنسی، اُس کا جی کہنا۔ شام کو سیر کرنے والوں کے قہقہے، دوستوں کا حسد، اُن کی جلن۔ پرمیلا سے پہلی ملاقات، اُس کا پھول پیش کرنا۔ اور اُس کا یہ امید کرنا کہ میں کچھ کہوں گا۔ اور کچھ نہ کہنا ——— یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔ اور ماضی کی تصویر حال میں زندہ جاوید ہو جاتی ہے۔ اور میں محسوس کرتا ہوں، اکیلا نہیں رہتا۔ یہ سب تصویریں۔ یہ سب آوازیں۔ یہ سب باتیں، یہ سب مسکراہٹیں میرے اردگرد گھومتی ہیں ——— اور میں موت کی آخری دستک کی انتظار میں رہتا ہوں۔"

ہاں مجھے معلوم ہے۔ اب تم یہاں سے جانا چاہتے ہو، تمہاری محبوبہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ تمہاری ماں یاد رہے، اُس کی زندگی کا دور مختصر ہے۔

میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تمہیں کوئی نصیحت نہیں کروں گا۔ مر جانے سے پہلے ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں، کہ مسرت ایک لمحے کی ہوتی ہے اور — ہاں ایک لمحے کی۔ اور یہ لمحہ تمہارا ہے اور تمہاری محبوبہ کا۔

یہ کہہ کر بڈھا اوتار خاموش ہو گیا۔ بڈھے اوتار نے اپنی آنکھیں میچ لیں، اور ایک ہیبتناک سناٹا کمرے میں چھا گیا۔ نوجوان چپکے سے اٹھا، اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

مضامینِ جمال الدین افغانی

جمال الدین افغانی ایسا نڈر اور بے باک رہنما تھا جس سے انگریزوں کی سلطنت کانپ اٹھی تھی۔ ان جیسا انگریزوں کا دشمن اور مسلمانوں کا خیر خواہ ڈھونڈھے سے نہیں ملے گا۔

مسلمانوں کو ایک مرکز پر لانے کیلئے انہوں نے عربی میں ایک اخبار "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا تھا۔ اس میں جتنے آتشیں مضامین نکلے تھے وہ سب اس کتاب کی زینت ہیں۔ ان کے مطالعہ سے آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کو ایک مرکز پر لاکر تمام دنیا کی سرداری کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا وہ آج بھی پورا ہو سکتا ہے۔

قیمت -/۵

اِنتقاد

سید عابد علی عابد کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔ عابد صاحب نامور شاعر، ماہر انشاپرداز اور بے مثل نقاد ہیں۔ ان کی تنقید میں روایتی نقادوں کی طرح ثقالت اور یاوہ گوئی نہیں ہوتی۔

یہ جو بات بھی کہنا چاہتے ہیں اس کیلئے مناسب الفاظ ڈھونڈھتے ہیں اور نپی تلی بات کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں شعروں کی سی مٹھاس اور فیصلوں میں تلوار کی سی کاٹ موجود ہے۔ ان کے نزدیک کسی لفظ کا غلط استعمال گناہ ہے اور یہ بھی گناہ ہے کہ نقاد اپنے ساتھ قاری کو بھی الجھا دے۔

قیمت -/۳

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

سات دن کی بادشاہت

کشمیری لال ذاکر

ہیرا صبح سویرے ہی اپنے گاؤں سے شہر چلا آیا۔

اس کا گاؤں شہر سے چھ میل دور تھا اور وہ پچھلے تین برسوں سے ہر روز دن چڑھتے ہی شہر چلا آتا تھا جہاں وہ گورنمنٹ ہائی سکول میں پڑھتا تھا۔ گورنمنٹ سکول میں داخلہ اس نے آٹھویں جماعت میں لیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے گاؤں کے ڈسٹرکٹ بورڈ مڈل سکول میں پڑھتا تھا جس کا ہیڈ ماسٹر اسے رتی بھر نہ بھاتا تھا۔ اس کی آواز بے حد کرخت اور اس کی آنکھیں بڑی دہشت ناک تھیں۔ اسے دیکھ کر اس کے ذہن میں جو تصویر ابھرتی تھی وہ اور بھی زیادہ ڈراؤنی تھی۔ آٹھ سال تک ہیرا نے اس کرخت گونجتی ہوئی آواز کو سُنا تھا اور ان خوفناک آنکھوں میں سمائی ہوئی دہشت کا مقابلہ کیا تھا اور جب وہ آٹھویں جماعت پاس کر کے سکول چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ لے کر سکول کی چار دیواری سے باہر نکلا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اب تک وہ پھانسی کے تختے پر کھڑا تھا اور بالوں بھرے سیاہ جسم کا ایک بے ہنگم انسان ہاتھ میں پھانسی کی ڈوری لئے اپنی آنکھوں کی ساری آگ اس پر برساتا رہا تھا اور اب یکدم سب کچھ بدل گیا تھا اور اس کی پھانسی کی سزا منسوخ ہو گئی تھی۔

ہیرا طبعاً بڑا نازک مزاج تھا۔ اسے خوبصورت، رنگین اور متناسب چیزیں ہی پسند تھیں۔ اسی لئے اسے گندم کی بالیاں اور عورتوں کے لہنگے اچھے لگتے تھے اور کھیتوں میں ہل کی دھار اور کیاریاں ہی اچھی لگتی تھیں اور جب اس کا باپ اسے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے ساتھ لے جاتا تو وہ کام کم کرتا اور سوچتا زیادہ تھا اور جب سکول میں اس کی پٹائی ہوتی تو اس کے ہاتھوں کی طرح سرخ سرخ ہتھیلیاں تو کم دکھتیں لیکن اس کے دماغ کی نسیں درد سے پھٹنے لگتیں۔

اور جب وہ اپنے گاؤں کے مڈل سکول سے نکل کر شہر کے گورنمنٹ سکول میں داخل ہوا تو اس کی نازک طبع کو بے حد سکون ملا۔ خوبصورت عمارت، کھلا میدان پھولوں سے بھری کیاریاں، صاف کمرے چمکتے ہوئے برآمدے، نیا فرنیچر، اُجلی دیواریں، خوب بڑے بڑے بلیک بورڈ، کتنی ہی دیر تک وہ اس طرح کھویا ہوا سا رہا جیسے بھرے میلے میں اپنے باپ سے بچھڑ گیا ہو حالانکہ اس کا باپ اس کے ساتھ تھا اور اسے بار بار کوس رہا تھا۔ اس کا باپ جب اسے بھاری بھرکم گالیاں دیتا تو اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ ان کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ جائے گا۔ دراصل اسے کوئی بھی وزنی اور بھاری اور بدشکل چیز پسند نہ تھی۔ اسی لئے کبھی کبھی اسے اپنے باپ سے بھی نفرت ہونے لگتی اور اب ماں سے بھی ہونے لگی تھی جس نے جانے کیسے اپنا پیٹ مشک

کی طرح چھپایا تھا اور اسے چھپانے کے لئے ہر وقت اپنی اوڑھنی کی اوٹ کئے رکھتی تھی۔

لیکن اس وقت وہ خوش تھا کیونکہ اس کے ذہن کے آنگن میں اب بالوں بھرا جسم، وحشت ناک آنکھیں، پسینے بھرے کپڑوں کی بُو اور گھٹن نہ رہی تھی۔ ان کی جگہ آم کے گھنے درختوں کی چھاؤں، پھولوں کے رنگ اور ان سب سے زیادہ نئے ہیڈ ماسٹر کی پیاری سی شخصیت تھی جو ہیڈ ماسٹر کم اور انسان زیادہ دکھائی دیتا تھا اور وہ بھول گیا تھا کہ اس کے ساتھ اس کا باپ تھا جس نے گھٹنوں تک اونچی دھوتی باندھ رکھی تھی، جس کی قمیص میلی تھی اور جس کی داڑھی کے سیاہ اور سفید بال خوب بڑھے ہوئے تھے اور جو بات بات پر پیٹ دیتا اور ناقابلِ برداشت گالیاں دیتا تھا۔

پہلے ہی روز جب کلاس لگی تو ہیرا سب سے اگلی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس نے اپنے کپڑے خوب دھوئے تھے۔ بالوں میں تیل لگایا تھا اور ان میں کنگھی کی تھی۔ کنگھی چونکہ اس نے پہلی بار کی تھی اس لئے بال اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک سے نہ بیٹھے تھے اور کہیں کہیں عجیب اوٹ پٹانگ انداز سے کھڑے تھے لیکن وہ خود اپنے آپ میں بڑا مطمئن تھا۔ اسے اس کی پروا نہ تھی کہ دوسرے اس کے متعلق کیا سوچتے تھے۔ اس کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھا شہری چھوکرا بار بار اس کی طرف دیکھتا تھا لیکن ہیرا اپنے آپ میں ہی مست تھا۔ کلاس ٹیچر نے حاضری لیتے ہوئے جب اس کا نام پکارا تو اسے جیسے پہلی بار اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ وہاں گاؤں کے سکول میں تو ہیڈ ماسٹر نے اسے کبھی ہیرے سے زیادہ کچھ نہ کہا تھا اور یہاں اسے ہیرا سنگھ کہہ کر پکارا گیا تھا۔ کتنا بڑا فرق تھا اور بانکی طرح ہیرا اسی بات پر مرتا تھا۔

یہ بھی اچھا ہی تھا کہ اس کے گاؤں کا کوئی اور لڑکا گورنمنٹ سکول میں نہ پڑھتا تھا۔ وہ قومی سکولوں میں داخل ہوتے تھے۔ ہیرا کو فیس کی رعایت مل گئی تھی چونکہ اس کے باپ نے پہلی عالمگیر جنگ میں حصہ لیا تھا اور اس کی فوجی خدمات کی وجہ سے اسے سات روپے ماہانہ پنشن بھی مل رہی تھی۔ دوسرے لڑکوں کو گورنمنٹ سکول میں وہ رعایت نہیں مل سکتی تھی اس لئے وہ تھوڑی تھوڑی رعایت لے کر قومی سکولوں میں داخل ہو گئے تھے۔ ہیرا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گاؤں کا کوئی بھی اور لڑکا اس کے سکول میں پڑھے اور تمام دن سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہے۔ اس سے بھی اس کے احساس کو چوٹ لگتی تھی۔

بہرحال اس نئے ماحول سے ہیرا مطمئن تھا۔ ہر صبح وہ گھر سے پیدل نکل پڑتا اور ٹھیک وقت پر سکول پہنچ جاتا۔ گاؤں کے دو لڑکے جو دوسرے سکولوں میں پڑھتے تھے سائیکلوں پر جاتے تھے اور کبھی کبھی ان کے اصرار پر وہ سائیکل کے کیرئیر پر بیٹھ جاتا ورنہ عام طور سے وہ پیدل ہی جاتا تھا۔ دوسروں کا احسان اسے پسند نہ تھا اور جب کبھی وہ وقت سے پہلے سکول پہنچتا تو بازار کا ایک چکر ضرور لگاتا۔ اس سے اسے ایک انوکھی سی خوشی ملتی۔

سکول میں داخل ہوتے ہی اس نے جی لگا کر پڑھائی شروع کر دی۔ ایک بات اسے بے حد پریشان کرتی تھی۔ گاؤں کے سکول میں جتنی انگریزی اس نے پڑھ رکھی تھی وہ یہاں جماعت کے ساتھ چلنے کے لئے کافی نہ تھی۔ استاد زیادہ تر انگریزی ہی میں پڑھاتے تھے اور اس لئے بہت سی باتیں اس کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ ریاضی میں تو اسے اور بھی دقت پیش آتی تھی لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور محنت کر کے جماعت کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتا رہا۔ کمزور تو وہ رہا لیکن نالائق نہیں۔ اگلی سیٹ بھی اس نے نہ چھوڑی۔ اس کے ساتھ کے شہری لڑکے نے ایک آدھ بار اس سے چھیڑ چھاڑ کرنی چاہی تو اس نے اسے بیچ میدان میں اچھی خاصی پھینٹی دی اور اس کے بعد جماعت کے کسی دوسرے لڑکے نے اس کے ساتھ بھڑنے کی کوشش نہ کی۔ وہ بھرے جسم اور تگڑی جان کا لڑکا تھا اور سب نے اس کی برتری تسلیم کر لی تھی۔

لیکن گھر میں اس کے باپ کی گالیاں ویسی ہی وزنی تھیں جن کے خلاف بغاوت کرنے کو اس کا بار بار جی چاہتا تھا اور اس کی ماں کا پیٹ پھولتا جا رہا تھا اور اب تو وہ آسانی سے اٹھ بیٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ ہیرا اندر ہی اندر غصے سے پھڑک رہا تھا۔

جس روز ہیرا کی ماں نے ہیرا کی ایک اور بہن کو جنم دیا اس روز ہیرا نے گلباری کو سڑک کے بیچ ہی بھر کر پیٹا کیونکہ اس نے اسے سائیکل کے کیریئر سے گرا دیا تھا حالانکہ اس میں گلباری کا کوئی قصور نہ تھا۔ اس بے چارے کو تو خود بھی چوٹ آئی تھی اور اس رات ہیرا کے باپ نے اس کی ماں کو

لڑکی چھیڑنے پر بہت ہی گندی گندی گالیاں دی تھیں جن کی مار سے ہیرا کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔

سالانہ امتحان میں ہیرا پاس ہو گیا۔ ریاضی میں تو جیومیٹری کی وجہ سے اس نے پاس ہونے کے نمبر حاصل کر لیے اور انگریزی کے دونوں پرچوں میں پاجامے کے نیفے میں اڑسے ہوئے پرچے اس کے کام آئے۔

ہیرا دسویں جماعت میں چڑھا تو وہ بہت خوش تھا۔ اب وہ ہفتے میں دو بار خود اپنے کپڑے دھوتا تھا اور اب مسلسل کنگھی کرتے رہنے سے اس کے بال بھی اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک سے جم جاتے تھے۔ اب اس نے گاؤں کے چمار کے ہاتھ کی بنی ہوئی دیسی جوتی پہننا چھوڑ دی تھی اور باٹا کے کالے بوٹ لے لئے تھے۔ گنڈاری فیل ہو گیا تھا اور اب ہیرا سندو کے کیرئیر پر بیٹھ کر سکول جاتا تھا اور کبھی کبھی خود بھی سائیکل چلاتا تھا کیونکہ سندو نے اسے سائیکل چلانا سکھا دیا تھا۔ سندو نے بھی گورنمنٹ سکول میں داخلہ لینا چاہا پر اسے داخلہ ملا اور ہیرا اس پر خوش تھا۔ سندو آ جاتا تو کبڈی کی ٹیم کا کپتان وہی بنتا۔ سندو اگرچہ جسمانی لحاظ سے ہیرا سے ہلکا تھا لیکن کبڈی اس سے کہیں اچھی کھیلتا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے ہوٹ ویو ٹورنامنٹ ہوئے تو ہیرا کی ٹیم ضلع بھر میں اوّل رہی اور ہیرا کو سب سے اچھا کپتان ہونے کی وجہ سے چاندی کا بڑا سا کپ ملا۔ سکول میں اس کی تصویر اتری اور ڈپٹی کمشنر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہیں بھیڑ میں کھڑے کسی شائق نے اسے اپنی لڑکی کے لئے پسند کر لیا۔ دوسرے روز جب وہ سکول آیا تو ہیڈ ماسٹر نے اسے اپنے دفتر میں بلایا جہاں اس نے دو دیہاتی زمیندار بیٹھے ہوئے دیکھے جن میں سے ایک لڑکی کا باپ تھا اور ہیرا کو دیکھنے آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر نے اس سے کھیل کی باتیں کیں اور مسکراتا رہا اور لڑکی کے باپ کا ارادہ مضبوط ہوتا رہا اور جب وہ دفتر سے باہر جانے لگا تو لڑکی کے باپ نے پانچ روپے کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دیا۔ ہیرا نے ہیڈ ماسٹر کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کیا لے لے؟

"چودھری صاحب تمہیں انعام دے رہے ہیں لے لو۔" ہیڈ ماسٹر کے کہنے پر اس نے نوٹ لے لیا اور پرنام کر کے دفتر سے باہر نکل گیا۔ اس نے سنا کوئی کہہ رہا تھا:

"بڑا اچھا لڑکا ہے۔" آواز لڑکی کے باپ کی تھی۔

گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد جب سکول کھلا تو ہیرا کا بیاہ ہو چکا تھا اور جب وہ سکول آیا تو اس کے پاس نئی سائیکل تھی جس کی گھنٹی وہ بلا ضرورت ہی بجاتا تھا کہ دوسروں کو احساس ہو کہ اس کے پاس نئی سائیکل ہے، نئی ریشمی قمیص ہے اور نئی بیوی ہے —— اور نئی بیوی صرف ایک رات کے لئے اس کے گھر میں آئی تھی اور پھر واپس میکے چلی گئی تھی اور اس ایک رات میں بھی گاؤں کی عورتیں ہی اس کے پاس رہی تھیں۔ ہیرا بے چارہ تو چھت پر چارپائی ڈالے تاروں کو ہی دیکھتا رہا تھا۔ جنسی ضرورت سے زیادہ اسے اپنی بیوی کو دیکھنے کا اشتیاق تھا جو ہر نئے خاوند کو ہوتا ہے۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پر جب وہ اسے نہیں دیکھ سکا تو یہ معمولی بات غیر معمولی بات بن گئی تھی اور اب تو یہ بات اس کی شخصیت سے یوں چمٹ گئی تھی کہ بار بار جھٹکنے پر بھی الگ نہ ہوتی تھی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ برادری کے رواج کے مطابق اس کی بیوی سال سے پہلے میکے سے واپس نہیں آ سکتی۔

اب ہیرا جماعت میں اگلی سیٹ پر بیٹھتا تو جیومیٹری کی مختلف شکلوں میں جانے کیسے اسے عورت کے جسم کی قوسیں، زاویے اور گولائیاں نظر آنے لگتیں۔ جیومیٹری کی ہر شکل اسے گھونگھٹ میں چھپی ہوئی ایک دوشیزہ جان پڑتی اور جب ریاضی کا استاد اس شکل کو کتاب سے بلیک بورڈ پر منتقل کر دیتا تو وہ سمجھتا جیسے اس کی نئی نویلی بیوی چھپتے ہوئے اپنے گھر کی دہلیز سے باہر چوکھٹ کے پاس کھڑی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ گھبرا جاتا اور ایک دم دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملنے لگتا اور اس کا وہ تصور آنکھوں پر پڑی دھول کی طرح چھٹ جاتا۔

اس کے ذہن کی یہ کیفیت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جیومیٹری کے پیریڈ میں اس کے لئے کلاس میں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔

اور پھر امتحان کے ایڈمشن فارم بھرے گئے تو فارم میں اس نے اپنا نام ہیرا سنگھ کی جگہ ہیرا سنگھ سادھو لکھا تھا۔

اور اس سے اگلے روز ہیرا سنگھ یادو نے اپنی جیومیٹری کی کتاب بیچ ڈالی کہ اسے قوسوں اور گولائیوں سے چھٹکارا مل جائے اور رات جیسے اس نے سپنا دیکھا اور سپنا دیکھ کر جب وہ سائیکل پر گاؤں گیا تو وہ اتنا تیز جا رہا تھا کہ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور اس کے ذہن میں جیومیٹری کی بے شمار شکلیں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو رہی تھیں۔

اور پھر اس نے جیومیٹری کے پیریڈ مس کرنے شروع کر دیے اور امتحان تک جیومیٹری کو طاق پر رکھ دیا اور وہ بغیر کسی تیاری کے امتحان میں بیٹھ گیا اور جیومیٹری کے پرچے میں سارا وقت قوسیں اور زاویے اور گولائیاں ہی بناتا رہا۔

اور آج ہیرا صبح سویرے ہی شہر چلا آیا تھا کہ یہیں اخبار میں اپنا رزلٹ دیکھے گا اور جب اس نے اخبار میں اپنا رول نمبر ڈھونڈا تو اسے مایوسی ہوئی۔ وہ شہر کی ہموار سڑکوں پر سائیکل چلاتا رہا اور ڈاک کے وقت کا انتظار کرتا رہا کیونکہ رزلٹ کی بلیک لسٹ ڈاک سے آئی تھی جسے لینے کے لئے سکول کا چپراسی صبح سے وہاں بیٹھا تھا۔ جب وہ اس طرح سائیکل چلا چلا کر تھک گیا تو سکول میں چلا آیا جہاں اس نے بلیک لسٹ دیکھی اور جانا کہ وہ پانچوں مضمونوں میں فیل تھا۔

پانچوں مضمونوں میں فیل ہونے کی خبر وہ تحمل سے نہ سن سکا۔ اسے بڑا صدمہ ہوا۔ یہ خبر اس کے لئے بڑی وزنی تھی اور اس نے اس کے سارے احساس کو کچل کر رکھ دیا۔ ایک آدھ مضمون میں فیل ہونے کی اور بات تھی پر پانچوں مضمونوں میں صفر ہوا تو وہ برداشت نہ کر سکا اور سیدھا کمپنی باغ میں جا کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس بری طرح تو وہ جب بھی نہ رویا تھا جب کبڈی کے میچ میں اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن آج تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ نندو اور گاؤں کے دوسرے لڑکے بھی پاس ہو گئے تھے۔ ایک وہی فیل ہوا تھا۔ اب وہ کیسے منہ دکھائے گا گاؤں والوں کو۔ اس کا باپ تو اسے دیکھتے ہی گالیاں دینے لگے گا اور اس کی ماں جو پھر اپنا پیٹ بچانے لگی تھی اپنی کراہت آمیز ہمدردی اس کے حلق میں ٹھونسے گی اور اسے ابکائی آنے لگے گی۔

پھر ہیرا کو اپنی بیوی کا خیال آیا۔ اسی کم بخت نے تو ڈبو دیا تھا اسے۔ ایک رات کے لئے سالی آ دھمکی تھی میکے سے اور اب بیٹھی ہے باپ کے گھر۔ عمر بھر منہ نہ لگاؤں گا سالی کو۔ پر اب بیوی کا خیال آیا تو اس کے ساتھ وہ سب لطافتیں اور گدگدیاں نہیں تھیں جو اس سے پہلے اس کے تصور کو جھنجھوڑا کرتے تھے۔ ایک ہی بھرپور شکست نے اس کا ذہن سپاٹ کر ڈالا تھا جیسے کھیت میں ہل چلانے کے بعد اس پر دوزری سہاگا پھیر دیا گیا ہو اور ہیرا بھی نیچے دب کر رہ گیا ہو۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ گاؤں واپس نہیں جائے گا۔ شہر ہی میں رہے گا اور مزدوری کرے گا۔

شام تک وہ باغ میں بیٹھا رہا اور طرح طرح کے ارادے باندھتا رہا۔ پھر اس نے سائیکل پکڑی اور بازار میں آ گیا۔ کچھ آنے اس کی جیب میں تھے۔ ان کی اس نے لسی پی لی۔ جب وہ بنچ پر بیٹھا لسی پی رہا تھا تو اس کی نگاہ سامنے کی دکان پر پڑی۔ بورڈ پر لکھا تھا:

”یہاں رکشا کرائے پر ملتی ہیں“

اور ہیرا نے لسی پیتے پیتے ہی اپنے لئے آخری فیصلہ کر لیا۔ لسی پی چکنے کے بعد وہ سیدھا رکشا والے کی دکان پر گیا۔

”مجھے ایک رکشا چاہیے۔“

”کرائے پر؟“

”ہاں!“

”چوبیس گھنٹوں کا اڑھائی روپے کرایہ ہو گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ ہیرا نے بغیر کچھ سوچے سمجھے جواب دے دیا۔

"لیکن ضمانت؟" رکشا والے نے کہا۔

"میری نئی سائیکل ہے تم اپنے پاس رکھ لو۔" ہیرا نے جواب دیا۔

دکاندار نے ہیرا کی دلہن کی طرح سجی ریلے کی نئی سائیکل جس کی وہ بلا ضرورت گھنٹی بجایا کرتا تھا اٹھا کر دکان کے اندر رکھ لی اور اسے ایک پرانی سی رکشا دے دی۔

"کبھی پہلے بھی چلائی ہے رکشا؟" دکاندار نے ہمدردی سے پوچھا۔

"نہیں!"

"تو اسے کچھ دیر خالی ہی باہر کی سڑکوں پر چلاؤ تاکہ تمہارا ہاتھ جم جائے۔"

ہیرا اس پرانی ڈھچر رکشا پر بیٹھ گیا جو پہلے کرائے دار نے تنگ آ کر کل ہی دکاندار کو واپس کی تھی۔ اس نے کچھ ہی روز میں کرائے دار کی کمر توڑ ڈالی تھی۔

ہیرا رکشا کو لے کر باہر کی سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اس کے جذبات اتنے مشتعل تھے کہ اسے رکشا کے پرانے اور بھاری پن کا احساس ہی نہ ہوا۔

جب وہ واپس دکان پر آیا تو رکشا کے مالک نے پوچھا:

"ہاتھ جم گیا رکشا پر؟" اس بیچ میں اس نے ہیرا کی نئی ریلے کی سائیکل کو اچھی طرح دیکھ بھال لیا تھا۔

"ہاں جم گیا!"

"رکشا کا دھندا کرنا چاہتے ہو تو ایک وقت مالش ضرور کروا لیا کرو نہیں تو نسیں پھول جائیں گی۔"

ہیرا کو اس کی ہمدردی اچھی لگی۔ اس نے ہیرا کو مالش والے کی دکان بھی بتا دی۔

"لیکن کرایہ ہر روز رات کے دس بجے سے پہلے مل جانا چاہئے۔"

"مل جائے گا۔" ہیرا نے جواب دیا اور اصل رکشا والوں کے سے انداز میں رکشا کو گھما کر سوار ہو گیا۔ وہ سیدھا ریلوے اسٹیشن کی طرف گیا، کیونکہ گاڑی کا وقت ہو رہا تھا۔

چار گاڑیاں یہاں سے گزرتی تھیں۔ اس نے سوچا بس وہ بھی چار گاڑیاں دیکھا کرے گا، شہر میں نہیں گھومے گا۔ شہر میں گھومنے سے کسی کی نظر اس پر پڑ جائے گی اور وہ پکڑا جائے گا۔ کچھ دن اسی طرح گزر جائیں اور وہ کچھ روپے کما لے تو کسی دوسرے شہر میں جا کر کوئی دھندا شروع کرے گا۔

دوسری صبح اٹھ کر اس نے سب سے پہلے مالش کرائی۔ مالش کرانے کا اسے خوب مزا آیا۔ مالش کے اس نے آٹھ آنے دئے۔ چھ آنے کی اس نے لسی پی اور دو آنے میں بیڑی کا ایک بنڈل اور ماچس لی اور پھر دن میں اس نے چاروں گاڑیاں دیکھیں اور رات کو بھی مالش کرائی اور رکشا مالک کو دس بجے سے پہلے پہلے اس کا کرایہ ادا کر دیا۔

یہ نیا رکشا والا اڈے پر پہنچا تو سب نے اس کا سواگت کیا۔ اتنا نخرے والا اور جسم کا گٹھا ہوا کوئی دوسرا رکشا والا نہ تھا۔ سب بے چارے مریل اور بے جان تھے۔ اڈے کے رکشا والوں نے آپ سے آپ تسلیم کر لیا کہ وہ ان سب سے برتر تھا۔

"یہ رکشا والا تھوڑی ہے شہزادہ ہے۔" کستوری نے کہا۔

اور پھر سب نے اسے شہزادہ بنا دیا۔ کسی نے اس کا نام نہیں پوچھا، وطن نہیں پوچھا، ذات نہیں پوچھی۔ شہزادوں کا بھی بھلا کوئی نام اور وطن ہوتا ہے، وہ تو بس شہزادے ہوتے ہیں اور ہیرا ایک ہی دن میں ہیرے سے شہزادہ بن گیا۔

دو تین روز رکشا چلانے سے اسے معلوم ہوا کہ وہ رکشا کتنی ردی تھی۔ اسے خالی کھینچنے میں بھی اتنا ہی زور لگتا تھا جتنا کہ دو سواری بٹھا کر۔ اس کے پٹھے جھول کھاتے تھے اور ہتھیلیوں کا چمڑا اکھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کے بغیر اب چارہ بھی کیا تھا۔ مہینہ بھر تو اب اسی کو کھینچنا پڑے گا۔ اس کے بعد کوئی دوسری صورت نکل سکے گی۔

سر پر سرخ رومال باندھے فلمی گانے گاتے ہوئے وہ سب سے پہلے ریلوے اسٹیشن سے چلتا تھا اور اپنی سواریوں کو اڈے سے کچھ فاصلے پر ہی اتار دیتا تھا۔ ڈرتا تھا کہ اڈے پر اس کا کوئی جاننے والا نہ مل جائے۔ دوپہر کو جب دوسرے رکشا والے دھوپ ہی میں محنت کرتے وہ کمپنی باغ میں آم کے درختوں کے نیچے سویا رہتا۔ رات کو مالش کرانے کے بعد اسے اتنے زور کی نیند آتی کہ پھر وہ اگلی صبح ہی اٹھتا۔ وہ جو ایک چیز اس کی شخصیت کے ساتھ اتنے دنوں چمٹی رہی تھی خود بخود ہی کہیں گر گئی تھی۔ وہ خوشبوئیں اور گالیاں جو اسے رلا دینے کی حد تک پریشان کیا کرتی تھیں اب جانے کہاں چلی گئی تھیں۔ جیسے ان کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔

رات کو جب وہ رکشا کے مالک کو کرایہ دینے جاتا تو ایک بار اپنی نئی سائیکل کو ضرور دیکھتا جو دکان کے اندر کھڑی ہوتی اور جسے دکاندار کا لڑکا ادھر ادھر گھماتے پھرتا۔ ہیرے کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ علم ہوتا تو وہ اسے کبھی برداشت نہ کرتا اور پرانی رکشا کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دکان کے سامنے ڈھیر کر دیتا۔

ہیرا کو فلمیں بڑی پسند تھیں۔ آج اس کا فلم کی پکچر دیکھنے کا پروگرام تھا۔ گاڑی نو بجے پہنچتی تھی، پکچر ساڑھے نو بجے شروع ہوتی تھی۔ وہ سواریوں کو اڈے سے ادھر ہی اتار کر سیدھا سنیما چلا جائے گا اور وہیں کچھ کھا پی بھی لے گا۔ اسٹیشن سے باہر نکلنے والی پہلی دو سواریوں کو اس نے اپنی رکشا میں بٹھایا اور چل پڑا۔ ریلوے اسٹیشن شہر سے کوئی ڈیڑھ میل دور تھا اور چونکہ وہ میونسپل کمیٹی کی حدود سے باہر تھا وہاں روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ دونوں طرف سے نیم کے بڑے بڑے درختوں سے گھری ہوئی اندھیری سڑک تھی جس پر رکشا اور تانگے والے بھی عموماً بغیر روشنی کے ہی چلتے تھے۔

ہیرا خوب تیز رکشا چلا رہا تھا اور ایک گیت گا رہا تھا جو اس نے آج ہی کستوری سے سیکھا تھا۔ ہیرا اور کستوری دونوں گہرے دوست بن گئے تھے۔

جھوٹی ماں دے منڈے نے اکھ ماری
تے کڑیاں نے جان پھیری

اس کا لہجہ تو ہیرا منڈی کا تھا لیکن طرز ٹھیٹ فلمی تھی۔ وہ مست تھا۔ اس کا سرخ رومال ہوا میں اڑ رہا تھا اور اس کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ اس آواز کو سب رکشا والے پہچانتے تھے۔ وہ ہیرے کی آواز تھی جو رکشا والوں کا شہزادہ تھا۔ رکشا میں بیٹھی سواریاں بھی اس کی داد دے رہی تھیں۔

اندھیرے میں ایک اور رکشا اس کے بالکل نزدیک سے ہو کر گزری۔ وہ اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔

”بتی رکھی ہے سالے دیکھتا نہیں؟“ ہیرا نے اونچی آواز میں کہا۔

”تاں اپنی رکھی ہے حرامی!“ دوسری رکشا والے نے جواب دیا۔ وہ کستوری تھا۔ دونوں دوست تھے۔ کسی نے دوسرے کی بات کا برا نہ مانا تھا۔

”ہیرے رکو ذرا!“ تھوڑی دیر کے بعد کستوری کی آواز پیچھے سے گونجی۔ ہیرا رک گیا۔ شاید اس کے دوست کو کوئی ضرو[illegible]ام ہو۔

”سالا میرا سنیما کا پروگرام خراب کرے گا۔“ اس نے رکشا میں بیٹھی سواریوں کو سناتے ہوئے کہا۔

کستوری کی رکشا ہیرے کی رکشا کے بالکل برابر کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہے سالے؟“ ہیرے نے کستوری کو مخاطب کیا۔

”تو اپنی سواریاں مجھے دے دے اور میری سواریاں تو بٹھا لے؟“

"کیوں؟"

"ایسے ہی۔"

"نہیں۔" ہیرے نے جواب دیا اور اپنی رکشا کا پیڈل گھمانے لگا۔

کستوری کی رکشا کی سواریاں فوراً ہی نیچے اتر آئیں۔ ایک دیہاتی مرد تھا اور ایک عورت۔ مرد کے ہاتھ میں بڑا سا لٹھ تھا۔ اس نے لٹھ زمین پر پٹکا۔

"بھاگ رہا ہے ماں کے یار۔" ہیرا نے آواز سنی تو ایکدم ٹھٹک گیا۔ اس کا باپ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"آپ میری رکشا میں آجائیں۔" کستوری نے ہیرا کی سواریوں سے کہا۔

"کیا معاملہ ہے؟" سواریوں نے پوچھا۔

"راستے میں بتاؤں گا۔ آپ بیٹھئے۔" ہیرے کی سواریاں کستوری کی رکشا میں بیٹھ گئیں اور کستوری نے اپنی رکشا شہر کی طرف گھما دی۔

"شہزادہ بنا پھرتا ہے سالا۔" کستوری نے جاتے جاتے طنز کسا اور ہیرا تڑپ کر رہ گیا۔ جیسے واقعی وہ شہزادہ تھا اور اب اس کی بادشاہت چھن گئی تھی۔ کسی چالاک ریذیڈنٹ نے اس سے تخت لے کر دوبارہ اس کے باپ کو دے دیا تھا۔

ہیرے کا باپ اور اس کی ماں دونوں اطمینان سے رکشا میں بیٹھ گئے جیسے تخت کے اصلی حقدار وہی ہوں۔

"حرامی نے سات روز سے پریشان کر رکھا ہے سالے بھاگ اب کدھر بھاگتا ہے؟" ہیرے کے باپ نے لٹھ کو ایک بار زور سے رکشا کے پائدان پر مارا اور ہیرا کا جی دہل گیا۔

اس نے پیڈل پر پاؤں جمایا اور بوجھل رکشا کے جھٹکتے ہوئے پہیے اندھیری سڑک پر گھومنے لگے۔

زینو

ابو سعید قریشی

اس کا جھونپڑا وادی کے دہانے پر واقع تھا، جہاں وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا بھی نہیں تھا، صرف اس کی باتیں سنی تھیں۔ رات کو جب وادی دھندلکوں میں چھپ جاتی تو اس کا باپ حقہ سلگا کر بیٹھ جاتا اور چراغ کی لو پر نظریں گاڑے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ اس کی دھیمی دھیمی باتیں سن کر احساس ہوتا کہ شاید اس کا مخاطب باتیں کر رہا ہے۔

"تیری ماں وادی کی سب سے حسین دوشیزہ تھی۔ بالکل تجھ جیسی۔ میں اسے یہیں بیاہ کر لایا تھا، اسی جھونپڑے میں۔ شہد کی مکھیاں اسے کبھی ڈنک نہیں مارتی تھیں۔ بالکل تیری طرح۔ اور اس کے ہاتھوں میں بھی ایسی ہی برکت تھی۔ تیری اس گوری گائے کی ماں جو گوالوں کو پاس نہیں پھٹکنے دیا کرتی تھی بکری ہی تو بن جاتی تھی۔ پتہ نہیں کیا گنگناتی تھی اس کے کانوں میں۔ جب چاہو دودھ لو ------ بکریاں تھیں تو وہ جیسے کوئی جھنجھٹ ہی نہیں تھا۔ ٹوکری بھری رہتی تھی انڈوں سے، اور بچے انڈے بٹھاتی تو سبھی چوزے نکلتے تھے ------ تیری خوبانیاں بھی تو ویسی ہی ہیں ------ اور انگور، سیب، اخروٹ، خوبانی کا تو یہ حال تھا کہ وادی میں بانٹ کر بھی بچ رہتا تھا...... وہ جب کشیدہ لے کر بیٹھتی تھی تو تتلیاں پھول پر اترتی تھیں کہ سچ مچ کے پھول ہیں۔ تیرے ہاتھوں میں بھی وہی بات ہے ------ مگر سوچتا ہوں کہ جب ان ہاتھوں میں مہندی لگے گی، بیاہ ہوگا تیرا اور تو چلی جائے گی کسی اور کے گھر، جس طرح تیری ماں اس گھر میں آئی تھی، تو تیرے باپ کا کیا بنے گا؟"

"میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی بابا!"

"تو نہیں جائے گی؟ کہ ایک کا گھر سونا ہو کر ہی دوسرے کا گھر آباد ہوتا ہے، اور تیرے بیاہ کی تیاریاں تو تیری ماں نے تیرے پیدا ہونے سے پہلے ہی شروع کر دی تھیں ------ مجھے تو لڑکی چاہئے۔ سات لڑکیاں چاہئیں۔ میں سسرال میں رہوں تو چار بیٹے ہیں۔ وہ ادھر آئیں تو ادھر چلی جائیں اور ان کے بچے دن بھر گھر میں کھیلتے شور مچاتے پھریں۔"

"مجھ کو بھی ایک منا لا دو گے ابا؟" زینو اپنے باپ کی بات کاٹتی۔ "بڑے جاڑوں کے جھنڈ کے جھاڑیوں کے ننھے جیسا! روشا تو کرادی تھیں اس کو اتنا پیارا ہے کہ بس۔" اور وہ اپنے باپ کی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگتی۔ "لا دو گے نا ابا؟"

سمجھاؤں تجھے؟ — یہی تو کہتا ہوں کہ کاش تیری بہنیں اور ہوتیں، یا پھر بھائی ہوتے —— تو تو بس پگلی ہو گئی ہے لڑکی۔ اتنی بڑی ہو گئی پر عقل نہ آئی۔ اب میں کیسے سمجھاؤں تجھے۔ کاش تیری ماں ……

ایسے میں کہیں دور سے چنگ کی آواز آتی یا چکور کا نغمہ گونجتا۔ شاہ بلوط کی شاخوں میں بیٹھا اپنی سارنگی بجانے لگتا اور زینو بھول جاتی کہ ابھی ابھی اس نے اپنے باپ سے کیا فرمائش کی تھی۔ وہ چپکے سے اٹھتی اور دروازہ کھول کر رات کے منظر کا جزو بن جاتی۔ دودھیا چاندنی میں چناروں کے سائے خوابوں کا پیرہن پہن لیتے۔ اُدھر کہیں دیودار کے پیڑوں کے نیچے سے چنگ کی جھن جھن اَن دیکھے ناچوں کی گت بن جاتی —— بہتی ہوئی گھر گھر آبشار کا شور، زعفران کے کھیتوں کی مہک اور سبزے کے پراسرار اندھیرے میں جگنوؤں کی جگمگاہٹ جیسے جاپانیوں کا تماشا آنکھیں جھپکتا تھا —— زینو اس تصویر کو بہت پسند کرتی۔ یہاں تک کہ پیڑوں کے جھرمٹ میں ہوا گنگنانے لگتی اور زینو کے بالوں کی لٹیں اس کے گالوں پر لہرانے لگتیں۔

"پگلی ہو گئی ہے یہ لڑکی؟" اس کا باپ حقے کا لمبا کش لگاتے ہوئے اسے آواز دیتا۔ "بند کر دے اب دروازہ ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی اور تو اب اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ میں تیری تیمارداری بھی نہیں کر سکتا۔"

زینو اپنی کالی کالی التجا بھری آنکھوں سے جو نیند کے باعث اور بھی کالی نظر آتی تھیں، اپنے باپ کی طرف دیکھتی، جیسے کہہ رہی ہے کہ مجھے یہاں سے نہ ہٹاؤ۔

"بالکل اپنی ماں پر۔" بڈھے کا سر اپنے آپ دائیں بائیں ہلاتے ہوئے بجھے بجھے لہجے میں کہتا، "رات بہت بیت گئی زینو۔ اب سو جا بیٹی!"

زینو کے ہونٹوں پر وہی پراسرار مسکراہٹ ظاہر ہوتی جو اس کی ماں کے ہونٹوں پر نظر آیا کرتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ چاند، یہ جگنو، یہ چنگ اور پیڑوں کا نغمہ نیند میں مجھے کہاں ملے گا؟ —— مگر اس کا باپ چپکے سے اٹھتا اور اسے شانوں سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیتا۔ اس کی پیشانی کو اپنے ہونٹوں سے چھو کر، اسے لحاف اوڑھاتے ہوئے دل ہی دل میں کہتا۔ کاش آج اس کی ماں زندہ ہوتی۔

وہ جانتا تھا کہ زینو حسین ہے۔ وہ ابھی انگوٹھا ہی چوستی تھی جب اس کے لئے پیغام آنے شروع ہو گئے تھے لیکن اس نے ہر بار یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وقت آنے پر دیکھا جائے گا …… کتنے ہی آئے اور کتنے ہی یہ جواب لے کر چلے گئے۔ چنانچہ زینو چیڑ کے جنگلوں میں ہوا کی طرح آزاد، کوہستان کی کنواری چوٹی کی طرح ناقابلِ رسائی تھی، جس تک پہنچنے کی آرزو میں کتنے جوگی، کتنے گڈریے آہیں بھر کر رہ گئے تھے۔ سفیدے کے پیڑوں، چناروں کے پتوں، قوس قزح کی قاشوں، جھیلوں، آبشاروں، چشموں اور ندی نالوں کی طرح وہ بھی وادی کی تصویر کا ایک ضروری جزو تھی ——

مگر ایک روز کھیتوں، پھولوں، جھرنوں اور ندیوں کے موسم میں جب وادی سر کے جھومتے ساز کی طرح اپنا ازلی نغمہ الاپ رہی تھی یکایک یوں محسوس ہوا جیسے تار کھنچ گئے ہوں اور ان پر کسی نے انتہائی سیدھا گز پھیرنا شروع کر دیا ہو۔ زینو اس روز پہاڑ کے دامن میں خود رو گلاب کے گچھے گوندھ رہی تھی، اس آواز سے وہ چونک پڑی۔ کوئی پتنگا تو نہیں گھس گیا تھا؟ —— نہیں، ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ جھرنوں، پریوں کے آبشار کا شور بھی نہیں تھا اور چیڑ کے جنگلوں میں ہرنی کی آواز بھی نہیں تھی، چیتے کی گھُرگھُر بھی نہیں تھی ……

اس نے افق پر نگاہ دوڑائی اور دور آسمان پر سیاہی کا دھبہ نظر آیا۔ سیاہی کا یہ ننھا سا دھبہ قریب آتا اور پھیلتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی خوفناک آواز بڑھتی گئی۔ پہاڑوں کے پیڑ لرزنے لگے۔ زینو خوف سے بُت بنی دیکھ رہی تھی کہ یہ کیا بلا ہے؟ ایک مرتبہ اسے ٹڈی دل دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اتنی بڑی ٹڈیاں جن کے پر اس کے جھونپڑے کی چھت سے بھی بڑے تھے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتی تھیں۔ نہیں، یہ ٹڈیاں نہیں ہو سکتی تھیں۔ ایک بڈھے سیاح نے جو وادی سے گزرتے وقت ان کے یہاں ٹھہرا تھا، جنوں کے دیس کا حال سناتے وقت بتایا تھا کہ وہاں اتنے بڑے بڑے گدھ ہوتے ہیں کہ غزالوں کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر لے جاتے ہیں —— اس تصور سے وہ سہم گئی اور سورج مکھی کے پودوں میں ایک پتھر سے چمٹ گئی۔

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بچپن میں جب وہ کوئی خوفناک کہانی سنتی تھی تو لحاف سے منہ ڈھانپ کر اپنے باپ سے لپٹ جایا کرتی تھی اور

اس کا خوف دور ہو جاتا تھا۔

"زیتو!" گِدھوں کے شور کو چیرتی ہوئی اسے اپنے باپ کی آواز سنائی دی: "تم کہاں ہو زیتو؟"

لیکن زیتو کی آواز حلق ہی میں سوکھ گئی۔ اس نے اٹھ کر بھاگ جانا چاہا مگر سورج مکھی کی کیاریوں میں جہاں وہ چھپی ہوئی تھی گِدھوں کے پروں کے سائے تیر رہے تھے —— پتھر کے گرد اس کی باہوں کا حلقہ اور تنگ ہو گیا۔

اپنی آواز کا جواب نہ پا کر زیتو کے باپ نے اپنی بچی کی ہرنی کے بچے کو جسے پھولوں کی کیاریوں کو بچانے کے لئے کبھی کبھی باندھ دیا جاتا تھا کھول دیا۔ آہو بھاگا اور اس کے گھنگھروؤں کی آواز پر زیتو کا باپ سورج مکھی کے جھنڈ میں پہنچ گیا۔

"زیتو! —— زیتو بیٹی! یہ تیری باہوں کو کیا ہو گیا ہے؟ —— ڈر گئی پگلی —— اٹھ وہ چلے گئے۔"

گِدھ اب وادی کی دوسری جانب پرواز کر رہے تھے۔ سیٹیاں بجاتے، غوطے لگاتے، جیسے شکار کا جائزہ لے رہے ہوں۔

"مجھے ڈر لگتا ہے ابا کہ یہ گِدھ مجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔" زیتو کی سہمی ہوئی آواز آئی۔

"شور مت کر میری بیٹی۔ کوئی ہوا انہیں ادھر لے آتی ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ ٹڈی دل کی طرح آئی تھی اور ہم نے ٹڈیوں کو مار بھگایا تھا۔ ٹڈیاں تیرے دادا کے کھیت میں اتری تھیں مگر اس نے اپنے کھیتوں میں آگ لگا کر دوسرے کھیتوں کو بچا لیا تھا۔"

اس نے اپنا فقرہ ابھی مکمل نہیں کیا تھا کہ کھیتوں، غاروں، وادیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں سے ایک اور قسم کا شور ہوا۔ چاروں طرف سے کسان اور گڈریے ڈھول پیٹتے، شور مچاتے اس جانب بڑھے جہاں گِدھ منڈلا رہے تھے۔

"دیکھا تو نے؟" زیتو کے باپ نے کہا: "اس وادی کے لوگ تیرے دادا کا احسان نہیں بھولے —— تیرے گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، کبھی تالا نہیں ڈالا تو نے۔ لیکن ہمارا کبھی ایک تنکا بھی گم ہوا؟"

زیتو نے سر ہلایا کہ نہیں۔ لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ وہ اب تک سہمی ہوئی تھی۔

"تیرے باغ سے سیب کا ایک دانہ یا انگور کا ایک خوشہ بھی کسی نے توڑا؟"

"نہیں!" زیتو کے ہونٹ آہستہ سے ہلے۔

"تیری خوراک، تیری مرغیاں اور بطخیں ...... وادی میں ادھر ادھر گھومتی رہتی ہیں، کبھی کسی کا کتا بھی ان پر جھپٹا؟"

"کبھی نہیں!" زیتو نے جواب دیا۔

"یا پھر تو جو اندھیرے سویرے جنگلوں میں یا چشموں کے کنارے گھومتی رہتی ہے کبھی کسی نے تجھے اکیلا پا کر جھوٹ موٹ بھی ڈرایا ہو؟؟؟"

"قطعاً نہیں۔" زیتو نے کہا۔

"یہ سب تیرے دادا کی بدولت ہے۔ یہاں کے لوگوں پر اس کے ان گنت احسان ہیں، اور تو دیکھے گی کہ یہ ان گِدھوں کو اسی طرح اڑا دیں گے جس طرح تیرے دادا کے وقت میں ٹڈی دل کی سرخ آندھی یہاں سے اڑ گئی تھی ——"

"اور میرے بچپن کی بات ہے جب برف کا طوفان آیا تھا اور ہماری جھیلیں تک جم گئی تھیں۔ ہم برف پگھلا کر پانی پیتے تھے۔ طوفان تھما تو پہاڑوں سے بھیڑیوں کی یلغار ہوئی۔ سفید بھورے رنگ کے بھیڑیوں کو جب پہاڑوں پر کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا تو وادی پر ٹوٹ پڑے تھے اور پھر وہ جنگ شروع ہوئی تھی جس کی یاد سے میرا جسم آج بھی کانپ جاتا ہے۔ آدمیوں اور ڈنگروں کی چیخوں سے پرندے اپنے آشیانوں کو چھوڑ کر دیوانہ وار اڑ رہے تھے اور چٹانوں سے اپنا سر پھوڑ رہے تھے۔ تیرے دادا نے بھیڑیوں کے راستے میں جگہ جگہ الاؤ روشن کروا دئے تھے اور ان الاؤوں میں مشعلیں، لاٹھیاں اور کلہاڑیاں لئے لوگ دست بدست بھیڑیوں سے لڑ رہے تھے —— رات میں ایک عورت کی چیخ بلند ہوئی۔ ایک بھیڑیا کہیں پیچھے سے بچتا ہوا ایک جھونپڑی میں

گھس آیا تھا جو اس درخت سے صرف چند ہی قدم کے فاصلے پر واقع تھا جس کی شاخوں میں چھپا ہوا میں یہ خوفناک منظر دیکھ رہا تھا جیسے اگلے وقتوں کے بادشاہ جھروکوں میں بیٹھے آدمیوں اور درندوں کو آپس میں لڑوایا کرتے تھے۔"

"مگر اس ریچھ کا کیا ہوا ابا؟" زیبو نے اپنے باپ کی بات کاٹی۔ اسے معلوم تھا اگر بادشاہوں کا قصہ چھڑ گیا تو ریچھ کی کہانی ادھوری رہ جائے گی۔

"ہاں تو وہ ریچھ پھر جھنڈ میں گھس گیا اور ایک عورت کو لے بھاگا ——— بڑا موذی جانور ہے یہ ریچھ۔"

"موذی کیا ہوتا ہے ابا؟" زیبو نے پوچھا۔

"منہ سے چاٹ لیتا ہے عورتوں کو ——— میرا مطلب ہے۔ اب میں تجھے کیسے بتاؤں بیٹی۔ بہت بے شرم ہوتا ہے یوں سمجھ لو۔ آدمی کی طرح۔ پر میں کیسے بتاؤں تجھے۔ کاش تیری ماں زندہ ہوتی اس وقت۔" اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ زیبو جانتی تھی کہ جب وہ اس طرح سانس لیتا ہے تو بعض اوقات ایسی چپ سادھتا ہے کہ پہروں بیت جاتے ہیں۔ مگر یہاں ریچھ کی کہانی ادھوری رہی جا رہی تھی۔

"تو ریچھ اس عورت کو اٹھا کر لے گیا، اور اس کے بعد کیا ہوا ابا؟"

"ہاں ——— مرجینا نام تھا اس کا۔ اس کی چیخ مجھے اپنے گرد کنڈلی کی طرح لپٹتی ہوئی محسوس ہوئی، اور اگر میں نے درخت کی شاخوں کو نہ تھام لیا ہوتا تو زمین پر آ رہتا۔ پھر مرجینا کی چیخ سن کر ایک آدمی جس کے ایک ہاتھ میں مشعل تھی اور دوسرے میں درانتی، اڑتے ہوئے انگارے کی طرح لپکا اور اپنی درانتی ریچھ کے پیٹ میں گھونپ دی ——— یہ شخص تیرا دادا تھا بیٹی ——— زخمی ریچھ مرجینا کو چھوڑ کر تیرے دادا پر جھپٹا ——— تیرے دادا کو ورزش کا بہت شوق تھا اور یہ اس کی جوانی کا زمانہ تھا۔ بڑے بڑے تیراکوں کا بھاری جھیل کے آدھے ہی میں سانس ٹوٹ جاتا تھا لیکن تیرے دادا نے اسے کئی بار پار کیا ہوگا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ اس پر ضرور خواجہ خضر کا سایہ ہے ورنہ یہ جھیل تو ایک سانس میں کسی سے بھی پار نہیں ہو سکتی۔"

"تو ریچھ نے مرجینا کو چھوڑ دیا اور دادا ابا پر جھپٹا۔" زیبو نے کہا۔

"ہاں تیرا دادا جانتا تھا کہ زخمی ریچھ سے بچنا محال ہوتا ہے اور جب آدمی زندگی اور موت کا فرق مٹا دے تو بعض اوقات موت ہی زندگی بن جاتی ہے۔ اس نے ریچھ کو بانہوں میں لپیٹ کر بھینچنا جو شروع کیا تو درندے کی آنکھیں ابل پڑیں، منہ کھل گیا، بازو ڈھیلے پڑ گئے، حتیٰ کہ وہ بے جان ہو کر گر پڑا۔ بعد میں وہ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتا تھا کہ جنگ میں پہلا وار ہی آخری وار ہوتا ہے۔ اگر میں اس وقت سوچتا رہ جاتا تو میرا بھی حشر وہی ہوتا جو ریچھ کا ہوا تھا۔"

دفعتاً گدھوں کا ایک اور غول سیٹیاں بجاتا ہوا گزرا۔

"او بد جنس پرندے!" زیبو کے باپ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "میرا گھر بیٹا زیبو... میرا گھر بیٹا!"

لیکن زیبو جس کا خوف پھر عود کر آیا تھا، اپنے باپ کے گرد عشق پیچاں کی بیل کی طرح لپٹ گئی ——— اس کا دل اس کبوتری کی طرح دھک دھک کر رہا تھا جس کے سر پر باز منڈلا رہا ہو۔

"ادھر ہٹ کر کھڑی ہو جا بیٹی! یہ غلیظ پرندے شاید یہ نہیں جانتے کہ میں اپنی جوانی میں جنگلی سوروں کے سر کچل چکا ہوں۔"

اور وہ پتھر اٹھا اٹھا کر دیوانہ وار ہوا میں پھینکنے لگا لیکن گدھ سیٹیاں بجاتے گزرتے چلے گئے اور بڈھے کے پتھر اس کے گرد یوں گرتے رہے جیسے سردیوں میں اولے۔

"جانے دو ابا! تم تھک جاؤ گے! یہ موذی بہت اونچے اڑ رہے ہیں۔" زیبو نے اپنے باپ کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹی!" بڈھے نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ "شاید میں بوڑھا ہو گیا ہوں ورنہ ——— ورنہ ——— لیکن میں ان اڑیلوں سے ڈر نہیں سکتا۔

آدمی تو جنات سے ڈر جاتا ہے۔"

اس کے منہ سے جنات کا لفظ نکلا ہی تھا کہ ایک بگولا بلند ہوا اور سارے علاقے میں پھیل گیا۔ غبار کم ہوا تو زینو اور اس کا باپ کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے سامنے ایک دیو کھڑا ہے۔ دیو نے زینو کے باپ کو جھک کر سلام کیا اور اس کی جانب گیندے کا ہار پھینکتے ہوئے بولا:

"تمہیں مبارک ہو بڑے میاں! تمہاری بیٹی کا نصیبہ جاگ اٹھا۔"

زینو کے باپ نے گیندے کے ہار کو، جو کنٹھی کی طرح سیدھا اس کی گردن میں آ کے گرا تھا، توڑ کر جن کے منہ پر دے مارا۔

لے جاؤ اپنے یہ مرگی کے پھول[1]، اور میری زعفران کی کیاریوں سے اس طرف ہو کر بات کرو۔ تمہارے سانس کے تعفن سے ان کی خوشبو جاتی رہے گی۔"

دیو کی اکیلی آنکھ جو اس کے ماتھے کے درمیان تھی، سلگنے لگی۔ اس کے بال ساہی کے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے اور دانت جبڑے کے اندر سے نمودار ہوئے۔ لیکن وہ اپنا غصہ پی گیا اور اپنے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا:

"تیری بیٹی کا نصیبہ جاگ اٹھا ہے بڑے میاں۔ ہمارے بادشاہ نے اسے اپنے حرم کے لئے منتخب فرمایا ہے۔"

"میں نہ کہتا تھا بیٹی کہ تو جو ہر وقت پھولوں کے گندھے گجرے پہنے پھرتی ہے اور اندھیرے سویرے چشموں کے کنارے گھومتی ہے اچھا نہیں۔ پر تیری ماں ہوتی تو سمجھاتی نا تجھے اس کا مطلب کہ کنواری بچیوں کو خوشبو سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔" زینو کے باپ نے اپنی بیٹی کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا۔ "اور سب سے بڑا ظلم تو نے یہ کیا کہ وہ تعویذ اتار دیا جو تیری ماں نے تیرے بازو سے باندھا تھا لیکن وہ نہیں بیٹی — میرے جیتے جی ......"

وہ اپنی بات مکمل نہیں کر پایا تھا کہ آسمان سے نوبت و ناقوس کی آواز آئی — شہ جنات کا پیامی منہ کے بل گر پڑا اور ایک تخت زمین پر آتا تھا۔

"ہم میں اتنی تاب نہیں تھی بڑے میاں کہ ہم تمہارے جواب کا انتظار کرتے اس لئے ہم خود چلے آئے۔"

"تم!" زینو کے باپ نے کہا۔

"ہاں! تمہاری بیٹی کے حسن کا شہرہ ہم نے اپنے دربار میں سنا تھا اور ایک روز جب تم لوگ اپنا غلہ تقسیم کر رہے تھے ہمارا بھی ادھر سے گزر ہوا اور ہم نے دیکھا کہ نیلم ندی کے پانیوں میں ایک سفید شعلہ تیر رہا ہے — تیری بیٹی کا جسم کچی چاندی —"

"چپ ہو جا بے غیرت عفریت!" زینو کا باپ غصے سے کانپ اٹھا۔

"اپنی بیٹی کی تعریف بھی نہیں سن سکتے بڑے میاں۔ بہت پیار ہے تمہیں اس سے! تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ وہ شہ جنات کے پہلو میں بیٹھے گی اور دنیا کی کوئی نعمت اس کے لئے ناقابل رسا نہیں ہو گی۔"

"لیکن وہ تمہارے لئے ضرور ناقابل رسا ہے۔" زینو کے باپ نے کہا۔ "تم ناری ہو۔"

"تم نے اپنے اجداد سے نہیں سنا کہ تم میں بھی آگ موجود ہے — تم اگر ٹھنڈے ہو جاؤ تو مر جاؤ۔"

"کل تو تم یہ کہو گے کہ قمر اور تارے دونوں میں روشنی ہے اس لئے ہم نوری ہیں۔"

"تمہیں منطق میں ضرور ید طولیٰ حاصل ہے بڑے میاں لیکن شاید تم طاقت کے بارے میں کچھ نہیں جانتے — سو دلائل

---

[1] بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ گیندے کے پھولوں سے مرگی ہو جاتی ہے۔ (مصنف)

کی ایک دلیل۔"

"مگر طاقت سے تم روح کو زیر نہیں کر سکتے" اور جسم بغیر روح کے بالکل ویسا ہی ہے جیسے ——— جیسے ——— " اس نے رکتے ہوئے مناسب تشبیہ تلاش کرتے ہوئے کہا: "جیسے یہ وادی بغیر بہار کے ——— سو تیری طاقت کی مجھے اتنی بھی پروا نہیں جتنی اس پتھر کی ——— لیکن تیری بدتمیزی، جسارت اور دھمکی کے باوجود میں تیری درخواست پر غور کرنے کو تیار ہوں مگر ایک شرط ہے۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔" جن نے جواب دیا۔

"لوحِ سلیمانی کی قسم کھا!"

"کھائی ——— مگر اب مزید انتظار نہ کرا۔ آتشِ شوق نے مجھے پہلے ہی دیوانہ کر رکھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تمہیں بھسم کر دوں۔"

"لغزش ——— میرے خاندان کی روایت ہے کہ ہمارے یہاں کوئی لڑکی بغیر اپنی رضامندی کے شادی نہیں کرتی۔"

"خوب! تو کیا میں تیری بیٹی سے پوچھ سکتا ہوں کہ کیا وہ ملکۂ جنات بننا منظور کرے گی؟ ——— اے حسینہ! تیری ایک ہاں پر دنیا کی نعمتیں تیرے قدموں میں ہوں گی۔" اور اس نے موتیوں کی ست لڑی مالا اتار کر زینو کے قدموں میں پھینک دی۔ "کوہ قاف کی جھیلوں کا یہ تحفہ تیرے پاؤں کی دھول پر نثار ہے۔"

"کیا تیرے موتی میری جھیل میں کنول کے پتوں پر اوس کے قطروں سے زیادہ حسین ہیں؟" زینو نے موتیوں کی مالا کی طرف بے التفاتی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"او جاہل لڑکی! یہ ان سیپیوں کی سوغات ہے جنہیں قاف کی کنواری پریاں، مینہ کی پہلی بوندوں کی تلاش میں صدیوں اپنی جھولیوں میں لئے پھری ہیں۔"

"مجھے تیرا ہار نہیں چاہئے۔" زینو نے کہا۔ "کیا تو نے اپنے تاج کے پیچھے پا سینگ نہیں دیکھا؟"

عفریت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سر کی طرف گیا۔ وادی کے لوگوں نے جو گیدڑوں کو مارنے کے لئے اپنے گھروں سے آئے تھے اور زینو کے جھونپڑے کے گرد جمع ہو گئے تھے، ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔ شہ جنات نے چیخ ماری اور اس کے خدام "پناہ! پناہ!" پکارتے ہوئے اس کے سامنے سجدے میں گر پڑے۔

"کیا تجھے کچھ اور بھی پوچھنا ہے؟" زینو کے باپ نے دریافت کیا۔ "میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا تیرا ہم سے ملاپ نہیں ہو سکتا۔"

"چپ ہو جا بڈھے!" عفریت گرجا۔ "تجھے اور تیری گستاخ بیٹی دونوں کو اس بدتمیزی اور ناشکری کی سزا دی جائے گی۔"

"تو قسم کھا چکا ہے ——— سلیمان کے عذاب سے ڈر!"

"اسے شطرنج ہی سے فرصت نہیں کہ ان باتوں کی طرف دھیان دے سکے۔ اس کا مجھے کوئی کھٹکا نہیں۔"

"تو اپنے ضمیر سے بھی نہیں ڈرتا؟"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اس قدر توہم پرست واقع ہوا ہے۔"

"اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تو اس قدر سنگ دل اور وعدہ شکن ہے تو میں ان فضول باتوں میں کبھی اپنا وقت ضائع نہ کرتا۔"

"تمہاری زبان گدّی سے کھینچ لی جائے گی۔"

"تجھ پر انگشتِ سلیمانی کا قہر ٹوٹے گا۔"

"اس کا طلسم اپنی طاقت کھو چکا ہے۔"

"تو پھر میں تیرا مقابلہ کروں گا۔" زینو کے باپ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔

"مگر ان جنات کو نہیں دیکھا تو نے —— یہ دیو، یہ گدھ، یہ بھتنے ...... یہ سب میرے غلام ہیں۔" عفریت نے کہا۔

"اور ان کو بھی دیکھ لو۔" زینو کے باپ نے وادی کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ میرے بھائی ہیں، اور ان پہاڑوں کے اُدھر میرے اور بھی بھائی ہیں —— تیرا مقابلہ کیا جائے گا۔"

عفریت چنگھاڑا اور زینو کی طرف بڑھا۔

اور پھر آدمیوں اور عفریتوں کے درمیان وہ جنگ شروع ہوئی جس کا شور سن کر آس پڑوس کی وادیوں سے زینو کے باپ کے دوسرے بھائی بھی اپنی آبائی تلواریں لے کر آ پہنچے جو ایک مدت سے ان کے صندوقوں میں بند تھیں۔

لوگ لاٹھیاں، کلہاڑے، درانتیاں، برچھے اور پھاوڑے لے کر عفریتوں کے لشکر پر پل پڑے اور یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ عفریت گھبرا گیا۔ گلہ بانوں، کسانوں اور ملاحوں نے اس کا تخت توڑ ڈالا۔ اس کے ساتھی دم دبا کر بھاگ گئے اور وہ خود ایک گدھ کی دُم سے لٹک کر بڑی مشکل سے جان بچا سکا۔

لیکن عفریت کے فرار ہونے کے کچھ ہی دیر بعد وادی کے دہانے کی طرف ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور پہاڑ پھٹ گیا اور آسمان کا ایک ایسا منظر آنکھوں کے سامنے نمودار ہوا جسے وادی کے لوگوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

زمین لرزنے لگی اور جیسے اس کے پیٹ میں بادل دھمک رہے تھے، بجلیاں کوند رہی تھیں، وادی کے نشیب و فراز سے گرج کی گونج اٹھی۔ بیریوں کی چڑیاں، جھونپڑوں کے کبوتر، چٹانوں کی ابابیلیں بے تحاشا ہوا میں اڑنے لگیں۔ فضا میں شہد کی مکھیوں کے پر پھڑپھڑائے، جیسے ان کے چھتے پر کسی نے پتھر پھینک دیا تھا۔ بھیڑ بکریاں ممیائیں، زینو کی گائے بلبلا اٹھی، اس کی رسیوں سے گویا بلا دیکھ لیا، جھیل کی جانب سے اڑتی ہوئی مرغابیاں بغیر قطار کے اڑتی نظر آئیں۔ خرگوش اپنے اپنے بھٹ چھوڑ کر نکل آئے اور دیکھنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ درختوں کی شاخوں میں گلہریاں چک چک پوچھنے لگیں کہ یہ کیسی گڑگڑاہٹ ہے جس نے ہمیں درختوں کے کھوکھلوں میں بھی آرام نہیں لینے دیا۔ تتلیوں کے پر ٹوٹے بن کر پھولوں کے کٹوروں میں گر پڑے اور پھولوں کی پتیاں ایک ایک کر کے خاک میں مل گئیں۔ سیب، ناشپاتی اور شفتالو کی شاخوں سے پکے پھل آنسوؤں کی طرح ٹپ ٹپ گرنے لگے اور جھیل کے شفاف پانیوں کی سنہری مچھلیاں کناروں پر تڑپتی دکھائی دیں۔

"بھونچال!" زینو کے باپ نے کہا۔ لیکن پہاڑ کا وہ شگاف بند کیوں ہوا جا رہا تھا۔

"اژدہے!" کسی نے کہا۔

"چیتے!" کوئی پکارا۔

"چیتوں کی آنکھوں والے اژدہے!"

"اژدہوں کے جسم والے چیتے!"

"گینڈے!"

"گینڈے اور ہاتھی!"

"چار چار سونڈوں والے ہاتھی!"

"آگ نکلتی ہے سونڈوں سے!"

"سنو!"

"لمبے لمبے دانتوں والے جنگلی سور!"

"طلسمات!"

"طلسمات!!"

"طلسمات!!!"

"ٹوٹ جائے گا یہ طلسم!" زینو کا باپ پکارا۔ "اپنی زمین کی مٹی اپنے ہاتھوں سے مل لو، امر ہو جاؤ گے تم اس سحر سے ۔۔۔ یہ نفس تمہاری حمیت کا امتحان ہے۔"

زینو کا باپ اور اس کے ساتھی نعرے لگاتے ایک بار پھر جھپٹ کر سوروں پر ٹوٹ پڑے۔ اژدہے آگ اگلنے لگے۔ ان کے نتھنوں سے دھوئیں کے بادل اڑ رہے تھے۔ سوروں کے دانتوں سے چنگاریاں جھڑنے لگیں اور ان کے بوزوں سے لاوا بہہ نکلا۔ زینو کے باپ کے ساتھی کٹ رہے تھے، گر رہے تھے، مر رہے تھے لیکن ان کا ہر قدم آگے ہی کو بڑھتا تھا۔ ان کی دیوانگی نے دیووں کی گرہ ڈھیلی کر دی اور جنات کی فوج پھر اسی شگاف کی طرف پسپا ہوتی نظر آئی جدھر سے وہ داخل ہوئی تھی۔ مگر عین ایسے میں جب کہ ان کی شکست یقینی ہو چکی تھی آسمان یکایک تاریک ہو گیا۔ سورج گدھوں کے پروں کے پیچھے چھپ گیا۔

"ابا!" زینو پکاری۔ "یہ گدھ نہیں رخ ہیں جنہوں نے سندباد کے جہاز کو پتھراؤ سے غرق کر دیا تھا۔"

رخوں کے پرے وادی کے مختلف علاقوں پر پھیل گئے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرتے زمین سے شعلے بھڑک اٹھتے اور لوگ "آگ کے بیچ آگ کے بیچ!" پکارتے ہوئے اپنے گھروں کی آگ بجھانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوتے۔ لیکن زینو کے باپ کے ساتھیوں میں پھر بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کے سینوں میں زینو کے دادا کے احسانات سلگ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے جلتے ہوئے جھونپڑوں سے منہ موڑ لیا اور ناموس کے نعرے لگاتے ہوئے پھر جھپٹ کر ابلیسی کی طرف بڑھے۔

مگر اتنے میں رخوں کے پرے یکایک کہیں غائب ہو گئے اور اس جانب سے جہاں پہاڑ پھٹا تھا ساون کے بادلوں کی طرح کالی کونجوں کا جھنڈ آتا دکھائی دیا۔ ان کی چونچوں میں کچھ چمک رہا تھا۔ جب وہ زینو کے باپ کے لشکر کے اوپر پہنچیں تو انہوں نے اپنی چونچیں کھول دیں اور لشکر پر اشرفیوں کی بارش ہونے لگی ۔۔۔ لوگ اشرفیاں لوٹنے کے لئے لپکے اور آپس میں الجھ گئے۔

زینو اور اس کا باپ اکیلے رہ گئے اور جنات نے انہیں اپنے پنجوں میں جکڑ لیا۔

فضا میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔

"اب بتاؤ!" آسمان سے شہ جنات کی آواز سنائی دی۔ "لیکن ہماری پیشکش بدستور موجود ہے۔ یہ لڑکی اگر اب بھی ہماری ہو جائے تو ہفت اقلیم کی ملکہ کہلائے گی۔"

"چپ ہو جا مردود!" زینو کے باپ کے منہ سے کف جاری ہو گیا لیکن اس کے بازو جکڑے ہوئے تھے۔ اس کا بدن اپنی جھیل کے کنارے بید مجنوں کی شاخوں کی طرح کانپنے لگا۔

"لیکن تو بڈھا ہو گیا ہے شاید، اور اپنی برائی بھلائی کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم تیری بیٹی سے بات کریں گے ۔۔۔ کہاں ہے وہ؟" شہ جنات نے تالی بجائی۔ "وہ تاج کہاں ہے؟ ہماری ملکہ کا تاج، جسے ہمارے دربار کی کنواری پریوں نے ہماری دلہن کے لئے تیار کیا ہے ۔۔۔ دیکھ لڑکی ادھر دیکھ! اس ہیرے کو دیکھ، ملکہ سبا کے تاج میں بھی ایسا نگینہ نہیں ملے گا تجھے ۔۔۔ اور یہ نیلم دیکھ رہی ہے تو، ساتویں آسمان کی نیلاہٹ اس کے آگے ماند ہے اور یہ زمرد روئے ارض کا سبزہ اس سے اپنا رنگ ادھار مانگتا ہے۔ یہ لعل پریوں کا تحفہ ہے تیرے تاج کے لئے ۔۔۔ اور تو نے کہا نہیں ہیں

لعلِ بدخشاں کا نام سُنا ہوگا! ان لعلوں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بدخشاں کے سوداگر اپنا ایمان نیلام کرتے ہیں۔ اس میں اس آگ کی سرخی بند ہے جنہیں ہماری بہاریں کبھی بجھنے نہیں دیتیں۔ خواجہ سنگ پرست کو اگر ان لعلوں کی آب کا حال معلوم ہو جائے تو اپنے کتے کا پٹہ اتار کر اپنے گلے میں ڈال لے ——— لیکن تیری ایک 'ہاں' پر یہ تاج تیرا ہے۔"

"تیرا تاج میری وادی کے خودرو گلاب کے تاج سے بہتر ہے؟ اور تیرے زیورات جن کا تو مجھے لالچ دے رہا ہے ان گجروں سے اچھے ہیں جو بادام کی شاخیں میرے لئے ہر روز گوندھتی ہیں؟" زرینہ نے پوچھا۔

"سُن لیا تو نے؟" زرینہ کے باپ نے کہا، اور اب کہ وہ آخری بار تنبیہ کر چکا ہے، "اگر تیری آگ میں غیرت کی کوئی بجھی ہوئی چنگاری بھی موجود ہے تو تیرا راستہ وہ ہے جو ادھر سے گزرتا ہے ——— رہے ہم اور ہمارے جلے ہوئے جھونپڑے، کھیتوں کھلیانوں میں ہمارے مردے، اور ہمارے باغوں میں بجھے ہوئے پھول اور کلیاں ——— سو ہم سمجھیں گے کہ یہ ہماری شامتِ اعمال تھی۔ جا ——— اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔"

"جذباتی بڈھا!" حضرت نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"مطعون ناری؟" زرینہ کا باپ بھڑک اٹھا۔ "تو ہمارے جذبات کو کیا سمجھ سکتا ہے ——— ہماری بیوائیں، ہمارے یتیم، ہماری بیمار بوڑھیاں ...... اور سب سے بڑھ کر ہماری عزت جو تیری شیطانی فوج کے ہاتھوں برباد ہوئی ——— تجھے ان جذبات کا کیا احساس ہو سکتا ہے۔ ہوس کار حضرت! جا دور ہو یہاں سے، ورنہ ایک ایک لاش بھڑک اٹھے گی اور پھر تجھے ——— تجھ ناری کو بھی اس حدت سے پناہ نہ ملے گی۔ سمندروں کا پانی، صحراؤں کی گھٹائیں، پہاڑوں کی برف اور کرۂ زمہریر کی ہوائیں بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکیں گی ——— جا ——— جہنم کی مخلوق دور ہو جا یہاں سے!"

"کپڑا ٹھونس دو اس بد لگام بڈھے کے منہ میں اور اس کی مغرور بیٹی کو اندھے غار میں ڈال دو۔ لیکن ٹھہرو ——— باپ بیٹی ایک دوسرے کے قریب رہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم رحم و کرم کے جذبات سے عاری تھے۔"

اور بھولے بھٹکے سیاحوں کا بیان ہے کہ زرینہ کی وادی میں اب زعفران کے کھیتوں سے لاشوں کا تعفن پھوٹتا ہے! تاکستانوں کی بیلیں سوکھ گئی ہیں، عشق پیچاں کو امربیل کھا گئی ہے، تھوہر کے کانٹوں نے نرگس کی آنکھیں پھوڑ دی ہیں، چشموں کا پانی پہاڑوں کے سینے میں جذب ہو گیا ہے، جھیلوں میں سنہری مچھلیوں کے بجائے جونکیں رینگتی ہیں، کنول کے پھول بجھے دلوں کی طرح سیاہ پوش ہیں، سیب کی شاخوں سے پتھر لٹکتے ہیں، جگنو اپنی چمک بھول چکے ہیں، کوہساروں سے مرغ زریں پر کٹے کا گمان گزرتا ہے اور کوہ گراں خواب کی برفوں کے پیچھے نیلم کی رگیں کوئلہ بن گئی ہیں، شہد کی مکھیاں زنبوروں کی طرح ڈستی ہیں اور ان کے چھتوں میں تتلیوں کا بسیرا ہے، گلوں کے تختوں سے بچھو نکلتے ہیں ...... اور ان فضاؤں میں جہاں کبھی تتلیوں کے پر جھلملاتے تھے اب چمگادڑ مردہ چوہوں کی بو پھیلاتے ہیں ...... گڈریوں کے چنگ گنگ ہیں اور پن چکی سے مکی کے سنہرے آٹے کی بجائے شعلے لپکتے ہیں

اور

اندھے غار کی گہرائیوں سے کبھی کبھی "مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!" کی آواز آتی ہے اور غار کے باہر، ایک بڈھا جس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہے، پاؤں میں زنجیریں ہیں اور ہاتھ ستونوں کے پیچھے بندھے ہیں، اپنا سر پتھروں سے پٹختا ہے لیکن اس سے لہو کا ایک قطرہ نہیں نکلتا ——— خیال ہے کہ بے بسی کے احساس نے اس کا سارا خون خشک کر دیا ہے۔

ایک انسان کی موت

فکر تونسوی

شہر کے سب سے بڑے اور بارونق چوک پر ایک انسان کی لاش پڑی ہے۔ وہ ابھی ابھی دس منٹ پہلے مرا ہے۔ اس نے دانائی یہ برتی کہ فٹ پاتھ پر مرا۔ اگر وہ چوک کے عین درمیان مرتا تو ٹریفک رک جاتا اور آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی۔ —— مرنے والے زندہ رہنے والوں سے زیادہ ذمہ دار انسان ہوتے ہیں۔

"ارے! —— یہ تو شبو فقیر ہے!" —— شبو فقیر کے ایک کامریڈ نندو فقیر نے آگے بڑھ کر اعلان کیا —— نندو فقیر شبو فقیر سے تین گز کے فاصلے پر بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا ہے۔ اس لئے پڑوسی ہونے کے ناطے اس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ آگے آئے اور لوگوں کو بتائے کہ میرے مرحوم پڑوسی کا نام کیا ہے —— چنانچہ وہ سنجیدگی سے آگے بڑھ آیا۔ وہ لاش پر جھکا اور ہمدردانہ نگاہ شبو پر ڈالی، جیسے وہ نگاہ کہہ رہی ہو —— "میں نہ کہتا تھا شبو! آخر تم مر جاؤ گے اور تمہاری اس جگہ پر مجھے ہی بیٹھ کر بھیک مانگنی پڑے گی؟"

شبو —— قسمت کا دھنی تھا۔ کیونکہ وہ عین اس بارونق چوک پر بیٹھا کرتا تھا۔ جہاں سے پل کے نیچے سے اترنے چڑھنے والی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ اور اس کا کامریڈ نندو فقیر نے اس نادر جگہ کو حاصل کرنے کے لئے جانے کتنی بار دعا کی تھی جب جانے شبو مرے ——

نندو نے اپنے کانوں پر سے ادھ جلی بیڑی اتاری ہے اور شبو کی لاش کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ماچس نکالی ہے اور بیڑی سلگا کر ماچس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا ہے —— "میرا اور شبو کا دس سال کا ساتھ تھا۔ ہم بالکل بھائیوں، دوستوں کی طرح بھیک مانگا کرتے تھے۔ آہ! بھگوان نے اسے مجھ سے پہلے بلا لیا ——"

ایک ٹھنڈا سانس بھر کر بڑی حد تک وہ رونے لگتا ہے۔ اور روتے روتے قریب سے گزرتی ہوئی ایک اپ ٹو ڈیٹ اور خوشحال جیب کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگتا ہے —— "بابو! بھگوان کے نام پر ایک پیسہ۔ بھگوان تجھے امیر بنائے رکھے۔"

شبو کا منہ کھلا ہوا ہے۔ جیسے مرتے ہوئے منہ میں بھیک مانگنے کا انداز نہیں ہے۔ کیونکہ موت کے بعد کسی کے لئے بھیک مانگنی غیر ضروری ہے۔ اس کے ساتھ

گٹی سے بھینچے ہوئے ہیں۔ اس کا چہرہ خشک، زرد اور پھیکا پھیکا سا ہو گیا ہے۔ کلائی کی ہڈیاں اور نیلی نیلی رگیں پوری آب و تاب سے اُبھر آئی ہیں ——— غرض کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر لاش کو خوبصورت کہا جا سکے۔ لباس دریدہ اور میلا پڑا ہے۔ وہ تین جگہوں پر جو پیوند لگے ہوئے ہیں وہ اصل لباس سے زیادہ صاف اور چمکیلے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر یہ حسرت ہوتی ہے کہ شمبھو کا پیوند لگانے کا ٹیسٹ کافی جدید اور ترقی یافتہ تھا۔

شمبھو کی لاش سے ڈیڑھ گز کے فاصلے پر ہی اسے بوٹوں کا سوداگر آرام سے بیٹھا ہے۔ وہ پالش سے چمکتے ہوئے [illegible] بوٹوں کو [illegible] میں مصروف ہے۔ وہ شمبھو فقیر کی موت سے بے خبر ہے۔ وہ اس لئے نہیں ہے کیونکہ شمبھو نے کبھی اس سے پرانا بوٹ نہیں خریدا تھا۔ اس لئے اُسے یہ بھی معلوم نہیں ہوا کہ شمبھو فقیر مر گیا ہے۔ وہ اپنے گاہک سے کہہ رہا ہے ۔ ”جناب! میں نے یہ بوٹ امریکہ کے ایک خاص فوجی آفیسر سے حاصل کیا ہے۔ آپ بھی اسے پہن کر فوجی آفیسر معلوم ہوں گے۔“

شمبھو مرا پڑا ہے۔ اور ڈیڑھ گز کے فاصلے پر جو شخص ابھی مرا نہیں ہے، فوجی آفیسر بننے میں مصروف ہے ——— اس سے پرے ایک جوتشی پانسے پھینک رہا ہے۔ اور غیب کے خزانے ڈھونڈنے میں جٹا ہوا ہے۔ ایک [illegible] سی بھدی عورت [illegible] عمر کی عورت اپنے میلے دانت کھول کر ہنس رہی ہے اور مردوں کے ہاتھ سانڈے کا تیل بیچ رہی ہے۔ اٹھارہ سال کی ایک شوخ و شنگ کنواری لڑکی اپنے ایک کنوارے عاشق کے ساتھ آئس کریم کھا رہی ہے اور کنوارا عاشق کہہ رہا ہے کہ یہ آئس کریم تمہارے ہونٹوں کی طرح شیریں اور لذیذ ہے۔ ایک دہقانی بھی جو کہ اپنے کھیتوں کی گلی سڑی ترکاری لئے ہوئے اس حسین کنواری کی منت خوشامد کر رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ میرے کیلے آئس کریم سے زیادہ میٹھے اور لذیذ ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ یہ ساری ترکاری صرف دو آنے میں دینے کو تیار ہے ——— سارا فٹ پاتھ زندہ رہنے میں مصروف ہے ——— شمبھو کے بارے میں ہر ایک کو صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ مر گیا ہے، یہی اطلاع کافی ہے اس سے زیادہ اطلاع کے لئے اُن کے ذہن میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کے ذہن کی بیشتر جگہ پرانے بوٹوں، آئس کریموں، غیب کے خزانوں، سانڈے کے تیل اور گلے سڑے کیلوں سے گھری ہوئی ہے۔

”اسے کیا ہو گیا ہے؟“ لاش کے قریب گزرتے ہوئے ایک معزز آدمی نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے مر گیا ہے“ دوسرے معزز آدمی نے نہایت ایمانداری سے جواب دیا ہے۔

”مر کیوں گیا ہے؟“

”سالا گھٹیا اور زیادہ بیڑیاں پیتا ہوگا۔ اس لئے اُسے دمہ ہو گیا ہوگا۔“

”آپ بجا فرماتے ہیں ایسے بھی دمہ کا ہی کیس دکھائی دیتا ہے۔“ پہلے معزز آدمی نے نہایت [illegible] لہجہ میں تائید کی ہے۔ اور پھر وہ ہلکا پھلکا ہو کر چلا گیا ہے۔ جیسے اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اگر اسے یہ نہ بتایا جاتا کہ شمبھو دمہ سے مرا ہے تو اسے سخت جسمانی کرب ہوتا۔ چنانچہ اپنے جسمانی کرب کا علاج کر کے وہ مطمئن ہو کر چلا گیا ہے۔

”میرے خیال میں کسی سپاہی کو بلا لینا چاہئے“ ایک اور آدمی نے رائے دی ہے ——— ہر آدمی کو کوئی نہ کوئی رائے دینا پڑتی ہے۔

”میرا خیال ہے سپاہی کو نہیں بلانا چاہئے“ دوسرے آدمی نے پہلے آدمی کی رائے کو جڑ سے کاٹ دیا ہے۔

پہلا آدمی لاجواب ہو گیا ہے اور غصہ میں آکر جیب سے چلغوزے نکال کر چبانے لگا ہے۔ اس کی رائے کی ساری عزت نہیں کی گئی ہے لہذا وہ شمبھو کی لاش سے سخت ناراض ہو کر چلا گیا ہے۔ اگر پولیس کے سپاہی کو بلا کر لاش اس کے حوالے کر دی جاتی تو آخر کس کا کیا بگڑ جاتا! لوگ زمانے پولیس سے اتنا کیوں بدکتے ہیں کہ اپنے مُردے بھی اُس کے حوالے کرنے سے گھبراتے ہیں۔

سڑک کا ٹریفک نہایت زور شور سے جاری ہے۔ بسیں، لاریاں، کاریں، موٹر سائیکلیں، ٹرک، سائیکلیں ——— سبھی مشینیں نہایت تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ ہر مشین کی رفتار کی سوئی اپنے توازن میں ہے۔ اور اپنے مقررہ نشان پر ٹکی ہوئی ہے۔ کسی کا پٹرول ختم نہیں ہوا۔ کسی کے ٹائر میں نقص پیدا نہیں

ہو رہا۔ کوئی ہنگامہ ایسا پیدا نہیں ہو رہا جس کی وجہ سے کچھ لوگ رک جائیں اور شمبھو کی لاش پر ایک نظر ڈال لیں۔ شاید شمبھو کی موت سے کسی کو دلچسپی نہیں ہے۔ کیونکہ شمبھو انسان تھا اور انسان اور مشینوں میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ انسان جذبات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ مگر مشین پرزوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔

ایک کتا حرکت کرتا ہوا شمبھو کی لاش کے قریب سے گزرتا ہے۔ ایک دو سیکنڈ کے لئے شمبھو کی لاش کے پاس ٹھٹکتا ہے۔ وہ لاش کو پہچاننے لگا ہے۔ وہ لاش کو پہچان گیا ہے کیونکہ شمبھو اور وہ دونوں کئی بار اکٹھے سوتے رہے ہیں۔ کتے نے لاش کو پہچان کر پیار سے دم ہلائی ہے۔ مگر شمبھو کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی ہے۔ اس نے مزید توجہ دلانے کے لئے اور شمبھو کو چھیڑنے کے لئے اس کے ساتھ رکھی ہوئی گٹھڑی کو سونگھا ہے۔ مگر شمبھو کی لاش بدستور بے حس پڑی ہوئی ہے۔ کتا مایوس ہو گیا ہے۔ اس نے ایک آخری کوشش کی ہے اور سامنے گزرتے ہوئے آدمیوں پر بھونکا ہے۔ شاید اس کا خیال ہے کہ یہ لوگ شمبھو کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ شمبھو کے دشمن ہیں۔ لیکن کیا فائدہ۔ دم ہلاتے ہوئے وہ شمبھو کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ شمبھو کی موجودگی نے کیا ہے۔

لاش کے قریب آدمی آتے ہیں، ایک دو منٹ ٹھہرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہر آدمی یہ تصدیق کر کے آگے بڑھتا ہے کہ واقعی ایک انسان مرا ہے۔ یہ لاش ایک ایسے چبوترے کی طرح دکھائی دے رہی ہے جہاں سے لوگ ایک دو منٹ میں کراس کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شمبھو کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں نے آ کے اس کو پاس کیا ہے۔ وہ زندگی بھر وہ بھیک کے لئے لوگوں کو پکارتا رہا، ہاتھ جوڑ جوڑ کر پکارتا رہا، مگر کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ —— موت نے اسے زندہ لوگوں کے بہت قریب کر دیا ہے۔

"اس کے اوپر کوئی کپڑا ڈال دینا چاہئے۔ لاش کو کھلا رکھنا مناسب نہیں ہے۔" —— ایک کھدر پوش نے انسانیت کی بلندیوں سے پکارا ہے۔

"ہاں، ضرور ڈال دینا چاہئے۔ آخر انسان کی لاش ہے۔ لوگ تو جانوروں کی لاش پر بھی بوری ڈال دیتے ہیں۔" —— دوسرے نے انسان کو جانور سے بلند کرنے کا اعلان کیا ہے۔

معاملہ معمولی سا ہے۔ اس لئے کوئی آدمی بھی یہ بات منہ سے کہنے کی ہمت نہیں کر رہا بلکہ ایک شخص نے تو آگے بڑھ کر ایک میلا کچیلا کھیس شمبھو پر ڈال بھی دیا ہے —— یہ کھیس خود شمبھو کا ہے، وہ اس کی گٹھڑی کے اوپر پڑا ہوا تھا۔ اس کھیس نے زندگی بھر اس کا ساتھ دیا ہے اور اب موت کے وقت بھی دے رہا ہے —— میلے کچیلے کھیس سے میلی کچیلی لاش ڈھانپ دی گئی ہے۔ رنگ سے رنگ میل کھا گیا ہے۔

"اس کے منہ پر کھیس مت ڈالو!" کسی نے سختی سے پروٹسٹ کیا ہے۔

"نہیں نہیں، ڈال دو!" کسی نے ناک پر رومال رکھتے ہوئے کہا ہے۔

"نہیں نہیں، مت ڈالو، پتہ کیسے چلے گا کہ کھیس کے نیچے مردہ پڑا ہے؟" اس آدمی نے خطرہ کی گھنٹی بجائی ہے۔

"یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ضرورت ہے۔"

"نہیں ہے۔"

"ہے!"

"نہیں ہے۔"

اس آدمی نے سیکنڈوں میں آ کر لاش کے منہ پر سے کھیس ہٹا دیا ہے۔ دوسرے نے غصہ میں آ کر دوبارہ کھیس منہ پر ڈال دیا ہے۔ پہلے نے پھر ہٹا دیا ہے، دوسرے نے پھر ڈال دیا ہے اور پھر دونوں نے کھیس کو چھوڑ کر ایک دوسرے کے منہ پر گھونسہ مارا ہے اور حق اور صداقت کی لڑائی ہونے لگی ہے اور پھر اس لڑائی کو چار آدمیوں نے بیچ میں پڑ کر ختم کرا دیا ہے اور وہ دونوں صداقت کی لاش میں دو مختلف سمتوں کو چلے گئے ہیں۔ —— ایک گھٹیا موضوع پیدا ہو گیا

ہے۔ جب زندہ شمبھو پر کوئی کیس ہی نہیں رہا تھا تو اب مردہ شمبھو پر لڑنے کا کیا فائدہ ہے ——— اور پھر رحم اور پیار کا زمانہ تو ویسے ہی ختم ہو گیا ہے۔

اب لاش اپنا منہ چھپائے ہوئے پڑی ہے۔ اُس کے قریب کوئی آدمی نہیں ہے۔ جتنے آدمی آئے تھے، وہ اپنا اپنا فرض ادا کر کے جا چکے ہیں۔ کسی نئے آدمی کو پتہ نہیں چل رہا کہ کمبل کے نیچے شمبھو سو رہا ہے یا مر گیا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے چند منٹ پہلے شمبھو کو جو موت آئی تھی۔ وہ کمبل ڈالتے ہی بھاگ گئی ہے۔ یعنی زندگی اور موت کے درمیان کمبل آ گیا ہے۔ جس نے زندگی اور موت کے درمیان ایک خلیج حائل کر دی ہے۔

تین چار منٹ سے لاش کمبل کی اوٹ میں ہے۔ اور پھر وہ تیرہ سال کا ایک نحیف سا لڑکا منگلو، انگلی تھامے آیا ہے۔ اس نے پہلے شمبھو کا کمبل جھنجھوڑا ہے اور پھر منہ سے کپڑا ہٹا دیا ہے۔ موت ایک بار پھر سورج کی روشنی میں چمک اٹھی ہے۔ لاش کی اس حرکت سے منگلو ڈر گیا ہے۔ اور اس نے بلبلاتے ہوئے لہجہ میں کہا ہے:۔

"بابا! ——— بابا! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"ابے سالے! مر گیا ہے تیرا بابا!" قریب کھڑے ہوئے ایک گنڈیری والے شخص نے جیسے اُسے ترس دلاتے ہوئے کہا ہے۔

"کیسے مرا؟"

"موت سے!"

"ابھی ابھی تو میرے سے اچھا بھلا چھوڑ کر گیا تھا؟"

"ابے اتنا ڈر تو نہیں تھا کہ تم سے پوچھ کر مرتا۔ اُس کا جی چاہا اور مر گیا۔ !!!! — !! ——— گنڈیریاں ایک آنے کی پانچ۔ رے بھائیو! ایک آنے کی پانچ۔"

منگلو کی خوف زدہ آنکھیں یکدم خیرہ ہو گئی ہیں۔ اُس نے کمبل کے اندر اپنا ہاتھ ڈال کر شمبھو کی ڈب کھولی ہے۔ اس میں سے کچھ ریزگاری نکلی ہے۔ جسے اُس نے احتیاط سے جیب میں ڈال لیا ہے۔ اُسے شاید بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ اس لئے اس نے اپنے پھٹے پرانے کوٹ کی جیب میں سے دو روٹیاں نکالی ہیں۔ گٹھڑی کھول کر اس میں سے سبزی کا سالن نکالا ہے اور لاش کے قریب بیٹھ کر کھانے لگا ہے۔ . . . روٹی کے دو چار لقموں نے ہی اس کے رخساروں پر لہو دوڑا دیا ہے۔ اس چہرے میں ایک طمانیت ہے۔ جو بھیک میں ملی ہوئی سوکھی روٹی میں سے پھوٹ نکلی ہے۔ اور شمبھو کا لڑکا چونکہ شمبھو کی طرح ابھی مرا نہیں ہے اس لئے وہ طمانیت محسوس کر سکتا ہے۔

منگلو نے کھانا ختم کیا ہے، بڑی صفائی سے شمبھو کی گٹھڑی میں سے اپنے کپڑے نکالے ہیں۔ ایک کٹورا، ایک گلاس اور ایک پرانی چپل نکال لی ہے اور باقی گٹھڑی وہیں باندھ کر رکھ دی ہے۔ اور پھر اپنی اشیاء کی ایک نئی گٹھڑی بنا کر گنگناتا چلا گیا ہے ؎

جوبن کے دن چار ——— اے گوری
جوبن کے دن چار
لوٹ لے موج بہار ——— اے گوری
جوبن کے دن چار ———

اب لاش پھر ایک بار ننگے منہ پڑی ہے۔ نئے نئے راہگیر آ جا رہے ہیں۔ مگر وہ پرانی پرانی باتیں دُہرا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے، جیسے شمبھو کی لاش پر کوئی اچھوتی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اور اب لاش ایک ایسے ریگستان کی طرح پڑی ہوئی ہے۔ جہاں سالوں میں ایک آدھ سے زیادہ بارش نہیں ہوتی۔

"یہ لاش آخر کب تک یہاں پڑی رہے گی؟" قریب کھڑے ہوئے گنڈیری والے شخص نے ایک جوان سے کہا۔

"میں کیا جانوں، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟"

"میرے خیال میں لاش کو یہاں سے اُٹھوا دینا چاہئے بُری لگ رہی ہے۔" گنڈیری والے نے ایک تجویز اٹھائی۔

"ہاں بڑی بُری لگ رہی ہے۔ زندہ انسانوں کے درمیان ایک مُردے کا پڑا رہنا ؟؟؟ ...... بھگی بھگی!" بدھا رام نے ایک ٹھیلے سے بُوٹ کو میلے سے کپڑے سے جھاڑتے ہوئے کہا۔

"مگر اُٹھوایا کیسے جائے۔ اس سالے کا کوئی ساک سمبندھی بھی تو نہ ہوگا؟"

"تو پھر؟ ...... میرا خیال ہے، پٹری والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ سب مل کر اس کے کفن دفن کے لئے چندہ اکٹھا کریں؟"

"تجویز بُری تو نہیں۔ مگر پٹری والے مانیں گے نہیں۔ سب حرامی ہیں۔ یہ انسان کی قدر کیا جانیں ——— اچھا ذرا خیال رکھنا بھیا! میرے بُوٹوں کا۔ میں ذرا سامنے دُکان سے چائے پی آؤں۔"

بدھا رام چائے پینے چلا گیا ہے ——— سارے پٹری والے حرامی ہیں۔ چائے کے گھونٹ پیتے ہیں۔ گنڈیری والا شاید سوچ رہا ہے کہ بدھا رام ٹھیک کہتا ہے۔ پٹری والے انسان کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ ابھی تو آدھی گنڈیریاں بیچنا باقی ہیں۔ لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں بیچنا بہت بُرا لگتا ہے۔ گاہک لاش کے پاس کھڑے ہو کر گنڈیریاں خریدنے سے ہچکچاتے ہیں۔ گزشتہ آدھے گھنٹے سے ایک بھی گاہک قریب نہیں پھٹکا ہے۔

وہ اپنا خوانچہ اُٹھا کر چل دیا ہے۔ اور سامنے والے فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے ——— پٹری والے سب حرامی ہیں۔ انسانوں کی قدر نہیں کرتے گنڈیریوں کی زیادہ کرتے ہیں۔

لاش پر جو مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ وہ گنڈیریوں کی وجہ سے تھیں۔ اب وہ مکھیاں بھی شمبھو کو چھوڑ کر گنڈیریوں کے پیچھے پیچھے دوسرے فٹ پاتھ پر جا رہی ہیں ——— ہر چیز شمبھو کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔

پانچ منٹ اور گزر گئے ہیں۔

نند فقیر پھر لنگڑاتا ہوا آیا ہے، وہ لاش کے گرد گدھ کی طرح منڈلانے لگا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہے۔ جس کا چہرہ ایک نیک قسم کا ہے۔ اس نے بازو پر ایک بلّا لگا رکھا ہے۔ جس پر "جماعت خادمانِ قوم" کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس نے جیسے لاش کو سونگھ کر پوچھا ہے،

"اچھا تو یہ لاش ہے؟"

"جی ہاں" نند فقیر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا ہے۔ "بھیک مانگتا تھا، کئی دنوں سے بیمار تھا، آج مر گیا بے چارا۔"

"کوئی پروا نہیں، ہماری جماعت اس کے کریا کرم کا بندوبست کرے گی۔ آہ! دیکھیں بھکاریوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔"

نند فقیر کو بھکاریوں کے فلسفہ پر بحث میں حصہ لینے کا کوئی شعور نہیں ہے۔ اس لئے وہ مضطرب ہے اور کہہ رہا ہے۔ "اسے آپ کیسے اُٹھوا کر لے جائیں گے؟"

"مزدوروں کے ذریعے رسّے سے باندھ کر۔"

وہ شخص مُردے اُٹھوانے کا شاید تجربہ رکھتا ہے۔ اس نے دو مزدوروں کو اشارے سے بلایا ہے اور انہیں حکم دیا ہے کہ لاش کو رسّے سے باندھ کر سر پر اُٹھا کر جماعت کے دفتر تک لے چلو۔"

نند فقیر نے رسّہ بندھوانے میں نہایت پھرتی سے امداد دینا شروع کر دی ہے۔ راہگیر ایک لاش کو رسّہ بندھتے دیکھ کر پھر اکٹھے ہو گئے ہیں۔ رسّہ باندھنا ایک تماشہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہر تماشہ ہر راہگیر کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ کشش ثقل کا اصول ہے۔

"یہ بہت بے ادبی ہے۔ انسانی لاش کو رسّہ نہیں باندھنا چاہئے۔" ایک راہگیر نے حقارت سے کہا ہے۔

"تو پھر آپ اپنے گھر سے ایک چارپائی لا دیجئے۔"

"میں ہوٹل میں رہتا ہوں، میری اپنی چارپائی کوئی نہیں ہے۔"

ہوٹل والا لطیفہ خوبصورت ہے، سب کو مزا دے گیا ہے۔ اور سبھی بے ساختہ ہنس پڑے ہیں۔

مجمع دیکھ کر ایک کانسٹیبل فٹ پاتھ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مجمع کو ڈنڈا لہرا کر دور ہی سے دھکا رہا ہے۔ "ایک طرف ہٹ جاؤ، کیوں اکٹھے ہو رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"یہ شمبھو فقیر مر گیا ہے۔" خادم قوم نے جیسے رٹا ہوا جواب دیا ہے۔

"کیوں مر گیا ہے؟ کیسے مر گیا ہے؟ کس نے مارا ہے؟" کانسٹیبل نے آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی ہے۔ اور لاش کے سرہانے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ مزدوروں نے وقتی طور پر کام بند کر دیا ہے۔ انہیں قانونی آرڈر کا انتظار ہے۔

"یہ لاوارث لاش ہے، اور ہماری جماعت اسے شمشان لے جا رہی ہے۔" خادم قوم نے فخر کے ساتھ اعلان کیا ہے۔

"کون سی ہے تمہاری جماعت؟ ہونہہ! میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کی چوسا ماشیاں۔ تم اسے مار کر اب لاش چھپانا چاہتے ہو؟"

ڈنڈے کی آواز پھر ابھری ہے۔ جس سے سبھی لوگ سہم گئے ہیں۔ کئی کئی کترا کر نکل گئے ہیں۔ خادم قوم پورے جوش و خروش سے آگے بڑھا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"اس فقیر کے قاتل تم ہو، ہمارا سماج ہے، ہمارا نظام ہے، ہماری سرکار ہے۔ انسان سڑکوں پر یوں بھوک کے مارے مر رہے ہیں۔ اور تم ہتھکڑی ہاتھ میں لئے مردوں کو گرفتار کرنے کے لئے پھر رہے ہو۔ شیم! شیم!"

سبھی لوگ اس تقریر سے متاثر ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ "شیم! شیم!"

"اپنا لیکچر جیب میں رکھ،" کانسٹیبل اپنے وقار کو مٹی میں ملتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ "میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں، کیونکہ تم قانونی کارروائی میں رکاوٹ ڈال رہے ہو۔"

سبھی لوگ کانسٹیبل کی معقول بات سے متاثر ہوئے ہیں —— شیم! شیم!

نندو فقیر کی حالت دگرگوں ہے —— اسے قانون کے باریک نکتوں کی سمجھ نہیں ہے۔ اس لئے وہ گرفتاری کے ڈر سے کھسک کر اپنی پرانی جگہ پر جا بیٹھتا ہے۔

"تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔ میں خادم قوم ہوں۔" خادم قوم کا چہرہ غصہ سے سرخ ہے۔

"چلو چلو، بکواس بند کرو، اور تھانے چلو۔"

"یہ لاوارث لاش ہے، اس لئے قوم کی امانت ہے، اسے میں لے جاؤں گا۔"

"تم اس لاش کو ہاتھ تک نہیں لگا سکتے۔"

"میں اسے لے جائے بغیر ٹلوں گا نہیں۔"

کانسٹیبل نے اس کی کلائی میں ہتھکڑی ڈال دی ہے۔ لوگ تذبذب میں ہیں کہ لاش کس کے ہاتھوں میں زیادہ محفوظ رہے گی۔ پولیس کے یا خادم قوم کے۔

"مجھے شک ہے کہ اس کی موت کے ذمہ دار تم ہو۔" کانسٹیبل نے خادم قوم پر آخری اور بھرپور وار کیا ہے۔ "اس لئے اب تمہارے خلاف مقدمہ چلے گا۔"

شمبھو کو کس نے مارا ہے؟ اس سلسلہ میں شمبھو خاموش ہے۔ اپنی موت کے متعلق وہ کچھ کیا کہے۔ اپنے دفنانے کے بارے میں اس کا اپنا نقطہ نظر کیا ہے؟ اس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا۔ کیونکہ شمبھو اپنی لاش کے مستقبل سے بے نیاز ہو کر مرا پڑا ہے۔ خادم قوم ہتھکڑی پہن کر سپاہی کے ساتھ چلا جا رہا ہے اور نہایت جوشیلے انداز میں کہتا جا رہا ہے —— "میں عدالت میں ثابت کروں گا کہ اس موت کا اصل ذمہ دار کون ہے۔ ...... میں حق اور صداقت ......"

وہ چلے گئے ہیں۔ رنگ بھی چلے گئے ہیں۔ شمبھو کی لاش پر سے اب مطلع پھر صاف ہو گیا ہے۔

اب شمبھو کی لاش بھی رنگوں سے کٹ گئی ہے۔

تین چار منٹ اور گزر گئے ہیں۔

تین چار منٹ اور

——— دس پندرہ اور

اور پھر لاش میں ایک خفیف سی حرکت پیدا ہوئی ہے۔ اس کے منہ سے ایک خفیف سی کراہ نکلی ہے جیسے کوئی لگ لگ کر سانس لے رہا ہو۔ اس نے نہایت کرب اور اذیت کے ساتھ بوجھل اپنی آنکھیں کھولی ہیں۔ — اور پھر بند کر لی ہیں، پھر کھولی ہیں اور پھر بند کر لی ہیں۔ اور پھر جیسے بڑی مشکل سے اٹھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر نقاہت کے باعث اس سے اٹھا نہیں جا سکا۔ اس نے چند بے معنی الفاظ منہ سے نکالے ہیں۔ اس نے بھیگی ہوئی سڑک کی طرف کانپتا ہوا ہاتھ پھیلا دیا ہے۔

نندو فقیر بھاگ کر لنگڑاتا ہوا اس کے پاس آ گیا ہے۔

"شمبھو! — تم ...... تمہیں ...... بچو! تم تو زندہ بیٹھے ہو!" شمبھو نے اٹھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس کا سر اٹھ نہیں رہا ہے۔ نندو چونکہ اس کا کامریڈ ہے اس لئے وہ شمبھو کے سر کو سہارا دے کر اٹھا رہا ہے۔ "تمہیں کیا ہو گیا تھا؟"

"کچھ نہیں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔ کہیں سے پانی لاؤ۔"

نندو فقیر پانی لینے چلا گیا ہے۔ اس کے قدم من من کے بھاری ہو رہے ہیں۔

"گنڈیریاں ایک آنے کی پاؤ" سامنے کے فٹ پاتھ سے آواز اُبھری ہے۔

"مالٹے کابلی! مالٹے کابلی!" ایک اور آواز جاگی ہے۔

"صاحب! بالکل امریکی بوٹ ہیں، خالص فوجی......" ایک اور سازشی آواز شمبھو کے کانوں میں پڑی ہے۔

شمبھو نے ایک ہاتھ اپنے ڈوبتے ہوئے دل پر رکھا ہے۔ اور دوسرا ہاتھ ایک حسین راہگیر جوڑے کی طرف پھیلا دیا ہے۔

"جوڑی جیتی رہے بابو جی! بھگوان کے نام پر ایک پیسہ!"

پکّی اینٹ

غلام علی چودھری

آدھی صبح کی اذان کے ساتھ کندھے پر بندوق رکھ کر گھر سے نکلا ہوں پانچ سات کوس ٹیلوں ڈھلانوں پر یہی دوڑتا پھرا ہوں اور ہوں شہر کا رہنے والا تو معاملہ کچھ زیادہ ہی رنگیں ہو جاتا ہے۔ میں کنوئیں پر پہنچا تو بے طرح ہانپ رہا تھا اور سر سے پاؤں تک پسینے سے شرابور تھا۔ بندوق میں نے شیشم کے تنے کے ساتھ کھڑی کر دی اور تھیلا زمین پر رکھ دیا۔ بوٹ اتار کر گیلی جگہ پر پاؤں رکھے تو آنکھوں تک ٹھنڈک پہنچ گئی۔ پہلے میں نے اوک سے پانی پیا پھر پتلون گھٹنوں تک چڑھا کر پنڈلیوں تک ٹانگیں چاہ بچے میں ڈبو دیں۔

بوڑھا گادی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا جتی جتائی جوڑی رک گئی تو وہ دھچکا کھا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ایک ڈنڈا اس نے بیلوں کی ٹانگوں پر مار کر انھیں یوں ہانکا کہ کنوئیں کی شامت آ گئی۔ گہرا سانولا رنگ، سر پر چھوٹی سی پگڑی، بڑا سا کھلا تہبند باندھے ننگے سے ننگا، سفید داڑھی ناف سے کچھ ہی اوپر تھی۔ بیچ سامنے چاہ بچے کی دوسری طرف بیٹھ گیا اور ڈنڈے سے پانی میں پڑی ٹھیکریاں کریدنے لگا۔ پہلے میری طرف دیکھتا رہا پھر بولا، "بابو شاید ابھی آیا ہے۔"

میں نے کہا، "جی ہاں بابا! بس آ کے پانی پیا ہے۔"

بولا، "اتنی کڑاکے کی دھوپ میں سے آتے ہی پانی بھی پی لیا اور ٹانگیں بھی چاہ بچے میں ڈبو دیں۔ ایسے تو تاؤ لگ جاتا ہے بیٹا۔"

میں نے جھٹ ٹانگیں پانی سے باہر نکال لیں تو مسکراتے ہوئے بولا، "اپنی طرف سے احتیاط چاہیے ورنہ جو لکھا بھاگوں میں ہو، ہو جانے والا ہو کے ہی رہتا ہے۔ اسی نامراد تاؤ کا مارا ہوا میں چھ مہینے چارپائی پر پڑا رہا۔ وہ تو خدا بخشے میاں غوث کا ہاتھ برکت والا تھا نہیں تو میرے بچنے کی تو امید ہی نہ تھی۔"

میں نے پوچھا، "تمہیں یہ تاؤ کس طرح لگ گیا تھا بابا جی؟"

بولا، "کبھی کی بات ہے بیٹا کیا یاد رہتا ہے، ایسے ہی گرم سرد کا خیال نہیں کیا ہو گا۔"

کچھ دیر تک خاموش رہا پھر کہنے لگا، "میاں غوث بڑا اچھا آدمی تھا، مسجد میں اذان دیتا تھا، نماز بھی پڑھاتا تھا، دوا دارو بھی کرتا تھا اور جن بھوت بھی بھگا دیتا تھا اور کچھ لوگ تو کہتے تھے اسے کالا علم بھی آتا تھا۔ میرے چچا کا بیٹا خدا بخش تو یہی کہا کرتا تھا کہ میاں کا چیلا اللہ دتا اصل میں جن ہے۔

ایک رات خدایا میاں کو دبانے گیا تو رلدو میاں کے پاؤں دبا رہا تھا۔ خدایا دو گھڑی بیٹھا رہا۔ میاں کو یاد نہ رہا اس نے دیکھے ہی بیٹھے بیٹھے آنکھیں بند کیے کہہ دیا، "دیا بجھا کے لیٹ جا بچو!" رلدو وہیں بیٹھے بیٹھے باہنہ لمبی کر کے وہیں ہاتھ پرے سے دیا اٹھانے لگا تو خدایے کی چیخ نکل گئی۔ میاں بہت دیر تک پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارتا رہا جب کہیں جا کر اسے ہوش آیا۔ پھر بھی اسے دو دن تک بڑے زور کا تاپ رہا۔"

بابا جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈنڈا گاڑی پر پھینک کر بولا، "پانی آگیا، کیاری کی طرف موڑ آؤں۔"

وہ آہستہ آہستہ کھیت کی طرف چلا جا رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رلدو شیشم کے درخت پر بیٹھا اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال کر مجھے اوپر کو اٹھائے لیے جا رہا ہو اور روں روں کرتا ہوا رہٹ کا کالا علم پڑھ رہا ہو۔

بابا واپس آگیا۔ بیلوں کو ہانک کے وہ پھر وہیں آ بیٹھا اور ہنس کے بولا، "میاں غوث بڑا اچھا آدمی تھا بیٹا۔ آج کل اس جیسے لوگ کہاں ملتے ہیں۔ جمعے کے دن وعظ میں بڑے بڑے اچھے مسئلے سنایا کرتا تھا۔ ایک بار کی بات مجھے نہیں بھولتی۔ بوڑھا نمبردار مر گیا تو اس کا بیٹا نمبردار بنا۔ جوانی کا وقت ہر چیز کی بہتات اور پوچھنے والا کوئی نہ تھا۔ کئی نئے نئے منصوبے اس نے باندھے اور کئی نئے نئے سلسلے اس نے چلائے۔ ایک بہت کھلی حویلی کے اندر اس نے ایک بڑی شان کا پکا مکان بنایا تو میاں غوث نے مسجد میں کہہ دیا، "گاؤں میں پکی اینٹ لگ گئی، یہ قیامت کی نشانی ہے۔" اس وقت میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ پر جلدی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ گاؤں نیچی جگہ تھا۔ دوسرے تیسرے برس سیلاب کا پانی آ جاتا تھا۔ مرنے والا نمبردار لاٹھی کے ساتھ لالٹین لٹکا کر ساری ساری رات بند کا پہرا، جگہ جگہ کھڑے ہو کے بند ٹھونکتا پھرا کرتا تھا —— اگلے ہی سال سیلاب آیا اور سارے گاؤں کی دیواریں بیٹھ گئیں۔ نئے نمبردار نے اپنے پکے چوبارے سے جھانک کے تو ضرور دیکھا پر نیچے نہ اترا۔ میاں غوث اس عرصے میں مر چکا تھا۔ اللہ کی قسم میں نے اونچی خانقاہ میں اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر کہا، 'میاں تو نے سچ کہا تھا، پانی میں کیا قیامت ہوتی تھی وہ تو آتا جاتا ہی رہتا ہے، پکی اینٹ ٹھیک قیامت ہے جس نے نمبردار کو سارے گاؤں سے الگ کر دیا اور اس کے من سے مہر محبت اٹھا دی......' میاں غوث بڑا ہی اچھا آدمی تھا بابو!"

بابا آہ بھر کر اٹھ کھڑا ہوا اور گاؤں کی طرف رخ کر کے بولا، "بڑھیا نہیں آئی ابھی۔" پھر آگے بڑھ کے اس نے جوڑی کو ٹھہرایا، اوپر والے بیل کے ڈھاٹے ٹھیک کیے اور انہیں ہانک کر میرے پاس آ بیٹھا اور بولا، "خدا کے کام دیکھ کر آدمی کے منہ پر مہر لگ جاتی ہے کچھ کہا نہیں جاتا۔ اس جانتے ہیں میاں کے بیٹوں نے بھی پکا مکان بنا لیا ہے۔ میاں جو کچھ کرتا تھا اللہ کے نام پر کرتا تھا، انہیں دنیا کا لوبھ لگ گیا۔ اونچی خانقاہ کے پاس نیچے میاں کی زمین میں ایک کھیت تھا، اسے سب مربعوں والا کھیت کہتے تھے۔ اس میں خانقاہ کے پیروں کی جلیل برکت تھی۔ کسی طرح کا تپ ہو اس کی ایک مولی کھا کے دو اوک پانی کے خانقاہ کے کنوئیں سے پی لو اور دیکھو تپ کدھر جاتا ہے، پر ایک بات پکی تھی، مولی میاں کے ہاتھ سے لینی پڑتی تھی۔ میاں مولی دیتے وقت کہتا، 'بابو! پیسے کسی مسکین کو دے دو یا تیل مسجد میں چڑھا دو۔' تعویذ دھاگا بھی کر کے دیتا تو یہی بات کہتا، 'دھیلا اپنے لیے نہ مانگتا۔ اپنا گزارہ اپنی زمین کی فصل پر ہی کرتا گیا۔ اس کے بعد بیٹوں نے اسی کو بیوپار بنا لیا۔ کرنا خدا کا اگلی بار سیلاب آیا اور مربعوں والے کھیت تک پانی جا پہنچا۔ بہتیرا زور لگا چکے ہیں ایک بھی کام کی مولی کھیت سے نہیں نکلی، سب سڑی اور کیڑا لگی ہوئی، تپ کیسے کٹے۔ رہا دھاگا اور تعویذ گنڈا تو اب اس سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ گاؤں کے بچے اسی طرح چیخیں مار مار کر روتے ہیں اور گائے بھینسیں اسی طرح تھنوں کو چھوتے ٹاپنے لگتی ہیں۔ نیتوں میں طمع گھس جائے تو دعا میں تاثیر رہتی ہے نہ کلام میں برکت، اور تو اور زمین کے زور گھٹ جاتے ہیں۔ گندم کے گٹھے کا جھاڑ پہلے سے آدھا بھی نہیں رہ گیا بیٹا......؟"

پھر وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے لمبی آہ بھر کے اٹھا تو میرے دل کو دھکا سا لگا۔ میں نے کہا، "بابا جی، کاشتکاری بڑا مشکل کام ہے اور تمہاری عمر ہو چکی کوئی بچہ نہیں جو تمہارا بوجھ اٹھائے اور تمہارے پیچھے رہے؟"

ہنس کے بولا، "بوجھ تو بیٹا اپنا اپنا اٹھاتے ہیں، رہی بات پیچھے کی تو اللہ نے جو کیا اچھا کیا، کوئی ہوتا تو کیا پتہ آج مجھ سے [illegible] میں ٹانگیں [illegible] کے بھی دام لگ جاتا۔"

پھر گاؤں کی پگڈنڈی کی طرف دیکھ کے بولا: "وہ چلی آ رہی ہے جاگو، تجھے جو کی روٹی اور بینگن کا بھرتا کھلانے، بابو پر کیا پتہ ترے جی کو بھائے کہ نہ بھائے۔"

میں نے کہا: "میں بڑا خوش ہو کے کھاؤں گا بابا جی۔ میں بھی بچپن میں ایک گاؤں میں رہا ہوں۔"

بولا: "اچھی بات ہے بیٹا پر شکار بھی تو گاؤں والوں کی طرح ہی کیا کرنا! ہمارے یہاں تو تجھے پتہ ہے بھیڑ و جال پھانستا ہے تو آدمی بھی مارتا ہے۔ یہاں غرض بندوق کا شکار نہیں کھایا تھا۔ کہا کرتا تھا جیسے جانور کو مارنا بڑی کمینی بات ہے جا دوسرے کی جان   چاہو تو کچھ پتے سے بھی تو لگاؤ!"

میرا خیال پیچھے ہیں پڑی فاختاؤں اور کبوتروں کی طرف گیا تو میں نے آنکھیں نیچی کر لیں اور میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

بڑھیا کٹوٹی سے پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھی کہ بابا نے گاڑھے سے کندھے کی چادر اتار کے میری طرف پھینکی اور بولا: "اسے باندھ کے ذرا پانی اوپر ڈال لے بیٹا پھر روٹی سوکھی ٹکیا کھا لیں۔"

میں نے پانی کی موٹی دھار کے نیچے سر رکھا تو یوں لگا جیسے شہر کی ساری پکی اینٹوں کا تاؤ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔

بہنا

جمیل الزماں

وہ ابھی ریستوران میں آ کے بیٹھی ہی تھی کہ جماہیاں لیتا ہوا بیرا منہ پر دونوں ہاتھ پھیرتا ہوا آہستہ آہستہ اس کے پاس آیا اور کشادہ ہال کے بائیں کونے میں ستون کے ساتھ آخری میز کے پیچھے اور دائیں طرف پردے سرکا کر بولا: "حکم سرکار!"

"پہلے ٹھنڈا پانی لے آئیے۔"

بیرے نے لڑکی کے پسینے سے شرابور گندمی چہرے پر ایک اچٹتی نگاہ دوڑائی اور بیزاری اور فرسودہ پیڈسٹل فین کا رخ درست کرتا ہوا الٹے پاؤں چلا گیا کاؤنٹر کے پاس پنکھے کا پلگ لگاتے لگاتے بیرے نے اپنی سندھی آنکھوں پر ہاتھ ملتے سوچا۔ اس قدر تیز دھوپ میں دن کے ڈھائی بجے برقعہ اوڑھے کس سے ملنے آئی ہے یہاں؟ اور پھر ایک جگ میں پانی اور برف کی ننھی ڈلیاں ہلاتا دوسرے ہاتھ میں گلاس تھامے پچھلے سے چند منٹ بعد میز پر دونوں چیزیں رکھ کر وہ ہال کے دروازے کی دہلیز کے قریب جا کھڑا ہوا تاکہ اس لڑکی کے ملاقاتی کا استقبال کر سکے۔

ریستوران میں اس وقت بالعموم کوئی گاہک موجود نہ ہوتا اور وہ اطمینان سے کاؤنٹر کلرک کی کرسی پر ٹیک لگائے اونگھتا رہتا لیکن آج اس لڑکی نے کسی سے خوش گپیوں کا یہ اوکھا وقت نکال کر اس کے معمول میں خلل اندازی کی تھی۔ نہ جانے اس نے کیوں ملاقات کے لیے اس سنسان ریستوران کا انتخاب کیا تھا جو شارع عام سے ایک طرف ہٹ کر پرسکون سڑک پر واقع تھا اور جہاں مختلف دفتروں کے ایک بجے بند ہونے کے ایک آدھ گھنٹہ بعد مکمل سکوت مسلط ہو جاتا۔ دس پندرہ منٹ تو بیرا یونہی خالی الذہن دروازے اور کھڑکیوں کے باہر دیکھتا اور ادھر ادھر تکتا رہا۔ چند گز پرے چوک کے ساتھ والی سڑک پر اکا دکا تانگے گزر رہے تھے ہر ایک تانگے کو آتا دیکھ کر اسے گمان ہوتا کہ شاید اسی میں وہ ملاقاتی بیٹھا ہو جس سے یہ لڑکی ملنے آئی تھی لیکن وقت یونہی گزرتا جا رہا تھا اور کوئی تانگہ کسی رنگین مزاج سواری کو بٹھائے ریستوران کی طرف مڑنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ پنکھے کی ہوا کب تک ٹھنڈے پانی پر حاوی ہوتی ہوگی۔ اسے اپنے کنجوس مالک کا یہ خیال آ گیا جو اسے تنخواہ بالاقساط ادا کرتا تھا۔ دوپہر کی بخشیش میں کاؤنٹر کلرک کو حصہ نہ دینا پڑتا تھا لیکن لڑکی کے برقعے کا کپڑا سستی پاپلین قسم کا تھا اور اسے اس کے ہاتھوں کسی بخشیش کی توقع بھی نہ تھی چنانچہ تنگ آ کر بیرا دبے پاؤں ہال کے کونے کی طرف چل دیا اور میز کے قریب کھانس کر آگے بڑھتا ہوا بولا: "کسی اور چیز کی ضرورت ہے آپ کو؟"

سہمی ہوئی لڑکی نے اپنے کالے نقاب کا داہنا حصہ بائیں کندھے پر پھینکا۔ حسرت بھری آنکھیں پانی کے خالی گلاس سے اٹھائیں اور بولی: "اور کیا مل جائے گا اس وقت؟"

"لیمن، سوڈا، روز، چائے جو آپ چاہیں۔"

"لیمن سستی ہوگی یا چائے؟" وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

یٰسین یہ فقرہ سن کر چوکنا ہو گیا اور اس کی رہی سہی غنودگی کافور ہو گئی۔ آج تک کسی گاہک نے اپنے منہ سے یہ بات یوں بے ڈھنگ نہ کہی تھی۔ اس نے لڑکی کے میز پر جھکے ہوئے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے اترے ہوئے چہرے پر پاؤڈر سرخی کا نام و نشان نہ تھا۔ اس کی کلائیوں کی رگیں ہاتھوں پر ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے ناخن سرخی سے ناآشنا تھے۔ اس نے جگ اٹھا کر پانی کا گلاس از سر نو بھرا اور پوچھا: "اخبار آتا ہے کوئی یہاں؟"

"مالک صبح انگریزی کا اخبار منگاتا ہے۔"

"وہی لے آئیے آپ۔" عام بابوؤں سے لیمن سوڈے یا چائے کی بجائے اخبار کا آرڈر لے کر یٰسین دل ہی دل میں کڑھا تو سہی لیکن اس لڑکی کے کملائے چہرے کو دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا اور وہ اپنے پاس سے لیمن کی ایک بوتل اور گلاس لے کر انگریزی اخبار سمیت ہال کے آخری ستون کی طرف بڑھنے لگا تو ریستوران کے دروازے پر تیس ایک برس کا کھاتا پیتا شخص نمودار ہوا۔ یٰسین کے چلتے قدم رک گئے۔ نووارد نے اپنی پتلون کی جیب سے سفید رومال نکال کر پسینہ پونچھتے ہوئے ہال کے گرد طائرانہ نگاہ ڈالی اور یٰسین کے قریب پہنچ کر قدرے تامل سے پوچھا: "اس پردے کے پیچھے جگہ خالی ہے؟"

"جناب کو کسی سے ملنا تھا یہاں؟" یٰسین نے اخبار کھینچتے ہوئے سوال کیا۔

اتنے میں ہال کے بائیں کونے میں کرسی سرکنے کی آواز آئی۔ یٰسین نے نووارد کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ دونوں کو لڑکی کی مغموم صورت پردے سے جھانکتی نظر آئی۔ نووارد اپنی بڑھی ہوئی توند پر پتلون درست کرتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ یٰسین نے اخبار اور لیمن کی بوتل قریبی میز پر رکھ دی اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

چند لمحے بعد یٰسین آہستہ آہستہ آخری ستون کی جانب بڑھا اور پردے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ نووارد لڑکی سے دیر میں آنے کے لئے معذرت خواہ تھا اور لڑکی کہہ رہی تھی: "کوئی بات نہیں آپ میڈیکل سٹور میں اس قدر مصروف رہتے ہیں، کھانے کے بعد نیند تو آ ہی جاتی ہے۔"

یٰسین پردے کو ہٹا کر آگے بڑھا اور نووارد کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

"آپ کیا پئیں گی؟" نووارد نے لڑکی سے پوچھا۔

"جو چیز بھی آپ منگائیں مجھے قبول ہے۔" وہ کھسیانی ہو کر بولی۔

"میں تو اس وقت چائے ہی پیوں گا۔" نووارد نے یٰسین سے کہا۔

"کچھ کھانے کے لئے بھی لے آؤں حضور؟" یٰسین نے حسب عادت گاہک کی استطاعت کا اندازہ لگانے کے لئے کہا اور نووارد کی "ہاں بھئی لیتے آؤ" سن کر ریستوران کے باورچی خانے کی طرف ڈگ بھرنے لگا۔

یٰسین نووارد اور لڑکی کی گفتگو سننے کا خواہاں تھا چنانچہ اس نے جلدی جلدی پانی میں چائے ابالی، دودھ کو آنچ دی، شکر میں چینی ملائی، کیک پیسٹری کے چند ٹکڑے ایک پلیٹ میں ڈالے اور ٹرے ہاتھ میں لئے پردے کے پاس پہنچا تو اسے نووارد کی آواز سنائی دی: "میں وعدہ تو نہیں کر سکتا البتہ کوشش ضرور کروں گا۔"

"آپ چاہیں تو اسے ایک دن میں ملازمت دلا سکتے ہیں۔" ملتجی لڑکی بولی۔

"ہاں مگر آپ کے بھائی . . . . ." نووارد کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن قدموں کی آہٹ سن کر خاموش ہو گیا۔ یٰسین پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا۔

تو نووارد سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ یٰسین نے سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس اس کے پاس میز پر رکھ دی۔ جگ اور گلاس کو ایک طرف ہٹایا اور دونوں گاہکوں کے سامنے چائے کی پیالیاں اور پلیٹ وغیرہ سلیقے سے سجا کر ٹرے میں جگ اور گلاس دھرے اور واپس چل دیا۔

ٹرے واپس پہنچاتے وقت یٰسین نے سوچا بیکاری کتنی بڑی مصیبت ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے یکے بعد دیگرے ان بیکار نوجوانوں کے چہرے گھومنے لگے جو پچھلے دو تین روز سے سامنے والے ایک نئے دفتر میں کلرکوں کی خالی آسامیوں کے متلاشی تھے اور اس کے ریستوران میں اکا دکا ایک پیالی چائے پینے یا ایک سگریٹ خریدنے چلے آتے تھے۔ یہ دفتر اس کے ایک مہربان گاہک نے کھولا تھا جسے دن کا کھانا یٰسین کھلانے جاتا اور اسے یقین تھا کہ اگر وہ کسی ایک لڑکے کی سفارش کر دے تو مالک اس کا کہا نہیں ٹالے گا لیکن کسی لڑکے نے اس کی اتنی خدمت نہ کی کہ وہ اس شدید ضرورت میں اس کے کام آتا۔ اس کے پاس تو فقط وہ لڑکے آتے تھے جو ریستوران میں بیرا گیری کی ملازمت حاصل کرنے کی سعی لاحاصل کر رہے تھے۔

اسے تو بیرا گیری کے لئے جو جو پاپڑ بیلنا پڑے تھے وہ ابھی تک اس کے ذہن پر منقش تھے۔ پڑوس میں عبدل بیرے کی بیوی سے یٰسین کی ماں کا بڑا جھگڑا چلا آتا تھا لیکن جب یٰسین سن بلوغ کو پہنچا تو اس کی ماں نے عبدل کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کی لڑاکا بیوی کے طعن و تشنیع کے باوجود بالکل چپ سادھ لی اور پھر دھیرے دھیرے عبدل کو اس بات پر راضی کر لیا کہ جب کبھی اس کے ہوٹل میں عید، بقر عید یا رام لیلا کے موقع پر ہجوم ہو تو وہ یٰسین کو بیرا گیری کا کام دلوا دیا کرے۔ عبدل کی بیوی نے یٰسین اور اس کی ماں کے کئی چکر لگوائے تھے تب کہیں جا کر یٰسین کو بیرا گیری کا مستقل کام ملا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن اسے اپنا روزگار برقرار رکھنے اور بیکاری سے بچنے کے لئے کس طرح کولہو کے بیل کی طرح کئی ہوٹلوں اور ریستورانوں میں متواتر صبح شام کام کرنا پڑا تھا۔

باورچی خانے میں تسلی سے خالی ٹرے رکھ کر یٰسین کاؤنٹر کلرک کی کرسی پر آ بیٹھا ہی تھا تو اسے خیال آیا کہ اسے کاؤنٹر کلرک سے بخشش کی رقم میں حصہ دینے سے پس و پیش نہیں کرنا چاہئے کہیں وہ مالک سے کہہ کر کسی بہانے اسے خارج خدمت نہ کروا دے۔ اب اگر وہ بیکار ہو گیا تو کیا کرے گا۔ اب نہ تو عبدل زندہ ہے نہ اس کی ماں —— اور پھر بیرے کی طرف اس کی نظر گئی تو دفعتاً اس کے دماغ میں ایک گھناؤنا خیال کوندا۔ نہیں نہیں اس کی ماں تو ایسی عورت نہ تھی۔ اگرچہ عبدل کی رنگ رلیوں کے متعلق اسے کوئی غلط فہمی نہ تھی اور پھر وہ اپنی مونچھوں سے کھیلتا اسی چکر میں پڑا رہا کہ کہیں اسے ملازمت دلوانے کے لئے اس کی ماں کو تو عبدل کبھی کسی ہوٹل میں نہیں لے گیا تھا؟ اسے یقین تھا کہ یہ ناممکن بات تھی لیکن پھر بھی بیرے کی موجودگی میں اس کے ذہن کا بوجھ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھاگ کر پردہ پھاڑ ڈالے اور نووارد اور لڑکی سے کہے کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو شام کو مالک اسے جوتے مار کر ریستوران سے باہر نکال دے گا اور وہ سڑکوں پر بے کار اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کی فکر میں مارا مارا پھرے گا۔

یٰسین اسی ذہنی اذیت میں مبتلا تھا کہ ہال کے کونے میں نووارد کی آواز گونجی: "بیرا ——!"

"آیا حضور!" اس نے حسب عادت جوابی نعرہ لگا دیا لیکن حضور کا لفظ اس کے حلق سے ایسے نکلا جیسے اس نے گاہک کو ایک مغلظ گالی دے دی ہو۔ اس نے پاؤں میں چپل پھنسائی اور فیملی کیبن کی جانب دبے پاؤں چل دیا۔ ستون سے دو تین قدم ادھر وہ خاموشی سے ہتھیلیاں بھینچ کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔ لڑکی گڑگڑا کر نووارد سے کہہ رہی تھی: "مجھے اپنی مجبوریوں کی داستان سناتے شرم آتی ہے لیکن کیا کروں میرا اور کوئی سہارا نہیں۔"

"میں بھی مجبور ہوں۔" نووارد نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"میں آپ کی خدمت کے ناقابل ہوں۔ مجھے کئی دن سے بخار آ رہا ہے۔"

"آپ کا بخار اتر جائے تو پھر کسی شام مفصل بات چیت ہوگی۔"

نوادرو کی یہ بات لیٹین کے سینے میں تیر کی طرح پیوست ہوگئی۔ اس کی غیرت نے جوش مارا۔ وہ ایک دم آگے بڑھا اور قدرے بلند آواز سے کھانس کر بولا: "کیا حکم ہے؟"

"بل لے آؤ۔"

"بل تو اس وقت نہیں بنے گا۔ بابو جی ہوٹل میں نہیں ہیں۔" لیٹین نے میز پر کیک اور مٹھائی کے ٹکڑوں کو اپنی سرخ آنکھوں سے گنتے ہوئے کہا۔ "ایک روپیہ آٹھ آنے ہوئے۔"

نوادرو نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر میز پر روپے روپے کے دو نوٹ دھر دیے اور اٹھتے ہوئے بولا: "باقی پیسے تم رکھ لو۔"

"مجھے ان کی ضرورت نہیں۔" لیٹین نے اپنی پاکٹ سے آٹھ آنے نکال کر نوادرو کے ہاتھ میں پکڑا دیے اور اس کے بازو کو جھٹکا دے کر کہا "نکل جاؤ یہاں سے ورنہ تمہارا سر توڑ دوں گا۔"

نوادرو اس غیر متوقع ردعمل سے بھونچکا رہ گیا۔ اس کے دل میں آئی کہ اس ٹھگنے کے بیرے کا دماغ درست کر دے لیکن اس کے جی کے چور نے اسے سمجھایا کہ یہاں سے خاموشی سے کھسک جانے میں ہی بھلائی ہے۔ اس نے مبہوت لڑکی کی طرف دیکھا جو پہلے ہی اپنی نامرادی سے سراسیمہ تھی۔ وہ اپنا نقاب درست کرتی کرسی سے اٹھتے اٹھتے لڑکھڑائی تو لیٹین بولا:

"تم ٹھہرو بہنا! میں تمہارے بھائی کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔"

مومن کی واپسی

احمد سعید

اس گھر میں جو سات افراد پر مشتمل مہاجروں کے ایک کنبہ کو پناہ دی گئی۔ یہ لوگ ہوشیار پور سے پیدل چل کر آئے تھے۔ ان میں دو مرد، ایک لڑکا اور دو عورتیں تھیں۔ ...... تایا، اس کی بھابی، بھتیجی اور بھتیجے۔ ان کی عمریں بالترتیب ساٹھ، پچاس، سترہ، بائیس اور بارہ برس تھی۔ پچیس تیس آدمیوں پر مشتمل اس خاندان میں سے یہ سوائے ایک۔ نوجوان لڑکی کے جو بلوائیوں کے ہاتھ لگ گئی باقی سب شہید ہو گئے تھے۔ اس کے شوہر کا نام خوشی محمد تھا جسے عام طور پر خوشیا کے نام سے پکارا جاتا۔

اس کے بیاہ کو ابھی ایک مہینہ ہی ہوا تھا جب ہندوستان کا بٹوارہ ہو گیا۔ اس کی بیوی رحمت نہایت جاذب نظر تھی۔ چک نمبر ۴۲ میں اس کا چرچا ایک نمبر اور باقی شیدا، ایسا پٹھا نو جو ہر نوجوان رحمت کو دل چاہتا۔ اس گاؤں کے نمبردار غلام رسول نے بھی اس کا رشتہ مانگا۔ وہ اس کے والدین کو منہ مانگی رقم دینے پر رضامند ہو گیا۔ لیکن منہ زور رحمت کی آنکھ خوشی محمد سے لڑ چکی تھی۔ وہ اسے دل سے چاہتا تھا اور ان کا آپس میں دل کا سودا ہو چکا تھا ——— نمبردار نے پہلے ہی تین عورتیں بیویاں بنا کر گھر میں ڈال رکھی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ رحمت جیسی چڑیا کو بڑی کامیابی اور آسانی سے سونے کے پنجرے میں بند کر لیتا۔

چک نمبر ۴۲ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ اس میں سکھوں کی اکثریت تھی۔ مسلمانوں کے تو صرف پندرہ بیس گھر تھے۔ لیکن سب کا آپس میں کافی بھائی چارہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کے غم میں یکساں طور پر شریک ہوتے لیکن مسلمان دشمنوں کو دیکھ کر ان کی دشمنی رگیں بھی پھڑکنے لگتیں۔ گاؤں کی لڑکی اپنی ماں بہن یا لڑکی کے برابر ہوتی ہے اس لئے سب چپ ہی تھے۔ تاہم رحمت کو دیکھ کر شاید ہی کوئی ایسا نوجوان ہو جو چشم زدن ترستا ہو اس کے منہ میں پانی نہ بھر آتا ہو۔ اس سے شادی کے معاملہ کو دوسروں میں خوشی محمد کا نمبر اول تھا۔ ایک تو اس نے پختہ گھر کا وارث تھا اور پھر بیس بیگھہ زمین کا وارث تھا۔ گھر میں گائے، بھینس، گھوڑے اور بکریاں بھی تھیں۔ ایک کشادہ مکان۔ سادہ مگر بڑی محنت کرتا۔ زمین کی دیکھ بھال کرتا۔ یہ ایک گھر تھا جو سماجی کار کی زد سے بچا ہوا تھا۔ اس لئے یہ غیر مسلموں کو دل ہی دل میں کھٹکتا تھا۔

خوشی محمد کے باپ کو ایک حسرت تھی کہ گھر میں بہو جیسی بہو آئے۔ شریف خوشی محمد نے جب چپکے چپکے رحمت سے شادی کے عہد و پیمان کر لئے اور گاؤں میں ان دونوں کے عشق کے چرچے ہونے لگے تو رحمت کے والدین نے لڑکی کی بدنامی سے بچنے کے لئے اس کی چٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا۔ جب میاں بیوی راضی تھے تو قاضی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ پھر بچے پتے بھی کہاں منتے تھے۔ رحمت کی جوانی کا کھیت تو ابھی ٹھاٹھیں مارنے کو تھا۔ ابھی اس پر کس طرح برسات کی پھوار

کی طرح آئی تھی۔ گاؤں والے اسے دیکھ دیکھ کر حیرت سے منہ میں انگلیاں دبا لیتے۔

چنانچہ رحمت کو جب خوش قسمتی کی ناگہانی آمد ہوئی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ بٹیر لگ گئی ہو۔ ساون کے دن تھے آموں پر بور پڑ چکے تھے۔ پیا جتا جوڑے کی جوانی کی امنگیں چڑھیں سامنے ہیں اچانک اس کے رستے کاٹ دیئے گئے۔۔۔۔۔۔ بٹوارہ ہوا۔ اور چک نمبر ۲۲ کا بلوائیوں نے بڑی درندگی سے صفایا کر دیا۔ مصروف وقت جب آپہنچا جب اسے پتہ چلا کہ خوشیا باپ بننے والا ہے۔ اُدھر ریاست پٹیالہ کی گدی کے بڑے حقدار راؤ محمد علی خان کی اپنی [illegible] گاؤں کے مسلمانوں کی حفاظت اور مدد [illegible] کے باوجود جان بچانی مشکل ہو گئی۔ اگر اس کا بس چلتا اور وہ وقت اس کے ساتھ دیتا تو بڑے ہی ہنسی خوشی [illegible] کی کا بیٹی چل سکتی تھی۔ کیونکہ قصد اور پٹیالے سے جنگلی اور اکثر سید لوگوں کے جتھے چاروں اطراف سے آ گھیر گئے تھے۔ ضلع ہوشیارپور [illegible] کی کافی تعداد تھی۔ بچنے کا کافی سامان تھا۔ ان کے چہرے مہرے ایسے تھے [illegible] دیکھ کر [illegible] انسان [illegible] پیدا ہو جاتی۔ ان کا ایک معمولی کا لڑکا سردار ہربنس سنگھ زمیندار تھا۔ وہ [illegible] کا بیٹا بھی تھا۔

سردار ہربنس سنگھ نے بھائیوں کو اس [illegible] کی کوشش کی۔ [illegible] انگریز سامراج طاقت کے ہتھکنڈوں سے بچنے اور مسلمانوں کو قتل کرنے سے روکنے کی کوشش کی۔ اس [illegible] پارٹی اور کانگریس کے چند غیر متعصب اور مخلص کارکنوں کے ساتھ چک نمبر ۲۲ کے مسلمان بڑے بوڑھوں، عورتوں اور نوجوان لڑکوں اور کم عمر بچوں کو محفوظ کرنے کا [illegible] بندوبست کیا۔ لیکن جو [illegible] نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ہربنس سنگھ اور اس کے ساتھیوں سے [illegible] اس کے [illegible] تو وہ انہیں کا اور اس کے خاندان کا بھی خاتمہ کر دیں گے اور اس کے گھروں کو جلا کر [illegible] کر دیں گے۔ اس کا باپ سردار [illegible] اس کے خلاف تھا چنانچہ اس نے اپنے گھر میں پناہ گزیں مسلمانوں کو باہر نکلنے کو کہا۔ بیٹے کا اس وقت باپ سے [illegible] تھا۔ چنانچہ اس نے حکمت عملی سے کام لینا چاہا۔ وہ یہ کہ وہ باپ کے حکم کی تعمیل کے لئے اس سے ڈیڑھ ایک گھنٹہ کی مہلت مانگے۔ باپ نے یہ شرط مان لی۔ بیٹے کی [illegible] چک نمبر ۲۲ سے [illegible] کے فاصلے پر ملٹری اور پولیس کی چوکی تھی۔ وہاں سے مدد لانے کے لئے ہربنس سنگھ نے اپنا ایک خاص آدمی گھوڑے پر بھگایا۔ اس نے اپنی جیپ خاص طرح پر استعمال کے لئے بوقت ضرورت رکھ چھوڑی۔

اس اثناء میں شام گہری ہوتی چلی گئی۔ اور گرد کے گاؤں سے ڈھول اور [illegible] کی آوازوں کا شور بڑھتا گیا۔

جب ملٹری کو خبر ملی کہ چک نمبر ۲۲ پر حملہ ہونے والا تھا وہ [illegible] گھنٹے کے اندر اندر وہاں پہنچی۔ اس نے ہربنس سنگھ کی [illegible] پناہ گزیں مسلمانوں کو اس کے گھر سے باہر نکالا۔

ملٹری دو جیپوں میں آٹھ دس مسلح آدمیوں پر مشتمل تھی۔ اس کے علاوہ چند ایک خالی ٹرک تھے۔ گو اس کی پوسٹ قریب تھی۔ لیکن راستہ نہایت خطرناک اور دشوار گزار تھا۔ اس لئے اس نے [illegible] مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ تیار کیا۔ اس میں [illegible] اس طرح ایک دوسرے سے [illegible] کے آگے رہے [illegible] اس کے درمیان۔ [illegible] رستہ کا [illegible] ایک [illegible] تھا۔ وہ [illegible] تھا۔ اس کے [illegible] قافلہ ایک گھنٹے کے اندر اندر تیار ہو گیا۔ لیکن جب اس کے کوچ کا مقررہ وقت آیا تو ایک جیپ خراب ہو گئی۔ گو وہ جیپ ٹرک کے پیچھے باندھی جا سکتی تھی لیکن [illegible] اپنے سپاہیوں کو اپنے ساتھ [illegible] رکھنا چاہتا تھا جس سے وہ سب [illegible] اس کی ہدایات کی تعمیل کر سکیں۔ ٹرک کے پیچھے گاڑی باندھنے سے رستے کی [illegible] اور [illegible] کے متعلق [illegible] ہو جانے کا امکان تھا۔ نتیجتاً گاڑی کو ٹھیک کرنے میں [illegible] منٹ لگ گئے۔ جس سے ہربنس سنگھ بالخصوص زیادہ فکرمند ہو گیا۔ رات بڑھتی گئی۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ تو [illegible] مرتب کرنے میں گیارہ بج گئے۔ تب میجر [illegible] نے اسے چلنے کا حکم دیا۔

[illegible] قافلہ [illegible] میل [illegible] چلا [illegible] ایک [illegible] کے [illegible] تھا۔ حتیٰ کہ [illegible] جیپ [illegible] لگ گئی۔ سب [illegible] ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ اس وقت خوشیا رحمت کو [illegible] کے لئے بہت مضطرب ہوا۔ دوسری طرف [illegible]

خیال تھا۔

آسمان پر بادل گھرے چلے آ رہے تھے۔ تاریکی پر ایک اور تاریکی کا پردہ پڑ گیا۔ اچانک جیسے جھاڑیوں سے آس پاس کے گھنے ٹاہلیوں کے درختوں میں سے ایک مسلح جوانوں کا جتھا نکل پڑا۔ اور ان کے ہاتھوں میں ست سری اکال کے نعرے لگاتا ہوا قافلے پر ٹوٹ پڑا۔ سپاہی چند ایک فائر کر بیٹھے۔ اور مشعلوں کی شعاعیں بھی تیز اندھیرے میں پڑ گئیں۔

ہرچرن سنگھ نے قافلے کو بچانے کے لئے جتھے والوں سے ـــــ بھائیوں پر حملہ نہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ "ہم تو خود گھر گئے ہیں!" اس نے جواب دیا۔

دراصل ہرچرن کو جوابی فائرنگ کرنے سے منع کر دیا گیا تھا اس لئے سب سپاہی بے بس تھے۔ چنانچہ قتل و غارت شروع ہو گئی۔ گاہے گاہے قافلے پر حملہ آوروں کی برچھیوں کی چمکتی اطراف سے روشنی کی شعاعیں پڑتی تھیں۔ خوشیے کی آواز نے رحمت کو پکارتی سنائی دی۔ جواب میں رحمت کی آواز ایک بار تاریکی کو چیرتی اس تک پہنچی۔ اس کے بعد یکدم بند ہوتی سنائی دی۔ جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس وقت خوشیے کے جی میں آیا اور وہاں وہ ایک کھڈ میں جا چھپے۔ اس کا چھوٹا بھائی امرداد جھاڑیوں سے ایک درخت پر چڑھ گیا۔

جب ستاروں کی روشنی ہوئی تو جوان اور خوبصورت عورتیں وحشیوں کے پنجوں میں جاتی دکھائی دیتیں۔ ان کے پیچھے ان کے عزیز تلواروں سے کٹ کٹ کر گرتے۔ رات کی تاریکی میں "ہائے مر گیا" "کٹ گیا" کی آوازیں بھی سنائی دیتیں۔

ہرچرن سنگھ اس منظر کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا۔

جب قافلہ کٹ کر ایک چوتھائی رہ گیا تو فوجی دستہ کو واپس آنے کا حکم ہوا۔ بگڑی ہوئی جیپ ٹھیک ہو گئی تھی۔

اور اس طرح خوشیا اپنے گھرانے کے بچے کھچے افراد سمیت لاہور پہنچا۔

وہ رحمت کی تلاش میں ہر روز مہاجرین کے کیمپوں کا چکر لگاتا۔ ریڈیو سٹیشن خبر بھیجتا تاکہ آیا اس کے پیغام کا کوئی جواب ملتا ہے کہ نہیں۔

لیکن رحمت کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس نے اپنے علاقہ اور گاؤں کے تمام آئے ہوئے لوگوں سے اپنی بیوی کا اتا پتا پوچھا لیکن بے سود۔ وہ لوگ بھاگم بھاگ ایک گٹھڑی کر کے نکلے تھے۔ ہوئے مہاجرین کب تک خالی ہاتھوں پر زندہ رہ سکتے تھے۔ انہوں نے کئی دن فاقے کاٹے۔ اب وہ تلاش معاش میں سرگرداں ہو گئے۔ اس کے کنبے کے افراد نے جگہ جگہ کام شروع کر دیا۔ جیواں کو چھوڑ کر باقی سب نے مزدوری کر لی۔ نئے مہاجر اور مقامی مالکوں کے ہاں ملازمت کر لی۔ اس امید پر کہ انہیں جلد زمین مل جائے گی۔ وہ دیہاڑی پر کام کرتے اور اپنی تنخواہ جیواں کے پاس جمع کرا دیتے۔ شروع میں ان کی مجموعی آمدنی سر ڈھانپنے کے قریب پہنچتی۔ جیواں کو اب تک کوری تھی اس لئے انہوں نے اسے گھر پر ہی رہنے دیا۔ ماں باپ کی یہ اکلوتی لڑکی ویسے بھی بڑی لاڈ پیار میں پلی تھی۔ خوشیا نے اسے اور بھی سر پر چڑھا رکھا تھا۔ اس کا بس ہوتا تو اسے گھر کا کام کاج تک نہ کرنے دیتا۔ اور اس کی ضرورت کوئی خاص زیادہ بھی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے علاوہ باقی سب مالکوں کے ہاں ہی کھانا کھاتے تھے۔ وہ اپنا کھانا گھر سے لاتی اور جیواں سے مل کر کھاتی۔

رحمت کا انتظار کرتے کرتے جب سب مایوس ہو گئے تو خوشیا کی ماں نے ان سے تجویز پیش کی کہ اس کی شادی کر دی جائے۔ اس کے لئے مناسب لڑکی ڈھونڈنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ وہ کماؤ تھا۔ جوان تھا۔ ذات کا ارائیں۔ شادی شدہ مرد بیوی کے بغیر یوں محسوس کرتا ہے جیسے گھوڑی کے بغیر سوار۔ خوشیا کی ماں نے بعد چاہا خوشیا کی دوسری شادی کرنے کا تہیہ جیسے جلد فیصلہ ہو گیا۔ وہیں کے ایک ٹھیکیدار گاؤں کے بیٹے ایک بچی، سب طے شدہ زیور اور ایک گھر لانے والا سرخ جوڑا اختیار کر گیا۔ خوشیے نے اپنے لئے تو صرف سفید کورے کپڑے ہی شادی پر پہننے تجویز کئے لیکن ماں اور تایا نے اسے مخمل کی شکل کا ایک رنگدار، دھاری دار ململ کا کرتہ اور چھوٹے ریشم کا تہمد، پاؤں میں باٹا کا فلیٹ ٹن کا بوٹ اور سر پر جناح کیپ لے دی۔ شادی پر لڈو میٹھے چاول اور گوشت پکائے گئے۔ دو چار براتی آئے، نکاح پڑھا گیا جس میں مبلغ سو روپیہ حق مہر طے کیا گیا، اور خوشیے کی شادی کر دی گئی۔

دلہن ایک آنکھ سے قدرے بھینگی تھی۔ لیکن بلا کی تندرست اور متناسب الاعضاء۔ رنگ گندمی۔ جسے دیکھ کر ادھیڑ عمر کے خوشیا جیسے کسی شوہر کو اتنا حق مہر باندھنا جائز معلوم ہوتا۔ تاہم رحمت اور اس میں بہت فرق تھا۔ اگر رحمت شوخ اور شریر تھی تو یہ اس کے برعکس، خاموش اور سنجیدہ۔ رحمت اگر

تھی تو بیگاں کالی۔ اس کے جسم میں ایک خاص لطافت تھی جو خوشیا کو پسند تھی جس کے باعث وہ اس کا گرویدہ تھا۔ اور بیگاں اس سے ہمیشہ گھونگھٹ کاڑھتی۔ خوشیا کام کاج سے فارغ ہو کر رات کے دس بجے گھر واپس آتا اور صبح پانچ بجے چلا جاتا۔ جب کبھی فرصت ملتی تو دوپہر کے وقت گھر کا ایک آدھا پھیرا مار جاتا۔

اب ایک وقت پھر ایسا آیا جب اُسے یہ خبر ملی کہ وہ باپ بننے والا ہے۔ اس خوشی میں اُس نے بیگاں کی اور دیکھ بھال اور خاطر مدارات کی شروع کی جیسے وہ آم کا پودا ہو جسے بور آ گیا ہو۔

ایک دن اسے اچانک سرکار سے اطلاع ملی کہ اسے رحمت کا کچھ سراغ مل گیا ہے۔ اس کی خبر کے مطابق وہ چک نمبر ۲۲ سے ۲۰ میل کے فاصلے پر تھی جہاں فسادات کے زمانے میں عارضی پوسٹ قائم کی گئی تھی۔

خوشیا کے لئے یہ خبر نعمت غیر مترقبہ تھی۔ دھک دھک کر کے اس کا دل قفس میں پھیلنے لگا۔ اس نے چاہا کہ اُسے پر لگ جائیں اور وہ اپنی محبوبہ رحمت کے پاس پہنچ جائے۔ چنانچہ اسی روز سے اس کی توجہ بارڈر پار کرنے کے لئے ویزا اور پاسپورٹ حاصل کرنے میں لگ گئی۔

اسے حاصل کرنے میں آٹھ ماہ لگ گئے۔ دفاتر اور متعلقہ کاغذات کو مکمل کروانے کے لئے وہ ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس کی ساری تنخواہ صرف ہو گئی۔ کلرکوں، چپراسیوں کو خوش کرنا الگ رہا۔ جہاں جہاں [illegible] لوگوں میں کئی پرانے امیر اور بیشتر ضمانت دینے والے شامل ہوتے تاکہ ان تک بڑی آسانی سے رسائی ہو جاتی۔ خوشی محمد ولد اللہ دتہ تو [illegible] صاف تھا۔

آخر خدا خدا کر کے ایک پروانہ راہداری تیار ہوا۔ لیکن خوشیے کی ماں اور جیواں اس سے دن بدن بگڑتے گئے۔

”جہاں وہ تو شہید ہوئے اسے بھی پھر وہ کلموہی یاد آ گئی ہے“ اس کی ماں کہتی۔

”نہ معلوم اب منہ کالا کر کے کس کا ہو کے اس چڑیل کو لے آئے گا“ جیواں تُنک کر کہتی۔

”لیکن بس اس میں قصور کس کا ہے“ بیگاں دونوں کا ترش اور بے رحمانہ رویہ دیکھ کر پیچھے سے شوہر کی تسلی کی خاطر کہہ دیتی۔

”وہ تو ہم جانتی، تم تو اب کے تیرے سے دوسری بیوی لانے ہو۔ اس کا تجھے کچھ خیال نہیں۔ ہمارے پاس دوسرے جانے کے لئے پیسے نہیں۔“

خوشیا ایسی باتیں سن کر بڑا تلملاتا۔ لیکن اس کا دل اس کے بس میں کب تھا۔

”میں تو تمہیں ہندوستان جانے کے لئے ایک کوڑی بھی نہ دوں گی“ جیواں [illegible] نے کہا۔

خوشیا کے مالک نے اسے ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

”میں نے لوٹ مار کر کے دولت نہیں کمائی۔ گاڑھے پسینے سے“۔ اس نے صاف صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔

چنانچہ خوشی محمد نے ایک پٹھان سے سود پر پچاس روپے قرض لئے اور سوئے ہندوستان روانہ ہوا۔

وہ جالندھر سے ہوشیار پور پہنچا۔ مطلوب کاغذات دکھا کر پولیس اور دیگر اہلکاروں کو ساتھ لے کر وہاں سے اجازت لے کر وہ چک نمبر ۲۲ پہنچا۔

. . . . رحمت کا گھر!

دوپہر کا وقت تھا۔ گاؤں کے بیشتر مرد اس وقت باہر کام پر گئے ہوئے تھے۔ پولیس نے پتا کر کے سراغ اور ثبوت کے مطابق سردار ہرپال سنگھ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ رحمت اب اس کی بیوی تھی۔

سردار کا نیا مکان دیکھ کر خوشیا دنگ رہ گیا۔ اس کے باہر ایک جیپ گاڑی کھڑی تھی۔ وہی جیپ جو اس نے تین برس پہلے اس کے پاس دیکھی تھی۔ ایک طرف دو چار گھوڑے کھڑے ہنہنا رہے تھے۔

مکان نہایت صاف ستھرا، پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ایک کشادہ اور رعب دار حویلی نما گھر تھا۔ یہ اس کی ہی سفارت سے بنوایا گیا تھا۔ کیونکہ ہرپال سنگھ کی اپنے باپ سے کشت پٹ ہو گئی تھی جس کی بنیادی وجہ اس کے سیاسی نظریات تھے۔ وہ باپ کا مسلمانوں سے بے رحمانہ سلوک تھا جس کے باعث [illegible]

ختم ہوئی تھیں۔ وہ اس سے الگ ہو گیا۔

گھر کے مکین اور کارندے کام کرنے میں مصروف تھے۔ پولیس نے اپنی آمد اور مقصد کی اطلاع کروائی۔ دو بچے اجلے قمیص پہنے، صاف ستھرے صحن میں ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے دکھائی دیئے۔ ان میں ایک تندرست سانولے رنگ کا تھا، دوسرا گورا چٹا۔

«گلاب سنگھ، ادھر آؤ۔ چلو اندر۔» تراشیدہ داڑھی والے ایک سکھ ملازم نے پولیس کو دیکھ کر ٹھٹھک کر بچوں کو اندر چلے جانے کے لئے کہا۔

یہ خبر آگ کی مانند پھیل گئی تھی کہ پولیس رحمت بی بی زوجہ خوشیا ولد اللہ دتہ کو واپس لینے آئی تھی۔ عورت کا مسلمان شوہر اب تک زندہ تھا اور اسے لینے آیا تھا۔

«تھانیدار صاحب، آپ یہاں تشریف رکھیں۔ میں سردار کو اطلاع کرواتا ہوں۔» نوکر نے بڑے اطمینان سے افسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

خوشیا سانولے رنگ کے، بڑے بچے کو بغور دیکھ رہا تھا جب نوکر اسے اٹھا کر اندر لے گیا۔ خوشیا کی شادی فسادات سے کوئی دو ایک مہینے ہی پہلے ہوئی تھی۔ سانولے رنگ کے لڑکے کی عمر اب تین ایک برس ہوگی۔ چھوٹا شائد ڈیڑھ ایک برس کا تھا۔

پاکستان سے کسی شخص کے اتنی مدت کے بعد گاؤں میں آنے کی خبر سن کر مکان کی بالائی منزل پر زنانہ حصے کی ایک چق ہلی۔ ایک سڈول بازو نے جس پر سونے کا چوڑا چڑھا ہوا تھا اور ایک ہاتھ میں ہیرے کی دمکتی ہوئی انگوٹھی چق کو پرے ہٹایا اور اس کے پیچھے کسی کا چہرہ صحن میں بغور جھانکتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک چارپائی پر پولیس کے ایک سکھ سپاہی کے ہمراہ ایک جوان بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی گرد و غبار جما ہوا تھا۔ اور کپڑے بھی مسلسل سفر کی وجہ سے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ بہت مضطرب و متعجب دکھائی دیتا تھا۔ گھر کا ایک ملازم ان ملاقاتیوں کو دودھ کی لسی پلا رہا تھا۔ ان میں سے ایک خوشیا تھا۔

چق یکلخت گر گئی۔ سردارنی کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

اتنے میں سردار ہرچرن سنگھ نمودار ہوا۔ اس نے اب داڑھی اور کیس منڈوا دیئے تھے۔ اس کا باپ فسادات کے ایک سال بعد سورگ باشی ہو گیا تھا۔ گو اس کا تمام عمر باپ سے نظریاتی اختلاف کی وجہ سے کھچاؤ رہا، جس کے باعث اس کی ماں نے اُسے الگ رہنے کے لئے اسی جگہ اپنے ننھیال کا ایک نیا مکان بنوا دیا تھا۔ مدتوں ہرچرن سنگھ کے عاق ہو جانے کی خبریں بھی گرم رہیں لیکن ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں باپ کو نہایت پیارا تھا اس لئے تمام جائیداد اسی کے حصے آئی۔ بڑے بڑے امیر کمیونسٹوں مثلاً دیوان من اور میاں نظام الدین کی مانند اس نے اسے غریب کسانوں میں تقسیم کرنا بہتر نہ سمجھا۔ بلکہ سرمایہ دارانہ نظام سے جوجھنے کے لئے روک رکھی۔ اور پارٹی کی دستگیری کرنے کا ایک طریقہ۔ پولیس ایسے مشہور سیاسی کارکن کو کسی نہ کسی طرح گرفت میں لینا چاہتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے گھر میں ایک مسلمان عورت رہتی ہے۔ یہ ایک مسئلہ تھا جس میں وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ جب کبھی ایسی لڑکیوں کے دعویداروں کی طرف سے بہت زور پڑتا اور عورت غائب کرنا بے سود ہوتا تو عدالتوں کی بازیابی میں مدد دیتے۔ ورنہ پنجاب کے اکثر سکھوں کی طرح یہ لوگ اس کام کو حتی الامکان اپنی جوانمردی اور قوم کی خلاف شان سمجھتے تھے۔ اس کی تہ میں کئی قسم کے انتقام چھپے پڑے تھے۔

خوشیا کو دیکھ کر سردار ہرچرن سنگھ گھبرا کر ہچکچانے لگا۔ اس کا سر چکرا سا گیا۔

چق ایک لمحے کے لئے پھر اٹھی اور گر گئی۔

خوشیا کو بتلایا گیا کہ اس کی بیوی ایک بڑے گھر کی مالکن ہے۔ اسے اس میں ہر قسم کا عیش و آرام تھا۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ اس کی گھر میں حرمت تھی۔ اُسے مذہب تبدیل کرنے پر کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ اس کا نام اب بھی رحمت بی بی تھا۔

آخر کار خوشیا اور رحمت کا آمنا سامنا ہوا۔ خوشیا اس کے سونے کے زیورات کی تاب نہ لا سکا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ خوشیا نے اس سے لپٹ کر رونا چاہا۔

"آپ ...... آ گئے؟"

"ہاں"

"اتنی ...... دیر"

"میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا ......"

"بچھڑ جو گئے تھے"

"اب لینے آیا ہوں"

دونوں نے ایک طرف منہ پھیر لیا۔ اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں آئیں۔ کچھ وقفہ کے بعد خوشیا بولا۔

"میں غریب ہوں نا ...... اس لئے؟"

"...... اس وقت مجھے ذبح کرانے پیچھے چھوڑ گئے تھے!"

اتنے میں گلاب دوڑتا ہوا اندر آیا۔ اس کے پیچھے ہرچرن سنگھ تھا۔

"اگر تم چاہو تو جا سکتی ہو" ہرچرن کی آواز آئی۔ اس کی گھگھی بندھی ہوئی محسوس ہوئی۔

"میں نے تم سے وعدہ کیا تھا ...... اس کا پالن کی ...... دونوں ملکوں کے درمیان اس بارے میں جو معاہدہ ہوا ہے اسے پورا کرنا ہمارا فرض ہے"

"فرض پورا ہونا چاہئے" ہرچرن سنگھ کی والدہ کی ایک طرف سے آواز آئی۔

"کبھی کبھار فرض پر دل کو قربان کرنا پڑتا ہے"

رحمت گنگ ہو کر رہ گئی۔ مکان پر سناٹا چھا گیا۔

"خوشی خوشی ...... میں تمہاری امانت تمہیں واپس کر رہا ہوں۔ لیکن ...... اس میں۔ میرا بھی کچھ حصہ ہے۔ ابھی چند روز یہاں رہو۔ آخر واپس جانے کے لئے تیاری کی ضرورت ہے۔ اور تم تھکے ہوئے ہو۔ میں تمہیں خود جا کر چھوڑ آؤں گا" ہرچرن سنگھ نے کہا۔

لیکن رحمت نے "تیاری" نہ چاہی۔ وہ نہایت سادہ لباس میں ملبوس ہو کر بچوں کے ساتھ ایک فقیر کی طرح رخصت ہوئی۔ اس نے اپنے تمام زیورات اتار کر اپنی ساس کے حوالے کر دیے۔ وہ سب کا احسان مانتے ہوئے اور اپنی کسی خطا یا غلطی کی معافی مانگتے ہوئے گلاب، شمشیر کا بوجھ اٹھائے پاکستان روانہ ہوئی۔ ہرچرن سنگھ نے خوشیا کو بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ان دنوں زچگی میں عورت کو سفر کرانا نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ اور قافلوں میں بغیر آرام وہ سفر کرنے سے رہی۔ خوشیا کو اس بات سے چڑ لگ گئی۔ اس کے جی میں آیا کہ زچہ کا پیٹ پھاڑ کر اس میں سکھ کا بچہ ضائع کر دے۔

سردار ہرچرن سنگھ نے بڑے آرام سے اپنی کار میں بٹھا کر بارڈر تک پہنچایا۔ اس نے بچوں کو اپنے پاس رکھنے کے لئے کہا لیکن رحمت نہ مانی۔ اس نے ان [illegible] میں [illegible] جیسے وہ [illegible] کا حکم ہو۔

سرگرم کمیونسٹ کارکن ہوتے ہوئے اور وقت کی تنگی کے پیش نظر ہرچرن سنگھ کو پاسپورٹ نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے وہ رحمت اور خوشیا اور بچوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا بارڈر سے واپس لوٹا۔

بارڈر سے جلو کا سفر رحمت کے لئے اتنا تکلیف دہ ثابت نہ ہوا جتنا وہاں سے لاہور تک۔

رحمت کی حالت پہلے ہی نازک تھی۔ بھری بس میں سفر کرنے سے اسے اتنے جھٹکے لگے محسوس ہوئے کہ اسے درد زہ شروع ہو گئی۔ بیچاری ٹرک پر چڑھی اور اس کے دوسرے مسافر سب مرد تھے۔ اس سے طبیعت اور بھی بگڑ گئی۔ بچوں، گلاب اور شمشیر نے الگ رونا چلانا شروع کیا۔ ماں کی ناقابل سمجھ بے [illegible]

اور ایک ابھی ساتھی کی گھڑیاں۔ گھٹی فضا سے نکل کر لاری کی تپش نے ان کی حالت بھی ناگفتہ بہ کر دی۔

جب ہوشیا ہوتے، روز بعد ہی گھر پہنچا اس نے مڑ کر اپنے چھوٹے بھائی کو ان سب کا منتظر پایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک منحوس ٹولی کو دیکھ کر ان سب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بھوت دیکھ رہا ہو۔ رحمت کی ساس اسے دیکھ کر بڑے استہزا آمیز انداز میں مسکرا دی۔ اس نے بڑے تپاک سے اپنی ساس کے سر پر ہاتھ پھیرا جیسے اس کے چھو جانے سے اسے متعدی بیماری لگ جائے گی۔

جیواں نے نفرت سے دیکھ کر ایک طرف حقارت سے منہ پھیر لیا۔

بیگاں نے اپنے مخصوص، غیر منظم انداز میں اپنی بہو کی حالت کے پیش نظر فوراً چارپائی نکال کر اس پر کھیس بچھا دیا۔ اسے اس پر بہت رحم آیا۔ لیکن وہ اس کے مخالفین کا کس طرح مقابلہ کر سکتی تھی؟ انہیں کس طرح رام کر سکتی تھی۔ رحمت مظلوم تھی۔ اسے دیکھ کر اس کا دل اندر ہی اندر پسیج گیا۔ اس نے بچوں کو پچکارا، پیار کیا۔ لڑکا اور ان کی ماں کو شکر کا شربت بنا کر پلایا۔ رحمت بیہوش ہو کر ایک چارپائی پر گر پڑی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر سب کو حیرت ہوئی۔

بڑی آئی تھی سے وہاں اگر یہاں آ کر بھی اس نے ایسے ہی پچھاڑ کرنے تھے تو اسے چند دن وہاں ہی چھوڑ آتا ابھیا۔" جیواں نے بڑی تلخی سے وہاں بیٹھے ہوئے کہا۔

"بھیا! ..... کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔ بیچاری مری جا رہی ہے۔"

"جیواں!" ہوشیا نے بے قابو ہو کر بہن کو زبان بند کرنے کے لئے کہا۔ پھر ماں سے مخاطب ہو کر وہ بولا۔

"چاچی! ذرا دیکھ ..... کیا تکلیف ہے اسے؟"

"ساتواں مہینہ ہے۔" ماں بولی۔

"خون بہہ رہا۔ جلدی کر۔ کسی دائی کو بلا لاؤ۔" بیگاں نے منت کر کے شوہر سے کہا۔

"جاؤ۔ کہیں کوئی اور مصیبت نہ آ جائے۔" اب جیواں قدرے نرم انداز میں بولی۔

چنانچہ ہوشیا فوراً بھاگا بھاگا محلہ کی دائی کو بلا لے آیا۔

دائی نے آ کر بتایا کہ بچہ ہونے کے مرحلے سے زچہ کی جان خطرے میں تھی۔ بچہ پیٹ میں ہی مر گیا تھا۔ جب تک وقت گزرا، فوراً ہسپتال پہنچا دو۔ گلاب اور شمشیراں کی ناگفتہ حالت دیکھ کر زار و قطار رونے لگے۔ وہ ماں سے لپٹ لپٹ جاتے۔ جیواں ابھی بچوں کو ایک طرف کھینچتی۔ شمشیر کو دیکھ کر اسے اور بھی غصہ آتا۔

"کافر کا بچہ!" اس نے بے قابو ہو کر اس کے منہ پر زور سے طمانچہ رسید کیا۔ "چپ ہو جا ورنہ تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔"

"نہیں، اس میں اس معصوم کا کیا قصور ہے۔" بیگاں نے بچے کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ماں۔ رحمت تو تجھے بھی پیاری لگنے لگی۔ کس بیٹے کو پالنے کی خواہش ہی ہو!"

اتنے میں ان کا بابا بھی کام سے واپس آ گیا۔ وہ ان دونوں کو دیکھ کر اس کے چہرے پر یکدم تاریکی کے بادل چھا گئے۔ لیکن یکدم غائب ہو گئے۔

جب رحمت نے ایک لمحہ کے لئے آنکھیں کھولیں تو اس نے اس سے کہا۔

"کاکی۔ رحمت۔ تو نے بڑا اچھا کیا جو واپس آ گئی۔"

"ان کے لئے پانی دانی کا بندوبست کیا ہے کہ نہیں۔ گھر میں مشکل ہے کہ انہیں یہاں رہنے دوں۔ دیکھ بیگاں بیٹا تم جلدی جلدی ان کے لئے روٹی پکا دو۔ یہ ..... بیچارے تو بھوکے ہوں گے۔ پھر کس کے ہیں!"

رحمت پر بار بار غشی طاری ہو جاتی۔ وہ اسی میں بڑبڑائی۔

"تیرا بھیا۔ !! ..... کیا ہے کہ نہیں شمشیر۔" اس نے بڑی نرم اور محبت آمیز آواز میں خود کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لبوں پر زہر خند پھیل گیا۔

جب اس نے آنکھیں کھولیں، وہ ہوا میں کسی چیز کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے جست کر کے گلاب اور شمشیر کو جو اس کے سرہانے بیٹھے تھے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سینے سے چمٹا لیا اور ایک چیخ مار کر پھر بے ہوش ہو گئی۔

"پاگل ہو رہا تھا اسے لانے کے لئے!" رحمت نے ایک مسخرانہ تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے بچوں کی بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑے پانی میں بھگو کر شکر کے ساتھ کھلانے کے لئے بیگاں کو فرمائش کی۔

"لیکن غضب ہے۔ دو بچوں کی ماں ہو کر اور تیسرے کے لئے تیار ہوتے ہوئے بھی یہ بیگاں سے کتنی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔" اس نے خوشیا کی ماں کو سرگوشی میں کہا۔

"اب یہ دیکھنا ہے کہ اس گھر میں کون رہتا ہے؟" اس نے جواب میں کہا۔

"ابھی تو اس نے پٹھان کا ایک سو روپیہ دینا ہے۔ وہ اتارے گا یا نئی بیوی کا خرچ چلائے گا۔" خوشیا کی ماں نے مزید تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

اتنے میں وہ تانگہ لے آیا اور رحمت کو اس پر لاد کر پھر ہسپتال لے گیا۔ جو وہاں سے کوئی ڈیڑھ ایک میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

ڈاکٹروں کی تشخیص درست تھی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر انتہائی تکلیف کے بعد رحمت کے سات ماہی لڑکی پیدا ہوئی۔

ہسپتال کے جنرل وارڈ میں بھی خوشیا کا خرچ ایک دو روپیہ روز ہو ہی جاتا۔ مناسب خوراک اور دوائیاں۔ ان سب کی ضرورت تھی۔ گو وہاں سے کافی آرام تھا۔ بہت سی چیزیں رعایتاً اور مفت بھی مل جاتیں۔ ہسپتال میں دوائیوں کی بلیک نہ ہوتی۔ مسیحائی دارالشفا میں محمود و ایاز مریضوں میں امتیاز نہ کیا جاتا۔ نرسیں اور دیگر عملہ اپنی خدمات کا معاوضہ طلب نہ کرتے۔ یسوع مسیح کا پیغام عملی طور پر غیر عیسائیوں تک پہنچایا جاتا۔

خوشیا کی یہی کوشش تھی کہ جس طرح ہو اس کی رحمت کی جان بچ جائے۔ نتیجتاً جب وہ اسے گھر واپس لایا۔ تو وہ گل خان پٹھان کا اور مقروض ہو چکا تھا۔ اس نے اس سے پچیس روپے اور ادھار لئے تھے جس کے عوض اس نے چھ روپے ماہوار سود دینے کا قرار پایا تھا۔ یعنی کل واجب الادا بیاج ایک اٹھنی روپیہ بنتا تھا۔ اور خوشیا کی ماہوار تنخواہ چالیس روپے تھی جس میں سے وہ ایک مہینہ پیشگی لے چکا۔ اور اصل واپس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی پہلی تنخواہ بھی پٹھان کے پاس رہن تھی۔ جس کی کوشش ہوتی کہ کسی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ روپے اپنی شادی کے لئے اکٹھے کرتے جائیں۔

جب وہ رحمت اور بچوں کو لے کر واپس گھر آیا تو معلوم ہوا کہ گھر والے سب چند روز کے لئے سندھ چلے گئے تھے۔ انہیں زمین مفت مل گئی تھی۔ اسے دیکھنے گئے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے کلیم داخل کر رکھے تھے۔ کیا وہ اسے دھکا دے جائیں گے؟ خوشیا کو یقین نہ آیا۔ محلے والی کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ بیگاں شوہر کی اجازت کے بغیر ان کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن نادان اور کم سمجھ تھی۔ ان کے بہکانے میں آگئی۔ کہ خوشیا اس کی سوت کے کہنے سے ان کے پیچھے نہ بھاگے گا۔ اس نے خود انہیں یہ ہدایت کی تھی۔ اس نے بیگاں کو اجازت دے دی تھی کہ اس سے ملے بغیر وہ سندھ چلی جائے۔ اس پر انہوں نے یہ کہہ کر اس کے کان بھرے کہ وہ تو اسے طلاق دینا چاہتا تھا۔ اس کی پہلی ملاقات تھی؟ اب وہ اس کی ماں اس گھر میں کیسے گل سکتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے سسرال کے بہکانے میں آگئی۔

اس صورت میں خوشیا بیوی بچوں کو لے کر اپنے مالک کے ہاں چلا گیا۔ وہاں ایک کوارٹر خالی پڑا تھا۔ مالک نے اس پر مہربانی کر کے اسے مفت دے دیا۔ اس شرط پر کہ وہ ایک مہینے سے زیادہ وہاں رہا تو اسے باقاعدہ پانچ روپے کرایہ ادا کرنا پڑے گا۔ اسے اس کوارٹر کے لینے کے لئے کئی جتن کرنے پڑے تھیں۔ لیکن وہ چونکہ سو روپیہ پگڑی مانگ رہا تھا اس لئے کوئی بھی وہاں آنے پر تیار نہ ہوا۔

جوں جوں خوشیا کا وقت گزرتا گیا رحمت کی صحت بحال ہوتی گئی۔ اس پر نیا روپ آنے لگا۔ لیکن شمشیر، فرزانہ دونوں اسی طرح گلاب تک خوشیا کو کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے۔ انہیں دیکھ کر اس پر نفرت کی لہر دوڑ جاتی۔

"ان کو یتیم خانے کیوں نہ چھوڑ آئیں؟" ایک روز خوشیا نے رحمت سے کہا۔

"ابھی یہ ان کا کیا قصور ہے، گلاب تو تمہارا ہے!" رحمت نے جواب دیا۔

"...... ہوں ...... مجھے ۔ مجھے کیا معلوم!"

"...... ثبوت کے لئے میرے پاس اللہ کے سوا اور کون گواہ موجود ہے۔ اور وہ بھی تو بڑا بے پرواہ ہے۔ بڑا ...." رحمت نے ایک لمبی آہ بھر کر اپنی طرف سے فیصلہ کن جواب دیا۔

"لیکن تم انہیں ساتھ کیوں لے آئیں؟"

"اپنے آپ کو شاید انہیں بھی ......" رحمت کی گھگی بندھ گئی۔

"لیکن تم نے تو اس سے شادی کر لی تھی؟"

"جب اسے — کسی طرف سے کوئی خبر نہ آئی تو کیا کرتی۔ وہ جگہ جگہ چھپتی بھی ...... جب انہوں نے مجھے تلاش کر کے اپنے پاس ......"

"کون ...... ہرچرن سنگھ؟"

"...... ہاں ...... اور گلاب کو۔ جو آپ کی اولاد ہے۔ میں کس طرح بے آسرا لئے پھرتی۔"

"...... وہ ......"

"وہ سب میری عزت کرتے تھے۔"

"کیونکہ اس نے تمہیں اپنے گھر میں ڈال لیا تھا؟"

"یہ غلط ہے۔ انہوں نے مجھ سے شادی کر لی تھی؟"

"شادی کیسی؟"

"وہ بڑا نیک آدمی تھا؟"

"کیا تم سکھنی ہو؟"

"پہلے تو — انہوں نے کہا، کہ تم اگر چاہو تو اپنے مذہب پر قائم رہو۔ میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا؟"

ہوشیار سوالوں میں پڑ گیا۔

"لیکن تمہیں بچے چھوڑنے ہوں گے؟"

اس نے بچوں سے بہت پیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں دور دور تک نہ جانے دیتا۔ اگر وہ کسی چیز کے لینے پر اصرار کرتے تو انہیں وہ چیزیں لے دیتا۔ اس کے دوسرے دو دوستوں نے اس کے دل میں یہ شک پیدا کر دیا تھا کہ اگر اس نے بچوں کو علحدہ کیا تو رحمت اس کی کبھی بیوی نہ رہ سکے گی۔ انہیں دیکھ کر اُسے ان کے باپ کی یاد ستاتی رہے گی۔

ایک رات رحمت نے ہوشیار کو راضی کر لیا۔ ہرچرن سنگھ سے کہا گیا تھا کہ وہ جب چاہیں بچے اُسے واپس بھیج دیں۔ وہ انہیں خود اگر لے جانے کا قائل تو اس نے انہیں پہلے ہی ان کے پاس چھوڑ جانے کو کہا تھا لیکن رحمت نہ مانی۔ وہ بچوں کو یتیم خانہ میں چندہ اکٹھا کرنے یا یتیموں کے لئے کہیں اکٹھا کرنے کے لئے ان کے سپرد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اس بارے میں کئی دن رات سے سوچ لیا تھا۔ اس نے یہی کہ ہندوستان بھجوانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ننھی سلطانہ جو ابھی دو برس کی تھی کا سوال اب بھی باقی رہ گیا تھا۔ ہوشیار کے لئے یہ ایک اور ثابت شدہ جیتا جاگتا کلنک تھا۔

رحمت نے ہرچرن سنگھ کو بچے واپس لے جانے کے لئے خط لکھوایا۔

وہ ایک جتھے کے ہمراہ انہیں لینے کے لئے بارڈر پر آیا۔ اپنے آنے کی اس نے پہلے اطلاع کر دی۔ سیاسی پابندیاں ابھی تک اس پر پڑی تھیں۔

اُسے پاسپورٹ نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے خوشیا اور سب کو ملنے کی بڑی خواہش ظاہر کی۔ اس کا سات آٹھ مہینے کے عرصے میں صرف ایک خط آیا تھا جس میں اس نے نہایت اختصار سے بچوں کا حال احوال پوچھا تھا۔ خوشیے نے ہرچرن سنگھ کا نام پڑھ کر ہی اسے پھاڑ دیا۔ آج وہی ہرچرن سنگھ دوبارہ بارڈر پر آ رہا تھا۔

خوشیا نے سلطانہ کو بھی ماں کی گود سے چھین کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی۔

"اگر تم نے مجھے اسے حوالے کیا تو میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔"

"اس سے پہلے میں نہ اس کا گلا گھونٹ دوں گی بھلا؟"

بچوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے سے جدا ہوتے دیکھ کر رحمت پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ وہ اس خونچکاں نظارے کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے خوشیا کو اکیلے ہی جانے کو کہا۔

"میرے جانے سے کہیں بات بگڑ نہ جائے،" اس نے گلاب اور شمشیر کو آخری بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"تمہاری ماں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں بیٹے۔ جہاں رہو، خوش رہو!"

واپسی کے وقت خوشیا نے بچوں کو آم، انگوٹھیاں، طوطیاں اور مٹھائی لے دی۔ انہیں کھلونے بھی لے دیئے۔ وہ اب انہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن بچے سب سے چھپتے پھرتے، ماں۔ کو گھورتے تھے۔ ان کی نظریں اداس و سوگوار تھیں وہ یوں خائف تھے جیسے کوئی انہیں مقتل کی طرف لے جا رہا ہو۔

بارڈر پر ہرچرن سنگھ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ پہلے سے بہت دُبلا دکھائی دیتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ بہت سے پھل، نہایت عمدہ آم اور خربوزے لایا تھا۔ اگر وہ چاہتا تو وہاں کئی آموں کے رسیا کو دوڑ کر بلیک کر سکتا تھا۔ بچے کے پاس، علاوہ ازیں، پاپڑ اور بڑیاں تھیں جو وہ خوشیا کے لئے تحفہ لایا تھا۔

خوشیا اور بچوں کو دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔ گلاب کو دیکھ کر اس کی نظریں سوال سے خود بخود جواب میں بدل گئیں۔ بچوں کی واپسی کے لئے رسمی اور قانونی کارروائی ہو چکی تھی۔ اس نے انہیں سنبھالتے ہوئے نہایت مختصر الفاظ میں پوچھا۔

"اور سب خیریت ہے؟"

"ہاں۔ خدا کا فضل ہے۔ آپ ہی ...... کیسے ہیں؟"

"بارڈر پر تو وقت کا پتہ نہیں چلتا۔ یہاں آ کر ذہن میں عجب عجب خیالات آتے ہیں،...... لکیروں کی سرحدوں کی طرح مٹتے اور ابھرتے، بنتے اور مٹتے ہیں۔"

بارڈر بند ہونے والا تھا۔ خوشی محمد نے جلدی جلدی ہرچرن سنگھ سے اجازت لی۔ آخری وقت اس نے اسے اور بچوں کو یوں چھاتی سے بھینچ کر رخصت کیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے جیسے وہ سب کچھ وہیں بھول گیا ہو۔

ابھی وہ گھر بھی نہیں پہنچا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ چودھری گل محمد اصل سے دوگنی رقم یعنی دو آنے فی بیگہ کے حساب سے سود کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں خوشیا کے خلاف ڈگری لے کر اس کی چیزیں قرق کرا چکا ہے۔

جب وہ گھر پہنچا تو خوشی محمد نے سلطانہ کو مرا پایا۔ پتہ چلا کہ رحمت نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس عرصے میں رحمت اور کالو کی بیوی انہیں پر خوشیا کا ایک دوست عاشق ہو گیا تھا۔ اس واردات کی اپنے عشق میں ناکام ہونے کی وجہ سے پولیس میں خبر کرا دی۔

پولیس موقع پر پہنچی۔ رحمت کو زیر حراست لے لیا گیا۔

یورپ میں اجنبی

منظور الٰہی

(۱)

اندلس کی فضا میں اداسی ہی اداسی ہے۔ اس کے در و بام پر ایک ناقابلِ بیان افسردگی کہر کی طرح مسلط ہے۔ ابھی دن کا تڑکا تھا کہ گاڑی آہستہ آہستہ قرطبہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں جو تاریخ کے بعض نازک موڑ پر خون میں نہا گئی تھیں۔ اس خون میں طوائف الملوکی اور عیش پرستی کی بیہودہ قربانیاں بھی شامل تھیں۔ انہیں پہاڑیوں پر جذبۂ حب الوطنی سے سرشار نصرانیوں نے مذہب کے نام پر "وحشی" عربوں کو تہِ تیغ کیا تھا۔ شاید اس BROODING SADNESS کی وجہ وہ ہے جو ایک عیسائی مؤرخ نے لکھی ہے: "عربوں نے اندلس کو گلزار کی طرح سجایا۔ جب یورپ پر جہالت و ظلمت کا عالم تھا، ادب کی شمعیں روشن کیں، شاعری — CHIVALRY کے اصول وضع کئے۔ ہسپانیوں نے عربوں کو جلا وطن کرکے کیا پایا؟ کچھ عرصہ ہسپانیہ چاند کی طرح مستعار روشنی سے چمکتا رہا۔ پھر گہن لگ گیا اور اس وقت سے یہ ملک تاریکیوں میں بھٹک رہا ہے۔" جس قسم کے مسلسل، مضمحل احساسات لئے قرطبہ کے نواحی علاقے میں پہنچتا ہوں، اترائی گھٹتی گئی۔ دن کا اجالا آگے بڑھ رہا ہے۔ ان ویران پہاڑیوں پر کبھی عربوں نے انجینئرنگ کے کمالات دکھائے تھے۔ AQUEDUCTS بنائے گئے تھے جن سے سیرا مورینا کے پہاڑوں سے پانی لا کر دریا پر بند بنا کر سارے علاقے کو شاداب کیا تھا۔ انار، انگور، خوبانی، بادام، کھجور اور مسلسل مقامی پھلوں پر اضافہ کئے تھے۔ بعض پھلوں کو ہسپانیہ کی آب و ہوا قبول نہیں کرتی تھی لیکن عرب باغبانوں نے اپنے کمالِ فن سے ملک کے گوشے گوشے میں پیوند لگائے۔ آج یہ علاقہ SOIL EROSION کا شکار ہے۔ مٹی کے ٹیلوں میں گہرے شگاف نظر آ رہے ہیں۔

بدعملی کے ایک مختصر وقفے کے سوا قرطبہ اڑھائی سو سال مغرب کا عظیم ترین شہر رہا۔ اس کے کمالِ عروج کا زمانہ دسویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ شہر کی آبادی دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ آب رسانی کا بندوبست جیسا کیا گیا تھا، میلوں لمبے پختہ کوچے جہاں رات کو روشنی کی جاتی تھی۔ آئندہ دو سو سال تک یورپ میں کوئی ایسا شہر نہ تھا جہاں پختہ کوچے اور روشنی کا انتظام ہو، جہاں پبلک سکول اور حمام ایسی نعمتوں کا خیال کیا جا سکتا تھا۔

روزمرہ زندگی میں نفاست کو جو مقام حاصل تھا شمالی یورپ والے اس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ قرطبہ کا منقش چرمی ظروف سازی اور چرم سازی کا کام CORDWAIN — قرطبہ کی مناسبت سے محاورہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ الہمبرا کا ریشم اور زردوزی کا کام، ویلنسیا کے قالین، مرسیہ کے پھل اور باغات، اشبیلیہ کی شراب

اور زیتون کا تیل اور دیگر کا پگھلا ہوا روغن سے بنا ہوا صابن . . . . . لکھائی کے لئے عرب کاغذ کی بہترین قسم استعمال کرتے تھے۔ کتابیں جلد بندھی ہوتی تھیں مورخین متفق ہیں کہ الحکم کی لائبریری میں چار لاکھ کتابیں تھیں۔ علم کے کارندے اسی دھن میں دور دراز ممالک کا سفر کرتے اور جہاں کوئی نادر یا نئی تصنیف شدہ کتاب دستیاب ہوتی منہ مانگی قیمت پر خرید لیتے۔ قرطبہ کی یونیورسٹی نظامیہ بغداد اور الازہر کی ہم پلہ تھی۔ بچہ بچہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا یورپ میں ابھی تک جہالت کا دور دورہ تھا۔ چند راہبوں پادریوں کے علاوہ لوگ علم سے بے بہرہ تھے اور کتابوں کی تعداد بس چند تھی۔

قدیم شہر کا محیط چوبیس میل تھا لیکن خوشنما سواد شہر دریا کے کنارے پر پھیل گئے تھے۔ میلوں تک باغات اور مکانوں کا لامتناہی سلسلہ تھا۔ گلیاں اس نفاست سے PAVE کئے گئے تھے کہ آج بھی گلیوں کے پتھروں والی گاڑی شور مچاتی ان گول اور سخت پتھروں پر سے گزرتی ہے جو ایک ہزار سال پہلے عربوں نے ترتیب سے جوڑے تھے۔ دیہہ دریا کے کناروں کو ملاتے تھے۔ اس سے بڑا پل اب بھی وادی الکبیر کی موج سیلاب سے بلند و محفوظ کھڑا ہے۔

قرطبہ کے بھرے بازاروں میں سیاہ فام حبشی، گندمی رنگ والے بربر، ایرانی تاجر، عرب علما اور کاریگر علمی وردی پہنے خواجہ سرا اور شاہی محل کے پاسبان سفید ریشم میں ملبوس امرا اور درمیانہ طبقہ کے تاجر اور مفلس میں نسبتاً غریب کاریگر اور مزدور ناظرین کے گرد گھومتے۔ یہ کاروان رنگ و بو گو چلا آتا سواد شہر میں گم ہو جاتا تھا جیسے شوکت مرحوم کا ماتم کر رہے ہوں۔

قرطبہ چھوٹا شہر ہے لیکن وضع قطع سادگی اور دلکشی کے لحاظ سے اس میں ایک ایسی جاذبیت تھی جس کا نقش ذہن پر رہ گیا۔ اُمرا کے مکانات ہسپانوی طرز کی حویلیاں مسلمانوں کے انداز کی، سنگ مرمر کا بس RATIO اور دروازہ کے گرد ہرے بھرے بیل بوٹے اوپر صیقل شدہ جنگلہ مکان مکین کی ذوق اور نفاست طبع کا پتہ دیتے تھے۔ ہر چیز قرینہ سے دھری تھی گلیاں گو تنگ تھیں لیکن بے حد صاف ستھری۔ مسجد کا راستہ شہر کے پرانے حصے میں سے ہو کر جاتا ہے۔ مسجد کے قریب ایک چھوٹا سا چوراہا تھا اتنا دلفریب کہ بیٹھنے کو جی چاہے پتھروں سے بنی ہوئی گلیاں دو منزلہ مکانوں پر ختم ہو گئی تھیں۔

مسجد اس میں گویا پس انداز کا دل تھی۔ مسجد کے اندر قدم رکھتے ہی جو چیز متوجہ کرتی ہے وہ اس کی وسعت اور کشادگی ہے۔ مسجد کی خوبصورتی اس کی سادگی اور SWEEP میں پنہاں ہے۔ متناسب و متعدد ستون چھت کو سہارا دیئے ہوئے ہیں آج ایک ہزار میں سے ۸۵۰ ستون قائم ہیں۔ باقی ستون گرا کر مسجد میں درمیان کلیسا بنا دیئے گئے ہیں۔ گو کلیسا کی تعمیر نامناسب حالت پر اضافہ ہوئی ہے اس کے باوجود مسجد کی وجاہت لازوال ہے۔ انسان اس دالان حصہ کی کشادگی دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے۔ امتداد وقت سے زینت سے نقش و نگار مٹ گئے لیکن سیپٹے کے چھوٹی چوکیاں اور گلکاریاں اب بھی پرانی آب و تاب کی یاد دلاتی ہیں۔ چارلس پنجم نصرانی ہونے کے باوجود قرطبہ کے بلدیہ والوں نے کلیسا بنانے کی سخت مخالفت کی تھی وہ آخر زور لگاتے رہے کہ کلیسا کی تعمیر سے مسجد کی خوبصورتی تباہ ہو جائے گی لیکن آرچ بشپ نے فیصلہ اُن کے خلاف دیا اور دس سال بعد جب آرچ بشپ کو قرطبہ سے ہوا تب آئے اور مسجد دیکھنے کا موقع ملا اس نے اپنے کئے پر اظہار تاسف کرتے ہوئے کہا اگر مجھے معلوم ہوتا مسجد اتنی جمیل ہے تو یہاں کلیسا تعمیر کرنے کا حکم نہ دیتا یہ روایت قرطبہ کے میونسپل ہال میں ایک دستاویز کی شکل میں محفوظ ہے۔

ہمارے ہسپانوی راہبر نے کہا۔ مسجد کے بیچ کلیساؤں کی تعمیر ایک افسوسناک امر ہے لیکن مجھے یہ سوچ کر گونہ تسلی ہوتی ہے کہ اگر یہ در کلیسا نہ ہوتے تو شاید اس مسجد کا بھی وہی حشر ہوتا جو قرطبہ کی . . . مساجد . . . کا ہوا جن کا ڈھونڈے سے بھی اب نشان نہیں ملتا۔ علامہ اقبال ہی یہاں آئے [illegible] مجازی حسن سے ادا [illegible] کر کہہ رہے ہیں؟ ہادی تعالیٰ نے اپنے دیوانوں کو دیکھا جہاں ایک مسجد میں جو ہم نے دو نفل پڑھے گئے

تیرے عشق میں وہ عظمت بھی راحت تھی

جاننا خوب ہے کہ علامہ اقبال نے مسجد کو کسی مادی چیز سے تشبیہ نہیں دی۔ ان کے نزدیک وہ ایسی مناسبت سے واضح ہے ؎

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل　　　وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

پھر سے

ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلب مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

مسجد سے باہر نکلے تو خیال آیا چند SOUVENIRS خریدے جائیں۔ ایک بڑے دروازے کے سامنے ایک دکان میں چلے گئے۔ تین لڑکیاں کاؤنٹر کے دوسری جانب ہم سے روبرو تھیں، خوش خلق، ہنس مکھ، اور میٹھی میٹھی باتیں کرنے پر بضد۔ لیکن یہاں وہ نقشہ تھا کہ

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

زیادہ گفتگو اشاروں سے ہوئی، آدھی آدھی باتیں۔ اور ان میں کوئی کاروباری پن نہ تھا جیسے فرانس یا اٹلی میں دیکھنے میں آیا۔ چلنے سے پہلے میں نے سوچا ہسپانیہ سے کچھ تعلق جتانا چاہیے۔ لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

"ہسپانیہ پر کبھی مسلمان حکمران تھے؟"

"جی ہاں" (لاعلمی کی مسکراہٹ)

"ہمارا حکمرانوں سے روحانی تعلق ہے ہم بھی مسلمان ہیں؟"

"جی" (ایک اور مسکراہٹ)

"آپ زہرا ہو آئے ہیں؟"

"ابھی تو نہیں جا سکا لیکن آپ ہو آئیے۔ راستہ بھی ٹھیک ہے، دیکھنے کی جگہ ہے" ہوٹل کے منیجر نے کہا۔

"آپ کو یہاں کتنے سال ہو گئے؟"

"آٹھ سال!"

عبدالرحمٰن الناصر کا تعمیر کردہ قصر زہرا اس نے اپنی کنیز کو اپنے نام سے موسوم کیا، مدینۃ الزہرا۔ یہ جہاں اگر بیچے گا چار سو درہم پائے گا۔ الناصر کی بھتیجی زہرا کی رہائش کے لئے قرطبہ سے چھ میل دور اس صحرا پہاڑ کی بنیاد رکھی گئی۔ مختلف رنگ کا مرمر دنیا کے مختلف حصوں سے منگایا گیا۔ سلاطین قسطنطنیہ اور روم نے ستونوں کے تحفے بھیجے۔ [illegible] سال مسلسل مرمر تراشنے میں مصروف ہو گئے۔ آبنوس اور [illegible] خوشبودار لکڑی مشرق سے۔ سونے کے اور منقش [illegible] سے [illegible] سنگ مرمر سے تراشی ہوئی [illegible] اپنے عروج پر [illegible] کے زور سے [illegible] تھا۔

المنصور نے ایک اور عالیشان محل تعمیر کیا جہاں وہ غیر ممالک کے سفیروں سے ملاقات کرتا اور مصاحب گردوں کی جبیں [illegible] تحفے۔ اس محل کا [illegible] بربروں کے ہاتھوں لٹا تھا۔ تہذیب دشمن سے [illegible] سپاہی جو خلیفہ نے [illegible] کے لئے بلائے گئے۔ ایک سیلاب کی طرح اس حسین مرقع پر ٹوٹ پڑے۔ اور جو اشیاء [illegible] قوت کے ساتھ آرائش و زیبائش کی دھجیاں بکھیر دیں۔ پھر [illegible] جیسے قبر یا [illegible] ۔

ایک عرصہ دراز کی کوشش سے ان کھنڈرات کو [illegible] کا حجاب [illegible] زیر زمین [illegible] اور ٹھیکریوں کی [illegible] نکلنے ہوئے تو اور کسی زمانے میں [illegible] ۔ عورت [illegible] یا ستونوں کے [illegible] زہرا کی [illegible] حالت [illegible] عجائب خانہ [illegible] جاتے ہیں۔

اشبیلیہ اندلس کی دوسری [illegible] عربوں کا مشہور دارالسلطنت "المعتمد" [illegible] اشبیلیہ [illegible] آج بھی [illegible] عرب سے [illegible] ہوتی ہے۔ شہر کی گلیاں، محرابیں، محل کے شاندار جھروکے [illegible] "القصر" کا ایوان السفیر آج بھی عظمت گذشتہ کی یاد دلاتا ہے۔

مسجد کا نام و نشان باقی نہیں لیکن اس کا مینار "جیرالڈا" اب بھی ناز سے سر اٹھائے شہر کی نگہبانی کر رہا ہے۔ جیرالڈا کی چوٹی پر شہسوار گھوڑوں سمیت [illegible] پہنچ جاتے تھے۔ سات صدیاں گزریں یہ ایک عظیم مسجد کی نگہبانی کرتا تھا۔ اور جب رات کی چادر کائنات کو ڈھانپ لیتی [illegible]

کر اب کی حرکات کا مطالعہ کرتے سیاحوں کو ہسپانوی رقص ناچتے اور کورٹ وشرٹ کا حساب لگاتے۔

PLAZA کے درمیان ایک جنگجو کا مجسمہ ایستادہ ہے۔ وہ گھوڑے پر سوار دشمنوں سے نبرد آزما ہونے جا رہا ہے۔ اس کے گھوڑے کے اگلے دونوں اٹھے ہوئے ہیں۔ اشبیلیہ میں اصطبل گاہ ہے۔ مسکراتی ہیں BULL FIGHTS شام کو پلازا میں گھر سے نکل جاتا ہے۔

معتضد میں [illegible] ہم نے شہر کو [illegible] خلیفہ دوم میں القصر دیکھی بادیاں رکھتے تھے۔ مگر رہیاں سناتے تھے اور پہلی میں عیسائی رعایا بھی آباد کرتی تھی۔ بھائی بچا ہے لیکن شمال میں عیسائی حکومتوں کے حالات کروٹ لے رہے تھے اور سوچ تو آتی ہی ....

یہ علم دوست عالم پرور معتمد کا اشبیلیہ ہے۔ شمشیر زن معتمد جنگ زلاقہ میں اس کی رانوں تلے تین گھوڑے مرے۔ زرہ بکتر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے لیکن جو ساتھ آ گیا تھا ایک ہی تلوار کا دھنی تھا لیکن قسمت کا دھنی نہ تھا۔ یوسف بن تاشفین اس کے بلانے پر ساحل پر آیا تو عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے سیل کو روکے۔ پھر معتمد نے یوسف بن تاشفین کے خلاف [illegible] جنگ آزما ہونے سے شکست کھا کر قید ہو [illegible] میں ہے جیسے نبرد و شمشیر کی ایک مثل میں رشد کا اشبیلیہ ہے جس نے یوسف بن عبدالمومن کے دربار میں عروج پایا! ابو یوسف الموحدین نے "رجعت پسند" [illegible] کا جسم جلایا!!

غرناطہ۔

الحمرا۔ جنت رواں۔ شہرت کے جشن۔

غرناطہ پر شمع ہلالی شہاب ثاقب کی طرح اندلس کے افق پر ابھی تک منور رہا جب ہسپانوی مسلمان باہم خانہ جنگی میں مصروف تھے اور عیسائیوں کے ہاتھوں پے در پے شکست کھا رہے تھے۔ الاحمر نے جس خاندان کی بنیاد رکھی اسے اندلس میں مسلمانوں کے اقتدار کے اڑھائی سو برس بعد تک حکومت کرنا تھی۔ اس نے غرناطہ کو دارالسلطنت بنایا۔ اس تاج کو اہل غرناطہ نے "غالب" کا خطاب دیا تو اس کا جواب تھا: لاغالب الا اللہ۔ یہ الفاظ الحمرا کے گوشے گوشے میں ایک ابدی حقیقت کی طرح ثبت ہیں گو وہ دور زمانہ سے عتیق و تمام ہو گئی ہے۔

الحمرا محض سلطنت ہی نہیں کا ایک کارنامہ ہے۔ دارالسرور۔ ایوان السفیر، ایوان الاسد۔ ایوان بنی سراج۔ چھت کی جواہر نگاری، زردوزی، گلکاری، دودھ دھلی قوس و قزح کے [illegible] ستونوں کی قطاریں جالی کے کام کی نفاست، دیواروں کی جاذبیت خوشنما کھڑکیاں اور پتھر کے ٹکڑوں سے بنتے ہوئے نقشے جال اب بھی انسان کو محو حیرت کرتے ہیں۔ ایسی منظر میں [illegible] فوارہ کی [illegible] ایسے رنگ [illegible] میں پانی کے چشمے ابلتے ہیں۔ بھرتے شور مچاتے ہیں اور کسی وادی کی چٹانوں سے ٹکرا کر تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ غرناطہ آج بھی اک لٹے ہوئے تمدن کی نوحہ خوانی ہے جس کے ایوانوں میں اک مرد حر کی آواز آخری بار گونجی تھی۔ [illegible] اور [illegible] ایک تسلیم نے پہلے [illegible] کو آئیوں کے ساتھ انجام ہوگا؟ اگر تم میں کچھ بھی غیرت باقی ہے تو میرے پیچھے آؤ۔ [illegible] کی طرح میدان میں کٹ مرنا غلامی کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔

موسیٰ بن ابی الغسان [illegible] ایوانوں سے نکل کر [illegible] ابو عبداللہ اور اس کے [illegible] زمین میں گڑ گئے۔ غیرت وحمیت کا [illegible] وہ اللہ کی مرضی [illegible] موسیٰ نے [illegible] گھوڑے کے [illegible] زخمی [illegible] غرناطہ کے [illegible] باہر اس کی مڈبھیڑ چند عیسائی KNIGHTS سے ہوئی۔ دست بدست لڑائی میں اس نے چار پانچ کو ابدی نیند سلا دیا۔ خود زخموں سے چور ہو کر دریا میں کود پڑا اور زرہ بکتر کے بوجھ سے وہ اس کی گہرائیوں میں اتر گیا۔

غرناطہ کے شجیع منظر سے باہر عیسائی KNIGHTS کو چیلنج کر کے داد شجاعت دیتے ہسپانوی غرناطہ کے شہسواروں کا لوہا مانتے تھے۔

GENTLEMEN ALBEIT MOORS.

وہ شمشیر زنی کے آداب جانتے تھے۔ موسیقی کے دلدادہ، باہم بہ حریف سے جنگ، بیکسوں کی حمایت .... غرناطی افواج کا محاصرہ [illegible] ناکام ہوا۔ وہ طویل صلیبی جنگ جو [illegible] سال جاری رہی جس میں [illegible] سو برس [illegible] غرناطہ اس مسلسل کی آخری کڑی تھی۔

غرناطہ کے اوپر پہاڑ کاٹ کر جپسیوں نے رہائش کے لئے گپھائیں بنالی ہیں۔ یہ گپھائیں رات کو بجلی کی روشنی میں جگمگ کرتی ہیں۔ جپسی رقاصہ بل کھا کھا کر تیزی سے رقص کرتی رہی اور بیچارا داور بھی تیزی سے سفید شراب کے گلاس خالی کرتا رہا اور سب سے زیادہ داد بھی اسی نے دی۔

دوسرے روز ریستوراں میں ایک خوش پوش جوڑا ہمارے ساتھ والی میز پر بیٹھ گیا۔ وہی بشاشت اور مسکراہٹ، وہی بات کرنے پر اصرار۔ آخر ہم نے مان لیا کہ آدمی کب تک اشاروں سے بات کر سکتا ہے۔

ہسپانیوں کا BOABDIL اہلِ غرناطہ کا سلطان الصغیر سر جھکائے آہستہ آہستہ جا رہا ہے۔ اصل لقب ابو عبداللہ۔ زوالِ اندلس کی مجسم تصویر۔ غرناطہ کا آخری فرمانروا اپنی ماں عائشہ کے زیرِ اثر ایک مطلق العنان حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس آرزو کو حاصل کرنے کے لئے اس نے فرڈیننڈ کی کٹھ پتلی بننا منظور کیا۔ اپنے مجبور باپ ابوالحسن کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور بغاوت بھی اس وقت جب ابوالحسن اہلِ قسطیلہ سے انتقام لینا چاہتا تھا اور جس نے خراج بھی بند کر کے فرڈیننڈ کو پیغام لکھ بھیجا تھا: "بادشاہ غرناطہ مر گئے اب ہماری ٹکسال میں سکوں کی بجائے شمشیر اور نیزے تیار ہوتے ہیں۔"

روایت ہے کہ فتح غرناطہ کے بعد جب ابو عبداللہ جلاوطنی کے دن گزارنے وادیٔ بشارات کی سمت جا رہا تھا تو فرطِ غم سے بار بار حسرت سے الحمرا کی طرف دیکھتا۔ پھر ایک پہاڑ کی چوٹی پر ٹھہر گیا اور آخری نظر اپنے محبوب شہر پر ڈالی۔ ایک طرف گلستان تھے، سرو مسلمانوں کے مقابر پر جھوم رہے تھے اور ان کے اوپر قصر الحمرا جگمگا رہا تھا۔ دوسری طرف ویران میدان مسلسل تھا جس میں جارح کی فوج ایک اجنبی ملک کو مسخر کرنے آئی تھی۔

دیدۂ عبرت باز رہے، ایسی قوم کو زندہ رہنے کا حق نہ تھا۔ اس کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ عرب، بربر، مولد، حجازی، نسلی تفاخر و امتیاز، طمع اور تفرقہ میں امتیاز، تاراج، خودمختاری کی ہوس ...... اس کی ہلاکت کا باعث بنی تھی۔ شمالی افریقہ کے صحراؤں سے تازہ دم مذہب کے نشے میں سرشار بربر "موحدین" جو عیش سے متنفر تھے اور فلسفیوں کی عبارت حقارت سے دیکھتے تھے۔ شمال میں عیسائی حکمران اندلس کی غلامی اور زوال کے عروج پر آ گئے تھے۔ دراصل وہ مردوں کو بھی معاف نہ کرتے۔ دل کے میل ڈالے بیٹھے تھے جنگ کے وہ ہاتھ جو عرب ہسپانیہ کو مٹا دینا چاہتے تھے۔

جو ہم لوگ آج بھی بعض رنگ دیکھنے کی اہمیت نہیں سمجھتے ان کو محسوس ہوگا کس شدت سے وہ احساس ہے وقت کا دھارا کیسا تند رہا ہے۔ اس "تند و سبک سیر" میں اندلس کی خانہ جنگیاں، جگمگاتے ہوئے شہر اور ایک پرشکوہ تمدن خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

ہسپانوی مورخوں کا ایک گروہ دعویٰ کرتا ہے کہ انہوں نے عربوں سے کچھ ورثہ میں پایا ہی ہو تو کسی چیز کے لئے ان کے احسان مند ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اندلس پر آٹھ سو سال تک حکومت کرنے کے باوجود عرب اور مور ان کی موجودہ طرزِ معاشرت اور ثقافت پر اثر انداز نہیں ہوئے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود اشبیلیہ میں ایک نسبتاً "ماڈرن" عمارت موجود ہے جو نمائش کے لئے بنائی گئی تھی اور جس کا ایک حصہ بالکل مسجد کے مشابہ ہے جس کا مینار تک موجود ہے۔ نام اور کھانوں میں مشرق کی جھلک سے قطع نظر "خوش دل و گرم اختلاط، سادہ و رنگیں جبیں" اس حد تک کہ زبان سے اجنبیت کے باوجود باتیں کرنے پر مصر، اجنبی کے پیچھے خوش امید بیچنے والے موجود، کہیں ہسپانوی ٹرین سے اترنے والے سب کو "الوداع" کہتے، السلام، دوپہر کے طعام کے بعد تین چار گھنٹے آرام (SIESTA) MANANA یعنی "آج نہیں" کا بکثرت استعمال ...... کون کہہ سکتا ہے کہ ہسپانوی ثقافت میں عرب کا حصہ نہیں۔ رنگ میں اتنا ڈوبے ہیں، رقاصائیں اور رقاصین جو آگے وقت کچھ کر تال دیتے ہیں، بھڑکیلے لباس میں ملبوس رقاصہ کبھی ایک انداز سے جیسے بہتی جاتی ہے کبھی بجلی کی تابانیاں سی لگا دیتی ہے، اور ساتھ ساتھ بجانے والا اپنے جوہر دکھاتا ہے۔ یہ اصول اشبیلیہ کا نہیں ہسپانیہ کا مغربی صوبہ اندلس ہے جس کے شوخ رنگ لباس اور دھنوں میں حدت پیدا کرنے والے گانے یورپ میں مشہور رہیں۔

---

(۲)

• ٹنٹرن ایبے کا نواحی علاقہ لطیف وہ طور پر خوبصورت تھا، وہ خوبصورتی ایک ستیر سے کے سے رنگ کی ایک فراوانی ہو جاتے خنک سائے میں ہو گئی تھیں۔ سواری جلدی کیا ہے نیچے ڈھلوان پر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے جو نہیں کھیل رہے تھے کھیل دیکھ رہے تھے۔ ایبے کے کھنڈرات نظر آ رہے تھے ابھی وقت بھی کم نہ تھے جب ورڈز ورتھ نے اپنی خوبصورت نظم لکھی اور اب تو بنیادیں ہی رہ گئی ہیں آگے بڑھے تو دیکھا کہ ایک صاحب کھنڈرات کے گیٹ پر بنائے بیٹھے ہیں اور ٹکٹ طلب کر رہے ہیں۔ داخلہ کا کرایہ ایک شلنگ۔ میرے ساتھی نے ٹکٹ بھی خریدا اور ہم کھنڈرات کو چھوڑ کر ان میں نظارے میں محو ہو گئے جو ایک خوش گوار خواب کی مانند تھا۔ بس یہ سمجھئے چلی جا رہی تھی، پیچ و خم کھاتی ہوئی سڑک خاموش گھنے جنگلوں میں سے گزر رہی تھی۔ یہ WYE VALLEY تھی جو نیچے کھڈ میں دریا کے دائیں بہہ رہا تھا کہ ذرا وقفہ پاتا تو ٹھہر جاتا اور ایک خوبصورت کریم رنگ کا سرگرم سفر ہو جاتے، دو دستے کا دل تھی اسی میں دوام تھا ثبات تھا ٹھہراؤ تھی انقلاب کو جذب کرنے اور نظارے میں جذب ہو جانے کی دعوت تھی۔

چند باتوں میں انگلستان یورپ سے جدا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں مجھے جب پیرس اور فرانس دیکھا اس کی جاذبیت کا قائل ہوا تھا۔ "فرانسیسی سیکھنے کی کیا ضرورت ہے انگریزی سے کام چل جائے گا" میں نے شروع میں مشورہ دیا گیا۔ پیرس میں یہ عالم تھا کہ شاید ہی ریستوران اور دکان ٹی شاپ ایسی سنٹرل جگہوں پر فرانسیسی بولنے والے بیٹھے کہ وہ انگریزی سے قطعاً نابلد ہیں، یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس میں قومی غرور بھی شامل ہے جیسے کہہ رہے ہوں "انگریزی بولنے ہو تو فرانسیسی سیکھنے ضرورت آ پڑی تھی"۔ بہرحال سمندر پار انگلستان کے آس پاس ایک الگ دنیا ہے۔ اگر پیرس اور لندن کا موازنہ کیا جائے تو کچھ ایسا نتیجہ نکلتا ہے۔

لندن	پیرس
لنچ پندرہ منٹ میں ختم ہو جاتا ہے۔	لنچ دو ڈھائی گھنٹے میں ختم ہوتا ہے، ہر کورس کے ساتھ مختلف شراب۔
سستا لنچ تین چار شلنگ میں۔	سستا لنچ ایک ڈیڑھ پونڈ میں۔
فرنچ بینس سے گھن آتی ہے۔	مکھن میں تلی ہوئی فرنچ بینس سے دل خوش کن مہک اٹھتی ہے۔
لنچ کے فوراً بعد کام۔	پیرس اور سپین میں لنچ کے بعد طویل قیلولہ
ٹریفک کا سپاہی دیو قامت اور وجیہہ۔	ٹریفک کا سپاہی پست قد اس پہ طرہ یہ کہ حسین لڑکیوں سے مذاق بھی کر لیتا ہے۔

بحیرۂ روم کے نیلگوں ساحل کے ساتھ ساتھ نیس سے جینوا کا سفر بے پناہ شہرت کا حامل ہے۔ جب ہم نے نیس کو خیرباد کہا تو صبح کی پہلی کرنیں چمک رہی تھیں۔ ایک طرف اتھاہ نیلا سمندر تھا دوسری طرف بے آب و گیاہ پہاڑ جن کے اس پار سورج کی شعاعیں بادلوں سے جھلک رہی تھیں اور حیرت انگیز رنگ بکھیر رہی تھیں۔ چند منٹ میں سورج طلوع ہو چکا تھا اور سارا منظر ایک کتاب کی طرح کھل گیا جیسے کسی آرٹسٹ نے تصویر کشی کے لئے ایک بڑا کینوس ایستادہ کیا ہو جس پر ایک جاذب پینٹنگ کو بنانا زیادہ موزوں ہوگا۔ وسیع وادیاں، پہاڑ اور ان کے اوپر بادلوں میں آنکھ مچولی کھیلنے والا سورج، ایک مصور کو تصویر کشی کے لئے اس سے بہتر منظر شاید ہی ملے گا۔

ہم سوئٹزرلینڈ کے سرگرم سفر تھے۔ بس فرانسیسی ایلپس سے گزر رہی تھی، بس پیچ در پیچ سڑک پر چڑھتی جا رہی تھی، برف پوش پہاڑ نظر آنے لگے۔ ہم قریب سے قریب تر ہوتے گئے حتیٰ کہ پہاڑوں پر برف کے PATTERNS صاف نظر آنے لگے، وہ بھی PATTERNS ایسے تھے جیسے کسی نے کریم کیک اونچا اور یا ہو جگہ جگہ پہاڑی ڈھلوان برف کی سفید چادر نے ترچھے سے ڈھانپ رکھی تھی۔ پانی کی رستی ہوئی بوندیں دھوپ میں چمک سے پیچھے رہ جاتی ہوئی سمجھ جھیلوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ جب ہم آگے بڑھے تو خود بہت بادلوں کی لڑیاں آگئے۔ وہ دھیا برف دھیرے دھیرے گر رہی تھی۔ دھنکی ہوئی روئی کے گالوں کی مانند، سارے منظر کو اپنی چادر سے ڈھانپ لیا تھا، برف کے گالے ہماری بس کی چھت سے بے خبر ہمارے رنج و غم سے بے خبر آہستہ آہستہ گرتے رہے

کی طرف آ رہے تھے جیسے فضا میں معلق ہوں جیسے کوئی غلطی نہ ہوا اور میں نے سوچا اگر تصویر اور پاکیزگی کے اِس مرقع کو اپنے رنگ و پنے میں محفوظ کروں تو شاید میری روح کے داغ دھل جائیں لیکن یہ خواہش ناپختہ تھی۔ بس کے پیچھے برف کا کھیت چیر کر رستہ بناتے رہے۔ برف باروں سے ٹہنیوں اور چوٹی کا زیادہ حصّہ ڈھانپ لیا تھا کچھ حصّہ برف کا منتظر تھا اس لئے بھلا معلوم ہوتا تھا۔ برف کی تہیں جمتی چلی گئیں۔ اندھیرا گہرا ہو گیا اور پہاڑ آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔

صبح سویرے ہم نے جنیوا کا رُخ کیا۔ موسم ماحول ویسا ہی تھا۔ ہمارے گرد و پیش سب چیزیں برف کی آغوش میں تھیں۔ اب ہم ایک خوش رو علاقہ سے گزر رہے تھے۔ ڈھلوانیں چوٹی سے لے کر خالی تھیں لیکن فرش نہیں۔ برف کی دبیز تہیں وقت جم گئی تھیں۔ یہ منظر کرسمس کارڈ کی یاد دلاتا تھا۔ اونچی وادی کے [illegible] میں ایک برف پوش گرجا، برف کے بوجھ سے جھکی ہوئی شاخیں، فطرت کی افسردہ خیرگی و معصومیت کی تصویر۔

جنیوا کا قیام پھیکا رہا۔ برف کی پھوار مسلسل پڑتی جا رہی تھی۔ جنیوا کی مشہور جھیل بھی یخ بستہ تھی اور ہماری CRUISING سے معذور طبیعت اسی شدت سے ہوئی کہ وہاں سے کوچ کر جانے کو جی چاہا۔ چنانچہ دوسرے روز ہی ہم جنگ فراؤ کی چوٹیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ برقی ریل برف سے ڈھکی ہوئی وادیوں اور پہاڑیوں کو تراشتی ہوئی خاموشی سے گزرتی رہی۔ وینگن جنگ فراؤ کے دامن میں ہے۔ جب وہاں پہنچے۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ اسٹیشن کے نزدیک ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ OFF SEASON ہونے کی وجہ سے ہوٹل تقریباً خالی تھا تاہم CENTRAL HEATING کی بدولت بہتر تھی اور صبح ویٹرس جو لائی جس سے زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ [illegible] دودھ کا جگ اور چاکلیٹ وغیرہ رکھ کر میری طرف مڑی۔ "بینتو؟" میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا مجھ سے COMPLIMENT کی متوقع تھی جس میں مجھے پہل کرنی چاہئے تھی۔ "بینتو میکسیکی مادموازیل" میں نے کہا۔ وہ ہنسی۔ قصبہ چھوٹا تھا لیکن سب سہولتیں وہاں میسر تھیں۔ ریل، ٹیلیفون، ریستوران، CENTRALLY HEATED عمارتیں اور دکانیں، سیاحوں، گائیڈوں اور گھوڑوں سے بھرپور۔ ہم نے منصوبہ کے مطابق سب سے اونچی چوٹی کا رخ کیا۔ ریل دو ڈبوں پر مشتمل تھی اور نیم چٹیل پہاڑیوں پر آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ راستے میں اکثر SKING کا سامان سنبھالے ہوئے [illegible] مناسب مقام کی تلاش میں جا رہے تھے۔ گاڑی [illegible] جب پہنچی۔ سامنے ہی ایک ریستوران تھا جہاں گرم کھانا اور SOUVENIERS بیچتے تھے۔ برف سے [illegible] ریڈ کراس کا ہسپتال دیکھا پھر وہ میدان جس میں سب چیزیں برف کی تھیں۔ اس دوران میں برف پڑ رہی تھی اور اس کے اثرات واپسی پر ظاہر ہوئے جب گارڈ نے آ کر کہا، برف شدت پکڑ چکی ہے۔ گاڑی اگلے سٹیشن تک نہ پہنچ سکے گی۔ ہمیں افسوس ہے آپ کو ڈیڑھ میل کا فاصلہ پیدل طے کرنا ہو گا۔ ہمارے قافلے میں ایک انگریز جوڑا بعد دو بچوں کے، ایک کیوبن اور امریکن جوڑا اور ایک خوش گپ امریکن بوڑھا شامل تھے۔ برف کا وہ طوفان کہ الحفیظ و الامان۔ برف کے بادل یک لخت تند جھکڑ کی صورت میں ہمارے رستے میں حائل ہو کر ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ جب برف کے ذرّات نے گھٹنوں اور چہرے کے پیکروں میں لگنا شروع کیا تو مجھے [illegible] یاد آ گئی [illegible] کے ساتھ راستہ تو دے [illegible] تھا۔ پاؤں جاتا اور برف میں دھنس گئے۔ ہم چھوٹے چھوٹے قدم رک رک کے رہے تھے۔ میرے سر پر ٹوپی نہیں تھی جو میری حالت تھی۔ ایک ہاتھ سے میں نے انگریز بچی کو تھام رکھا تھا جسے بچانا چھوڑ کے اس کے والدین آگے بڑھ گئے تھے۔ وہ ڈیڑھ میل کا سفر خدا خدا کر کے ختم ہوا۔

وینس: وہ روز اس تیم [illegible] کی گرینڈ کینال کا نظارہ کیا اور شہر سے دُور بسے جزیرے میں [illegible] بے شمار موجوں پر تیرتے رہے جو کبھی زمانے میں دولت بازی کی جولان گاہ رہی تھیں۔ آرٹ گیلریاں، ڈوج کے محل، دریا کے بیچوں بیچ پر وقار کلیسا BRIDGE OF SIGHS جس کو عبور کر کے [illegible] کے بدقسمت قیدی زندان میں داخل ہو جاتے۔ [illegible] اس کے سامنے فراخ میدان اور [illegible] ستون [illegible] سے بہت کم [illegible] اتنی جاذب ہوں گی۔ میدان میں [illegible] موجود تھے [illegible] اور [illegible] جب [illegible] داخل ہو کر [illegible] خریدنے لگے تو [illegible] گیا — [illegible] ہوئے VENETIAN نے کہا۔

SHUT THE DOOR YOU INDIAN

میں پھر کچھ نہ پوچھ سکا جو اس کی دکان پر ہم نے محو حیرت کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ اس نے ہمیں غلط فہمی کی بنا پر انڈین کہا ہے۔ اس کی تصحیح تو کر دیں۔ وینس میں متعدد "جیکٹوں" پر شیشہ سازی کا کام نظر سے گزرا۔ دیکھ کر تعجب ہوا کہ سارا کام "ہاتھ کی صفائی" سے ہوتا ہے۔ چابکدست کاریگر گرم پگھلا ہوا شیشہ انگلیوں سے توڑ مروڑ کر منہ سے ہوا بھرتے اور چند لمحوں میں نفاست سے بھری ہوئی چیزیں تیار کر دیتے۔

سر شام وینس سے RAPIDO یعنی ایکسپریس گاڑی میں سوار ہوئے۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے صاف ستھرے اور گدیلے۔ سفر رات بھر کا تھا۔ ساری ٹرین CENTALLY HEATED تھی۔ عام ترین سروس کی نسبت کرایہ بھی کچھ زیادہ تھا۔ دو اطالوی بزنس مین پہلے تو بحث کرتے رہے جب بحث نے اتنی شدت اختیار کی کہ پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونا شروع ہوئے تو ایک صاحب نے لپک کر دروازہ کھول دیا اور خود CORRIDOR میں کھڑے ہو کر بحث جاری رکھی۔ سرد ہوا اندر آنا شروع ہوئی تو ہم مروت کی وجہ سے خاموش رہے لیکن جب دیکھا کہ بحث سے نجات ملے گی نہ سردی سے تو ہم نے عرض کی کہ ...... یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ ہم نے انگریزی میں کہا۔ اور انہوں نے اشارے کنائے سے سمجھا بہرحال دروازہ بند کر دیا۔ وہ صاحب جنہوں نے دوسرے کو اپنا طریق نکالا کہ جس میں بیٹھے ہوئے اطالوی کنڈکٹر سے "اندر میں گرما رہے ہیں" "بھائی جان تو نہیں ہیں اگر یہ دیکھنا، ذرا دم تو دیکھئے رہا ہوں" اُن کی DIO یہ تھی کہ اطالوی کنڈکٹر انگریزی ہی سمجھتا ہے۔ وہ سمجھ تو گیا خوب ہے کہ انگریزی میں گفتگو کی جائے لیکن ہم صاحب کو پیرس میں شرمندگی ہوئی تھی جب فرانسیسی ٹیلی کے دربان نے تو کا اور انہوں نے فرانسیسی زبان سے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے طنز کہا "مجھے تو اپنا مفہوم سمجھا نہیں سکتے اور چار حرف پڑھے ہوں گے۔"

سامنے سیٹ پر ایک اطالوی لڑکی بیٹھی تھی۔ شوخ و شنگ اور ضرورت سے زیادہ بے باک یعنی کہ بہ نگاہوں میں شوخی تو دلبری کہا ہے — لیکن جب معاملہ ایک حد سے گزر جائے تو گستاخی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بالعموم ایک کیم و شیم امریکی نوجوان جرنلسٹ کی طرف مائل تھی جو مشرق وسطی کا دورہ ختم کر کے "پولیٹیکل اسلام" پر تھیسس لکھ رہا تھا۔ یعنی کیا سیاسی طور پر اب بھی اسلام مختلف اقوام کو ایک لڑی میں پرونے میں کامیاب ہے یا اس نقطہ نظر سے یکسر ناکام ہو چکا ہے۔ جب نوجوان نے اس کا پتہ پوچھنے پر اصرار کیا تو اس نے مسکراہٹ کے انداز میں کہا "زندگی کے اس فیصلے کی موڑ پر آگئی ہے جب وہ اس لغزش سے ہمیشہ کے لئے باز رہ کر وفا شعاری میں رہ جائے گی!"

یہ بحث طلب ہے کہ درست کہاوت SEE NAPLES AND DIE ہے یا SEE NAPLES BEFORE YOU DIE بہرحال یہ ہم کو اطالوی مہمان کا ذکر کرتے ہوئے ... [illegible] ... اب تو ... [illegible] ... شہر کو اسی ... [illegible] ... جس کا نام اطالوی تاریخ ہمیشہ ادب کے ساتھ لے گی۔ جو ... [illegible] ... کے باوجود عوام کی آزادی کے لئے ہر جدوجہد میں پیش پیش رہا۔

مجھے اعتراف ہے میلان پہنچتے پہنچتے میں تھک چکا تھا۔ ... [illegible] ... عجائب خانے دیکھ کر طبیعت اکتا گئی تھی۔ ... [illegible] ... اور اس بات کا ... [illegible] ... سمندر ... [illegible] ... سر شام ساحل کی سیر کو جا نکلا ... PATTERN ... [illegible] ... ساحل پر روشنیاں ... [illegible] ... کشتیوں ... [illegible] ...

میلان کے ... [illegible] ... اطالوی BARTENDER سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں گفتگو کی کوشش کی۔ اس نے ... [illegible] ... کی حالت کچھ ایسی ہے جب بندرگاہوں میں جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں تو کام بنتا ہے ورنہ

NO SHIPS NO WORK

اتنے میں جیان پینے ایک چوڑے چکلے سینے والا مزدور داخل ہوا اور باتوں میں شامل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم اینگلو امریکن ایجنٹ تو نہیں؟" میں نے بھی اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ سیاسیات یا کسی SPY RING سے میرا کوئی تعلق نہیں لیکن وہ بھرا بیٹھا تھا اور زبان کی دشواری حائل تھی گو BARTENDER میرا ہمنوا تھا پھر بھی میں نے کھسک جانے میں عافیت سمجھی۔

جو سیاح کیپری جاتا ہے BLUE GROTTO کی زیارت ضرور کرتا ہے۔ سردی کی آمد آمد تھی لیکن تیز ہوا کی وجہ سے سمندر میں ہیجان تھا۔ ہماری کشتی ہچکولے کھاتی زیر و زبر ہوتی ہوئی بڑھتی رہی۔ ہم اُن پہاڑیوں کے گرد سے جن کی چوٹیوں پر متمول سیاحوں نے انگور کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی VILLAS بنا رکھی تھیں اور جو اب بھی معزول سنتریوں کی طرح ایستادہ، عہد رفتہ کی یاد دلاتی ہیں، جابجا پست طاق جیسے چھوٹے چھوٹے کشتیاں BLUE GROTTO کے تنگ دہانے سے گزرتی ہیں۔ اس وقت سب لیٹ کر کشتی سے چپک جاتے ہیں لیکن اندر پہنچ کر سب کلفت دھل جاتی ہے۔ اندر خوابوں کی نیلگوں سائی اپنی تمام سحرکاریوں کے ساتھ جلوہ فرما ہے، خواب آلود نیلاہٹ فضا میں معلق ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک رومانی خواب منجمد ہو کے رہ گیا ہے۔ پہاڑی ڈھلانوں کے مناظر، چھوٹے چھوٹے گرجے اور عجیب و غریب طرز کی آبادی کی تعمیر کیپری کو خاص شخصیت بخشتی ہیں اور اسے DOLL'S HOUSE کہنا بے جا نہ ہوگا۔

ہماری ریل انگور کی بیلوں اور سنگترے کے باغوں میں سے گزر رہی تھی۔ انگور کا موسم ختم ہو چکا تھا، بیلیں مرجھا گئی تھیں، انگور کے خوشے کسی سرد [illegible] شراب میں تحلیل ہو چکے تھے۔ البتہ سنگترے بھرپور جوانی پر تھے۔ بیلوں جیسی قطاروں میں پھلدار درخت اترج اور عنبر کا امتزاج، حیات و ممات کا تضاد بھی تو موجود تھا۔ انگور مر چکے تھے، سنگترے شباب پر تھے۔

بہت سے باغوں میں ٹنڈ منڈ درخت بھی سر نکالے کھڑے تھے۔ وہ پورے طور پر خزاں کی زد میں آ چکے تھے۔ ایک پتہ بھی باقی نہیں تھا۔ انگلستان اور وہ تمام کب سے خزاں کی لپیٹ میں تھے۔ خزاں شاید ہمیشہ تعاقب میں رہتی ہے؟

پومپیائی کی بہاروں کو بھی ایک ایسی خزاں نے دفعتاً تاراج کر دیا تھا۔ پومپیائی ایک ہرے بھرے چمن کی مانند اپنی بہاروں پر نازاں تھا۔ انگوروں کے خوشے پک چکے تھے حتی کہ بڑے بڑے مٹکوں میں شراب بھرنے والی تھی۔ حسن و جوانی عیش و نعیم کے گہوارے میں جھول رہے تھے اور دفعتاً سب کچھ بے پناہ جھلس دینے والے لاوے کی لپیٹ میں تھا۔ آج پومپیائی کے عظیم کھنڈر عظمت پارینہ پر نوحہ کناں ہیں۔ مسجد، تھیٹر، کوچے اور مکان مکینوں کی نفاست طبع کا پتہ دیتے ہیں گو اس نفاست میں بربریت بھی شامل تھی۔

ایمفی تھیٹر میں ہزاروں تماشائی بیٹھ سکتے تھے۔ یہاں تندرست و توانا غلاموں پر بھوکے شیر چھوڑ دیئے جاتے تھے اور تماشائی اُن کی لڑائی سے محظوظ ہوتے۔ یا دو غلاموں کو لڑائی کا حکم دیا جاتا۔ غالب مفتوح کو موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا۔ فاتح ایک پاؤں مفتوح کے سینے پر رکھ کر اوپر دیکھتا کہ اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین انگوٹھے سے کس قسم کا اشارہ کرتی ہیں۔ اس اشارے سے مغلوب کی قسمت کا فیصلہ ہوتا تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان کشمکش تماش بینوں کے لئے سامان تفریح تھی۔ چند مکانوں میں استعمال کی چیزیں اب تک قرینے سے رکھی ہیں جیسے مکین ابھی مکان چھوڑ کر گئے ہوں اور ہوا بھی یہی تھا۔ سارا شہر آناً فاناً آتشیں لاوے کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ یوں تو عجائب خانہ کی کئی چیزیں قابل ذکر ہیں۔ منقش کوزے، کھانے پکانے کا سامان، جراحی کے اوزار، تراشیدہ اصنام لیکن جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس بدنصیب کا "خاکہ" تھا جسے لاوے نے گھیر لیا تھا۔ وہ اکڑوں بیٹھا ہے اور اپنے چہرے کو بازوؤں کے ڈھالے میں لئے ہے جیسے کہہ رہا ہو "میرے اللہ یہ کیا آفت آئی؟" اور وہ گرم لاوا میں منجمد ہو کے رہ گیا۔ لاوے نے ایک ہیولیٰ بخش کر اُسے زندہ جاوید کر دیا ہے۔ باقی نام اللہ کا۔ قصر الحمرا میں جا بجا لا غالب الا اللہ لکھا تھا۔ واقعی اللہ ہی ہے جو بالآخر غالب رہتا ہے۔ کسے مجال ہے جو اس کی ہمسری کا دعویٰ کرے۔ "الحمرا" ایک خوبصورت نگینے کی طرح پہاڑوں کے درمیان جڑا ہے۔ جن شجیع وطن پرور عربوں نے یہ محل تعمیر کیا شاید اُن کے ذہن میں یہ خیال ہمیشہ رہا کہیں ایسا نہ ہو جاہ و جلال کے اس مرقع میں بیٹھ کر ہم میں نخوت آ جائے اور ہم یہ بات بھول جائیں کہ سروری تو فقط

اس مطلب حقیقی کو زیب دیتی ہے۔ آج بھی قصر الحمرا کے گوشے گوشے میں صدیوں پرانی صدا گونجتی ہے لا غالب الا اللہ! ہسپانیہ کے باسیوں نے اس حقیقت کا اعتراف نہ کیا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ہسپانیہ کے کھنڈر آج بھی بیانگ دہل اعلان کر رہے ہیں لا غالب الا اللہ۔

لیکن بحیرہ روم کا نیلگوں پانی ——— محو مرگ و خزاں سے بے نیاز ——— زمین اور اہل زمین پر ہنس رہا تھا اور زبان حال سے کہہ رہا تھا میں ہمیشہ سے ایسا ہی تھا جب میرے شفاف سینے پر باہمت عربوں نے سفینے ڈال دیئے تھے اور صقلیہ میں اسلام کا نشان گاڑ دیا تھا۔ لیکن زندگی تو آگے ہی بڑھتی رہتی ہے اور ہماری ریل بھی سرعت کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پہاڑیاں ڈھلوانیں اور میدان گھاس اور کھیتوں سے ڈھکے ہوئے ہیں؟ خوبصورت شہروں کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے میدان اور تین طرف سے سمندر کو گھیرے ہوئے پہاڑیاں گزرتی رہیں۔ اور ویسوویس کی چوٹی ——— باری تعالیٰ کی قہاری و جبروت کی مظہر اتم ——— ان خوبصورت مناظر کو گھور رہی تھی لیکن بحیرہ روم کے خطے کے انواع و اقسام کے درخت، املیں گھاس سے اٹے ہوئے میدان اور ہری بھری کیاریاں حیات دوام کا درس دے رہی تھیں۔ دنیا بھی اک بہشت ہے اللہ رے کرم

باغ خلد سے نکالے گئے احتجاب ارضی میں جگہ پائی زندگی کے دکھ درد بلا سے جان سہی لیکن وہ جینا کس کام کا تھا جو جذبات سے عاری تھا جس میں حرارت تھی نہ ہی تموج۔ ؎

پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود

گو حضور خداوندی وصل دوام کے مترادف تھا تو ہجر بھی اک گونہ لذت ہے۔

مجھے مسینا کی وہ رات ہمیشہ یاد رہے گی ——— اندھیری رات میں بحیرہ روم کی لہریں کنارے سے ٹکرا کر اپنا سر پھوڑ رہی تھیں۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا جیسے کسی ملاح کی موت کا راگ الاپ رہی ہو۔ مسینا کا شہر حد نظر پر ایک قوس کی شکل میں بکھرا ہوا تھا۔ اس کی جھلملاتی روشنیوں پر پرستان کا دھوکا ہوتا تھا۔ مسینا! عظیم الشان شاعروں اور فنکاروں نے تیری رعنائی کے گیت گائے جسے اطالوی دوشیزاؤں نے تانوں میں ڈھالا آج ایک غریب الوطن کا تحفہ بھی قبول کر!

یورپ کے حسن نادر الوداع! چند ماہ میں تمہارا مہمان رہا۔ ذہنی لاشعور میں یہ ہمیشہ کھٹکتا رہا کہ میری حیثیت مہمان کی سی ہے اگر میں نے تمہارا زہر کھایا تو جان بوجھ کر کھایا۔ وہ زہر خوشگوار تھا اور جانے جان بھی، شاید ہم وہ دام ہیں جو زندگی کا زہر بھی یوں ہی کھاتے رہتے ہیں۔ دیدہ و دانستہ ؎

دام نگزد و جہاں تار نظر خویشیم
جز بجنون نیاز ناز دگر دام اسیر

میں گیروا رنگ کے چولے پہنے "تماشائے اہل کرم" دیکھتا رہا۔ میں بھی اس ہجوم میں شامل ہو گیا تھا جو کوچہ کوچہ اپنے زخموں کا مرہم ڈھونڈتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ میرے زخموں کے لئے یہاں کوئی مرہم نہیں۔ اگر میں تشنہ لب رہا تو یہ میری محرومیٔ قسمت تھی ورنہ تیرے میکدوں کے در کھلے تھے اور تیرے [illegible] کے سامنے بے تاب زندگی کے یہ دن یوں گزرتے رہے جیسے ایک خواب ہو۔ ہمیشہ یہ احساس رہا کہ یہ سراب ہے حقیقت سے کہیں دور جس کا طلسم کچھ دیر تک ٹوٹ جائے گا۔ بیداری کا شعور خواب کے تعاقب میں رہا اور یہ بھی نہیں کہ وہ خواب ہمیشہ خوشگوار ہی تھا۔ اس میں NIGHT MARE کی گھڑی بھی شامل رہی اور متعدد بار اس خیال نے ستایا کہ یہ خواب ختم کیوں نہیں ہو چکا۔

طنزیہ

غدر سن انیس سو ستاون کے اسباب

(ایک مورخ کے قلم سے ۲رمئی ۱۹۹۵ء)

احمد جمال پاشا

غدر کے اسباب غدر کی اطلاع سب کو پہلے سے تھی۔ نجومیوں نے جنتریوں اور لیڈروں نے تقریروں کے ذریعہ پہلے سے آگاہ کر دیا تھا۔ حکومت کی جانب سے بطور حفظ ما تقدم نے سروے ڈیپارٹمنٹ کی خدمات حاصل کر کے غدر کے طول و عرض کی پیمائش کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ عوام بے چینی و گڑبڑ میں پہلے سے تھی اور کسی خاص چیز کا انتظار تھا۔ یوں چھوٹے چھوٹے غدر پہلے بھی ہو چکے تھے۔ مگر قومی سطح کی حیثیت سے ہم زیادہ سے زیادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اہتمام منعقد کردہ غدر کے بعد سے ۵۷ء کے غدر کا نام سنتے ہیں مگر یہ غدر ایسی ہی کچھ تقسیم ہو کر رہ گیا تھا اس وجہ سے کوئی بڑی تصویر ہمارے سامنے نہیں آ سکی۔ ہاں ہم اس کو زیادہ سے زیادہ وقت دے کر سکتے ہیں۔

حکومت نے بطور حفظ ما تقدم بر وقت ڈگیاں پٹوائیں، اپیلیں کیں، لوگوں سے کہلا دیا ——— "جو غدر کا نام لے گا، اس کو غدار قرار دیا جائے گا۔" مگر لوگ ان سب باتوں سے متاثر نہ ہو سکے۔ ایوان حکومت نے حزب مخالف کی مخالفت کے باوجود بل پاس کر دیا کہ ——— "سن ستاون کے بجائے سن چھپن الف اور سن چھپن ب کر دیا جائے تاکہ نہ سن ستاون آئے اور نہ غدر ہو۔" مگر مخالف جماعت نے ایک انڈر گراؤنڈ پارٹی سے سن ستاون کے کیلنڈر چھپوا کر سارے ملک کے طول و عرض میں تقسیم کرا دئے۔ لوگ پیشتر ہی سے بارود کی طرح پھٹنے کو تیار بیٹھے تھے اول تو لوگ ملک آزاد کرنے کے لئے بے قرار تھے پھر ملک غلط طریقے پر آزاد کیا گیا تھا خواہ مخواہ ریاستیں اور جاگیریں ضبط کر لی گئی تھیں اگر ملک آزاد ہی کرانا تھا تو اتنی سی بات کے لئے انگریزوں سے ملک چھڑوانے کی کیا ضرورت تھی پھر تقسیم بھی غلط ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں کافی غفلت سے کام لیا گیا تھا۔

آزاد ہندوستان کے پہلے انگریز گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت جو پریس کانفرنس کی تھی اس میں پریس کے چند غیر ذمہ دار نمائندوں نے جو سوالات کئے تھے ان سے عوام میں کافی برہمی اور انتشار کے آثار نمایاں ہو چلے تھے ——— قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم اس کے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں ———

"لارڈ صاحب آپ تو جا ہی رہے ہیں، اب تو بتا دیجئے کہ غدر کس نے کروایا تھا ———؟"

لارڈ صاحب نے منہ بچکا کر جواب دیا ——— "ہم نے غدر نہیں کرایا تھا ———"

"آپ نے باغیوں کو گولی سے کیوں اڑوا دیا تھا ـــــ؟"

"باغیوں کو غدر باغیوں سے ملا تھا یا گوریوں سے یہ باغیوں اور گوریوں کا معاملہ ہے ہم اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتے ـــــ"

"مگر آپ لوگوں نے جو قتل عام کروائے تھے ـــــ؟"

"مثلاً ـــــ"

"غدر ـــــ جلیانوالہ باغ اور سن بیالیس وغیرہ ـــــ"

"وہ تو بس تنبیہ جیسے چھوٹے اور ہلکے پھلکے واقعے جاری کروا دیے گئے تھے ـــــ"

"اب دوبارہ آپ غدر کب کروا رہے ہیں ـــــ؟"

"نہیں اب کے آپ کو کرانا پڑے گا ـــــ"

"آپ دوبارہ واپس کب آ رہے ہیں ـــــ؟" کسی ملاقاتی نے سوال کیا اور لارڈ صاحب کا موڈ خراب ہو گیا ۔ انہوں نے اپنے ڈرائیور سے کہا۔

ـــــ "ہماری گاڑی آگے بڑھائی جائے ـــــ" (اقتباس مل کرانیکل)

اسباب بہت دنوں سے غدر نہیں ہوا تھا۔ لوگ خواہش مند تھے کہ اب غدر ہونا چاہئے اسی وجہ سے روسی ستاروں کا سنہری مرغ ۱۸۵۷ سے نہیں دیا جا رہا تھا۔ ملک میں ایک باقاعدہ غدر کی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی لوگوں کے منہ سے ۱۸۵۷ء کا خون لگ چکا تھا۔ بہت دنوں سے عوام کے بلوہ فساد کی حسرتوں کا خون ہو رہا تھا۔ ساری ایشیا ملک ایسی بڑے بڑے عجیب منصوبوں پر عمل خارج کی جا رہی تھی۔ دنیا کے ہر ملک نے اپنی اپنی فوجوں کو زراعتی دستوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ خصوصاً روس، انگلستان، چین، امریکہ اور ہندوستان میں بڑی بڑی آرڈیننس فیکٹریوں اور بم سازی کے کارخانوں کو صنعتی و زراعتی دستوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہر جگہ اخلاقی ناسور کی حد بڑھ چکی تھی۔ بم اور مہلک ہتھیار نیلام، ٹینکوں کی جگہ ٹریکٹر ڈھالے جا رہے تھے جبکہ عوام چاہتے تھے کہ روس، ہیروشیما و ناگاساکی بنائے جائیں۔ ایٹم بم ـــ ہائیڈروجن بم اور راکٹ تو عوام اس کمیشنوں کی نگرانی میں سمندر کے سینوں میں برابر دفن کئے جا رہے تھے۔ عوام اس ملکی و قومی نقصان پر بہت برافروختہ تھے۔ وہ خفا تھے کہ حکومت منصوبے کیوں بناتی ہے آخر صوبے کیوں نہیں بناتی۔ صوبوں کی از سر نو تشکیل دلائی نہ ہونے پر غدر نہ ہونے دینے کا الزام حکومت عوام اور عوام حکومت کے سر تھوپنا چاہتے تھے ـــــ

انڈیا آفس لائبریری لندن اور کولمبیا کمپنی کے نزدیک شرواش ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ "اگر جاتے جاتے انگریز کا گرانٹ الاؤنس برقرار رکھا جاتا - تو یہ نوبت نہ آنے پاتی ـــــ" "اگر ملک کو بیرونی ممالک کی امداد کے ذریعہ گورستان، انگلستان، مریکستان، ہالستان، کشمیرستان، افغانستان اور ترکستان جیسے کم از کم بیس حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تو نتائج اتنے ہولناک نہ ہونے پاتے ـــــ" (مولا بخش لائبریری پٹنہ کا ریکارڈ) غدر کے ذمہ دار سب سے زیادہ ملک کے مختلف متعدد رسائل اور پبلشرز ہیں جنہوں نے غدر نمبر نکالنے کے لئے غدریہ حالات کو ہوا دی ـــــ "ملکہ موسم کی اطلاع کے مطابق غدر کا طوفان اپنے صحیح وقت پر آیا۔ غدر کا آنا ضروری تھا۔ اگر اس وقت غدر نہ آتا تو زلزلہ آتا" ـــــ بقول سعدی کاشی ـــــ "زلزلے سے غدر ہمیشہ بہتر ہوتا ہے ـــــ" غدر کے صحیح حالات اور عینی مشاہدات کی نایابی کا سبب یہ ہے کہ غدر آتے ہی باقی سب رہنے والے سمجھ گئے کہ اچھے اپنے گھروں کو چل دیئے یا گھر بیٹھے رہے جو ہر کش ہی تھے بیہوش ہو گئے اور ہوش آنے پر غدر ختم ہو چکا تھا۔

ملک کے سیاستدانوں اور ادیبوں میں غدر ہونے اور نہ ہونے پر مناقشے چھڑ گئے تھے۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ غدر کا خاص استقبال کیا جائے اور اس کی شاندار جوبلی منائی جائے "غدر نمبر" اور "غدر ڈے"۔ یہ لوگ نرم جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اکثریت ان کے خلاف تھی۔ جن کا تعلق گرم پارٹی سے تھا۔ یہ ماضی کا ماتم ناپسند کرتے تھے اور خواہاں تھے کہ ان کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء میں غدر کی جس تحریک کی بنیاد ڈالی تھی اس کا جشن صد سالہ منائیں اور (جیسا کہ انگریزوں نے کیا تھا) انسانیت کی لاشوں پر فاتحہ پڑھیں تاکہ اس کا ایصال ثواب ان کی روحوں کو پہنچ سکے اور جیسا کہ انہیں اپنے جاہ و حشمت میں رکھے

سکے۔ ماضی کی روایات کو زندہ رکھنے کے لئے اس ستاون کی تشکیل داشت ضروری تھی۔

تاریخ | آل احمد سرور۔ فیض احمد فیض اور سردار جعفری وغیرہ نے غدر کی تاریخ کہی ——

فیض —— گلوں میں رنگ بھرا ہے بہار گذری ہے
کہ عندلیب غدر فقرہ بار گذری ہے
۲۷۳ + ۱۱۰۳ = ۱۳۷۷ ھ

جعفری —— تفنگ و تیغ کی چمک کا اسلامی دور
کہ سرخ پوش ہوا غدر شہسوار آیا
۱۹۵۷ ء

مسلم لائبریری علیگڑھ (شعبۂ مخطوطات) کے بالائی کمرہ غدر کے دستاویزات میں ہم کو ایک تاریخ پروفیسر آل احمد سرور کی لکھی ہوئی ملتی ہے۔

دستِ گل [illegible] غدر داری

1957 A.D.

(بشکریہ مسلم لائبریری علی گڑھ)

شروعات | غدر اچانک شروع ہو گیا۔ غدر صحیح وقت پر یعنی ۹ر جون ۱۸۵۷ء کو دن کے بارہ بجے شروع ہوا۔ ہم اس کے بارے میں بالکل وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ غدر پنجاب سے شروع ہوا یا یو پی سے یا دونوں جگہ ساتھ ساتھ لیکن جو مواد دستیاب ہوا ہے اس سے یو پی کا نمبر آگے معلوم ہوتا ہے۔ غدر کا اہتمام ہندوستان ہی میں کیا گیا تھا مگر برصغیر کے دوسرے ممالک مثلاً افغانستان، اور نیپال وغیرہ میں بھی پھیل گیا تھا۔ جیسا کہ تاریخی دستاویزوں سے ثابت ہوتا ہے سب سے پہلے مراد آباد کی چھاؤنی میں مرزا بھیا کے گھر کے سامنے سے شروع ہوا۔ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اسی منگل پانڈے (اکبر ہی کے دادا منگل پانڈے جنہوں نے ۱۸۵۷ء میں چھاؤنی میں چربی لگے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر کے غدر کا آغاز کیا تھا) جب گورنمنٹ راشن ڈپو سے گیہوں لینے گیا تو دوکاندار نے اس کو گیہوں ایک روپیہ کے ڈھائی سیر کے عوض دس سیر اس کے پلے باندھنے کی کوشش کر کے اس کے سادہ و معصوم جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی۔ منگل نے دکاندار کو سمجھایا بھی —— "نہیں بھائی ہم روپیہ کے ڈھائی سیر ہی لے جاتے ہیں ہم کو ڈھائی سیر دو ——" مگر دوکاندار نے جھگڑا کرتے ہوئے کہا "ہم دس سیر سے ایک ذرہ کم نہیں دے سکتے کیونکہ یہ حکومت کا حکم ہے ——"

اسی طرح دوکاندار نے سستا اور زیادہ سودا دینے کے فریب سے منگل پانڈے کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا تو وہ اور بھی مشتعل ہو گیا۔ شاید منگل پانڈے اس پر بھی صبر کر لیتا مگر جب اس کو روپیہ کے چالیس آنے واپس لوٹانے کی کوشش کی گئی تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے غصے میں پاگل ہو کر تین چار کو وہیں ڈھیر کر دیا اور اپنا باغیانہ اور جنگ کا اعلان کر دیا —— "ہم اس حکومت کا خاتمہ کر دیں گے جو اس قسم کے سستے سودے بازی کے ذریعہ مجبور کرنا چاہتی ہے۔"

فوراً سپاہیوں نے منگل کا ساتھ دیا اور دیکھتے دیکھتے منگل کی اور منگل نے جنگل کے جنگل میں دنگل برپا کر دیا —— چھاؤنی میں آگ لگا دی گئی افسروں کو گولی سے اڑا دیا گیا اور "دلّی چلو" کا نعرہ بلند کر دیا گیا ——

غدر | انگریزوں کے اسباب بالعموم تھے ہی کے وقت سے غدر کے اسباب پیدا ہو چلے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں۔ مراد آباد کی بغاوت اور دلّی چلو کے نعرے نے پورے ملک میں بغاوت کی آگ پھیلا دی۔ سب سے پہلے کشمیر کے بخشی غلام محمد نے اپنے باغی پن کا اعلان بذریعہ تار وزیر حرب اور وزیر اعظم کو دیا۔ حکومت کے ذمہ داران نے باغیوں میں نظم و نسق برقرار رکھنے کی خاطر ان کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اور دلّی میں ان کے استقبال کے لئے آل پارٹیز غدر کمیٹی کی تشکیل ہوئی تمام صوبوں سے جو ذمہ دار غدر کے اسباب بنانے کی پالیسی کی بھونڈی [illegible] تعداد میں باغیوں کے دستے دلّی کی طرف بڑھنے لگے ساری خلقت دلّی کی طرف ٹوٹ پڑی [illegible] شام کو وزیر اعظم لال قلعے کی برجیوں پر کھڑے ہو کر دیں سے باغیوں کا نظارہ دیکھتے تو انہوں نے باغیوں کو سلامی دی۔ اسی اندر Coexistence کا بہترین [illegible] ہندوستان کے غدر [illegible]

گیا۔ اس کے پیغام نے جاوا والوں کے سینوں میں آگ لگا دی۔ ویسے بھی ہر روز اطلاعات ہر جانب سے خبریں آ رہی تھیں کہ باغی ان کمپنیوں کے دفاتر، تعمیری ورکشاپوں، بحری جہازوں بیڑوں اور دوسرے سماجی اداروں میں آگ لگا کر تاپ رہے ہیں۔

حالات حالات بہت نازک تھے تمام فوجیں اور صوبے خود مختار ہو کر باغیوں میں شامل ہو گئے تھے ہر طرف بدامنی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ مائیں اپنے جوان جوان بیٹوں کو گھروں میں اپنے سینوں سے لگائے بیٹھی تھیں اگر وہ ذرا بازار میں سودا سلف خریدنے بھی نکلتے تو انہیں دوسرے ملکوں کے ٹھیکے دار، کلرک اور کمپنیوں کے مخبر زبردستی پکڑ لیتے۔

”بیٹے چلو اب تمہیں کمپنی کے مخبر ہو جانا چاہئے ہم آپ کو بہت بڑی تنخواہ دیں گے —“ اب وہ لڑکوں کو خوشامد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے — ”بھیا میں تو اپنی اماں کے لئے بازار سے دو پیسے کے پان لینے آیا تھا۔ اگر تم نے مجھے جا کر پاشتیل کا مخبر بنایا تو اماں کو کہاں سے چار کوڑی دے گا۔ [illegible] میں تو صرف میٹرک پاس ہوں مجھے تو ساٹھ روپے کی کلرکی چاہئے مجھے اتنا بڑا افسر نہیں بننا ہے —“ ”ارے تیل والے بچے —“ ”پھر خوشامد سے بیچ میں کہتے —“ ”ارے ہم تو صرف آپ کو مخبر بنا رہے ہیں۔ آپ ہم سے کچھ زیادہ تنخواہ لے لیجئے —“ آخر آپ تیل کا کام کر کے تیل ہی تو دیں گے پھر ہمارا کام تو صرف تھوڑی باتوں سے بھی چل جاتا آپ تو میٹرک میں ہیں لڑکے — ”ہمیں آپ کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ آپ کے تیل ہو جانے سے آپ کی ذات والا صفات پر بہت اثر پڑے گا آپ ہماری کامیابی کے لئے ہمارا کام کریں گے؟“ — گر نوجوان رو پڑتا — ”نہیں، نہیں — خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو — مجھے جانے دو — میں کلرک بننا چاہتا ہوں مجھے کلرک ہی رہنے دو خدا — مجھ سے میری کلرکی نہ چھینو — مجھ پر رحم کرو رحم —“ ”اگر باغی بروقت انہیں بچا لیتے تو ان کو کمپنی والے زبردستی پکڑ کر کام دلانے لے جاتے۔ روزگار کا جو خوف لوگوں پر اسی طرح سوار تھا کہ وہ ہر شام ہی اندر سے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہتے۔ اگر بھولا بھٹکا کوئی دن میں بازار کی طرف نکل جاتا تو وہ کافور معدوم ہوتا۔ کمپنیوں کے مظالم کے خلاف ہر قسم کی ضروریات و آسائش زندگی، بے اعتبار روزگاری روز ان کے سر پر قائم رہتے —

شادی بیاہ اور روزگار کا یہ عالم تھا کہ سرکاری لوگ ہر طرف بازار تاک میں لگے رہتے اگر خبر ہو جاتی کہ فلاں شخص اس کا لڑکا یا خاندان میں کہیں دور دراز میں کوئی بے روزگار یا کلرک رہا ہے یا اس کے پاس صرف ایک مکان ہے یا صرف ایک لڑکی یا ایک بیوی ہے تو زبردستی سرکاری طور پر اس کا اغوا کر کے اس کی لڑکیوں اور بچوں کو ان سے الگ کر دیا جاتا۔ اور بجز قیدیوں کے کسی کو شہروں اور جنگلوں کا رخ کرنا پڑتا۔ لوگ انہی مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات پانے کے لئے جنگلوں کی طرف نکل بھاگے۔ بجائے اس کے اگر مجاہد ہتھیار کی طرح جنگل کا رخ کرتے تو اس سلسلے میں بڑی مایوسی ہوتی کیونکہ تمام طوائفیں تیر تجہ بازاروں وغیرہ کے لئے چلی گئیں تھیں یا غیر ملکی وضع دار طوائف غیروں میں اپنے ملک کی نمائندگی کرنے کو دعویدار تھیں۔

ظلم و ستم کی یہ صورت تھی کہ عوام طوائفیں بچاتے تھے اور حکومت ان کے گلے میں بانسری باندھنا چاہتی تھی —

ملک میں بیٹھکوں کا یہ بدنام تھا بڑی مشکل سے باغیوں کو پتہ چلا کہ ایشیا میں ایک ڈیرہ موجود ہے بانی بڑی بھاری تعداد میں اس کی زیارت کو جمع ہوئے اور اس کی زندگی میں اس کا بڑا شاندار عرس دو دن تک رہا۔ پھر اسے عجائب گھر میں محفوظ کر کے اس پر ٹکٹ لگا دیا۔ تعلیم کا یہ عالم تھا کہ لوگ جبراً بڑی بڑی جماعتوں میں پڑھنے کے لئے بھیج دیئے جاتے تھے مقابلے کے امتحانوں کا سال بھر برابر اشتہار نکلتا رہتا۔ آخر میں مجبور ہو کر حکومت باغیوں سے چھپ کر بادیانوں میں رہا کرے ملکی اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اعلیٰ ترقی سرکاری ملازمتیں دیں۔ خواہشمندوں کو امتحانات کے ہال میں سے جبراً بند کر دیتے۔ کامیاب ہونے کے لئے صرف امتحان میں شرکت ضروری ہوتی۔ اگر کوئی رشوت یا پچوں دینے کی کوشش کرتا تو افسران سے مجھ دیا جاتے۔ آخر میں باغیوں کا زور اتنا بڑھ گیا، اور لوگ نوکری کرنے کے لئے کسی طرح راضی ہوتے تو حکومت نے مجبوراً ”نوکریوں اور ملازمتوں کو پیش کش کی وہ اپنے علم و عمل سے ایسے لوگوں کے نام اور پتے بتائیں جو ہمارے کام آ سکیں۔ نوکریوں کی نشاندہی پر حکومت کے چھاپہ مار دستے کلرکوں اور بیکار خادموں تک کو اعلیٰ عہدوں پر تعیناتیاں کرنے کے لئے ان کے گھروں سے برآمد کرتے اکثر اس سلسلے میں باغیوں و چھاپہ مار دستوں میں بڑی سخت جنگ بھی ہوتی۔

عدالتوں کو گرا دو جتنے لوگ [illegible] کے مارے گواہی دیتے [illegible] کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ ہم کو سرکاری افسر یا وزیر نہ بنایا جائے۔

ڈگریاں [illegible] کی طرح سڑکوں پر اس طرح پھینکیں جیسی ردی کاغذ [illegible] بیچتے ہیں سوائے چند دیہاتیوں کے جو گھر بھاگ نکلے تھے سب مارے جاتے۔ [illegible] انکار کریں [illegible] دیکھتے یا معصوم بچے سے جا کر [illegible] لڑ جاتے۔ حکومت نے باغیوں کے سامنے بار بار پیش کش یہی کی کہ —— "ہم تمہاری امداد بڑھا دیں گے۔ تعلیم کو سستی کر دیں گے، عقل سے کام لیں گے، نوکریاں عام کر دیں گے، ٹیکس منسوخ کر دیں گے —— " مگر باغی یہ سب جانتے ہی نہ تھے ان باتوں سے وہ اور بھی مشتعل ہو جاتے ——

باغیوں کا راج اب غیر جانبدار اخبار نویسوں اور ایجنسیوں کی مستند [illegible] سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ ملک پر باغیوں کا قبضہ ڈھائی دن اور تین گھنٹے رہا۔

لوٹ مار و قتل عام باغیوں نے اس [illegible] میں ہسپتال، تعلیم گاہیں، ریڈیو اسٹیشن کے دفاتر، [illegible] بنانے والے مرکز، منڈی لانے والے جہازوں، آگ بجھانے والے انجنوں، دفتر روزگار، [illegible] دینے والے دفتروں، حفاظتی چوکیوں، پانی گھروں، بجلی گھروں اور صنعتی [illegible] کا خاتمہ کر کے وہاں انہیں جو بھی [illegible] ملا انہوں نے سولی پر چڑھا دیا۔

باغیوں میں پھوٹ ٹھیک اسی وقت جب غدر اپنے نقطۂ انتہا پر پہنچ چکا تھا باغیوں میں پھوٹ پڑ گئی اس کے بارے میں لوگ مختلف آراء رکھتے ہیں کچھ کہتے ہیں کہ باغیوں نے پھوٹ [illegible] اور سبب بتاتے ہیں یعنی یہ کہ لوگ غدر کی جو اصل منزل چاہتے تھے باغیوں نے اس منزل کو پسند نہیں کیا —— اور حکومت [illegible] اپنے [illegible] کے [illegible] ہو گئی تھی اور باقی ابھی ان [illegible] تک نہ پہنچ سکے تھے، انہوں نے حکومت سے خفیہ ساز باز کی اور سازش کامیاب ہوئی۔ غدر کرنے والے رات کو خود اپنے ہی [illegible] کے ہاتھوں گرفتار کر لیے گئے۔

واقعہ واقعہ یوں ہوا کہ نرم پارٹی جو صرف [illegible] اور غدر [illegible] چاہتی تھی گرم پارٹی سے جو [illegible] پر آمادہ تھی [illegible] کے باوجود [illegible] نے غدر منانے کے بہانے [illegible] کے [illegible] میں اپنے سپاہی اور [illegible] اور رات کے پچھلے پہر ان [illegible] سپاہیوں نے [illegible] دروازہ کھول دیا۔ حکومت کی فوجوں نے [illegible] کامیاب رہا۔ باغیوں کے تمام سرغنہ گرفتار کر لیے گئے۔ [illegible] کے بعد تمام باغیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور عام معافی [illegible] کی پیشکش کی۔

گرفتاریاں اور معافیاں عام باغیوں کو جرمانے ادا کرنے یا [illegible] عدالت کی سزا دے کر چھوڑ دیا گیا۔ [illegible] اور [illegible] کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے [illegible] کے [illegible] کے ضمانت [illegible] کر چھوڑ دیا گیا۔

مقدمے سزائیں جن کو سزا دینا تھا ان کو طویل و مختصر سزاؤں کا حکم سنا دیا گیا پھر بھی باغیوں کی بڑی تعداد [illegible] کر کے انہیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد غدر کے قائدین پر مقدمہ چلانے کی تحریک ہوئی۔

تاریخی مقدمہ [illegible] غدر کرنے والے باغیوں کے سرغنہ پر تاریخی مقدمہ چلایا گیا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی کوئی تاریخ نہیں مقرر کی گئی تھی پھر بھی [illegible] کا دن تھا باغیوں کے بیانات شروع ہونے تھے اس کثرت سے تھا کہ پہلی بار تماشائیوں پر ٹکٹ لگا دیا گیا۔ [illegible] اور [illegible] لوگ عام [illegible] تماشائیوں کی گیلریوں میں بیٹھ سکتے تھے۔ پولیس، وکلاء، مجرمین، [illegible] اور [illegible] پر کوئی ٹکٹ نہیں لگایا گیا تھا صرف ان سے پیسے لیے گئے تھے۔

باغیوں کے بیانات اور سزائیں سب سے پہلے باغیوں کے قائد "[illegible] پاشا" کو [illegible] عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان کے [illegible] ہوتے ہی [illegible] باہر ہو گیا۔ [illegible] اور [illegible] کے نعروں اور [illegible] کے [illegible] کی آوازیں [illegible] دوست و دشمن کی تمیز کا مشکل ہو گئی۔ مگر پھر بھی اس نے سب کا شکریہ ادا کیا کہ [illegible] کے فوجی کورٹ میں بصورت کورٹ مارشل چل رہا تھا اس نے مارشل نے [illegible] سے اس کا بیان حلفی شروع کرنے کا حکم دیا ——

مارشل —— "تم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟"

جگی ——" صفائی کی ضرورت مجھے نہیں تم کو ہے ——"

"تم نے غدر کروایا کیا یہ الزام درست ہے — بولو ——؟"

"ہاں مجھے فخر ہے کہ میں نے غدر کروایا ——"

"عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا ——"

"عدالت اس کے اسباب جانتی ہے ——"

"اور تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم حکومت کے باغی ہو ——"

"ہاں مجھے اپنے باغی ہونے پر ناز ہے ——"

"اور بغاوت کی سزا کیا ہے یہ بھی جانتے ہو ——"

"تمہاری سزاؤں کی جس کو پروا ہو وہ ان کو جاننے کی کوشش کرے۔ جگی اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتا؟"

"حکومت تمہاری شکایات جاننا چاہتی ہے ——"

"کیا حکومت یہ جاننا چاہتی ہے کہ جگی باغی کیوں بنا؟ کیا حکومت کو یہ علم نہیں کہ اس نے روپیہ کے چالیس سیر آٹے اور [illegible] سیر کے بجائے دس سیر کا اعلان کر دیا۔ کیا حکومت نے ریاستیں و زمینداریاں نہیں ضبط کیں۔ میں یہ پوچھتا ہوں کہ حکومت نے اس کے لئے عوام کے فائدوں کا بھی پاس کیا تھا۔ ان کے جذبات کا بھی خیال کیا تھا۔ عوام کے [illegible] اور عدالت کی [illegible] کیا حکومت نے منصوبے نہیں بنائے۔ ہر پانچ سال بعد ایک منصوبہ [illegible] ہمیں یہ اس [illegible] کوئی برداشت کر سکتا ہے کیا آج مجھے گرفتار کرنے والے بتا سکیں گے کہ انہوں نے بیروزگاری کو کیوں ختم کر دیا۔ طوائفوں کو کیوں ختم کیا۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں کہ ہمارے لئے تعلیم کو سستا اور آسان نہیں کیا گیا۔ پھر جب ہر چیز سستی اور آسان ہو جائے گی تب ہماری نسل میں [illegible] مستی کا ضمیر اور تجربہ کا مادہ کہاں سے آئے گا۔ کیا حکومت کو علم نہیں کہ روزگار دلانے والے دفتروں نے ہمارے بیٹوں اور بیٹیوں کو [illegible] روزگار دلا کر ہمارے بیٹوں کو کاہل اور [illegible] نہیں بنا دیئے۔ ہماری معصوم عورتوں نے ہمارے [illegible] بنانے کے سنہرے خوابوں کو مسمار نہیں کیا۔

میں یہ پوچھتا ہوں۔ کہاں ہیں [illegible] جو اس وقت انگریزوں کو ملک سے نکال رہے تھے جنہوں نے ملک کو تقسیم کرتے وقت علاقائی و [illegible] کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ جنہوں نے اپنی حکومت اور عدالت کے گھروں میں صوبائی و علاقائی و سیاسی تعصب اور [illegible] کو ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دیا۔ میں کہتا ہوں کیا وہ ملک کے [illegible] نہیں رکھتے تھے۔ کیا ہمارے وزیروں اور لیڈروں نے اپنے پیٹ کاٹ کاٹ کر اور [illegible] ہماری ناک دوسرے ملک کے سامنے نیچی نہیں کی۔ انہوں نے اپنی تنخواہیں اور الاؤنس لٹا لٹا کر کیا ہماری دل آزاری نہیں کی۔ [illegible] کیا حکومت نے [illegible] کیا [illegible] کسی قیامت کے نازل ہونے کا انتظار تھا ——"

[illegible] جگی بادشاہ [illegible] جذبات [illegible] جگی بادشاہ [illegible] کی اپیل کے [illegible]۔

[illegible] ہم اس کے لئے پھانسی کی سزا [illegible] حکم دیتے ہیں [illegible] —— [illegible]

[illegible] ہو جائیں ——" [illegible] جگی [illegible] ہو گیا۔ [illegible]

[illegible] —— اب غدر کے [illegible] —— تاریخ کے [illegible] حرف ان کی ہی [illegible] ہے ——

زندہ لاش

(ترجمہ)

سیّدہ ثریا سلطانہ

ایک فرانسیسی کہاوت ہے کہ بیوی کا شکار اور [illegible] دونوں تباہی [illegible] ہیں۔ مجھے کبھی [illegible] کے شکار کا شوق نہیں رہا اس لئے میں نہیں کہہ سکتی [illegible] دونوں میں [illegible] ایک [illegible] ہوگی اور [illegible] موسم میں مچھلیوں کی [illegible] شکایت کو کم کر دیتی ہوگی۔ یہ حقیقت ہے کہ شکاری کے لئے بارش بڑی مصیبت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک روز [illegible] شکار کو نکلے تو اسی مصیبت میں پھنس گئے۔ اس دن صبح سویرے سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ [illegible] سروں پر [illegible] برساتیاں [illegible] اور درختوں کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ برساتی [illegible] ٹھیک نہیں [illegible] تھا اور پانی ہمارے کپڑوں میں [illegible] رہا تھا۔ [illegible] درختوں کے نیچے [illegible] تھا [illegible] پانی اس قدر [illegible] ہر شاخ سے [illegible] کی طرح پانی ہم پر گر رہا تھا اور [illegible] ہے کہ آج شکار ممکن نہیں۔ [illegible] بھیگ گئے ہیں۔ اوف! [illegible] بڑی مصیبت ہے۔“

میں نے پوچھا ”تو پھر کیا کیا جائے؟“ وہ بولا ”چلو [illegible] کو چلیں۔ یہ تمہاری [illegible] کا گاؤں ہے جو یہاں سے سات میل دور ہے رات وہاں ٹھہریں گے اور کل ——“

”وہاں بھی بارش ہوگی۔“

”نہیں یہاں نہیں۔ میں [illegible] جانتا ہوں جہاں یہاں سے زیادہ [illegible] ملیں گے۔“

میں فوراً اپنے [illegible] ملازم کی بات مان گیا اور اس سے [illegible] نہیں پوچھا [illegible] مجھے وہاں کیوں [illegible] تھا۔ اسی وقت ہم دونوں اس گاؤں کی طرف چل پڑے جس کے وجود کا اس سے پہلے مجھے کوئی علم نہ تھا۔ [illegible] اس گاؤں میں ایک [illegible] بنگلہ ہے [illegible] لیکن صاف ستھرا ہونے کی وجہ سے رات کو آرام سے گزر جائے گی۔

دوسرے دن [illegible] سورج طلوع ہو رہا تھا مطلع صاف تھا۔ [illegible] جب [illegible] گاؤں [illegible] ہو جاتے ہیں

بنگلہ کے باغیچے میں ٹہلنے نکل گیا جو اب اپنی ویرانی کے باعث جنگل بن گیا تھا۔ مگر یہاں کی کھلی نیلی فضا اور خنکی کی تازگی میں مجھے عجیب قسم کا سرور حاصل ہو رہا تھا۔ جہاں وہ مدت سے بیکار رہ چکے تھے۔ وہاں کی آوارہ گھاس میں شبنم کی سی نرمی اور لطافت تھی۔ میں نے ٹوپی اتاری اور اطمینان کی لمبی سانس لی۔ باغیچے کے پاس ڈھلوان پر شہد کی مکھیوں کے چھتے لگے ہوئے تھے۔ اس طرف بل کھاتی ہوئی ایک چھوٹی سی پگڈنڈی جا رہی تھی۔ میں اس پگڈنڈی پر ہو لیا اور چھتوں تک پہنچ گیا۔

چھتوں کے پاس سرکنڈوں کی ایک جھونپڑی تھی جہاں سردیوں میں چھتے رکھے جاتے تھے۔ میں نے جھونپڑی کے کھلے دروازے میں جھانکا۔ اندر اندھیرا تھا پھر بھی اس وقت مری ہوئی خوشبو اور پتیوں کی ایک مہک آ رہی تھی۔ ایک کونے میں خشک پھونس کی چٹائی پر کوئی چیز پڑی تھی۔ میں وہاں سے پلٹنے لگا تو ایک بہت ہلکی آواز سنائی دی۔ جس میں ایسی گھبراہٹ تھی جیسے کوئی سوتے سے بیدار ہوئی ہے۔ "سرکار! سرکار! پیٹر پیٹرووچ!" میں رک گیا۔ آواز اس کونے سے آئی جہاں گٹھڑی پڑی تھی— "پیٹر پیٹرووچ! مہربانی سے ذرا اندر تو آئیے۔" میں قریب گیا دیکھا تو گودڑ کا ٹکڑا ہلا۔ میرے سامنے ایک زندہ انسان تو ضرور تھا مگر عجیب و غریب مخلوق معلوم ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا اور بے رونق تھا۔ ناک سکڑ کر چونچ کی طرح نوکدار ہو گئی تھی۔ ہونٹ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پورے چہرے میں صرف سفید دانت اور بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سر پر رومال بندھا تھا جس میں سے دو چار سنہری لٹیں ماتھے پر نکل آئی تھیں۔ ٹھوڑی کے پاس رومال کے نیچے سے دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ نکلے ہوئے تھے۔ ان کا رنگ بھی نیلا پڑ گیا تھا۔ انگلیاں کانپ رہی تھیں اور لکڑی کی طرح سخت تھیں۔ میں نے جب اس چہرے کو غور سے دیکھا تو یہ بدصورت نہیں تھا بلکہ واقعی خوبصورت تھا مگر اس خوبصورتی پر جیسے شدت نے قسم کھا رکھی تھی۔ وہ چہرہ اور بھی شدید اداس ہو جاتا جب بے جان گالوں پر مسکراہٹ آنے کی ناکام کوشش کرتی اور کریہہ کی وجہ سے محض ہونٹ بیچ بیچ میں ہلتے رہ جاتے۔ آواز بھی بہر حال ادا نہ ہوتی۔ میں نے بمشکل سنا: "سرکار! کیا آپ مجھے پہچانتے نہیں؟ اور کیا تعجب ہے آپ مجھے پہچانتے ہی کیسے؟ مالک میں لکیریا ہوں۔ وہی جو آپ کی والدہ کے ہاں ناچنے گانے میں آگے آگے رہتی تھی۔ آپ کو یاد ہے؟"

"لکیریا! کیا کہا؟ یقین نہیں آتا کہ تم وہی لکیریا ہو......"

"ہاں سرکار میں...... میں ہی لکیریا ہوں......"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ حیرت سے میں اس ساکت پیلے چہرے کو تک رہا تھا جس کی بڑی بڑی مردہ آنکھیں مجھ پر لگی تھیں۔ میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی لکیریا ہے جس کی خوبصورتی ہمارے سارے گھرانے میں مشہور تھی۔ دبلی، گوری، سرخ و سفید۔ ہنستی گاتی ناچتی ہوئی چنچل لڑکی جس کے پیچھے ہم سب لڑکے دیوانے تھے۔ اس وقت میں سولہ برس کا تھا اور مجھے اب تک اس کے گیت یاد تھے۔ اس وقت کی لڑکی یاد آئی تو میرے ذہن میں گونج گئی اور میں نے بلا جھجک پوچھا: "ارے لکیریا یہ تمہیں ہو کیا گیا؟"

"مجھ پر بڑی مصیبتیں پڑی ہیں صاحب۔ مگر میرا کوئی خیال نہ کیجئے اور سرکار میری حالت سے گھن نہ کھائیے۔ اس تپائی پر بیٹھ جائیے اور میرے ذرا نزدیک آ جائیے ورنہ میری آواز آپ کو سنائی نہیں دے گی۔ آج کل میری آواز بہت ہلکی پڑ گئی ہے...... آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کیسے آج اکیلے ہی تشریف لے آئے؟" لکیریا آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

مجھے لکیریا پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ "مگر تم اپنا حال تو بتاؤ؟"

"بہت اچھا اب تک جو مجھ پر گزری ہے آپ کو سناتی ہوں۔ یہ چھ سات برس پہلے کی بات ہے۔ میری ان ہی دنوں واسیلی پولیاکوف سے منگنی ہوئی تھی۔ وہ بڑا خوبصورت دیہاتی تھا۔ اس کے بال گھنگھریالے تھے اور وہ آپ کی والدہ کے ہاں کام کرتا تھا۔ شاید آپ کو یاد نہ ہو کیونکہ اس زمانے میں آپ تعلیم کی غرض سے ماسکو میں رہتے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ وہ ہر وقت خیال میں میرے ساتھ رہتا۔ بہار کا موسم تھا اور رات تھی۔ میری نیند اچٹ گئی۔ بلبل باغیچے میں بڑی مٹھاس سے گا رہی تھی۔ اس کی آواز میں غضب کا درد تھا۔ مجھ سے نہیں رہا گیا پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر سننے لگی۔ وہ گا رہی تھی۔ اور میں اس کی میٹھی اور مدھری آواز میں ڈوب گئی تھی۔ یکایک مجھے ایسا لگا جیسے واسیلی نے آہستہ سے پکارا ہو "لکیریا۔ پیاری لکیریا!"...... ابھی میں نیند میں تھی بھاگ کر دیکھنے کے لئے جو مڑی تو میرا پاؤں پھسلا اور میں سیڑھیوں سے نیچے زمین پر آ رہی۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ فوراً اٹھ کر اندر چلی گئی......

ایک منٹ رکیے صاحب۔ میں ذرا سانس لے لوں۔" لائیرا خاموش ہو گئی اور میں اس کی صورت تکتا رہا۔ مجھے تعجب تھا کہ بغیر کسی کرب اور شکایت کے کیسے صبر سے وہ اپنی کہانی سنا رہی تھی۔ اس نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں تو اس حادثے کے بعد میں برابر مرجھاتی اور دبلی ہوتی گئی۔ میرا رنگ سنولا گیا۔ جسم سے چیتھڑا ہو گیا۔ میرے پیر جو نہیں اٹھتے تھے، اور تھوڑے دنوں کے بعد تو میری ٹانگیں بالکل بیکار ہو گئیں۔ اب نہ میں کھڑی ہو سکتی ہوں اور نہ چل سکتی ہوں۔ صرف لیٹی رہتی ہوں۔ ان دنوں میری بھوک پیاس اڑ گئی تھی اور حالت دن بدن بدتر ہوتی گئی۔ آپ کی والدہ کو میری حالت پر بہت ترس آیا۔ خدا انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔ مجھے انہوں نے کئی ایک ڈاکٹروں کو دکھایا۔ ہسپتال بھی بھیجا مگر میرا علاج نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر بھی تشخیص نہ کر سکے کہ میری بیماری کیا ہے۔ انہوں نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ کبھی یہ دیکھ کر کہ میرا جسم گرم ہے ہسپتال لے جایا گیا تو کبھی مجھے برف کی سیلوں میں لٹایا گیا۔ مگر کوئی چیز کارگر نہیں ہوئی۔ آخر میں میرا جسم بالکل سن ہو گیا۔ مالکن نے جب یہ دیکھا کہ کسی طرح اچھی نہیں ہو پاتی تو علاج چھوڑ دیا۔ مجھ جیسی اپاہج کا کوٹھی میں سوائے پڑے رہنے کے اور کوئی کام نہیں تھا۔ اس لئے انہوں نے مجھے یہاں میرے رشتہ داروں کے پاس بھیج دیا۔ چنانچہ جیسا آپ دیکھ رہے ہیں میں یہاں رہتی ہوں۔" اب لائیرا خاموش ہو گئی تھی۔ پھر اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ میں نے بے ساختہ کہا۔

"لائیرا یہ تو غضب ہو گیا۔ مگر سیسل کہاں گیا؟" میرے اس حماقت آمیز سوال پر لائیرا کی آنکھوں میں پریشانی دوڑ گئی۔

"پھر بات یہ ہوئی وہ تھوڑے دن رنجیدہ رہا۔ پھر اس نے گاؤں کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ جس کا نام [illegible] ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا مگر جوان لڑکا تھا کیسے اکیلے رہتا اور میں بھلا اس کا کیا ساتھ دے سکتی تھی؟ جس عورت سے اس نے شادی کی ہے وہ اچھی ہے۔ ان کے بچے ہیں۔ گھر سے وہ یہیں قریب رہتا ہے اور [illegible] ہے۔ آپ کی والدہ نے [illegible] دیا تھا اور [illegible] ابھی گزر رہی ہے۔"

"اور تم یہاں ہر وقت کیا اسی طرح پڑی رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی سرکار میں یہاں سات سال سے ہوں۔ گرمیوں میں اس جھونپڑی میں پڑی رہتی ہوں اور جب سردی ہو جاتی ہے تو یہ لوگ مجھے کام کی کوٹھڑی میں ڈال دیتے ہیں۔"

"کوئی تمہاری دیکھ بھال بھی کرتا ہے؟"

"ہاں سرکار۔ یہاں بھی اچھے لوگ بستے ہیں۔ انہوں نے مجھے اکیلا نہیں چھوڑ دیا ہے۔ میری تھوڑی بہت دیکھ بھال ہو ہی جاتی ہے۔ میں کھانے کی کچھ خاص نہیں ہوں۔ پانی یہاں گھڑے میں میرے پاس رکھا رہتا ہے اور گھڑا ہمیشہ چشمے کے ٹھنڈے پانی سے بھرا رہتا ہے۔ میرا ایک ہاتھ ابھی تھوڑا بہت کام کرتا ہے اس سے جب جی چاہتا ہے گھڑے سے پانی لے لیتی ہوں۔ ایک یتیم بچی یہاں رہتی ہے اور کبھی کبھی مجھے دیکھنے آ جاتی ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے وہ یہاں تھی کیا آپ نے جاتے اسے نہیں دیکھا؟ بڑی اچھی خوبصورت سی بچی لگتی ہے۔ وہ میرے لئے پھول لاتی ہے۔ پہلے یہاں باغ میں پھول ہوتے تھے مگر اب تو سب اجڑ گیا ہے۔ جنگلی پھول بھی اچھے ہوتے ہیں بلکہ باغ کے پھولوں سے زیادہ خوشبودار۔ مثلاً نرگس کی خوشبو کیسی بھینی بھینی ہوتی ہے۔"

"اس تنہائی سے کیا تمہارا جی نہیں گھبراتا؟ بیزار نہیں ہو گئی ہو؟"

"گھبرا کر کیا ہو گا۔ میں جھوٹ کیوں بولوں شروع میں تو بہت گھبراتی تھی۔ پھر میں عادی ہو گئی اور صبر آ گیا۔ میں سوچنے لگی یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اب بھی بہتوں سے بہتر ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"بہت سے ایسے ہیں جن کے پاس میری جیسی جھونپڑی کا بھی نہیں ہے۔ اور کوئی اندھا ہے تو کوئی بہرا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں سب دیکھ سکتی ہوں اور ایک ایک چیز سن سکتی ہوں۔ جب بچے مندر میں گیت گاتے ہیں تو میں سن لیتی ہوں۔ اسی طرح باغ سے بھینی خوشبو میں سونگھ لیتی ہوں۔ مثلاً جب جو [illegible] ہیں یا [illegible] کے [illegible] بہار آتے ہی تو مجھے سب سے پہلے خبر ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] سے [illegible] ہو جاتا ہے مگر دیکھئے کہیں گناہ سے بھی محروم ہوں۔

چند روز ہوئے پادری صاحب میرے پاس آئے تھے کہنے لگے تمہیں اعتراف کی ضرورت نہیں بھلا تم جیسی حالت میں کیا گناہ کرو گی؟ میں نے کہا۔ انسان اپنے خیالات میں بھی گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ وہ مسکرائے اور بولے۔ ہاں یہ کوئی گناہ نہیں۔ لیکن، اب میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح بھی میں کوئی بڑی گنہگار نہیں ہوں۔ میں نے اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنا لیا ہے کہ زیادہ نہ سوچوں اور خاص طور پر پرانی زندگی اور باتیں [illegible] کروں۔ اس طرح وقت اچھا گزر جاتا ہے؟

"دیکھیں یہ کوئی [illegible] ہے [illegible] تم اپنے آپ کو [illegible] سے کیسے [illegible] ہو؟" میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ "کیا ہر وقت [illegible] رہتی ہو؟"

"نہیں جناب ہر وقت کیسے سوچ سکتی ہوں۔ ویسے میرے جسم میں کسی [illegible] تو تکلیف وغیرہ نہیں ہے اگرچہ [illegible] سے ایسی طرح [illegible] نہیں [illegible]۔ میں پڑی رہتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ سوچوں بھی نہیں۔ میں خوش ہوں کہ زندہ ہوں۔ سانس لیتی ہوں۔ [illegible] کیا ہے؟ [illegible] روشنی کے [illegible] پرندوں نے [illegible] انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش [illegible] میں بڑی دلچسپی سے دیکھتی کہ ایک [illegible] اور اڑ جاتا [illegible] ...... میں سوچتی کہ اگلے سال پھر وہ یہاں اپنے گھر بنائیں گی [illegible] کسی شکاری نے ان کو مار ڈالا۔ [illegible] تم شکاری ہو [illegible] ہو؟"

"میں تو [illegible] نہیں [illegible]" میں نے جلدی سے کہا۔

"اور ایک دن بہت مزہ آیا۔" وہ کہنے لگی۔ "جب [illegible] اور میری [illegible] شکاری [illegible] تھے۔ [illegible] بہت [illegible] کوئی [illegible] میں [illegible] گیا۔ [illegible] اور [illegible] کہنے لگی۔" [illegible] میرے پاس کوئی کتاب نہیں ہے [illegible] پادری صاحب میرے [illegible] تھے مگر جب میں نے [illegible] آتی ہے۔ اگر میں [illegible] بہت [illegible] میں [illegible] بیماری بھول جاتی ہوں۔

وہ [illegible] میں [illegible] بیٹھا رہا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس بدنصیب عورت کی [illegible] میں نے [illegible] کہا۔ "[illegible] ہسپتال میں [illegible]" [illegible] اچھی ہو [illegible] "ارے نہیں صاحب مجھے ہسپتال نہ لے جائیے۔ مجھے وہاں [illegible] تکلیف ہوگی۔ [illegible] مجھے [illegible] لئے [illegible] مجھے [illegible]

کر دیکھا اور میری بیماری کا نام بھی مجھے بتایا تھا ...... بہت لمبا سا نام تھا ...... اس کے بعد وہ چلا گیا لیکن جتنے عرصے تک میری نبض پکڑی اور جو ہاتھ رکھتا رہا۔ آپ کہتے ہیں کہ میں ہر وقت اکیلی رہتی ہوں۔ نہیں جب لوگ مجھے دیکھنے آتے ہیں میں خاموش رہتی ہوں اور ان لوگوں کو کوئی زحمت نہیں دیتی۔ اکثر گاؤں کی لڑکیاں مجھ سے آکر باتیں کرتی ہیں۔ کبھی کوئی زیارت کرنے والی عورت آجاتی ہے تو مجھے پر رحیم خدا اور مریم و زیارتوں کے قصے سناتی ہے۔ میں تنہائی سے نہیں گھبراتی بلکہ مجھے اچھی لگتی ہے۔ نہیں نہیں مجھے مت چھوڑنا اور مجھے کسی ہسپتال نہ بھیجنا ڈاکٹر۔ ہاں ہاں آپ بہت اچھے ہیں لیکن مجھے ایسے ہی رہنے دیجئے۔ خدا کے لئے مجھے یہاں سے مت ہٹایئے۔

"اچھا اچھا تمہاری مرضی۔ لیکن میں تو تمہاری بھلائی کے لئے ہی کہتا تھا ......"

"میں جانتی ہوں ڈاکٹر کہ آپ میری بھلائی کے لئے کہتے ہیں مگر دوسرے کی کوئی کہاں تک مدد کر سکتا ہے۔ کسی کے دل کی بات کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ ہر ایک کو خود ہی اپنے لئے راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ میں کبھی کبھی بڑی اکیلی ہو جاتی ہوں اور یوں لگتا ہے کہ میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں لیکن تھوڑی دیر میں اپنے آپ ہی سنبھل جاتی ہوں۔ مگر راتوں میں عجیب و غریب خواب دیکھتی ہوں۔"

"کیسے خواب دیکھتی ہو لڑکی؟"

"میں ٹھیک سے بیان نہیں کر سکتی ڈاکٹر اور میں بھول بھی جاتی ہوں۔ خواب بادلوں کی طرح آتے ہیں۔ بہت سے ہیں اور مجھے تر و تازہ کر دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب میرے پاس دوسرے لوگ ہوتے ہیں تو مجھے ایسا محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان کی موجودگی سے اپنی دوری کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔" اس نے ٹھنڈی سی سانس لی۔ دوسرے اعضا کی طرح اس کی سانس بھی اکھڑی تھی۔ "لیکن ڈاکٹر میری وجہ سے آپ کو اتنا پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ اب بھی ...... آپ کو یاد ہوگا کہ میں اپنے زمانے میں کتنا ہنستی کھیلتی اور گاتی تھی اب بھی جب میں گیت گاتی ہوں تو سکون ملتا ہے۔"

"کیا تم اب بھی گا سکتی ہو؟"

"جی ہاں اب بڑے گیت گاتی ہوں۔ مجھے بہت گیت آتے ہیں۔ ہر قسم کے۔ اور سب یاد ہیں مجھے۔"

"تم گا سکتی ہو یا گنگناتی ہو؟"

"گاتی بھی ہوں اور گنگناتی بھی۔ زیادہ زور سے تو نہیں گا سکتی مگر دوسرے کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ میں نے ذکر کیا تھا کہ ایک چھوٹی سی یتیم لڑکی میرے پاس آتی ہے وہ بہت ہوشیار ہے۔ اس نے تھوڑے سے ہی دنوں میں مجھ سے چار گیت سیکھ لئے ہیں ...... آپ کو یقین نہیں آتا ٹھہریئے میں آپ کو سناتی ہوں۔"

ڈاکٹر نے لمبی سانس لی۔ اس خیال سے کہ اب یہ اندھی لڑکی گانے کی کوشش کرے گی۔ جیسے وہ گھٹنے ٹکڑے ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں اس نے آہستہ سے ایک میٹھا سا گیت چھیڑ دیا جس کے سر کچے اور بالکل سچے تھے۔ ابھی یہ آواز میرے کانوں تک پہنچی ہی تھی کہ اس نے دوسرا اور تیسرا شروع کر دیا۔ "بہت عجیب گیت ہیں ...... ڈاکٹر یاد آتی ہیں۔" وہ گاتی رہی مگر اس کے چہرے کی طرح اس کا چہرہ پر کوئی تاثر نہ تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی ایک جگہ ٹھہری تھیں بلکہ اس کی چھوٹی سی آواز جو بڑی مشکل سے نکل رہی تھی دھیمی کی طرح ہوا میں بکھر رہی تھی۔ اس میں کتنا درد اور سوز تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ گیت میں اپنے دل کا سارا دکھ درد بھر دے ...... اب مجھے ڈر نہیں لگ رہا تھا بلکہ اس کے لئے میرا دل رحم سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ "بس مجھ سے نہیں چلتا۔" اس نے ایک دم کہا۔ "مجھ میں طاقت ہی نہیں ہے میں آپ کو دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہو گئی ہوں۔" اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کی برف جیسی ٹھنڈی انگلیوں پر رکھ دیا۔ اس نے میرے اوپر نظر ڈالی۔ اس کے سیاہ بالوں کے بیچ میں سے کناروں پر سنہری جھلکیاں تھیں پھر سے بند ہو گئے۔ وہ بت کی طرح ساکت اور بے جان تھے۔ ایک لمحے کے بعد وہ نیم اندھیرے میں چھلکے تو آنسو ڈھلک رہے تھے۔

میں پہلے کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ "اے مجھے کیا ہو گیا۔ میں بھی کتنی بیوقوف ہوں۔" لڑکی نے خیر خیر ختم تمنا آواز سے کہا اور اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے آنکھیں بھینچ کر آنسو چھپائے اور کہنے لگی۔ "مجھے شرم آنی چاہئے۔ یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ بہت دن کے بعد میں ایسا محسوس کر رہی ہوں۔ ہاں ایک دن میں نے ایسا ہی اور محسوس کیا تھا۔ پچھلی بہار میں کوئی بلبل آیا تھا وہ ہر رنگ میں چہکا رہا۔ جب تک وہ بولتا رہا تو میں ٹھیک تھی مگر اس کے جانے کے بعد میں اکیلی میں کتنا روئی ہوں۔ اتنے آنسو نہ معلوم کہاں سے آ گئے تھے۔ ہم جیسی لڑکیوں کے آنسو تو یونہی آجاتے ہیں ڈاکٹر۔ دن کالا ہے۔ آپ کے پاس رومال ہو گا میرا رومال ہے وہ ذرا میری آنکھیں پونچھ دیجئے۔"

میں نے اس کے آنسو پونچھے اور رومال اس کے پاس چھوڑ دیا۔ رومال سادہ تھا لیکن صاف اور سفید تھا۔ پہلے تو اس نے لینے سے انکار کیا پھر بولی "میں اس تحفہ کا کیا کروں گی؟" پھر اس نے اس کو بھینچ کر اور انگلیوں سے دبایا اور چھوڑا نہیں۔ میں اب اس ماحول کا عادی ہو گیا تھا جس میں ہم دونوں بیٹھے تھے۔ چنانچہ میں اس کے نقش کو اب پہچاننے لگا تھا۔ اس کے بے رنگ چہرہ پر جو ہلکی سی سرخی دوڑ گئی تھی وہ بھی مجھے اب نظر آنے لگی تھی۔ اس کے چہرہ پر پہلے حسن کی پرچھائیاں بھی اب نمایاں تھا۔

"صاحب! میرے سونے کے بارے میں آپ پوچھ رہے تھے" ڈی کیرا کہنے لگی "تو میں بہت کم سوتی ہوں لیکن جب بھی سوتی ہوں۔ میں خواب دیکھتی ہوں بہت اچھے اچھے، شاندار۔ میں خواب میں بیمار نہیں ہوتی۔ ہمیشہ تندرست اور جوان .... میرا سارا دکھ درد جاتا رہتا ہے لیکن جب میں جاگتی ہوں تو دوبارہ سونے کو بہت ہی جی چاہتا ہے۔ اس وقت مجھے ایسا لگتا ہے کہ میرے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہیں۔ مجھے اپنی معذوریت کا احساس شدید ہو جاتا ہے تو بڑا افسوس ہوتا ہے۔ ایک دفعہ میں نے بہت اچھا خواب دیکھا .... کہا میں آپ کو بتاؤں؟ اچھا تو سنئے۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک بہت بڑے کھیت میں کھڑی ہوں۔ میرے چاروں طرف گیہوں کی لمبی لمبی پکی سنہری بالیاں لگی ہیں۔ میرے ساتھ ایک بھورا کتا تھا۔ وہ کتا بڑا خوفناک تھا۔ برابر مجھے کاٹنے کی فکر میں تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک درانتی تھی۔ یہ درانتی معمولی نہ تھی بلکہ وہ چاند معلوم ہوتی تھی۔ شروع دنوں میں چاند کی شکل درانتی کی طرح ہوتی ہی ہے۔ ہاں تو مجھے اس چاند والی درانتی سے گیہوں کاٹنے تھے۔ گرمی کی شدت سے میں بہت تھکی ہوئی تھی اور اپنے ہاتھ والے چاند سے چکاچوند ہو رہی تھی۔ مجھے سستی محسوس ہو رہی تھی۔ چاروں طرف بڑے بڑے نیلے رنگ کے پھول کھلے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنے سر میری طرف جھکائے۔ میں نے خواب میں سوچا کہ ان کو توڑوں کہ پہلے سے آنے کا وعدہ کیا تھا تو پہلے ایک بار چاروں پھر کتائی کروں گی پھر گیہوں کاٹنے کے لئے میرے پاس کافی وقت تھا۔ چنانچہ میں نے نیلے نیلے پھولوں کو چننا شروع کیا مگر وہ میرے ہاتھوں میں آتے ہی پگھلنے لگے۔ میں نے بہتیری حفاظت کی مگر وہ پگھلتے ہی گئے۔ میں بار بار گھبرا گئی کہ وہ علی اتنے میں کسی کے قدموں کی آہٹ میں نے سنی اور بہت پاس کسی نے پکارا "ڈی کیرا ...... ڈی کیرا" ..... اسے میں نے دل میں کہا کتنا برا ہوا کہ میں اب تک، اور گھبرا گئی۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں اب نیلے پھولوں کی جگہ چاند کو اپنے سر پر رکھ لوں گی۔ میں نے تاج کی طرح اسے سر پر رکھ لیا۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی۔ سارا کھیت چمک اٹھا اور سنہری بالیوں کے اوپر سے ایک شخص جلدی سے میری طرف بڑھتا ہوا آیا۔ وہ شخص روسیلی نہیں تھا بلکہ حضرت عیسیٰ تھے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ میں ان کو کیسے پہچان گئی کیونکہ تصویروں میں ان کی یہی شکل ہوتی ہے۔ وہ خوبصورت وجیہ جوان تھے۔ داڑھی ان کے نہیں تھی وہ سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ صرف چہرہ ان کا سنہری تھا۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے لئے بڑھایا اور کہا "ڈی کیرا! میری پیاری روح۔ میرے پیچھے آؤ۔ جنت کے گیت اور ناچ کے رنگ اب تم خوش رہو گی" میں نے مضبوطی سے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کتا اچانک میرے پیروں پر جھپٹا لیکن اسی وقت ہم اوپر اٹھنے لگے۔ حضرت عیسیٰ آگے آگے تھے۔ ان کے شہپر سے آسمان پر پھیل گئے تھے۔ اور میں ان کے پیچھے تھی۔ کتے کو پیچھے بھاگنا پڑا۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ وہ کتا میری بیماری تھا اور خوش قسمتی سے اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی" ڈی کیرا ایک منٹ ٹھیر گئی پھر بولی "میں نے ایک اور خواب دیکھا یا محض الہام ہو۔ میں ٹھیک نہیں بتا سکتی۔ میں نے دیکھا کہ میں اسی چھپری میں لیٹی ہوں۔ میرے مرحوم والدین میرے پاس آئے اور آ کے عقیدت سے میرے سامنے جھک گئے۔ میں نے پوچھا "امی ابا! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟" انہوں نے کہا "تم نے دنیا میں بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ مگر تم نے اپنی روح کو بگڑنے نہیں دیا بلکہ چادر سے بدن کو بھی اجالا ہے اور ہماری آخرت کو سنوارا ہے۔ تم نے ہمارے گناہ دھو دیئے۔" یہ کہتے ہوئے میرے والدین ایک دفعہ اور میرے سامنے جھک گئے پھر وہ مجھے نظر نہیں آئے۔ سوائے دیواروں کے کچھ اور دکھائی نہیں دیا۔ میں بڑے پس و پیش میں تھی کہ اس کا کیا مطلب ہوا۔ پادری صاحب سے جب میں نے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا یہ الہام نہیں ہو سکتا کیونکہ الہام تو صرف پہنچے ہوئے لوگوں ہی کو ہوتا ہے؟"

"میں آپ کو ایک خواب اور سناتی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میں بڑی سڑک پر درخت کے نیچے بیٹھی ہوں۔ میرے ہاتھ میں چھڑی تھی میری پیٹھ پر گٹھڑی تھی اور میرے سر پر رومال بندھا تھا بالکل زائر عورتوں کی طرح۔ مجھے کہیں بہت دور زیارت کے لئے جانا تھا۔ زائرین میرے پاس سے آہستہ آہستہ گزر رہے تھے وہ سب ایک ہی نغمہ گا رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوشی تھی اور دیکھنے میں وہ سب ایک سے تھے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ان لوگوں میں ایک عورت تھی جس کا سر اوروں سے الگ

رہا تھا۔ وہ عجیب سا لباس پہنے تھی جو روسیوں سے بہت مختلف۔ اس کا چہرہ عجیب تھا۔ کرخت اور تھکا ماندہ۔ جدھر وہ جاتی سب لوگ اُدھر سے فوراً ہٹ جاتے۔ وہ ایک دم مڑی اور سیدھی میری طرف آئی۔ میرے پاس آ کر وہ رکی اور غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں عقاب کی طرح بڑی بڑی اور پیلی تھیں۔ میں نے اس سے پوچھا "تم کون ہو؟" کہنے لگی "میں تمہاری موت ہوں۔" یہ سن کر بجائے ڈرنے کے میں بہت خوش ہوئی۔ میں نے جلدی سے سینہ پر صلیب کا نشان بنایا۔ یہ دیکھ کر وہ ڈائن کہنے لگی "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی۔" میں بہت رنجیدہ ہوئی اور بولی "مجھے لے چلو، اپنے ساتھ پیاری ماں موت مجھے لے چلو۔" میری موت جھک کر مجھ سے کچھ کہنے لگی جو بہت مبہم اور غیر واضح تھا لیکن مجھے معلوم تھا وہ میری موت کا وقت بتا رہی تھی۔ سینٹ پیٹرز کے تہوار کے بعد . . . . . . میری آنکھ کھل گئی۔ جناب میں عجب عجب کے خواب دیکھتی ہوں مگر مجھے کبھی پورے سے بھر نیند نہیں آتی۔ پچھلے سال ایک خاتون مجھے دیکھنے آئیں اور چلتے وقت مجھے نیند کی دوا کی ایک شیشی دے گئیں۔ اس سے بہت فائدہ ہوا۔ روز نیند آ جاتی تھی۔ لیکن وہ سب دوا ختم ہو گئی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کونسی دوا ہے اور کہاں سے مل سکتی ہے؟"

ظاہر ہے اس خاتون نے اس کو بار بیچوریٹ یا افیم دی ہو گی۔ میں نے وعدہ کیا کہ میں اس قسم کی دوا کی شیشی مزید لا دوں گا۔ اور تعجب سے میں نے کہا "تم اتنا صبر کیسے کرتی ہو؟" اس نے جواب دیا "آپ یہ کیا کہتے ہیں؟ بھلا میرا صبر ہی کیا۔ صبر تو سائمن سٹائلیٹ کا مشہور ہے جو ایک کھمبے پر تیس سال کھڑا رہا۔ ایک اور بزرگ تھے جنہوں نے سینہ تک اپنے آپ کو مٹی میں دبوا دیا تھا۔ چیونٹیاں ان کا چہرہ کھا گئیں مگر انہوں نے جنبش نہ کی۔ انجیل کے ایک پڑھنے والے نے مجھے بتایا کہ ایک ملک تھا جہاں مسلمانوں نے دھاوا بولا۔ وہاں کے سینکڑوں ہزاروں باشندوں کو مار ڈالا اور سخت اذیتیں پہنچائیں۔ وہاں کے انسانوں کو کسی طرح ان سے نجات نہیں ملتی تھی۔ سب سخت پریشان تھے کہ خدا کی رحمت سے ایک فرشتہ صفت لڑکی ان میں نمودار ہوئی۔ اس نے لوہے کی زرہ بکتر پہن رکھی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اس نے تلوار اٹھائی اور انہیں سمندر سے پرے نکال باہر کیا۔ نکال دینے کے بعد اس نے کہا "اب مجھے جلا دو۔ یہ میری قسم تھی کہ اپنے ہم وطنوں کی خاطر آگ میں جل کر مر جاؤں گی۔" مسلمان اس کو پکڑ کے لے گئے اور زندہ جلا دیا۔ اس وقت سے وہاں کے باشندے آزاد ہیں۔ بڑا نیک کام کیا تھا اس نے۔ مگر میں نے کیا کیا ہے اور میری عمر کی حقیقت ہی کیا ہے؟"

مجھے تعجب ہوا کہ جون آف آرک کی کہانی کس طرح مسخ ہو کر اس کے گاؤں تک پہنچی تھی۔ دفعتاً میں نے پوچھا "اس کی عمر کیا ہو گی؟"

"اٹھارہ یا انیس کی ہو گی۔ بیس سے کم۔ مگر سال گننے سے کیا فائدہ۔ مجھے ابھی آپ سے اور باتیں کرنی ہیں؟"

اس کو ایکدم زور سے پھندا لگا اور وہ کراہی۔

"بی بی! تم بہت باتیں کر رہی ہو، کہیں تمہاری طبیعت اور خراب نہ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"اس کا کیا ڈر ہے؟" اس نے بہت مدھم آواز میں کہا۔ "فرق کیا پڑتا ہے؟ اب آپ چلے جائیں گے تو میں چپ ہو جاؤں گی۔ میں اپنے آپ کو بہت ہلکا ہلکا محسوس کر رہی ہوں کیونکہ ساری کہانی میں نے آپ کے سامنے رکھ دی اور میری بیماری بھی چلی گئی۔"

میں جانے کے لئے اٹھا۔ خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے اس سے وعدہ کیا کہ اس کی مطلوبہ دوا بھیج دوں گا۔ یہ بھی دریافت کیا کہ کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو کہو۔ "مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں ہر چیز سے آزاد اور مطمئن ہوں۔ مگر ملک آپ یہ دیکھئے کہ یہاں کے غریب کسانوں کی سفارش کیجئے جو ادھر ادھر سے اُٹھ چکے ہیں۔ ان کے پاس جنگل زمین کچھ زیادہ نہیں۔ کتنا اچھا ہو اگر ان کا لگان کم ہو جائے۔ بڑے مظلوم اور بھلے لوگ ہیں۔ آپ کو دعائیں دیں گے۔ خدا آپ کو تندرست اور خوش رکھے۔ بس۔ مجھے اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں چاہئے۔" میں نے اس کی کراہ سے وعدہ کیا کہ میں اس کی خواہش پوری کروں گا۔ میں رخصت ہو کر دروازے تک پہنچا تھا کہ اس نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ "آپ کو یاد ہے میرے پاس کتنے بلبل تھے اور مجھے پیار کرنے گھونسلوں تک آ جاتے تھے۔ مگر ہمارے میں ان کو صاف رکھتا اور ٹھیک سے کھیلنے کو ... بڑے پس و پیش کے بعد جنت کے آخری نے کٹا ہی دیئے۔ اچھا خدا حافظ صاحب! اب میں زیادہ نہیں بول سکتی۔"

اس دن شکار جانے سے پہلے گاؤں کے چوکیدار سے میری بات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ گاؤں میں لکیریا کو زندہ لاش کہتے ہیں۔ وہ کسی

کو کوئی تکلیف نہیں دیتی اور نہ ہی شکوہ شکایت کرتی ہے۔ ۔ وہ کچھ نہیں مانگتی جو کچھ مل جاتا ہے اس کے لیے شکر گزار رہتی ہے۔ بڑی نیک روح معلوم ہوتی ہے گو بدکاری اس کا پیشہ تھا اس نے نہ معلوم ایسے کیا گناہ کئے ہیں جن کا اسے خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ہم تفصیل کیا جانیں اس کی۔

چند ہفتوں کے بعد میں نے سنا کہ ایک بار گئی وہ عورت ۔ ۔ ۔ ۔ عورت اس کو لیتے آئی تھی، سینٹ پیٹر کے تہوار کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے سنا کہ جس دن وہ مری ہو گی ہم گھر آیا۔ گھنٹیوں کی آواز میں بستی رہی۔ حالانکہ گرجا اس جگہ سے پانچ میل دور تھا اور آواز بھی نہیں تھی۔ لیکن یا کچھ تھا ہی کہ گھنٹیوں کی یہ آوازیں آ رہی تھیں نہیں آئی۔ مستعار ہی میں لیکن جنت کا نام لینے کی اسے جرأت نہیں ہوئی۔

شیخ محمد اکرام

غالب پر اتھارٹی کی حیثیت رکھتے ہیں

اب وہ

حکیم فرزانہ

کے نام سے

ایک اور معرکۃ الآرا کتاب

پیش کر رہے ہیں

(زیر طبع)

فیروز سنز لاہور

چھبیس اور ایک

(میکسم گورکی)

ترجمہ: انوار حسن ہاشمی

ہم چھبیس تھے ——— چھبیس زندہ مشینیں، جنہیں ایک تہ خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ یہاں ہوا مرطوب اور بوجھل تھی اور جہاں ہم صبح سے شام تک کیک اور بسکٹ بنانے کے لئے آٹا گوندھتے اور خمیر تیار کرتے۔

کھڑکیوں میں سے تہ خانے کے اندر جھانکنے پر یوں نظر آتا کہ جیسے ایک خندق منہ پھیلائے پڑی ہے۔ اس میں اینٹیں ابھری ہیں اور اس پر کائی کی سبزی پھیلی ہوئی ہے۔ کھڑکیوں کے نزدیک ہی باہر لوہے کا جنگلا تھا اور اندر شیشوں پر آٹے کی گرد کی موٹی تہ جمی تھی جس کی وجہ سے شیشے اتنے دھندلا گئے تھے کہ سورج کی روشنی ہم تک نہ پہنچ سکتی تھی۔ کارخانہ کے مالک نے کھڑکیوں پر لوہے کی چادر چڑھا دی تھی تاکہ ہم کسی غریب کو بسکٹ یا روٹی کا ٹکڑا نہ دے سکیں یا اپنے ان بدقسمت دوستوں کی طرف جو بے روزگاری کی وجہ سے مارے مارے پھرتے تھے اور جن پر کئی کئی وقت کے فاقے گزر جاتے کھانے کی کوئی چیز نہ پھینک سکیں۔ کارخانہ کا مالک ہمیں کمینے، الو اور بدمعاش جیسے لفظوں سے یاد کرتا اور دونوں وقت گلی سڑی اوجھڑی کھانے کو دیتا۔

یہ بہت ہی گھٹی ہوئی زندگی تھی جو ہم پتھریلے کے اس تنگ و تاریک حجرے میں بسر کر رہے تھے۔ اس کی چھت جہاں بھورے رنگ کے شہتیروں اور کڑیوں سے پٹی ہوئی اور دھوئیں کی سیاہی میں رنگی ہوئی تھی اور موٹی موٹی دیواروں پر جا بجا پھپھوندی اور کیچڑ جمی ہوئی تھی۔ ہمیں روزانہ صبح کو پانچ بجے اٹھنا پڑتا جبکہ ابھی ہماری نیند بھی پوری نہ ہوئی ہوتی اور ٹھیک چھ بجے ہم بے دلی سے کارخانے کی میز پر بیٹھ جاتے۔ جہاں ہمارے لئے گندھا ہوا آٹا تیار رکھا ہوتا اور ہم اس کے بسکٹ بنانے شروع کر دیتے۔

صبح سے رات کے دس بجے تک کچھ لوگ بسکٹ بناتے اور کچھ گندھے ہوئے آٹے کو پھینٹتے رہتے۔ کچھ لوگ آٹے میں پانی ملا کر گوندھتے اور تمام دن یہی کام آٹومیٹک مشین کی طرح ہوتا رہتا۔ بسکٹوں کو بھاپ میں سینکنے کیلئے دن بھر دیگ میں پانی کھولتا رہتا جس کی مغموم سنسناہٹ تہ خانے کی فضا پر چھائی رہتی۔

ادھر مستری[1] کا بیلچہ تندور میں کھٹ کھٹ کرتا رہتا۔ صبح سے شام تک آتش دان میں لکڑیاں جلتی رہتیں اور کارخانے کی دیواروں پر شعلوں کی سرخ روشنی یوں رقص

---

[1] بسکٹوں کا نانبائی۔

کرتی جیسے ہماری حالت زار پر چپکے چپکے ہنس رہی ہو۔ آتش دان کا دہانہ کسی الف لیلوی بلا کا منہ دکھائی دیتا جس کا دھڑ زمین میں دھنسا اور گردن باہر نکلی ہو اور وہ دہکتی آگ سے بھرا منہ پھیلائے گرم گرم پھنکاریں مار رہا ہو۔ آتش دان پر دو کش کی ہوا کے دو سوراخ اس عفریت کی دو آنکھیں معلوم ہوتے تھے ایسی آنکھیں جو رحم و کرم سے خالی ہوں اور جو برابر ہمارے مشقت طلب کام کی کڑی نگرانی کر رہی ہوں۔ ہمارے سامنے وہ ہمیشہ ایک ہی طرح خلوت و جلوت کی حالت میں کھلی رہتیں جیسے وہ اپنے شکاروں کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی ہوں۔ اور ہم سے انسانیت کی کوئی امید نہ رکھتی ہوں بلکہ ہمیں کامیابی کے احساس کا بد نما داغ سمجھ کر حقارت سے تکا کرتی ہوں۔ مٹی سے ہم گرد و غبار سے بھری ہوئی فضا میں اس کیچڑ میں جو باہر سے پیروں میں لگ آتی اور ہمارے فرش پر پھیل جاتی اور بھاپ کے کثیف اور متعفن بخارات میں بسکٹوں کا آٹا گوندھتے، بیلتے اور بسکٹ بنانے میں مشغول رہتے تھے اور بسکٹوں پر ہمارا پسینہ ٹپکا کرتا۔ اسی لئے ہمیں اس پیشے سے سخت نفرت تھی جو مال ہم بناتے اسے چکھنا بھی گوارا نہ کرتے۔ ساری روٹیوں کے مقابلہ میں ہمیں یہ بسکٹ کبھی پسند نہ آتے۔ بسکٹ بنانے کی لمبی میز پر ہم میں سے بیک وقت اٹھارہ آدمی کام کرتے۔ آمنے سامنے نو ادھر اور نو ادھر۔ ہماری انگلیاں صبح سے شام تک مشین کی طرح چلتی رہتیں۔ ایک عرصہ دراز سے یہی کام کرتے کرتے ہمارے اعصاب اتنے عادی ہو چکے تھے کہ چاہے ہم کچھ سوچ رہے ہوں، کسی طرف کو دیکھ رہے ہوں، کسی سے گفتگو کر رہے ہوں، کام میں کوئی فرق نہ آتا۔ ہم نے ایک دوسرے کو اتنی بار دیکھا اور ہم اتنا ایک دوسرے کے چہرے کی جھریوں اور شکنوں کی خصوصیات تک سے واقف تھے۔ ہم اکثر سارا سارا دن خاموش رہتے اور بعض دفعہ اسی حالت میں کئی کئی دن گزر جاتے۔ ہم کلام ہونے کی نوبت ہم پر اس وقت آتی جب آپس میں تنازع ہو جاتا۔ لڑنے کے لئے ذرا سا بہانہ کافی ہے۔ جو لوگ ایک ساتھ کام کرتے ہوں ان کے لئے اپنے ساتھیوں سے اس کی ترتیب بنانے کا ہر وقت موقع ہے۔ لیکن یہاں تو لڑنے کی نوبت بھی شاذ و نادر ہی آتی تھی۔ اور سارا وقت خاموشی ہی میں گزر جاتا۔ جو شخص نیم مردہ ہو جس کی حالت پتھر کی صورت کی سی ہو اور جس کے احساسات کو کام کے مسلسل دباؤ نے کند کر دیا ہو وہ یقیناً تشریح کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ لیکن خاموشی انہی لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے جو ہر قسم کی باتیں کہہ چکے ہوں اور اب ان کے پاس کچھ کہنے کے لئے نہ رہا ہو۔ جن لوگوں نے شروع ہی سے زبانیں بند رکھی ہوں ان کے لئے خاموش رہنا کوئی بڑی بات نہیں۔ ہاں کبھی کبھی ہم کوئی گیت الاپتے اور یہ اس طرح شروع ہوتا کہ ہم میں سے کوئی کام کرتے کرتے اکتائے ہوئے گھوڑے کی مانند ہنہناتا اور بہت ہی آہستہ اور دھیمے سروں میں کوئی جانا پہچانا مغموم گیت شروع کر دیتا ایسا مغموم گیت جس سے گانے والے کا مقصد مضطرب روح میں تازگی پیدا کرنا ہو سکتا ہے۔ یہ تنہا آواز کچھ دیر تک [illegible] کی طرح جھلملاتا اور بجھ جاتا جیسے سرمئی موسم بہار کی راتوں میں جب سائبیریا کے لق و دق میدانوں پر آسمان ایک خاکستری سائبان کی صورت میں تن جاتا ہے۔ کہیں دور کھیت میں ذرا سی آگ روشن ہوتی ہے اور چند ساعتوں میں بجھ جاتی ہے پھر تھوڑی دیر بعد دوسرے ساتھی کی مغموم آواز ابھرتی اور پہلے کی ہم نوا ہو جاتی۔ یہ دو غمگین آوازیں متوازی شعلوں کی طرح تنور کی دم گھونٹ دینے والی اور گرم ہوا سے ماورا ہو کر لہرانے لگتیں پھر کئی اور گلوں سے [illegible] اور یوں گیت پانی میں پتھر گرنے سے ابھرنے والے دائرے بناتی ہوئی لہروں کی طرح دھیرے دھیرے فضا میں پھیلنے لگتا۔ اس کی آواز بلند تر ہو جاتی اور ایسے معلوم ہوتا جیسے وہ زنداں نما تنور کی بھاری بھرکم دیواروں کو دھکیلتا اور اس کی فضا کو کشادہ کر رہا ہے۔ اسی طرح رفتہ رفتہ ہم چھبیسوں گانے میں مشغول ہو جاتے یہاں تک کہ گیت کی چڑھتی ہوئی تانیں تمام تنور کو گیتوں سے بھر دیتیں جیسے اب تنور کی وسعت مزید لہروں کی متحمل نہیں ہو سکے گی۔ یہ گیت پتھریلی دیواروں سے ٹکراتا، کراہتا، روتا اور ٹھنڈا دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا اور ایک عجیب میٹھی کسک پیدا کرتا۔ پرانے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے اور رگ رگ میں سوز و گداز کی لہر دوڑ جاتی۔ گانے والے سانس کھینچتے اور ٹھنڈی سانسیں بھرتے پھر کوئی گاتے گاتے یکایک رک جاتا اور ساتھی آوازوں کو دل سے غور سے سننے لگتا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس کی آواز ہجوم کی آوازوں کے سمندر میں مل جاتی۔ پھر کوئی ایک آہ سرد بھرتا مراقبہ میں بیٹھے ہوئے صوفی کی طرح آنکھیں بند کئے گیت کی لہروں میں کھو جاتا اور اسی حالت میں پھر گانے لگتا جیسے اس نے اس گیت کو ایک وسیع شاہراہ سمجھ لیا ہو جو بہت دور تک پھیلی ہو اور سورج کی روشنی میں صاف نظر آ رہی ہو۔ اور اس شاہراہ پر وہ اکیلا ہی بڑھتا چلا جا رہا ہو۔

آتش دان کے شعلے لپکتے اور لپکتے رہتے۔ مستری کا بیلچہ اینٹوں کے فرش پر کھڑکھڑا جاتا رہتا۔ کھولتے پانی کی مغموم سنسناہٹ جاری رہتی اور آگ کا عکس دیواروں پر زرد زرد روشنی بکھیرتا رہتا اور ہم لوگوں کی حالت پر چپکے چپکے ہنستا۔ ہم سورج کی روشنی اور ہوا سے محروم چند زندہ مفلس اپنی صورت ناک حالت

اور غلاموں کی سی مقہوریت کا اظہار گیت کے بولوں میں کرتے رہتے۔ زندگی ہمارے کندھوں پر اسی طرح بوجھ بن کر سوار تھی جیسے تہ خانے کی دیواروں پر [illegible]۔

گانے کے علاوہ ہمارا ایک اور شغل بھی تھا۔ نہایت مزیدار شغل۔ جو اس گھٹی ہوئی اور تاریک فضا میں سورج کی کرن کی طرح روشنی اور زندگی کا پیغام لاتا تھا۔ دوسری منزل پر کارچوبی کا ایک کارخانہ تھا جہاں بہت سی لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ انہی میں ایک دوشیزہ تھی جس کا نام ثانیا تھا۔ اس کی عمر مشکل سے سولہ سال کی ہوگی۔ وہ روزانہ سویرے کارخانے کے پھاٹک کی کھڑکی سامنے آ کھڑی ہوتی۔ شیشے پر گلاب سا چہرہ رکھ کر خوشی سے چھلکتی ہوئی نیلی نیلی آنکھوں سے اندر جھانکتی اور کہتی: "مظلوم قیدیو! مجھے تھوڑے سے بسکٹ دے دو!"

اس کی جانی پہچانی دلکش آواز فضا میں گونجتے ہی ہم سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اس کے بھولے بھالے سوالی چہرے کو بڑے پیار سے دیکھتے۔ کھڑکی کے شیشے پر دبی ہوئی چھوٹی سی چپٹی ناک اور تبسم سے کھلے ہوئے ہونٹوں کے درمیان موتیوں جیسے دانت ہمارے لئے روزانہ کا نظارہ ہی گئے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد وہ دروازہ کھولنے کے لئے دوڑتے اور دھکم پیل کرتے اور یہ سعادت حاصل کرنے کی خاطر ہم میں سے ہر ایک یہ چاہتا کہ سب سے پہلے اچھل کر دروازے تک پہنچ جائے۔ دروازہ کھول دیا جاتا اب وہ دہلیز پر کھڑی ہو جاتی۔ ہنستی مسکراتی، ایپرن کا دامن ہاتھوں میں تھامے اور اسی طرح مسکراتی اس کی پیلی سنہری لٹیں کندھوں سے گزر کر سینے پر لٹکتی جاتیں۔ اور ہم میلے کچیلے حبشیوں جیسے آدمی جن کا بخت ان کے جسم اور لباس کی طرح سیاہ تھا نیچے کھڑے اس کا منہ دیکھا کرتے۔ دہلیز فرش سے تقریباً چار فٹ بلند تھی اور اس کا وصل چار سیڑھیوں کے ذریعے ہوتا تھا اس لئے ہمیں ثانیا کو دیکھنے کے لئے اپنے سروں کو ذرا پیچھے اور اوپر اٹھانا پڑتا تھا۔ ہمیں اس کے صبح کے سلام کی ادا بے حد پسند تھی اور ہم اس سے ہمیشہ ایک خاص انداز میں گفتگو کیا کرتے۔ اس موقع پر ہمارے الفاظ ایک نیا رنگ اختیار کر لیتے۔ ہماری آوازوں میں بجائے کھردرے اور بھدے پن کے ایک نرمی اور انکساری پیدا ہو جاتی اور مذاق بھی عامیانہ سطح سے ابھر کر شائستہ سا رنگ اختیار کر لیتا اور یہ سب ہمارے ارادوں کے بغیر خود بخود ہی صرف ثانیا کی خاطر۔ مستری تنور میں بیلچہ ڈال کر خوب سکے ہوئے لال لال بسکٹ نکالتا اور ثانیا کے دامن میں پھینک دیتا۔

"ہوشیار رہنا کہیں مالک نہ دیکھ لے!" یہ ہدایت ہم ہمیشہ ثانیا کو کیا کرتے اور وہ شرارت سے ہنس کر جواب دیتی: "اچھا خدا حافظ قیدیو!" پھر ایک دم ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی۔

اس کے جانے کے بعد بہت دیر تک ہم اس کی باتیں کرتے رہتے۔ صبح سے شام تک یہی ایک وقت ہوتا جب ہم محبت سے ہم کلام ہوتے۔ روزانہ تقریباً ایک ہی انداز کی گفتگو ہوتی اس گفتگو کے تکرار اور یکسانی میں کبھی فرق نہ آیا۔ اور فرق آتا بھی کیسے جبکہ ثانیا ہم اور ہمارے گرد و پیش ہر چیز اسی طرح یکساں اور متواتر تھی۔ انسان کے لئے ایسی جگہ رہنا جہاں کوئی تبدیلی نہ ہو جہاں آس پاس ہر چیز یکساں ہو بڑی ہی دردناک حقیقت ہے خاص کر ایسی حالت میں جبکہ اس ماحول کے ہاتھوں اس کی روح بالکل فنا نہ ہو چکی ہو اور اس میں احساس کا ایک شائبہ باقی ہو۔ ماحول کا جمود نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے کیونکہ زندگی کے ساتھ ساتھ اس جمود کا احساس روز بروز تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے۔

عورتوں کے بارے میں ہم نے سیکڑوں دفعہ آپس میں باتیں کیں اور ہمیشہ ان کے لئے نہایت نازیبا الفاظ ہماری زبانوں پر آ جاتے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات اپنی بدزبانی پر خود ہمیں بھی ندامت محسوس ہوتی۔ یہ بات بھی تھی کہ جن عورتوں کو ہم جانتے تھے وہ اس قماش کی تھیں کہ ان کے لئے کسی اچھے انداز میں اظہار خیال کی گنجائش ہی نہ تھی لیکن ثانیا کے متعلق ہم نے کبھی غیر مہذب روش اختیار نہیں کی۔ نہ کسی نے اس کے لئے برے الفاظ زبان سے نکالے نہ اس طرح بے باکی سے گفتگو کی جرأت کی کہ دوسرے ساتھیوں کے مقابلہ میں بے تکلف ظاہر ہو۔ شاید یہ وجہ ہو کہ وہ ہمیں زیادہ دیر ٹھہرتی نہ تھی ہماری نظروں کے سامنے وہ ٹوٹتے تارے کی مانند نمودار ہو کر جھلملاتی اور غائب ہو جاتی لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ کم سن اور حسین تھی اور حسن خواہ کہیں بھی ہو ہر طبقے کے لوگوں میں بے حد احترام پاتا ہے۔ اس کے علاوہ اگرچہ اس کٹھن زندگی نے ہمارے احساسات اور جذبوں کو اس حد تک پامال کر دیا تھا کہ ہم جانوروں کی سطح کے قریب پہنچ چکے تھے تاہم ابھی ہم میں انسانیت کی رمق باقی تھی اور انسانی فطرت

کے علاوہ کسی کی پرستش کرنے کی خواہش بھی ہم میں موجود تھی۔ اس خواہش کے تحت رنگ مختلف پیرایوں میں مختلف چیزوں کو پوجتے ہیں ہم نے تانیا کو اپنا معبود بنا لیا تھا وہ ہماری روح کا ایک حصہ تھی جب تک اس کے دیدار سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی نہ ہو جائیں دل کو چین نصیب نہ ہوتا ہماری نظر میں دنیا کی کوئی چیز اس سے بہتر نہ تھی۔ یہ بات بھی تھی کہ کارخانے کی اس پوری زندگی میں صرف تانیا ہی ایسی ہستی تھی جس نے ہم خاص لوگوں کو دل دیا تھا بھی تھا اور وہ سب سے بڑا فخر ہمارا یہی تھا کہ ہم اس کی خدمت گزار کر رہے تھی۔ بیچنے کا کوئی راستہ اور کبھی بہت سے لوگ تھے لیکن ہمیں کوئی ایسا آدمی یاد نہیں پڑتا جس کے رویہ سے کبھی یہ ظاہر ہوا ہو کہ ہم نے کارخانے کے مزدوروں سے بھی کوئی دلچسپی ہے۔ ہم سب تانیا کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ بسکٹوں کے حیرت انگیز کا ذرہ ذرہ ہے۔ سب بڑی بے چینی سے اس کے منتظر رہتے اور تازے تازے گرم گرم بسکٹ اس کی خدمت میں پیش کرتے۔ یہ کام ہمارے لئے مقدس فرض کے برابر تھا۔ وہ محبت کی دیوی تھی اور ہم پجاری بن گئے والا میں پہلے سے زیادہ اس کا خلوص گرمجوش ظاہر ہوا تھا۔ بسکٹوں کے علاوہ ہم تانیا کو بعض مفید مشورے بھی دیتے مثلاً "تانیا یہ کپڑے جو تم پہنے ہو کافی گرم نہیں ہیں۔ ذرا زیادہ گرم کپڑے پہنا کرو۔ سیڑھیاں چڑھتے میں جلدی مت کیا کرو۔ لکڑیوں کے بھاری بھاری گٹھے نہ اٹھایا کرو" وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ مشورے ہنسی سے سنا کرتی اور جواب میں بس ایک قہقہہ لگاتی۔ جس کی گونج میں ہماری تمام ہدایات دب کر رہ جاتیں۔ اس لئے کہ تانیا نے کبھی ہمارے ان مشوروں پر عمل نہیں کیا تھا لیکن ہمیں اس پر افسوس کی کوئی وجہ نہیں۔ ہمارا مقصد صرف اسے یہ جتانا تھا کہ ہم اس کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔

کبھی کبھی وہ ہم سے مختلف کاموں کے لئے کہتی مثلاً آتے اور جاتے تہ خانہ کا بھاری دروازہ کھولنے کے لئے کہتیں یا کبھی لکڑیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر دینے کی فرمائش کرتی اور ہم بڑی خوشی اور فخر کے ساتھ اس کا ہر حکم بجا لاتے۔

لیکن جب ایک دفعہ ہمارے ایک ساتھی نے اس سے اپنی اکلوتی قمیص پر رفو کرنے کو کہا تو اس نے نفرت سے ناک سکیڑ کر جواب دیا تھا "اور ہو گئی! اور تم سمجھتے ہو میں ایسے ہی فضول کاموں کے لئے ہوں"۔

اور ہم سب اپنے اس سادہ لوح ساتھی پر خوب ہنسے تھے اور اس دن کے بعد سے کسی نے تانیا سے کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ ہم اس سے محبت کرتے ہمارے لئے بس اتنا ہی کافی تھا۔ جہاں محبت ہوتی ہے وہاں محبوب اور عشق کی راہیں بھی خود بخود کھلتی جاتی ہیں اور اس کے تحت بسا اوقات انسان محبوب کی ذات سے ایسی دور از کار توقعات وابستہ کر لیتا ہے کہ بسا اوقات محبوب کی شخصیت اور محبت دونوں چکنا چور ہو جاتے ہیں کبھی وہ اپنے ساتھیوں اور ہمسایوں کی زندگی میں بھی اس بار پر زہر گھول دیتا ہے کہ جو اس کا منظور نظر ہے۔ اس کے دوست اور ساتھی بھی اس کا احترام کیوں نہیں کرتے۔ ہم تانیا کی محبت میں اس لئے گرفتار ہوئے تھے کہ ہمارے لئے اظہار محبت کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا اور اب ہم یہ بھی جانتے تھے کہ ہر شخص اس میں اچھائیاں ہی دیکھے۔

کبھی کبھی ہمارا کوئی ساتھی اس قسم کا استفسار آہستہ آہستہ شروع کر دیتا کہ ہم اس کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں کس لئے اس کے ساتھ خوشامد کرنے کے وسیلے ہیں آخر اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے کہ ہم نے اس کے بارے میں خواہ مخواہ ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے لیکن ایسی کہنے والے کے فقرے پورے بھی نہ ہو پاتے کہ سب اسے ڈپٹ کر خاموش کر دیتے تانیا ہماری محبت کا واحد مرکز تھی اور ہم چاہتے تھے کہ وہ ہر قسم کی نکتہ چینیوں اور حماقتوں سے پاک رہے کیونکہ وہ ہمارے لئے ایک مقدس مورتی کی طرح قابل تعظیم و تکریم تھی اس معاملہ میں ہمارے جذبات اس قدر انتہا کو پہنچے ہوئے تھے کہ جو بھی اس کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نکالتا وہی ہمارا دشمن ہو جاتا۔

اس بسکٹ فیکٹری کے علاوہ کارخانے کے مالک کی ایک اور بیکری بھی تھی جو اسی کارخانے کے ایک حصہ میں واقع تھی۔ دونوں کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ بیکری میں چار آدمی کام کرتے تھے یہ چاروں ہم سے کھنچے کھنچے رہتے کیونکہ وہ اپنے کام کو ہم سے بہتر اور صاف ستھرا خیال کرتے اور اپنے کو بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ وہ ہمارے کارخانے میں کبھی نہ آتے اور جب کبھی ان سے باہر میدان میں ملاقات ہوتی تو وہ ہماری زندگی اور کام کا مذاق اڑاتے ہم بھی ان سے ملنا پسند نہ کرتے تھے اس کے علاوہ مالک کی یہ ہدایت تھی کہ ہمارا کوئی آدمی بیکری میں نہ جانے پائے کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ ہم وہاں سے کیک اور پیسٹریاں چرا لیں گے۔ اس کی دوسری وجہ [illegible]

بیکری والوں سے دوستی پیدا کرنے کا خیال کبھی ہمارے دل میں نہ آیا۔ ہمیں ان سے حسد تھا کیونکہ ان کا کام ہم سے آسان تھا۔ انہیں ہم سے زیادہ معاوضہ ملتا اور کھانے کو بھی اچھی اچھی چیزیں میسر آتی تھیں۔ ان کا کارخانہ ہم سے زیادہ صاف اور روشن تھا اور ان کے جسم اور لباس کی حالت ہم سے بہتر لگتی تھی۔ صفائی اور صحت میں وہ ہمارے برعکس تھے ہم سب زرد رو تھے۔ تین کی صحت خراب تھی کچھ دق کا استقبال کرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے ایک کو گٹھیا نے اپاہج کر رکھا تھا بیکری کے ملازم تعطیلات کے موقعوں پر اور فالتو اوقات میں بڑی سج دھج سے اوورکوٹ اور چرچر کرتے ہوئے بوٹ پہنتے ان میں سے دو کے پاس اکارڈین کا باجا اکثر بجتا بھی تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے ان کی ٹولیاں پارک میں گھوما کرتیں۔ ہم لوگ جب باہر نکلتے اور ادھر ادھر جاتے تو ہمارا لباس کارخانے کے لباس سے کچھ ہی بہتر ہوتا پاؤں میں پھٹے پرانے بوٹ یا چمڑے کے سلیپر ہوتے۔ یہ بھی خستہ حالی کے ہوتے۔ پولیس ہمیں پارک میں گھسنے نہ دیتی۔ اتنے عظیم تفاوت کے باوصف ہم بیکری والوں سے ملاپ کیسے پیدا کرسکتے تھے۔

چند روز بعد معلوم ہوا کہ ان کا ہیڈ بیکر شراب پیتا ہوا پکڑا گیا جس کی پاداش میں مالک نے اسے ملازمت سے برطرف کر دیا ہے اور اس کی جگہ ایک اور آدمی رکھ لیا ہے یہ نووارد ایک فوجی تھا۔ وہ کارخانے سے باہر جب بھی جاتا قیمتی ساٹن کی صدری زیب تن کرتا اور کبھی طلائی زنجیر بھی پہنتا۔ ہمیں اس کا شوقینانہ رکھ رکھاؤ بہت پسند آیا اور ہم اس سے ملنے کی خواہش کرنے لگے اسی خیال سے ہم سب باری باری صحن میں جاتے رہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی دعا سلام ہو جائے اور راہ و رسم کا سلسلہ شروع ہو۔

ایک روز وہ خود ہی ہمارے کارخانے میں چلا آیا اس نے ٹھوکر مار کر دروازے کا پٹ کھولا اور اسے کھلا چھوڑ کر دہلیز میں کھڑا ہو گیا اور ہماری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولا " خدا تمہیں سلامت رکھے میرے بچو! سلام " برف سے لدی ہوئی ہوا کثیف بادلوں کی صورت میں دروازے میں گھسی اور اس کے پاؤں سے لپٹ کر دہلیز میں چکر کھانے لگی وہ دہلیز میں ہی کھڑا ہماری طرف دیکھتا رہا۔ ہماری جگہ نیچی تھی اس لئے اس کی بڑی بڑی تاؤ دار مونچھوں کی اوٹ میں سے پیلے پیلے دانت نمودار ہو رہے تھے۔ اس وقت وہ نیلے رنگ کی ایک قیمتی واسکٹ پہنے ہوئے تھا جو واقعی خاص کاریگری معلوم ہوتی تھی۔ اس پر زردوزی کے پھول اور جا بجا شہاب ثاقب کی طرح چمکتی ہوئی کلیاں کاڑھی گئی تھیں۔ اس کے بٹن ننھے ننھے نگینوں سے بنائے گئے تھے اور ان میں سونے کی زنجیر پڑی تھی۔

وہ قبول صورت اور چھبیلا تھا جیسے ایک سپاہی کو ہونا چاہئے۔ گٹھا ہوا مضبوط جسم انگارا سے رخسار، بڑی بڑی روشن آنکھیں جن سے خلوص اور نرمی عیاں تھی۔

وہ ایک سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھا جس کا آہار کلف دار چست اور ہموار تھا۔ اس کے پالش سے چمکتے بوٹوں پر روشنی کا عکس سفید ستاروں کی طرح نمودار تھا۔

مستری نے اس سے کہا " مہربانی کر کے دروازہ بند کر دو "

اس نے دروازہ بند کر دیا اور اندر آ گیا۔ اور ہم سے کارخانے کے مالک کے بارے میں مختلف سوالات پوچھنے لگا۔

اس موضوع پر ہمارے دماغوں میں اتنا مواد موجود تھا کہ وہ ایک بات پوچھتا اور ہم سب بیک زبان جواب دیتے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔ ہم نے اسے بتایا کہ مالک غریبوں کا خون چوستا ہے ہمارے ساتھ غلاموں کا سا سلوک کرتا ہے بڑا ہی اذیت پسند ہے غرض اسی طرح کی کئی باتیں جو ہمارے دلی احساسات کی آئینہ دار تھیں اس وقت برجستہ زبانوں پر آ گئیں۔ فوجی نے انہیں غور سے سنا۔ اپنی تابدار مونچھوں کو تاؤ دیا اور ہمیں نرم نرم نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

پھر وہ اچانک بولا " کیوں بھئی آج کل تمہارے آس پاس کچھ چھوکریاں بھی موجود ہوں گی ؟ "

کئی ادب کے ساتھ ہنسے کسی نے کھسیانا منہ بنا لیا اور ایک نے بالکل صاف صاف کہہ دیا کہ یہاں آس پاس درجنوں چھوکریاں ہیں۔

" تو کیا وہ تمہیں تفریح کے لئے مل جاتی ہیں ؟ " فوجی نے آنکھ مارتے ہوئے پوچھا ؟ ہم پھر ہنس پڑے اور ہمارے چہروں پر کشمکش سی نمودار ہوئی۔ ہمارے کئی ساتھی فوجی کو یہ جتانا چاہتے تھے کہ وہ معاملات عشق و محبت میں اس سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ لیکن کسی نے صاف صاف یہ بات نہیں کہی۔ ایک نے ڈرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا۔ " کیوں نہیں، ہمیں بیٹھے بیٹھے . . . . "

"لیکن تم جیسے لوگوں کے لئے یہ بڑا ہی دشوار مسئلہ ہے،" فوجی نے بڑے رندانہ انداز میں کہا۔ اور ہمیں گھورتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "تمہیں پہلے اپنی حالت سدھارنی چاہئے جس حالت میں تم اس وقت ہو وہ ہرگز تمہیں کامیاب نہیں کر سکتی۔ تم بڑے بدنصیب لوگ ہو۔ کامیابی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ اس راز کو سمجھنے پر منحصر ہے کہ عورت کے لئے ظاہر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ عورتیں ہمیشہ اس شخص کو پسند کرتی ہیں جو اپنے آپ کو نوک پلک سے درست رکھے۔ مرد کو مردانہ حسن کا مظہر ہونا چاہئے کہ یہ بڑی صحت اور جیت ہو۔ دیکھئے! اس کے علاوہ عورت جسمانی طاقت اور صحت کا بھی بہت احترام کرتی ہے۔ مردانہ کلائی کا تمہارے نزدیک کیا ہے؟"

پھر اس نے اپنا دایاں ہاتھ جیب سے نکالا قمیص کی آستین کہنی تک چڑھائی اور اپنی کلائی برہنہ کر دی یہ واقعی ایک آہنی اور تنومند کلائی تھی۔ سرخ سپید رنگ اور چمکیلے سنہرے بالوں سے ڈھکی ہوئی۔

"ٹانگوں اور سینے کو بھی ایسے ہی سمجھو۔" وہ بھی ایسے ہی تنومند اور توانا ہیں۔ "اور یاد رکھو کہ آدمی کا لباس بہت باوضع ہونا چاہئے۔ اور اس کے پاس عمدہ عمدہ چیزیں ہونی چاہئیں۔ مجھے دیکھو تمام عورتیں مجھ پر مرتی ہیں۔ میں انہیں کبھی اپنے پاس نہیں بلاتا انہیں کبھی لفٹ نہیں کرتا۔ لیکن وہ مجنوں کی طرح مجھ پر پروانہ وار گرتی ہیں۔" وہ آٹے کے ڈھیر پر بیٹھ گیا اور کافی دیر تک ہم سے یہی بحث کرتا رہا کہ عورتیں کیسے مردوں سے ملنا چاہتی ہیں اور کس جرأت کے ساتھ ان سے قرب پیدا کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ چلا گیا۔ دروازہ چرچرایا اور اس کا تعاقب کرتے ہوئے بند ہو گیا۔ ہم کافی دیر تک خاموش رہے۔ ہم اسی کی ذات کے بارے میں سوچتے رہے تھوڑی دیر بعد ہم سب اچانک بول پڑے اور اس کے عجیب و غریب طرزِ گفتگو پر قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ مختصر سی بحث کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ ایک دلچسپ کافی بے تکلف اور زندہ دل آدمی ہے جب بھی تو وہ ہمارے پاس سیدھا اندر چلا آیا اور جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا اور اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے برسوں کا شناسا ہو۔ اس سے پہلے اتنے دوستانہ انداز میں کسی نے ہم سے گفتگو نہیں کی تھی۔ ہم یہی باتیں کرتے رہے کہ وہ کیسا عجیب و غریب آدمی ہے اور کارچوبی کے کارخانے کی لڑکیوں کے ساتھ اس کا مستقبل کیا ہو گا یہ لڑکیاں جب بھی ہمیں میدان میں ملتیں تو ہماری طرف دیکھ کر کبھی نفرت سے ہونٹ چبا دیتیں۔ کبھی ہم سے بہت ہی کترا کر نکل جاتیں یا اس شان بے اعتنائی سے گزر جاتیں کہ جیسے ان کے نزدیک ہمارا وجود کوئی چیز ہی نہیں۔ بہرحال جب بھی وہ ہمیں ملتیں ہم آنکھیں مزے سے سینک لیتے اور یہی ہماری سب سے بڑی تفریح تھی۔ یہ لڑکیاں سردیوں میں کمخواب و مخمل کی چھوٹی چھوٹی ٹوپیاں اوڑھتیں۔ سمور کا جامہ زیب تن ہوتا گرمیوں میں وہ بسنتی چھینٹ کی خوبصورت پوشاک پہنے ہوتے اور ان کے ہاتھوں میں رنگ برنگ کی چھوٹی خوبصورت چھتریاں ہوتیں جب ایسے میں ہم ان کا ذکر کر بیٹھتے تو اس انداز میں کرتے گویا وہ سب کچھ سن رہی ہیں۔ ابھی ان کے کان میں بھنک پڑ جائے گی تو وہ شدید غضب سے دیوانی اور شرم و ندامت سے پانی پانی ہو جائیں گی۔

"لیکن تانیا کا کیا بنے گا۔ مجھے تو امید نہیں کہ وہ غریب اس فوجی کی بوالہوسی سے محفوظ رہے گی۔" مستری نے بڑے افسردہ لہجہ میں کہا۔ ہمیں ان الفاظ نے اتنا متاثر کیا کہ سب پر خاموشی طاری ہو گئی۔

ہم تانیا کو قریب قریب بھول ہی گئے تھے ——— گویا فوجی اپنے حسین و جمیل خدوخال دکھا کر تانیا کو ہم سے بہت دور لے گیا تھا۔ ذرا دیر بعد اس معاملہ پر گرم بحث ہونے لگی بعض کہتے تھے کہ تانیا اپنے آپ کو ہرگز لوٹ نہ ہونے دے گی کچھ اس پر مصر تھے کہ وہ فوجی کے ٹھاٹ باٹ اور ہوس کاری کے مقابلے میں ثابت قدم نہیں رہ سکتی آخر میں ایک تیسرے گروہ نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اگر تانیا کے بارے میں فوجی کے ارادے ذرا بھی برے ہوئے دکھائی دیں۔ تو ہم اس کی پٹائی بھی کر دیں گے۔ بہرحال یہ جھگڑا اسی پر ختم ہوا کہ تانیا اور فوجی کی نگرانی کی جائے۔ اور تانیا کو اس کے خطرناک رجحان سے خبردار کر دیا جائے۔

ایک مہینہ گزر گیا فوجی اپنی بیکری میں اعلیٰ کیک اور کریم رول بناتا۔ کارخانہ کی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہا اور ہمارے کارخانے میں اکثر آتا۔ لیکن اس نے لڑکیوں کو جیت لینے کے بارے میں پہلی دفعہ کے بعد کبھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اب وہ مونچھوں پر تاؤ دیتا اور چٹخارے لے کر ہونٹ چاٹا کرتا۔

تانیا حسب معمول صبح سویرے بسکٹ لینے آتی اور خوش دکھائی دیتی۔ ہم لوگوں کے ساتھ اس کی پرخلوص اور شریفانہ محبت اسی طرح قائم تھی ہم نے کئی مرتبہ اس سے فوجی کے بارے میں باتیں کرنی چاہیں لیکن وہ اسے "ایک بوڑھا بچھڑا" یا اسی طرح کے مضحکہ خیز ناموں سے یاد کیا کرتی جس سے ہمیں پختہ یقین ہو گیا کہ وہ فوجی کے دام

میں آنے والی نہیں۔ ہم دیکھتے کہ کارخانہ کی دوسری لڑکیاں بے انتہا مار فوزی کے گرد پھرتی تھیں لیکن ثانیہ اسے منہ نہیں لگاتی۔ اس بات پر ہمیں بڑا فخر تھا۔

ثانیہ کا رویہ وقار اور سنجیدہ تھا ہم سب کے حوصلے بڑھاتا رہا۔ ہم خود کو ثانیہ کا ہیرو سمجھنے لگے اور فوزی کا وقار بھی اب ہماری نظر میں گر گیا۔ اب ہمیں ثانیہ پہلے سے بہت زیادہ عزیز تھی۔ آفس سے روز وہ ملاقاتیں ہوتیں۔ لیکن اب ان ملاقاتوں میں ہمارے لئے زیادہ دلکشی خوشی اور آسودگی شامل ہو گئی تھی۔

ایک روز فوزی ہمارے پاس آیا وہ بہت چپکے ہوئے تھا اسی وجہ سے وہ قد سے مختلف دکھائی دیتا تھا وہ ایک دم بیٹھ گیا اور ہنسنے لگا اور جب ہم نے اس سے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو بولا۔

" دو چھوکریاں لڑتی اور گرتی دیکھ کر لئے آپس میں لڑ پڑیں انہوں نے ایک دوسرے کو خوب خوب گالیاں دیں۔ ہا ہا ہا! ایک نے دوسری کے بال پکڑ لئے اور چیخ رہی دونوں دھڑام سے زمین پر گر پڑیں۔ کبھی شکو گرتی کے سینہ پر چڑھ بیٹھتی کبھی گرتی شکو کو چت کر دیتی۔ ہا ہا! دونوں نے خوب ایک دوسرے کے منہ نوچے اور دونوں خوب زخمی ہوئیں اور میرا ہنسی کے مارے برا حال ہو گیا۔ میں کبھی کبھی سوچا ہوں کہ عورتیں آپس میں یا مرد؟ کیوں نہیں لڑتیں وہ ہمیشہ نوچ کھسوٹ ہی کیوں کیا کرتی ہیں؟ ہا ہا ہا!

وہ ایک بینچ پر بیٹھا تھا بڑا پر امید اور صحت مند دکھائی دیتا تھا اور ہنسے جا رہا تھا۔ ہم خاموش تھے۔ اس وقت وہ ہمیں نہ جانے کیوں بڑا بھلا لگ رہا تھا۔

" نہیں! میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ عورتوں کے معاملے میں ہی خدا نے ایسی عجیب اور بد قسمت کیوں بنائی ہے۔ دوسری بے شمار کتابوں اور واہموں ہو جاتی ہیں۔ یہ تو ایک خاص مصیبت ہے۔ اس کے سرخ سپید بازو فضا میں اوپر اٹھے اور ایک زور دار چٹخے کے ساتھ اس کے گھٹنوں پر جا لگے پھر وہ ہماری طرف پلٹے اور ہنسنے کے ساتھ اس طرح متوجہ ہوا جیسے عورتوں کے معاملے کی فراوانی سے وہ دیکھ لیا ہو۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ خوشی سے دمکتا رہا۔ اور وہ زور زور سے اپنے ہونٹ چاٹتا رہا۔

منتری نے پیچ کو تنور میں ڈال کر زور سے حرکت دی جیسے جذب عیش میں ہو پھر وہ دفعتاً مسکرایا اور بولا صنوبر کے نیچے ہونے کا اشارہ جیسا کوئی بڑی بات نہیں ہے ہاں جب شکو وہاں گر پڑی درخت ہی چلا ہو اس وقت کوئی اسے گرا دے تو بات ہے۔

فوزی نے پوچھا۔

کیا تمہارا اشارہ میری طرف ہے؟

ہاں تمہاری طرف ہے۔

تمہارا مطلب؟

کچھ نہیں کوئی خاص بات نہیں۔

نہیں نہیں مجھے بھی بتاؤ کہ وہ صنوبر کے درخت والی بات کیا ہے؟

منتری نے کوئی جواب نہ دیا اور تنور سے بسکٹ نکالنے میں پھر مشغول ہو گیا جو بسکٹ تیار ہوتے رہے انہیں نکال نکال کر تنور سے فرش پر دونوں کے آگے ڈالتا رہا انہیں چٹائی پر قطاروں میں رکھتے جاتے۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ فوزی کو اور اپنے اور اس کے معاملہ کو بھول چکا ہے لیکن فوزی ایک تیز ہو گیا وہ اٹھا اور تیز قدموں سے اس کی طرف اس تیزی سے لپکا کہ بیلچہ کا دستہ اس کے سینے میں ٹکرا گیا۔

" ادھر دیکھو! اب کہو تمہارا کیا مطلب ہے " تم نے میری توہین کی ہے مجھے کسی عورت کے آگے آج تک شکست نہیں اٹھانی پڑی۔ اس پر بھی تم میری شان میں اس قسم کے ہتک آمیز فقرے استعمال کرتے ہو۔

وہ واقعی غضب ناک دکھائی دے رہا تھا۔ عورتوں کو جیتنے کی صلاحیت کے سوا اسے اپنی ذات میں کوئی اور قابل ذکر وصف نظر نہ آتا تھا۔

شاید اس کے علاوہ اس کی ذات میں زندگی کا کوئی اور جوہر تھا ہی نہیں۔ وہ محض اسی وصف کے سہارے خود کو زندوں میں شمار کرتا تھا۔

بعض لوگ اپنے کسی جسمانی یا نفسیاتی مرض کو عزیز ترین شے کی طرح زندگی بھر پالتے پوستے رہتے ہیں اور صرف اسی کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ گو وہ اس کی بدولت طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں تاہم یہ ان کے لئے ہوا اور پانی کی طرح ضروری ہوتی ہے وہ دوسرے لوگوں سے مختلف ہو رہے ہیں اس کا اظہار کرتے ہیں اور اسی کے ذریعے خود کو اپنے ہم چشموں کی توجہ کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ وہ اُسے ہمدردی حاصل کرنے کا ایک آلہ قرار دے بیٹھتے ہیں اس سے علاوہ ان کا وجود کچھ نہیں رہتا۔ اگر آپ ان کا علاج کر کے اس بیماری کو ان سے جدا کر دیں تو آپ دیکھیں گے کہ وہ زندگی کی مسرت ہی سے محروم ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ ان کے نزدیک جو اصل حیات تھی وہ آپ نے ان سے چھین لی۔ اس وقت وہ بالکل کھوکھلے دکھائی دینے لگیں گے بعض اوقات انسان کی زندگی اس حد تک مفلس و قلاش ہوتی ہے کہ وہ کسی دکھ یا معصیت ہی کو گراں مایہ چیز سمجھ لیتا ہے۔ اور اسی کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ اسی طرح اکثر لوگ معمولی برائی کو ترقی دے کر سنگین مجرم بن جاتے ہیں۔

فوجی کو بُری طرح غصہ آ رہا تھا۔ وہ مستری کی طرف لپکا اور گرج کر بولا صاف صاف بات بتاؤ! کون ہے وہ؟

صاف صاف بتا دوں؟

ہاں ہاں بالکل!

"تم جینی کو جانتے ہو؟"

"خوب اچھی طرح۔"

"تو پھر میدان میں آؤ اور اس کے لئے کوشش کرو"

"میں؟"

"ہاں تم"

"اونہہ یہ کونسی بڑی بات ہے۔"

"آخر ہم بھی دیکھیں۔"

"تم دیکھو گے!!"

"وہ تمہاری منتظر ہے۔"

مجھے ایک مہینے کی مہلت دو!

"یار تم کتنی شیخیاں مارتے تھے۔"

اچھا صرف پندرہ دن کی مہلت دے دو میں تمہیں دکھا دوں گا کہ اس بیچاری کی کیا ہستی ہے بڑی آئی کہیں کی اونہہ۔

"اچھا جاؤ منظور ہے۔"

پندرہ دن۔ ایک دن۔ صرف پندرہ دن! بس سمجھو کہ یہ کام ہو گیا!"

"ہاں ہاں اب یہاں سے چلے جاؤ"

مستری کا مزاج ایک دم برہم ہو گیا اور اس نے تندور میں ایندھن تیزی سے جھونکنا شروع کر دیا۔ فوجی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا اور ہم سے بھی کوئی بات نہ کی تھوڑی دیر بعد اس نے بڑی عجیب متانت کے ساتھ کہا۔ "بہت خوب" اور باہر چلا گیا۔

اس بحث کے دوران میں سب خاموش رہے جب فوجی چلا گیا تو یکایک ہم سب بول اٹھے۔

"ہاں! تم نے بہت ہی اچھا مشغلہ چھیڑ دیا۔"

"جاؤ جاؤ کام پر بیٹھو" مستری نے تنک کر جواب دیا۔

ہمیں محسوس ہوا کہ زیبی پوری طاقت سے اس مہم کو شروع کرے گا۔ اور ثانیا خطرہ میں ہے۔ ہمارے ذہنوں پر ایک ناخوشگوار تجسس چھا گیا اب کیا ہوگا۔ کیا ثانیا اس زیبی کے مقابلہ میں ثابت قدم رہ سکے گی اور قریب قریب سب کے سب بیک زبان پکار اٹھے۔

"معصوم ثانیا ضرور ثابت قدم رہے گی۔"

وہ بت جسے اپنی آرزوؤں کے صنم کدے میں ہم نے انتھک محنت و کاوش کے بعد تلاش کر نصب کیا تھا۔ اب ہمارے دل میں اسے خود ہی ایک بڑی زک دے کر توڑ ڈالنے کی خوفناک خواہش ابھر آئی تھی۔ ہم اسی مسئلہ پر دیر تک بحث کرتے اور ایک دوسرے پر بڑے جوش و خروش سے یہ ثابت کرتے رہتے کہ ہمارا بت کسی طاقت سے ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اس مقابلہ میں ثانیا ہی فتح مند ہوگی۔ چند روز بعد ہمیں یہ احساس ہوا کہ شاید زیبی اس معرکہ اور اس دن کے جھگڑے کو بھول ہی گیا ہے۔ اور ہمیں اس کی خود پسندی کو مہمیز کرنے کے لئے پھر کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ کیونکہ اس کے بعد اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ اس مہم کو چلانے کے لئے کچھ کر رہا ہے۔ اس دن سے ہماری زندگی میں ایک خاص تناؤ اور کشاکش شروع ہو گئی جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ اب ہم اس مسئلہ پر جھنجلایا کرتے اور بحث کرتے وقت اکثر لڑ پڑتے اس لئے کہ ہر شخص اپنے آپ کو زیادہ دانش مند سمجھتا تھا۔ ہم نے ایک شیطانی کھیل کی بنا ڈال دی تھی۔ اور ہماری بے چینی کا واحد سہارا ثانیا تھی۔ اور جب ہم نے بیکری کے دوسرے ملازموں سے یہ سنا کہ زیبی نے ثانیا کا پیچھا کرنا شروع کر دیا ہے۔ تو ہمارے کرب و اضطراب کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان دنوں ہمیں یہ بھی محسوس ہوا کہ کارخانہ کا مالک پیچھے پیچھے ہمارے جوش و خروش سے خوب فائدہ اٹھا رہا ہے اور اس نے ہماری کارکردگی میں ۱۰۰ پونڈ آٹے کا اور اضافہ کر دیا ہے۔ قریب قریب ہم سارا وقت اسی کام میں جٹے رہتے اور ثانیا کا نام ایک لمحہ کو بھی ہماری زبان سے جدا نہ ہوتا۔ اب ہم بے حد ایک نئے اضطراب کے ساتھ اس کا انتظار کیا کرتے اس معرکہ کے متعلق جو بیکری کے ملازموں کے بیان کے مطابق شروع ہو چکا تھا ہم نے ثانیا سے کبھی کوئی بات نہ کی اس سے کوئی سوال نہ پوچھا اور اسی طرح خلوص اور ملاطفت کے ساتھ پیش آتے رہے تاہم ان دنوں غیر محسوس طور پر ہم میں ایک نئی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور وہ تھی ایک بے جا سا تجسس، نشتر کی طرح تیز۔

"دوستو! آج وقت پورا ہو چکا" مستری نے ایک روز صبح کو اعلان کیا۔ اس کی یاددہانی کے بغیر بھی ہمیں اس بات کا علم تھا۔ لیکن جب اس نے یہ اعلان کیا تو نہ جانے کیوں پھر بھی سب لرز اٹھے۔

پھر مستری نے کہا: "وہ ابھی ابھی آتی ہوگی۔ آج ذرا غور سے اس کا جائزہ لینا۔"

پھر کوئی درد بھری آواز میں بولا۔

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے آنکھیں ہر چیز کو دیکھ سکتی ہیں۔"

پھر ہمارے درمیان ایک ہنگامہ خیز بحث شروع ہو گیا۔

آج سب یہ جاننے کے لئے بیتاب تھے کہ اس بتاں خانہ میں ہم نے اپنی متاع عقیدت کو رکھا تھا وہ کس حد تک محفوظ تھی اس روز بھی سب کو پہلے دن کی طرح یہ محسوس ہونے لگا کہ ہم کوئی بڑا شیطانی کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور ہمارے معبود محبت کا یہ امتحان اتنا کٹھن ہے کہ خود ہمارے ہاتھوں سے اس کے پاش پاش ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ گزشتہ چند روز میں ہم نے یہ سنا تھا کہ زیبی ثانیا کو اپنی طرف مائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔ لیکن کتنی عجیب بات تھی کہ ہم نے ثانیا سے اس کے اور زیبی کے تعلقات کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ہمارے پاس بسکٹوں کے لئے بدستور آتی رہی اور اس کے رویہ میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

اس روز بھی وہ تھوڑی دیر کے بعد حسب دستور مسکراتی اور چہکتی آ پہنچی۔ "قیدیو! میں آگئی ہوں" ہم اس سے ملنے کے لئے بڑی بے تابی سے آگے بڑھے اور جب

وہ دفعتاً آگئی تو خلافِ معمول سب اسی کے چہرے پر نظریں جمائے بت بنے کھڑے تھے اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس سے کیا کہیں اور کیا پوچھیں۔ سب کے چہروں پر عجیب افسردگی سی چھائی ہوئی تھی۔ اس خلافِ معمول اندازِ استقبال پر وہ حیران تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ دفعتاً اس کا رنگ فق ہو گیا ہے اور وہی گھٹن سے دوچار ہے۔ پھر اس نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا بات ہے تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟"

"تم نے آج کا اخبار پڑھا ہے؟" مستری نے چڑے ہوئے لہجے میں تانیا سے پوچھا اور اس کی نگاہیں تانیا کے چہرے پر گڑی رہیں۔

"میرا حشر! اخبار کا کیا مطلب ہے؟"

"اوہ۔ کچھ نہیں، کچھ نہیں!"

"ادھر آؤ اور مجھے بسکٹ دو۔ جلدی کرو!"

اس سے پہلے تانیا نے ہم سے اتنی تیز گفتگو کبھی نہیں کی تھی۔

"اوہو! تمہیں بہت جلدی ہے" مستری نے کہا اور اپنی جگہ کھڑا رہا اور اس کی نگاہیں تانیا کے چہرے سے نہ ہٹیں۔ پھر تانیا یکایک مڑی اور دروازے کی طرف لپک کر ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔

مستری نے اپنا بیلچہ اٹھایا اور بھٹی کی طرف جاتے ہوئے چپکے سے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے ہی خود کو فوجی کے حوالے کر چکی ہے۔ آہ فوجی! بچے، بدمعاش۔ ڈاکو!"

ہم بھیڑوں کی طرح کندھے سے کندھا رگڑتے میزوں کی طرف بڑھے اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ اور تیزی سے اپنے کام میں لگ گئے۔

ذرا دیر بعد کسی نے کہا۔ "کیا ایسا ممکن ہے؟"

مستری زور سے چلایا: "ارے اب ان باتوں سے کیا فائدہ؟"

ہم سب اسے اپنے سے کہیں زیادہ دانشمند سمجھتے تھے۔ اس کے الفاظ نے ہمیں کامل یقین دلا دیا کہ فوجی نے معرکہ جیت لیا ہے ——— ہم پر ایک کرب ناک اداسی چھا گئی۔

بارہ بجے جب کھانے کا وقت ہوا ——— فوجی کارخانے میں آیا وہ حسبِ معمول نہایت اچھے لباس میں ملبوس تھا اور اپنی عادت کے مطابق ——— ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔ لیکن ہم نے اس کی طرف دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔

"میرے قابلِ قدر دوستو! اگر تم پسند کرو تو میں تمہیں اپنی فوجیانہ دلیری کا تھوڑا سا مظاہرہ دکھاؤں۔" اس نے فخر سے قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ گودام میں چلے جاؤ۔ اور جھری دار دیوار کی جھریوں میں سے تماشا دیکھو۔" ہم ایک دوسرے کے کندھے رگڑتے اس طرف کو باہر گئے اور تختوں کی دیوار کے شگافوں میں اپنی آنکھیں ٹانک دیں۔ اور صحن کا نظارہ دیکھنے لگے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ تانیا جلد جلد تیز تیز قدم اٹھاتی اور گھبرائی ہوئی آئی۔ کیچڑ اور برف سے ڈھکی ہوئی زمین پر اچھلتی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وہیں کی تیزی اور پھرتی کے ساتھ اچھلتا اور سیٹی بجاتا ہوا فوجی نمودار ہوا اور اسی طرف چل دیا جدھر تانیا گئی تھی جس سے صاف ظاہر تھا کہ انہوں نے وہاں کوئی جگہ مقرر کر رکھی ہے۔ فوجی کے ہاتھ جیبوں میں اور سر تک گھسے ہوئے تھے۔ اور اس کی مونچھیں اوپر نیچے پھڑک رہی تھیں۔ وہ بھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر بارش شروع ہو گئی۔ ہم گیلی زمین پر پڑتی ہوئی بوندوں کو دیکھتے رہے اور بوندوں کی چوٹ سے زمین پر ننھے ننھے نشان بنتے رہے۔ سماں ابر کی وجہ سے سرمئی اور بھیگا ہوا تھا۔ نہایت اکتا دینے والا اور بوجھل اور مرجھایا سا۔ برف ابھی تک چھتوں پر پڑی تھی اور زمین پر کیچڑ کے سیاہ دھبے ہر طرف بکھرے تھے۔ چھتوں کی برف بھی دھوئیں کی سیاہ کالک سے ڈھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ بارش ایک مغموم آواز کے ساتھ قائم ہو گئی۔ یہاں انتظار میں کھڑے کھڑے ہمیں بہت سردی اور بے آرامی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن ہمارے دلوں میں تانیا کی طرف سے بہت غصہ بھرا ہوا تھا کہ اس نے ہمیں اپنے پرستاروں کو ایک معمولی فوجی کی خاطر چھوڑ

دیا اور اب ہم ایک جلاد کی سی عجیب خوشی کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ ثانیہ واپس آ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں مسرت و شادمانی سے چمک رہی ہیں اور اس کے ہونٹوں پر تبسم کی شادابی بکھری ہوئی ہے وہ اس طرح جھوم جھوم کر چل رہی تھی جیسے عالم خواب میں ہو یا جیسے اس نے شراب پی لی ہو۔

اس صورت حال کو ہم خاموشی سے برداشت نہ کر سکتے تھے۔ سب کے سب غصہ اور حقارت سے عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے اچھل اچھل کر صحن میں آ گئے اور اس کی طرف بڑھنے لگے۔

ہمیں اس حالت میں دیکھ کر وہ گھبرائی اور ہم اسے ایک دم سڑی سڑی گالیاں دینے لگے۔ معذرت کا لفظ بھی ہمارے منہ سے نہ نکلا۔ کیونکہ ہمیں جو غصہ تھا اس نے اتنی مہلت ہی نہ دی وہ ہمارے درمیان گھری ہوئی تھی ہمارے گھیرے سے نکل کر کہیں نہ جا سکتی تھی۔ ایسی حالت میں ہم اس پر جس طرح چاہتے غصہ اتار سکتے تھے۔ لیکن کسی نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کیوں؟ اس کی وجہ میں نہیں بتا سکتا۔ وہ ہمارے درمیان کھڑی تھی اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اب ہماری زہر میں بجھی ہوئی گالیوں کی بوچھاڑ اور بھی تیز ہو چکی تھی اس کا رنگ فق ہو گیا اس کی نیلی آنکھیں جو ذرا دیر پہلے خوشی کی چمک سے روشن نظر آ رہی تھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کا سینہ زور زور سے حرکت کرنے لگا اور ہونٹ کپکپانے لگے۔

ہم لوگ اس کو گھیرے کھڑے تھے اور دشنام طرازی کے ذریعے اپنے دل کا بخار نکال رہے تھے کیونکہ اس نے ہمیں دھوکا دیکر ٹھکرا دیا تھا۔ وہ ہم سے وابستہ تھی۔ ہم نے اپنی بہترین پونجی اس پر نثار کی تھی اگرچہ یہ بہترین پونجی بھکاریوں کے روکھے سوکھے ٹکڑے ہی سہی۔

ہم بچے ہی تو تھے اور وہ تنہا اس لئے ہم فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کر سکے کہ اسے اس لغزش کی سزا کیا دی جائے۔ ہم نے اسے کیا نہیں کہا لیکن وہ شروع سے آخر تک خاموش ہی رہی۔ شروع سے آخر تک وہ ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرح دیکھتی رہی جیسے شکار کا جانور وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ ہم نے اسے گالیاں دیں اس کا منہ چڑایا اور مذاق اڑایا اور لوگ بھی آ گئے اور تماشہ دیکھنے لگے۔ پھر ہمارے ایک ساتھی نے ثانیہ کی آستین پکڑ کر کھینچ لی۔

اس کی آنکھیں یکایک دمک اٹھیں۔ اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ ہاتھ سر کی طرف اٹھائے اور بالوں کو سنوار کر ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا پھر بلند آواز سے لیکن پرسکون لہجے میں بولی۔

"اُف یہ ۔ تو یہ " تم تو زنداں کے پنجرے کے پنچھی ہو تم قابل رحم ہو۔

وہ کسی جھجک کے بغیر وہ گھیرے میں سے سیدھی آگے بڑھتی چلی گئی جیسے ہم اس کے سامنے کھڑے ہی نہ تھے اور شاید یہی وجہ تھی کہ جب وہ ہماری طرف بڑھی تو کوئی اس کا راستہ نہ روک سکا اور جب وہ آگے بڑھ رہی تھی تو اس نے بلند آواز میں بڑی تمکنت کے ساتھ کہا۔

"آہ تم لوگ بڑے ذلیل ہو۔ گندے کیڑے کہیں کے!"

وہ اسی طرح گردن اونچی کئے سینہ تانے اپنی اس ہیئت کی تمام رعنائیوں کے ساتھ ہم سے دور ہوتی چلی گئی —— ہم کیچڑ اور بارش میں سورج سے محروم سیاہ آسمان کے نیچے کھڑے رہ گئے۔

کچھ دیر بعد ہم سب منہ لٹکائے اپنے سیاہ زمینی دوزخ میں واپس آ گئے۔ جہاں ہمیشہ کی طرح کھڑکی سے سورج نے کبھی اپنی کرنیں اندر نہیں بکھیریں۔ اور ثانیہ دوبارہ نہ آئی۔

چور

سعادت حسن منٹو

مجھے بے شمار لوگوں کا قرض ادا کرنا تھا اور یہ سب شراب نوشی کی بدولت تھا۔ رات کو جب میں سونے کے لیے چارپائی پر لیٹتا تو میرا ہر قرض خواہ میرے سرہانے موجود ہوتا ۔۔۔ کہتے ہیں کہ شرابی کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ میرے ضمیر کا معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ ہر روز مجھے سرزنش کرتا اور میں خفیف ہو کے رہ جاتا۔

واقعی میں نے بیسیوں لوگوں سے قرض لیا تھا۔ میں نے ایک رات سونے سے پہلے بلکہ یوں کہئے کہ سونے کی ناکام کوشش کرنے سے پہلے حساب لگایا تو قریب قریب ڈیڑھ ہزار روپے میرے ذمے نکلے۔ میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے سوچا یہ ڈیڑھ ہزار روپے کیسے ادا ہوں گے۔ میں پچیس روپے روزانہ کی آمدن ہے لیکن وہ میری شراب کے لیے بمشکل کافی ہوتے ہیں۔

اب میں آپ کو بتاؤں کہ ہر روز کی ایک بوتل ۔۔۔ تھرڈ کلاس رم کی ۔۔۔ دام ملاحظہ ہوں ۔۔۔ سولہ روپے ۔۔۔ سولہ روپے تو ایک طرف رہے ان کے حاصل کرنے میں کم از کم تین روپے ٹانگے پر صرف ہو جاتے تھے۔ کام ہوتا نہیں تھا۔ بس پیشگی پر گزارہ تھا لیکن جب پیشگی دینے والے تنگ آ گئے تو انہوں نے میری شکل دیکھتے ہی کوئی بہانہ تراش لیا یا اس سے پیشتر کہ میں ان سے ملوں کہیں غائب ہو گئے۔ آخر کب تک وہ مجھے پیشگی دیتے رہتے ۔۔۔ لیکن میں مایوس نہ ہوتا اور خدا پر بھروسہ رکھ کے کسی نہ کسی حیلے سے دس پندرہ روپے ادھار لینے میں کامیاب ہو جاتا۔

مگر یہ سلسلہ کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ لوگ میری عزت کرتے تھے مگر اب وہ میری شکل دیکھتے ہی بھاگ جاتے تھے ۔۔۔ سب کو افسوس تھا کہ اتنا اچھا ایڈیٹر تباہ ہو رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بہت اچھا ایڈیٹر تھا۔ مجھے کوئی بھی بگڑی ہوئی فلم دے دی جاتی میں اس کو سرسری طور پر دیکھنے کے بعد چند بیٹھکوں میں ٹھیک کر دیتا لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں میری یہ ذہانت صرف شراب ملنے کی امید پر قائم تھی اس لیے کہ میں پہلے سے کہہ دیا کرتا تھا کہ اگر کام ٹھیک ہو گیا تو وہ مجھے اتنے روپے دلوائیں گے جن سے میری دو روز کی شراب چل سکے گی۔

وہ لوگ خوش تھے۔ مجھے وہ تین چار روز کی شراب کے دام ادا کر دیتے۔ اس لیے کہ جو کام میں نے کیا تھا وہ کسی اور سے نہیں ہو سکتا تھا۔

لوگ مجھے لوٹ رہے تھے — میری ذہانت و ذکاوت پر میری اجازت سے ڈاکے ڈال رہے تھے — اور لطف یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا کہ میں انہیں لوٹ رہا ہوں — ان کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہوں — اصل میں مجھے اپنی صلاحیتوں کی کوئی قدر و قیمت ہی نہ تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ لکھنا بالکل ایسے ہے جیسے کھانا کھانا یا شراب پینا۔

میں نے جب بھی کوئی کام ہاتھ میں لیا مجھے کوفت محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ اتنی بات ضرور تھی کہ جب شام کے چھ بجتے تھے تو میری طبیعت بے چین ہو جاتی — کام مکمل ہو چکا ہوتا تو گھر میں ایک روپیہ غائب کر دیتا تاکہ دوسرے روز بھی آمدن کا سلسلہ قائم رہے — یہ شراب حرامزادی کتنی بُری چیز ہے کہ آدمی کو بے ایمان بھی بنا دیتی ہے۔

میں قریب قریب ہر روز کام کرتا تھا۔ میری مانگ بہت زیادہ تھی اس لئے کہ مجھ ایسا کاریگر ملک بھر میں نایاب تھا — ستار باجا اور آگ بجھانے والا حساب تھا۔ میں مشین دیکھتے ہی سمجھ جاتا تھا کہ اس میں کیا قصور ہے۔

میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں، مشینری کتنی ہی بگڑی ہوئی کیوں نہ ہو اس کو ٹھیک کرنے میں زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگنا چاہئے لیکن اگر اس میں نئے پرزوں کی ضرورت ہو اور وہ آسانی سے دستیاب موجود نہ ہوں تو اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

میں بلا ناغہ شراب پیتا تھا اور سوتے وقت بلا ناغہ اپنے قرض کے متعلق سوچا کرتا تھا جو مجھے مختلف آدمیوں کو ادا کرنا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا عذاب تھا جس کے باوجود اضطراب کے باعث مجھے نیند نہ آتی — دماغ میں سیکڑوں سکیمیں آتی تھیں۔ بس میری یہ خواہش تھی کہ کہیں سے دس ہزار روپے مل جائیں تو میری جان میں جان آئے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ قرض کا فی الفور ادا کر دوں۔ ایک ٹیکسی لوں اور ہر قرض خواہ کے پاس جا کر معذرت طلب کروں اور جیب سے روپے نکال کر ان کو دے دوں۔ جو روپے باقی بچیں ان سے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر خرید لوں اور شراب پینا چھوڑ دوں۔

پھر خیال آتا کہ نہیں، دس ہزار سے کام نہیں چلے گا۔ کم از کم پچاس ہزار ہونے چاہئیں — میں سوچنے لگتا کہ اگر اتنے روپے آ جائیں، جو یقیناً آنے چاہئیں تو سب سے پہلے میں ایک ہزار نادار لوگوں میں تقسیم کروں گا — ویسے لوگوں میں جو روپیہ لے کر کچھ کاروبار کر سکیں۔

باقی رہے انچاس ہزار — اس رقم میں سے میں نے دس ہزار اپنی بیوی کو دینے کا ارادہ کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ [illegible] پریزنٹ ہو جانا چاہئے — گیارہ ہزار ہو گئے تو باقی رہ جاتے انتالیس ہزار — میرے لئے بہت کافی تھے — میں نے سوچا یہ میری زیادتی ہے چاہئے، میں نے بیوی کا حصہ دو گنا کر دیا یعنی بیس ہزار۔ اب بچے انتیس ہزار — میں نے سوچا کہ پندرہ ہزار اپنی بچی کو بھی دے دوں۔ اب میرے پاس چودہ ہزار رہے — ان میں سے آپ سمجھئے کہ دو ہزار قرض کے نکل گئے۔ باقی بچے بارہ ہزار — ایک ہزار روپے کی اچھی شراب آنی چاہئے — لیکن میں نے فوراً تھوک دیا اور یہ سوچا کہ پہاڑ پر چلا جاؤں گا اور وہاں کم از کم چھ مہینے رہوں گا تاکہ صحت درست ہو جائے۔ شراب کے بجائے دودھ پیا کروں گا۔

بس ایسے ہی خیالات میں دن رات گزر رہے تھے — پچاس ہزار کہاں سے آئیں گے یہ مجھے معلوم نہیں تھا — ویسے دو تین سکیمیں ذہن میں تھیں، شمع دہلی کے معمے حل کروں اور پہلا انعام حاصل کروں۔ ڈربی کی لاٹری کا ٹکٹ خرید لوں۔ چوری کروں اور بڑی صفائی سے۔

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ مجھے کون سا قدم اٹھانا چاہئے۔ بہر حال یہ طے تھا کہ مجھے پچاس ہزار روپے حاصل کرنا ہیں — یہ رقم میں یا دو ماہ میں۔

اسکیمیں سوچ سوچ کر میرا دماغ چکرا گیا — رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ جو بہت بڑا عذاب تھا۔ قرض خواہ بے چارے تقاضا نہیں کرتے تھے لیکن جب میں ان کی شکل دیکھتا تھا تو ندامت کے مارے پسینہ پسینہ ہو جاتا۔ بعض اوقات تو میرا سانس رکنے لگتا اور میرا جی چاہتا کہ خودکشی کر لوں اور اس عذاب سے نجات پاؤں۔

مجھے معلوم نہیں کیسے اور کب میں نے تہیہ کر لیا کہ چوری کروں گا — مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ مجھے کیسے معلوم ہوا کہ محلے میں ایک بیوہ عورت رہتی ہے جس کے پاس بے اندازہ دولت ہے — اکیلی رہتی ہے — میں وہاں رات کے دو بجے پہنچا۔ یہ مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ دوسری منزل پر رہتی ہے — نیچے پٹھان کا پہرہ تھا۔ میں نے سوچا کوئی اور ترکیب سوچنی چاہئے اوپر جانے کے لئے — میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے خود کو اس [illegible]

کے فلیٹ کے اندر آ گیا ——— میرا خیال ہے کہ میں پائپ کے ذریعے سے اوپر چڑھ گیا تھا ——— ٹارچ میرے پاس تھی ——— اس کی روشنی میں میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک بہت بڑا سیف تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی سیف کھولا تھا نہ دیکھا تھا لیکن اس وقت جانے مجھے کہاں سے ہدایت ملی کہ میں نے ایک معمولی تار سے اسے کھول ڈالا۔ اندر زیور ہی زیور تھے۔ بہت بیش قیمت ——— میں نے سب سمیٹے اور کھنکنے والے زیور رومال میں باندھ لئے ——— کوئی ساٹھ ستر ہزار روپے کا مال ہوگا ——— میں نے کہا ٹھیک ہے بس اتنا ہی چاہیئے تھا کہ اچانک دوسرے کمرے سے ایک بڑھیا یا بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا ——— مجھے دیکھ کر پوپلی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہ ماجرا کیا ہے ——— میں نے اپنی جیب سے بھرا ہوا پستول نکال کر تان دیا ——— اس کی پوپلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اور زیادہ پھیل گئی۔ اس نے مجھ سے بڑے پیار سے پوچھا۔

"آپ یہاں کیسے آئے؟"

میں نے سیدھا سادا جواب دیا "چوری کرنے"

"اوہ!" بڑھیا کے چہرے کی جھریاں مسکرانے لگیں "تو بیٹھو ——— میرے گھر میں تو نقدی کی صورت میں صرف ڈیڑھ روپیہ ہے ——— تم نے زیور چرایا ہے لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم پکڑے جاؤ گے کیونکہ ان زیوروں کو صرف کوئی بڑا جوہری ہی لے سکتا ہے ——— اور ہر بڑا جوہری انہیں پہچانتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئی ——— میں بہت پریشان کہ یا الٰہی یہ سلسلہ کیا ہے۔ میں نے چوری کی ہے اور بڑی پیاری مسکراہٹ سے مسکرا کر مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔ لیکن فوراً اس کی بات کا مطلب سمجھ میں آ گیا جب ماما جی نے آگے بڑھ کر میرے پستول کی پرواہ نہ کرتے ہوئے میرے ہونٹوں کا بوسہ لے لیا اور اپنی بانہیں میری گردن میں ڈال دیں ——— اس وقت خدا کی قسم میرا جی چاہا کہ زیوروں کی گٹھڑی ایک طرف پھینکوں اور وہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر وہ تسمہ پا عورت تھی۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں مطلق ہل جل نہ سکا ——— اصل میں میرے ہر رگ و ریشے میں ایک عجیب و غریب قسم کا خوف سرایت کر گیا تھا۔ میں اسے ڈائن سمجھنے لگا تھا جو میرا کلیجہ نکال کر کھانا چاہتی تھی۔

میری زندگی میں کسی عورت کا دخل نہیں تھا۔ میں غیر شادی شدہ تھا۔ میں نے اپنی زندگی کے تئیس برسوں میں کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس رات جب کہ میں چوری کرنے کے لئے نکلا تو مجھے یہ بڑھیا مل گئی جس نے مجھ سے عشق کرنا شروع کر دیا ——— آپ کی جان کی قسم میرے ہوش و حواس غائب ہو گئے۔ وہ بہت ہی کریہہ المنظر تھی۔ میں نے اس سے ہاتھ جوڑ کر کہا "ماما جی مجھے بخشو ——— یہ پڑے ہیں آپ کے زیور ——— مجھے اجازت دیجئے۔"

اس نے تنک کر مجھ سے کہا "تم نہیں جا سکتے ——— تمہارا پستول میرے پاس ہے ——— اگر تم نے ذرا سی جنبش بھی کی تو میں شور کروں گی۔ ٹیلیفون کر کے پولیس کو اطلاع دے دوں گی کہ وہ آ کر تمہیں گرفتار کر لیں ——— لیکن جان من میں ایسا نہیں کروں گی ——— مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے ——— میں ابھی تک کنواری ہوں ——— میرا خیال ہے کہ اسّی برس میں اس غرض سے صرف تمہارے لئے کنواری رہی ہوں ——— اب تم یہاں سے نہیں جا سکتے۔"

میں غش کے قریب تھا کہ بے ہوش ہو جاؤں۔ گھڑی ٹن ٹن شروع ہو گئی۔ وہ دو کلاک تھا جو بارہ بجنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ میں نے بڑھیا کی ٹھوڑی پکڑی اور اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں کا بوسہ لے کر جھوٹ موٹ ہی کہا "ماما میں نے اپنی زندگی میں ہزاروں لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن خدا شاہد ہے کہ تم ایسی لڑکی سے میرا کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ تم کسی بہشت کی حور ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی اتنی گھڑیاں تمہارے بغیر گزار دیں ——— لیکن بہر حال میں کل آؤں گا بشرطیکہ تم وعدہ کرو کہ مکان میں اور کوئی نہیں ہوگا۔"

بڑھیا یہ سن کر بہت خوش ہوئی "ضرور آؤ ——— تم اگر چاہو گے تو گھر میں ایک بھی متنفس نہیں ہوگا جو تمہارے کانوں کو تکلیف دے ——— مجھے افسوس ہے کہ گھر میں صرف ایک روپیہ اور دو آنے تھے ——— لیکن تم کل آؤ گے تو میں تمہارے لئے دو تین ہزار روپیہ بنک سے نکلوا لوں گی ——— یہ لو اپنا پستول۔"

میں نے اپنا پستول لیا اور وہاں سے دم دبا کر بھاگا ——— پھر واپس نہیں گیا تھا ——— میں نے سوچا کہیں اور کوشش کرنی چاہئے۔ قرض ادا کرنے میں اور جو میں نے پلان بنایا ہے اس کی تکمیل بھی ہونا چاہئے۔

چنانچہ میں نے ایک جگہ اور کوشش کی ——— سردیوں کے دن تھے ——— صبح کے چار بجنے والے تھے ——— یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب سب گہری نیند سو رہے ہوتے ہیں

— مجھے ایک مکان کا پتہ تھا کہ اس کا مالک بہت بڑا مالدار ہے — بہت کنجوس ہے۔ اپنا روپیہ بینک میں نہیں رکھتا۔ گھر ہی رکھتا ہے۔ میں نے سوچا اس کے ہاں چلنا چاہئے۔

میں وہاں پہنچ گیا۔ کن مشکلوں سے اندر داخل ہوا، میں بیان نہیں کر سکتا۔ بہرحال پہنچ گیا۔ صاحبِ خانہ جو ماشاءاللہ جوان تھے سو رہے تھے۔ میں نے ان کے سرہانے سے چابیاں نکالیں اور الماریاں کھولنا شروع کر دیں۔

ایک الماری میں کاغذات تھے اور کچھ فرنچ لیدر۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص جو کنوارا ہے فرنچ لیدر کہاں استعمال کرتا ہے — دوسری الماری میں کپڑے تھے۔ تیسری بالکل خالی تھی معلوم نہیں اس میں تالا کیوں پڑا ہوا تھا۔

اور کوئی الماری نہیں تھی۔ میں نے تمام مکان کی تلاشی لی لیکن مجھے ایک پیسہ بھی نظر نہ آیا — میں نے سوچا، اس شخص نے ضرور اپنی دولت کہیں دبا کے رکھی ہوگی — چنانچہ میں نے اس کے سینے پر بھرا ہوا پستول رکھ کر اسے جگایا۔

وہ ایسا چونکا اور بدکا کہ میرا پستول فرش پر جا پڑا۔ میں نے ایک دم پستول اٹھایا اور اس سے کہا: "میں چور ہوں — یہاں چوری کرنے آیا ہوں — لیکن تمہاری تین الماریوں سے مجھے ایک دمڑی بھی نہیں ملی — حالانکہ میں نے سنا تھا کہ تم بڑے مالدار آدمی ہو۔"

وہ شخص جس کا نام مجھے اب یاد نہیں مسکرایا۔ انگڑائی لے کر اٹھا اور مجھ سے کہنے لگا: "یار تم چور ہو تو تم نے مجھے پہلے اطلاع دی ہوتی — مجھے چوروں سے بہت پیار ہے — یہاں جو بھی آتا ہے وہ خود کو بڑا شریف آدمی کہتا ہے، حالانکہ وہ اوّل درجے کا چور ہوتا ہے — مگر تم چور ہو۔ تم نے اپنے آپ کو چھپایا نہیں ہے — میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کے بعد ریفریجریٹر کھولا — میں سمجھا کہ شاید میری تواضع شربت وغیرہ سے کرے گا۔ لیکن اس نے مجھے بلایا اور کھلے ہوئے ریفریجریٹر کے پاس لے جا کر کہا: "دوست میں اپنا سارا روپیہ اسی میں رکھتا ہوں — یہ صندوقچی دیکھتے ہو — اس میں قریب قریب ایک لاکھ روپیہ پڑا ہے — تمہیں کتنا چاہئے؟"

اس نے صندوقچی باہر نکالی جو یخ بستہ تھی۔ اسے کھولا۔ اندر سبز رنگ کے نوٹوں کی گڈیاں پڑی تھیں، ایک گڈی نکال کر اس نے میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا: "بس اتنے کافی ہوں گے — دس ہزار ہیں۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دوں۔ میں تو چوری کرنے آیا تھا — میں نے گڈی اس کو واپس دی اور کہا: "صاحب! مجھے کچھ نہیں چاہئے — مجھے معاف کیجئے — پھر کبھی حاضر ہوں گا۔"

میں وہاں سے آپ سمجھئے کہ دُم دبا کر بھاگا، گھر پہنچا تو سورج نکل چکا تھا — میں نے سوچا کہ چوری کا ارادہ ترک کر دینا چاہئے — دو جگہ کوششیں کی مگر کامیاب نہ ہوا — دوسری رات کو کوشش کرتا تو کامیابی یقینی نہیں تھی — لیکن قرض بدستور اپنی جگہ پر موجود تھا جو مجھے بہت تنگ کر رہا تھا — حلق میں یوں سمجھئے کہ ایک پھانس سی اٹک گئی تھی — میں نے بالآخر یہ ارادہ کر لیا کہ جب اچھی طرح سو چکوں گا تو اٹھ کر خودکشی کر لوں گا۔

سو رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی — میں اٹھا — دروازہ کھولا — ایک بزرگ آدمی کھڑے تھے۔ میں نے ان کو آداب عرض کیا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا: "یہ لفافہ دینا تھا اس لئے آپ کو تکلیف دی — معاف فرمائیے گا، آپ سو رہے تھے۔"

میں نے ان سے لفافہ لیا۔ وہ سلام کر کے چلے گئے — میں نے دروازہ بند کیا — لفافہ کافی وزنی تھا — میں نے اسے کھولا اور دیکھا کہ سو سو روپے کے بے شمار نوٹ ہیں۔ گنے تو پچاس ہزار نکلے — ایک مختصر سا رقعہ تھا، جس میں لکھا تھا کہ آپ کے یہ روپے مجھے بہت عرصے سے ادا کرنے تھے — افسوس ہے کہ میں اب ادا کرنے کے قابل ہوا ہوں۔

میں نے بہت غور کیا کہ یہ صاحب کون ہو سکتے ہیں جنھوں نے مجھ سے قرض لیا —— سوچتے سوچتے میں نے آخر سوچا کہ ہو سکتا ہے کسی نے مجھ سے قرض لیا ہو جو مجھے یاد نہ رہا ہو۔

لفافہ تکیے کے نیچے رکھ کر میں نے سارا حساب کر لیا۔

بیس ہزار اپنی بیوی کو —— پندرہ ہزار روپے اپنی بیوہ بہن کو —— دو ہزار قرض کے —— باقی بچے بارہ ہزار —— ایک ہزار میں نے اچھی شراب کے لئے رکھ لئے —— پہاڑ پر جانے اور دودھ پینے کا خیال میں نے چھوڑ دیا۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی —— الٰہی کرم ہو گیا۔ دروازہ کھولا تو میرا ایک قرض خواہ کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے پانچ سو روپے لینا تھے —— میں لپک کر اندر گیا —— تکیے کے نیچے نوٹوں کا لفافہ دیکھا مگر وہاں کچھ موجود نہیں تھا۔

صاحب

آپ کی کتاب "صاحب" ملی۔ اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آج تک کسی کتاب کو ایک ہی نشست میں پڑھا ہو۔ اس کتاب کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ اُسے کوئی صاحب چرا کر ہی لے گئے۔ بہرحال تو مجھے سارے ہی مضمون پسند آئے۔ مگر احسان دانش والا مضمون سب سے زیادہ پسند آیا۔ اس انداز کے اور اتنے کامیاب مضمون اور کسی نے نہیں لکھے۔ آپ اور ادیبوں پر بھی لکھیں۔ آپ نے جن پر لکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر کو خود بھی جانتی تھی۔ آپ کی کتاب پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے نہیں جانتی تھی۔ آپ نے کسی خاتون پر مضمون نہیں لکھا۔ یہ زیادتی کیوں؟

"عصمت چغتائی"

۲۰۹ ایم،
پسنٹ موتشہ ہاؤسنگ سوسائٹی،
کراچی۔
۶ ۱/۵۹

حضرت، آپ کراچی تشریف لائے، اور میرے وجود کی نفی کرکے، مجھ سے ملنے تک نہیں آئے۔

آپ جب دہلی آتے تھے، تو ایک خورد کی حیثیت سے، میرے پاس ہمیشہ آتے تھے، لیکن اب، چونکہ میں پاکستانی ہو چکا ہوں، اس بنا پر، آپ کی نظروں میں، اپنی توقیر کھو چکا ہوں۔

آپ اپنے ذی قدر پرچے میں ایسے شخص کا کلام شائع فرما کر رسوائی کیوں مول لیں، جس سے اسلامی دنیا منہ پھیر چکی ہے۔

جاؤ، بالیں سے ہٹو بھی، موت کو آنے تو دو
چین سے جینے نہیں دیتے ہو، مر جانے تو دو!

جوش

جگر مرادآبادی

اک یہی حُسنِ یقیں تسکینِ جان و دل سہی
مجھ سے وہ غافل نہیں ہے اُس سے میں غافل سہی

پھر بھی آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اک سراپا ناز کو
زندگی میں ہر تجلّی حُسن کی شامل سہی

پھر بھی کتنی دل نشیں ہے، پھر بھی کتنی دل فزا
حُسن کی ایک ایک ادا ظالم سہی قاتل سہی

جو بھی مل جائے محبت میں وہی انعامِ دوست
لطفِ محرومی سہی، کیفِ شکستِ دل سہی

عشق ہی کی فطرتِ سرکش کا لیکن کیا جواب
ہر نفس رہبر سہی، جادہ سہی، منزل سہی

کس کو ملتی ہے جگرؔ یہ دولتِ بیدادِ دوست
لاکھ جامِ جم کے بدلے ایک ٹوٹا دل سہی

سیماب اکبر آبادی

(مشاعرہ کی ایک غیر مطبوعہ غزل)

جو در پردہ اُنھیں جلوہ نمائی کی نہ خُو ہوتی
میں سچ کہتا ہوں دنیا آرزو ہی آرزو ہوتی

متاعِ ضبط و قوتِ واپسیں کی رائگاں ہونے
نگاہِ حسن میں ایک اشک کی کیا آبرو ہوتی

مسافر اپنے پہلو ہی میں مل جاتی تجھے منزل
اگر منزل سے پہلے تجھ کو اپنی جستجو ہوتی

حدیثِ طور و موسیٰ اور وہ بھی چار لفظوں میں
ہوئی تھی گفتگو اُن سے تو کھل کر گفتگو ہوتی

غلط ہے عشق پر الزام آوارہ نگاہی کا
جو ہوتا حسن یک سو تو نظر کیوں چار سو ہوتی

دل اک قطرہ تھا۔ ژولیدہ، چکیدہ و سیلِ غم دیدہ
ذرا سی بوند پھر کیا اشک بنتی کیا لہو ہوتی

میں برقِ حسن کو روکے ہوئے ہوں دل پہ اے دُنیا
اگر یہ کوند کر گرتی تو مَیں ہوتا نہ تُو ہوتی

وہ ذوق و شوقِ موسیٰ اور وہ اک کم سے کم جلوہ!
جزائے آرزو یا رب! بقدرِ آرزو ہوتی

دل اے سیماب خالی آرزو سے رہ نہ سکتا تھا
نہ ہوتی آرزو، تو آرزو کی آرزو ہوتی

عابد علی عابد

یہی تھا وقت تری محفلِ طرب کے لئے
چراغِ دل کو سلگنا ہے آج سب کے لئے

کبھی میں جرأتِ اظہارِ مدعا تو کروں
کوئی جواز تو ہو لطفِ بے سبب کے لئے

افق سے چاند کی چھپا کلی اُبھرتی ہے
سجائے جاتے ہیں زیور نگارِ شب کے لئے

ترے گدا نے بھی ساغر کا نقرئی آنچل
کہیں سے مانگ لیا دخترِ عنب کے لئے

تمام عمر بہ فیضِ نگاہ لالہ رخاں
سند رہا ہوں اشاراتِ چشم و لب کے لئے

چمن سے پھولوں کے دہکے ہیں چُن لئے شعلے
کفِ وفا کے لئے دامنِ طلب کے لئے

کہیں جو پرسشِ احوال پر وہ مائل ہوں!
کہ ہم نے دل کو سنبھالا ہوا ہے جب کے لئے

مجھے خبر ہے بہت ہے متاعِ ذوقِ نظر
دکانِ کاکل و رخسار و چشم و لب کے لئے

ستارہ صبح کا روشن تھا شام سے عابدؔ
یہی تھی صوت حریفانِ بزمِ شب کے لئے

تین نامکمل غزلیں

احمد ندیم قاسمی

ہاتھ میں آتے ہی گل کچھ اس طرح کملائے ہیں
ہم نے جتنے دھوکے کھائے ہیں وہ سب یاد آئے ہیں

کتنی امیدوں کی شمعوں میں گھری ہے زندگی
جتنی روشن ہیں لویں اتنے ہی گھنے سائے ہیں

میری یادوں کے افق پر آپ کے وعدوں کے چاند
اس قدر چمکے نہیں ہیں جس قدر گہنائے ہیں

دھوپ نکلے گی تو کلیاں بھی چٹک لیں گی ندیم
کٹ چکی ہے شب مگر مشرق پہ بادل چھائے ہیں

دیدنی ہے شب فراق کا حسن
موت آئی تو ہم بھی سو لیں گے

جبر پر اتنا اختیار تو ہے
کچھ نہ بن آئے گی تو رو لیں گے

بادل اُٹھے ہیں۔ آگ برسے گی
باغ مہکے ہیں۔ زاغ بولیں گے

زندگی راز ہو تو چپ بھی رہیں
جب بھرم کھل چکا، تو بولیں گے

شب نے جب بھیگ کے لی انگڑائی
پَو اجالے کا سندیسہ لائی

صبح تیری ہے تو اے خالقِ صبح
رات ہے کس کی کرم فرمائی

اک سفینہ ہے تری یاد اگر
اک سمندر ہے مری تنہائی

سراج لکھنوی

فطرتِ عشق گنہگار ہوئی جاتی ہے
فکرِ دنیا بھی غمِ یار ہوئی جاتی ہے

کتنا نازک ہے خدا رکھے محبت کا مزاج
اب تسلی بھی دل آزار ہوئی جاتی ہے

جب سے چھینی ہے تری یاد نے نیند آنکھوں کی
دل کی جو حس ہے وہ بیدار ہوئی جاتی ہے

آہ پابندیٔ آدابِ محبت توبہ!
ٹھنڈی ہر سانس گناہگار ہوئی جاتی ہے

چھو لیا عرش کو منصور کی انگڑائی نے
صاف گوئی رسن و دار ہوئی جاتی ہے

ہر تجلی ہے ترے سامنے شرمندہ سی
چاندنی سایۂ دیوار ہوئی جاتی ہے

شکر یہ شوخیٔ حسنِ پسِ پردہ کا سراجؔ
آنکھ بے دیکھے گناہگار ہوئی جاتی ہے

آنند نرائن مُلّا

کتنی کرنیں جو افق پُر نور کا منبع تھیں جمال
اِک ذرا اُبھریں افق سے اور گھٹائیں ہو گئیں

عقل کے مینارِ بابل میں انھیں سنتا ہے کون
دل کی تانیں آج صحرا کی صدائیں ہو گئیں

اچھے اچھوں کی نہیں چلتی ہے پیشِ حُسن کچھ
تم تو انساں تھے فرشتوں سے خطائیں ہو گئیں

زندگی کی جہد میں ہارا بھی دل جیتا بھی دل
کچھ خطائیں ہو نہ پائیں کچھ خطائیں ہو گئیں

یہ عوامی دور ہے مُلّاؔ وہی بِینا ہے آج
جس کے حق میں کچھ سوا اندھوں کی رائیں ہو گئیں

جذبی

چمن میں آؤ ذرا سیرِ نوبہار کریں
گُلوں کی طرح جگر چاک دل فگار کریں

کہیں عذابِ جفا ہے کہیں نشاطِ وفا
یہیں کہیں سے تماشائے روزگار کریں

رہا نہ اپنا گریباں ہی جب تو دیوانے
تمھارا دامنِ رنگیں نہ تار تار کریں

ستم نصیبوں کا پیغام صرف اِتنا ہے
ہماری رسمِ وفا آپ اختیار کریں

کھُلی زباں نہ یوں بزمِ نامراداں میں
کہ سوگواروں کو کیا اور سوگوار کریں

وہ مبتلائے شبِ غم ہیں حضرتِ جذبیؔ
سحر سے دُور سحر کا جو انتظار کریں

سہاروں کی تلاش

اختر انصاری

اب گرا ہی چاہتا ہوں بے سہارا ہو کے میں
اے فریبِ سوز و دردِ آرزو! لینا مجھے
ریگ زارِ تشنگی کی نذر ہو جانے کو ہوں
اے سرابِ رنگ و نور و کیف و بو! لینا مجھے
اک سکوتِ مرگ طاری ہو رہا ہے روح پر
اے طلسمِ نائے و نوش و ہاؤ ہو! لینا مجھے
ڈھل رہا ہے نشۂ ذوقِ طرب تیزی کے ساتھ
اے ہوائے بادہ و جام و سبو! لینا مجھے
دل کشاکش سے تہی، خالی ہے کاوش سے جگر
اے فسونِ سعی و جہد و جستجو! لینا مجھے
نقشِ خاکِ رہگذر بننے کو ہے میرا وجود
اے جنونِ جست و خیز و تگ و پو! لینا مجھے
چھٹ رہا ہے ہاتھ سے سررشتۂ توقیرِ زیست
اے سرِ ناموس و زعمِ آبرو! لینا مجھے
ہے عجب اک ہولناک افتادگی کا سامنا
تھامنا! فکر و تخیل کے سہارو! تھامنا

عدم

جہاں بھی اُس مہ جبیں کے عہدِ شباب کی بات ہو رہی تھی
وہیں ہمارے دلِ تباہ و خراب کی بات ہو رہی تھی

چلے گئے بزمِ حشر میں ہم، تو صرف اِتنی سی بات سُن کر
سُنا تھا اُس انجمن کے اندر جناب کی بات ہو رہی تھی

میں کس طرح مان لوں کہ سرکار مائلِ اختلاط ہیں اب
ابھی ابھی تو جنابِ من اجتناب کی بات ہو رہی تھی

ہے بات میرے اور اُن کے دو دن کے پیار کی کچھ تو صرف اتنی
کہ خواب میں دو دلوں کے مابین خواب کی بات ہو رہی تھی

نظر ملا کے حضور نے کیوں نظر چرانے کا حشر ڈھایا!
بہار کا ذکر چھڑ رہا تھا، شراب کی بات ہو رہی تھی

میں مسکرا کر عدم قیامت کی بزمِ دانش سے لوٹ آیا
وہاں بھی دیکھا تو خیر سے احتساب کی بات ہو رہی تھی

بڑی صدا

عدم

تمام اقوالِ مصلحت میں ضرورتِ وقت رُو نما ہے
ضرورتِ وقت روشنی ہے، ضرورتِ وقت ارتقا ہے
سیاستوں کے بلند محلوں میں شور جس صدق کا بپا ہے
وہ مختلف نظریوں کی غارت گری کا اک جشنِ دلربا ہے
مگر یہ انسان جانتا ہے ضمیر سب سے بڑی صدا ہے

ضمیر اک عکسِ بزدلی ہے، یہ قول بھی سربسر بجا ہے
ضمیر اک مرتبہ کہن ہے، یہ عصرِ نو کا فیصلہ ہے!
نشیب ہو یا فراز، سارا نظام اک وہمِ خوشنما ہے
نہ کوئی پستی کی ماہیت ہے نہ کچھ بلندی کا مدعا ہے
مگر یہ انسان جانتا ہے ضمیر سب سے بڑی صدا ہے

سُنا ہے مایا کا رُوپ اس خاکداں کی سب سے بڑی ضیا ہے
کوئی یہ کہتا ہے ترکِ دُنیا، وسیلۂ رحمتِ خدا ہے
کوئی یہ کہتا ہے یہ غلط ہے، کوئی یہ کہتا ہے وہ بجا ہے
قیاس کی الجھنوں کی گرچہ نہ ابتدا ہے، نہ انتہا ہے
مگر یہ انسان جانتا ہے ضمیر سب سے بڑی صدا ہے

فضل احمد کریم فضلی

تعبیرِ نو قضا و قدر کی نظر میں ہے   آج ایک زلزلہ سا ہر اک بام و در میں ہے
کتنے چراغ امید کے جل جل کے بجھ گئے   کیا جانے کتنی دیر طلوعِ سحر میں ہے
ہر اک ہے سوئے منزلِ جاناں رواں دواں   ہر ذرہ کائنات کا پیہم سفر میں ہے
گم کردہ راہ ہو کے بھی ان سے ہوئے نہ دور   گم گشتگی بھی ہے تو اسی رہگذر میں ہے
آئی کہاں سے دیر و حرم میں یہ روشنی   میری جبیں کا نور مرے سنگِ در میں ہے
گذری روش روش میں جلاتی ہوئی چراغ   شانِ خرامِ یار نسیمِ سحر میں ہے
تم جو نہیں تو گھر میں وہ اب بات ہی نہیں   دیوار و در کی بات تو دیوار و در میں ہے
دل بھی دھڑک رہا ہے نگاہیں بھی در پہ ہیں   اک خاص لطف وعدۂ نامعتبر میں ہے
ڈر ہے کہیں مجھی کو یہ پہلے ڈبو نہ دے   طوفانِ التجا جو مری چشمِ تر میں ہے
ساحل تک آئی موج یہ کہہ کر پلٹ گئی   جینے کا لطف زندگیٔ پُرخطر میں ہے
خنجر بکف ہے یہ تو وہ خنجر در آستیں   اتنا سا فرق راہزن و راہبر میں ہے
آئی جگر فگارئ حوادث کے فیض سے   شوخی جو ان دنوں مرے خونِ جگر میں ہے
اہلِ ہنر کے دل میں دھڑکتے ہیں سب کے دل   "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"
افشائے رازِ دل تو بڑا عیب ہے مگر   ہو گر ادب کے ساتھ تو داخل ہنر میں ہے
آنکھوں میں بے ہنر کی کھٹکتا ہے بن کے عیب   یہ اک عجیب بات کمالِ ہنر میں ہے

ہوتا ہے بزمِ غیر میں بھی اب جو ذکرِ خیر
کوئی تو بات فضلیؔ آشفتہ سر میں ہے

عرشی رامپوری

ہماری محفلوں میں بے حجاب آنے سے کیا ہوگا
نہیں جب ہوش میں ہم، جلوہ فرمانے سے کیا ہوگا

جنوں کے ساتھ تھوڑی سی فضائے لامکاں بھی دے
مری وحشت کو اس دنیا کے ویرانے سے کیا ہوگا

ہے مر جانا کلید فتح، سمجھایا تھا رندوں نے
مگر ناصح یہ کہتا ہے کہ مر جانے سے کیا ہوگا

زہے قسمت اگر حضرت خود اپنا جائزہ بھی لیں
ہماری زندگی پر تیر برسانے سے کیا ہوگا

اگر ہمدرد بنتے ہو تو زنجیریں ذرا کھولو
مری پابستگی پر یونہی غم کھانے سے کیا ہوگا

در پیر مغاں چھوڑیں، یہ ہم سے ہو نہیں سکتا
کوئی واعظ سے کہہ دو، تیرے بہکانے سے کیا ہوگا

جسے دیکھو، وہ ہے سرمست صہبائے خرد یکسر
خداوندا! یہاں اک تیرے دیوانے سے کیا ہوگا

نہیں قلب و جگر میں خون کا قطرہ کوئی باقی
عزیزو! اب ہمارے ہوش میں آنے سے کیا ہوگا

دکھوں کو کھو نہیں سکتے اگر اہل خرد، عرشی
تو خالی سینۂ افلاک برمانے سے کیا ہوگا

شاد عارفی

ستمگر کو میں چارہ گر کہہ رہا ہوں   غلط کہہ رہا ہوں، مگر کہہ رہا ہوں
جنوں میں اُسے جلوہ گر کہہ رہا ہوں   بڑی بات ہے، مختصر کہہ رہا ہوں
مجھے آج کانٹوں کے منہ چومنے دو   بہاروں کا رُخ دیکھ کر کہہ رہا ہوں
یہ ماتھے پہ شکنیں یہ دانتوں میں آنچل   تو افسانۂ معتبر کہہ رہا ہوں
اُسی وقت آتی ہیں چہرے پہ زلفیں   اُنھیں جب میں نورِ سحر کہہ رہا ہوں
زمانہ کے منہ پر زمانے کی باتیں   سمجھنے لگا ہوں اگر کہہ رہا ہوں
یہ دیوانگی ہے کہ حالات حائل   وہ سُنتے نہیں ہیں مگر کہہ رہا ہوں
عتاب و تغافل ہی اچھے ہیں مجھ کو   مآلِ کرم دیکھ کر کہہ رہا ہوں

ابھی شاد۔ شاعر کو کہتے ہیں جھوٹا
خزاں میں بھی میں شعر تر کہہ رہا ہوں

نوّاب اشک رامپوری

سرد مہری سے تری دل جو تپاں رکھتے ہیں
ہمہ تن برف ہیں آہوں میں دھواں رکھتے ہیں
سیلِ غم آنکھ کے پردے میں نہاں رکھتے ہیں
ناتواں بھی ترے کیا تاب و تواں رکھتے ہیں
فرشِ رہ کس کے لئے ہم دل و جاں رکھتے ہیں
خوبرو پاؤں زمیں پر ہی کہاں رکھتے ہیں
بات میں بات اُسی کی ہے سنو تم جس کی
یوں تو کہنے کو سبھی منہ میں زباں رکھتے ہیں
جب سے دشوار ہوا سانس کا آنا جانا
ہم نگاہوں میں جہانِ گزراں رکھتے ہیں
کس سے بے دردیٔ احباب کا شکوہ کیجیے
نام بے تابیٔ دل کا خفقاں رکھتے ہیں
آنکھ کھولی ہے تو صیاد کے گھر کھولی ہے
ہم قفس پر ہی نشیمن کا گماں رکھتے ہیں
پھول بھی منہ سے جھڑیں بات بھی کانٹے کی رہے
یہ ادا اور سخن ساز کہاں رکھتے ہیں
لوگ روتے بھی ہیں تربت میں لٹا کر اے اشکؔ
اور سینے پہ بھی اک سنگِ گراں رکھتے ہیں

شورؔ علیگ

دیدہ و دانستہ دھوکا کھا گئے   ہم فریبِ زندگی میں آ گئے
جب ہجومِ شوق سے گھبرا گئے   کھو گئے خود اور تم کو پا گئے
چین بھی لینے نہیں دیتے مجھے   میں ابھی بھولا تھا پھر یاد آ گئے
میں کہاں جاؤں نظر کو کیا کروں   آپ تو ساری فضا پر چھا گئے
دل ہی دل میں اُف وہ دردِ ناگہاں   آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ سمجھا گئے
رُخ سے آنچل بھی نہ سرکا تھا ابھی   نیچی نظریں ہو گئیں شرما گئے
اُف یہ غنچوں کا تبسم یہ بہار   حیف اگر یہ غنچے کل مُرجھا گئے
جس قدر غنچے کھلے تھے نو بہ نو   میری آنکھوں سے لہو برسا گئے
پوچھتے کیا ہو ان اشکوں کا سبب   واقعاتِ رفتہ پھر یاد آ گئے

اب تو شورؔ اپنا فسانہ ختم کر
اُن کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے

ابر و باد

شور علیگ

یہ بادلوں کا تنفس یہ سرد سرد ہوا
یہ سنسناتی ہوائیں، یہ بولتے ہوئے ساز
کسے خبر تھی کہ تجھ کو پکارتے اے دوست
انہی فضاؤں میں کھو جائے گی مری آواز!

کسے خبر تھی کہ اس رنگ و بو کے طوفاں میں
گل و دمن کے سفینے بھی ڈوب جائیں گے
تھپک کے جن کو سلائے گی رات بھر شبنم
وہ غنچے صبح کی لو سے بھی کپکپائیں گے

تجھے بھی یاد ہے ان بدلیوں کے سائے میں
تری نگاہ سے ٹوٹے ہیں کتنے پیمانے
مگر یہ کون اٹھا آج تیری محفل سے
سلگ رہے ہیں چراغوں سے دور پروانے

سمجھ سکے تو سمجھ کتنی ظلمتوں کے حضور
کیا گیا ہے مہ و آفتاب سے انکار
دیا ہے کتنے بہشتوں سے انتقام نہ پوچھ
گلوں کے دام خریدے ہیں کتنے برق و شرار

کہا ہے کتنی نگاہوں نے "فی امان اللہ!"
ہوئے ہیں ساکت و مبہوت کتنے بام و در
اٹھے ہیں بہرِ دعا کتنے کانپتے ہوئے ہاتھ
کس اہتمام سے باندھا گیا ہے رختِ سفر

کراہتے رہے راہی پکارتے رہے خضر
ٹھہر سکا نہ مگر کاروانِ شمس و قمر
زمیں پہ آدم و حوا کے خون کا ماتم
مگر افق کی جبیں پر وہی ہے نورِ سحر

کسے خبر مری غربت مجھے کہاں لے جائے
ترا دیار مرے راستے میں آئے نہ آئے
مری نگاہ میں رقصاں ہیں سینکڑوں طوفاں
مگر خدا نہ کرے کوئی موج تجھ کو جگائے

غموں کی دھوپ سے رکھے تجھے خدا محفوظ
غبارِ وقت سے میلا ترا شباب نہ ہو
کسی ملال کی بے نجم و ماہ راتوں میں
غروب تیری جوانی کا آفتاب نہ ہو

رباعیات

قتیل شفائی

حالات کے ہر موڑ پہ مُڑ جاتے ہیں
پانی کی طرح ٹوٹ کے جُڑ جاتے ہیں
یہ وقت کے بندے یہ خیاباں زادے
شبنم کی طرح دھوپ میں اُڑ جاتے ہیں

نظارے نظر کو چھوڑ کے رُوپوش ہوئے
پنچھی بھی چہک چہک کے خاموش ہوئے
اُن لمحوں کا وقت کر رہا ہے ماتم
جو صبح کے لاشے سے ہم آغوش ہوئے

ظلمات کا عفریت بجھے یا نہ بجھے
کیوں موت کے بالیں پہ جلاتی ہے دیئے
اے رات سمیٹ لے ستارے اپنے
انسان ترس گیا ہے سورج کے لئے

یوں شاخِ نشیمن پہ نہ بجلی ٹوٹے
اس طرح شگوفوں کو نہ صرصر لوٹے
گلشن پہ جو سایہ فگن ہو جائیں
کانٹوں کے مسامات سے خوشبو پھوٹے

وا ہو گئی راہِ کامرانی شاید
ٹوٹا ہے طلسمِ حکمرانی شاید
اب لوح و قلم آ گئے انساں کے ہاتھ
قسمت کے بدل گئے معانی شاید

مخلص ہیں تو ہم خاک بسر اچھے ہیں
افلاس کے مارے ہیں مگر اچھے ہیں
جن محلوں میں سازشیں ہوں انساں کے خلاف
ان محلوں سے اُجڑے ہوئے گھر اچھے ہیں

یاد

غلام ربانی تاباں

ظالم وہ تری پہلی نظر یاد رہے گی   میں بھولنا چاہوں بھی مگر یاد رہے گی
اک قاتل و معصوم ادا نقش ہے دل پر   اک سادہ و پرکار نظر یاد رہے گی
ہونٹوں سے چھلکتا ہوا نازک سا تبسم   تابندگیٔ سلک گہر یاد رہے گی
برسات کا بھرپور سماں یاد رہے گا   زلفوں کی گھٹا تا بہ کمر یاد رہے گی
آرائش و زیبائشِ جنت کے نظارے   آسودگیٔ ذوق نظر یاد رہے گی
تجدید مراعات کے دلچسپ بہانے   ہر پرسشِ غم بارِ دگر یاد رہے گی
وہ عشق کا موسم وہ بہاروں کا زمانہ   بالیدگیٔ کیف و اثر یاد رہے گی
ہر روز مناتے تھے جہاں جشنِ ملاقات   وہ راہگزر راہگزر یاد رہے گی
گلگشت چمن ـــ ساحلِ گنگا کے مناظر   آوارگیٔ شام و سحر یاد رہے گی
آزردگیٔ شوق پہ اک خاص ادا سے   تسکیں بہ اشاراتِ نظر یاد رہے گی
ظلمت کدۂ دل میں جلائی تھی جو تو نے   ہر سو ہیں وہ شمعِ خضر یاد رہے گی
پابندیٔ آدابِ محبت پہ وہ اصرار   فہمائشِ دزدیدہ نظر یاد رہے گی
دل اپنی ہزیمت کو تو اب بھول چلا ہے   ہاں دوست تری فتح و ظفر یاد رہے گی
جس شام مجھے ترکِ محبت کا ملا حکم   وہ شام بہ عنوانِ دگر یاد رہے گی

گو چھوٹ چکا مجھ سے گلستانِ شیخ گڑھ
تا عمر تری اے گُلِ تر یاد رہے گی

حیرت شملوی

ایک تو خود اپنی غمگینی
اُس پر ان کی نکتہ چینی
اپنی شیرینی بھی تلخی
اُن کی تلخی بھی شیرینی
کھل جائے گا یہ بھی اک دن
کس نے کس کی راحت چھینی
کافی ہے کیا یہ کہہ دینا
"سب حالات کی ہے سنگینی"
کر نہیں سکتی ہم کو قائل
صرف عبارت کی رنگینی
ہے یہ وفا، وہ جرمِ محبت
ہے جس کی پاداش یقینی
کیا معلوم کسی کی مشکل
خودداری ہے یا خودبینی
آپ کی رائے عالی کیا ہے
دین ہے بہتر یا بے دینی
کیا کہنا اُس ہوش و خرد کا
سوجھتی ہے جس کو شوقینی
اپنے دامن کو بھی دیکھیں
ہو منظور جنھیں گل چینی
اچھے اچھوں کو اے حیرت
لے ڈوبی ہے بے آئینی

انجم رومانی

دن ہو کہ رات، کنجِ قفس ہو کہ صحنِ باغ
آلامِ روزگار سے حاصل نہیں فراغ

رغبت کسے کہ لیجیے عیش و طرب کا نام
فرصت کہاں کہ کیجیے صہبا سے پُر ایاغ

ویرانۂ حیات میں آسودہ خاطری
کس کو ملا اس آہوئے رم خوردہ کا سراغ

آثارِ کوئے دوست ہیں اور پاشکستگی
خوشبوئے زلفِ یار ہے اور ہم سے بے دماغ

کس کی جبیں پہ ہیں یہ ستارے عرق عرق
کس کے لہو سے چاند کا دامن ہے داغ داغ

کرتے ہیں کسبِ نور اسی تیرگی سے ہم
انجم ہیں دل کے داغ گہر ہائے شب چراغ

جگن ناتھ آزاد

دن سے خوف آتا ہے اب رات سے جی ڈرتا ہے
سحر و شام کے لمحات سے جی ڈرتا ہے

وہ ہو غیروں کی جفا یا ہو وفا اپنوں کی
اب تو دنیا تری ہر بات سے جی ڈرتا ہے

ستم و جورِ عزیزاں کا گلہ کیا کیجے
اپنے معصوم خیالات سے جی ڈرتا ہے

مجھ کو بگڑے ہوئے اطوارِ زمانہ کی قسم
اپنے سنورے ہوئے حالات سے جی ڈرتا ہے

اِس شکر خائی و شیریں سخنی کے باوصف
زندگی! تلخیٔ حالات سے جی ڈرتا ہے

جورِ اغیار کی آزادؔ شکایت کیسی
اب تو اپنوں کی ملاقات سے جی ڈرتا ہے

راز مراد ابادی

چمن میں آتشِ گل بھی نہیں دھواں بھی نہیں
بہار تو یہ نہیں ہے مگر خزاں بھی نہیں

بچھڑ گئے ہیں کہاں ہم سفر خدا جانے
نقوشِ پا بھی نہیں گردِ کارواں بھی نہیں

طوافِ کعبہ کیا، بت کدہ بھی دیکھ آئے
سکونِ قلب یہاں بھی نہیں، وہاں بھی نہیں

قفس ہے گوشۂ راحت، قفس ہے دارِ اماں
غمِ چمن بھی نہیں، فکرِ آشیاں بھی نہیں

کہاں کے گیت، کہاں کی غزل کہ ہم سخنو!
بہت دنوں سے ہمیں جرأتِ فغاں بھی نہیں

ناصر کاظمی

رنگ دکھلاتی ہے کیا کیا عمر کی رفتار بھی
بال چاندی ہو گئے سونا ہوئے رخسار بھی

درد کے جھونکوں نے اب کے دل ہی ٹھنڈا کر دیا
آگ برساتا تھا آگے دیدۂ خونبار بھی

بیٹھے بیٹھے جانے کیوں بیتاب ہو جاتا ہے دل
پوچھتے کیا ہو میاں! اچھا بھی ہوں بیمار بھی

شوقِ آزادی لیے جاتا ہے عالم سے پرے
روکتی ہے ہر قدم آوازِ پائے یار بھی

سادگی سے تم نہ سمجھے ترکِ دنیا کا سبب
ورنہ وہ درویش تھے پردے میں دنیادار بھی

کس طرح گزرے گا ناصر فرصتِ ہستی کا دن
جم گیا دیوار بن کر سایۂ دیوار بھی

گھونگٹ اوٹ

سوامی مارہروی

ایک کٹھن پربت سے بھاری، اُلجھی کو سُلجھاوے کون
کاگد لیکھا سب کوئی بانچے[1]، من کی اُلجھن بانچے کون

ندیا کنارے گپ چپ ٹھاڑی، اب یہ بھید بتاوے کون
دو دو نینا، دو دو کھونیا، جیون پار لگاوے کون

دیکھ سکھی! دھن وان[2] ہیں کیسے؟ تجھ کو نردھن[3] لاگے کون
پریم کی مایا، مکتی[4] چھایا، پوچھ تو ان میں راکھے کون

ایک تو مورے جیون ساتھی، اُن سے مجھ کو پیارے کون
دُوجے بس ہیں مرنا جینا، وہ جو جیائے مارے کون

پوتھی پترا پنڈت بانچیں، من کو بانچے جانے کون
من کی پہیلی کس سے بوجھوں، اب یہ بات بتاوے کون

گھونگٹ اوٹ کروں میں کت لنگ، کس کو لیھوں تھام
اک لنگ مورے پریتم ٹھاڑے، اک لنگ ٹھاڑے رام

---

[1] بانچے = پڑھے [2] دھن وان = دولت مند [3] نردھن = مفلس
[4] مکتی = بخشش [5] کت لنگ = کس طرف

ظہور نظر

ہر گھڑی قیامت تھی، یہ نہ پوچھ کب گزری
بس یہی غنیمت ہے تیرے بعد شب گزری

کنجِ غم میں اک گل بھی کھل نہیں سکا پورا
اس بلا کی تیزی سے صرصرِ طرب گزری

جانے کیا ہوا ہم کو اب کے فصلِ گُل میں بھی
برگِ دل نہیں لرزا تیری یاد جب گزری

ایک ساتھ رہ کر بھی دور ہی رہے ہم تم
دھوپ اور چھاؤں کی دوستی عجب گزری

کس طرح تراشو گے تہمتِ ہوس ہم پر
زندگی ہماری تو ساری بے طلب گزری

بے قرار و بے کل ہے جاں سکوں کے صحرا میں
آج تک نہ دیکھی تھی یہ گھڑی جو اب گزری

بعدِ ترکِ الفت بھی یوں تو ہم جیے، لیکن
وقت بے طرح بیتا، عمر بے سبب گزری

پھر نظر پہ حاوی ہیں وہ مناظرِ خوش رنگ
ایک عمر سے جن کی فکرِ تاب و تب گزری

غروب

ظہور نظر

ڈوبتی کرنوں کی مدھم آنچ میں
نیلگوں بادل کا ٹکڑا جل گیا
آگ، گہری سرخ، پیلی، قرمزی
ہر طرف دہکا کے سورج ڈھل گیا
لمبے ٹیلے، سنہرے ہو گئے
ریت پر رنگوں کا جادو چل گیا

ہوتے ہوتے سرمئی ہونے لگی
سبز، گہرے سبز پیڑوں کی قطار
کھو گئیں آغازِ شب کی دھند میں
کونپلیں جو ہو رہی تھیں زرنگار
بن گیا اطلس کی شہرنگی ردا
نہر کا پانی کہ تھا آئینہ دار

میں یہاں آیا تھا خود سے بھاگ کر
دل کو بہلانے سکوں کو ڈھونڈنے
سوچتا ہوں ذہن و دل کو کیا ملا
اپنے رنگوں میں سلگتی شام سے
صرف اک لمحے کا لمس جانگداز!
صرف اک لمحے کی رنگیں روشنی!!
صرف اک بوسہ لبِ احساس پر!
اور وہ بھی گرمیٔ خوں سے تہی!!

شاعر لکھنوی

اُن کا غم بھی نہ رہا پاس تو پھر کیا ہوگا
لُٹ گئی دولتِ احساس تو پھر کیا ہوگا
کون تا صبح جلائے گا تمنا کے چراغ
شام سے ٹوٹ گئی آس تو پھر کیا ہوگا
جن کی دوری میں وہ لذت ہے کہ جیتا ہے دل
آ گئے وہ جو کہیں پاس تو پھر کیا ہوگا
تم سے زندہ ہے تمنائے مذاقِ احساس
تم ہوئے دشمنِ احساس تو پھر کیا ہوگا
دل غمِ دوست پہ مغرور بہت ہے لیکن
غم بھی آیا نہ اگر راس تو پھر کیا ہوگا
اپنی مخمور نگاہوں کو نہ دو اذنِ خرام
بڑھ گئی اور اگر پیاس تو پھر کیا ہوگا
ہم پریشاں تھے پریشاں ہیں پریشاں ہوں گے
تم کو آئی نہ خوشی راس تو پھر کیا ہوگا
عظمتِ عشق ہے خودداریِ دل اے شاعرؔ
بجھ گیا شعلۂ احساس تو پھر کیا ہوگا

نور بجنوری

چھلکنے لگا ہے ترا غم بہت
دیے ہو چلے اب تو مدھم بہت
گھٹاؤں میں طوفاں کے آثار ہیں
تری زلف ہے آج برہم بہت
یہاں لہلہاتے ہیں اشکوں میں باغ
نہ اترائے پھولوں پہ شبنم بہت
یہ وہ دور ہے جس کا درماں نہیں
یہ وہ راز ہے جس کے محرم بہت
یہ دامان وحشت کی کچھ دھجیاں
بنائیں گے لوگ ان سے پرچم بہت
گدائے محبت کی خودداریاں
ملے راہ میں خسرو و جم بہت
سلگتی رہی رات بھر چاندنی
شب ہجر تھی روشنی کم بہت
نہ جائے گی دل سے کبھی آرزو
یہ بنیاد ہے آہ محکم بہت

پولونیئس

(شیکسپیئر بھائی کا ایک ولین)

مصطفٰے زیدی

میں اُس افسانے کا کردار ہوں جس کا ہیرو
عرش پر چلتا ہے، تاروں پہ قدم رکھتا ہے
اُس کی تحویل میں یونان کے بُت رہتے ہیں
وہ کنیزوں میں نگارانِ مجسم رکھتا ہے
تخت و طاؤس و طرب زار و غزال و نکہت
دیر و فردوس و صنادید و حرم رکھتا ہے

وہ اُس افسانے کا ہیرو ہے جس افسانے میں
میں جب آتا ہوں تو بے جیب و قبا آتا ہوں
رنگ اور نور کے سیلاب میں میری صورت
آئینہ دیکھنے لگتا ہے تو شرماتا ہوں
دن گزرتا ہے نئے زخموں کو گنتے گنتے
رات آتی ہے تو ہر زخم کو سہلاتا ہوں

وہ تو بس ایک ہے، اور مجھ سے گریباں بیزار
اتنی تعداد میں ہیں جیسے کہیں مور و مگس
ریشم اس کے لبادے کے لئے چلتا ہے
اور مرے دل میں دھڑکتا ہے سوالوں کا جرس
آخر اک عمر کی محنت مرے کس کام آئی؟
اس بڑھاپے کی سعادت مرے کس کام آئی؟
میری بچی کو بہا لے گئی چھوٹی سی ندی،
سیکڑوں سال کی حکمت مرے کس کام آئی؟

میں اُس افسانے کا کردار ہوں جس کے کردار
اک ذرا دھوپ میں نکلیں تو پگھل کر رہ جائیں
خواب اور فکر کی آغوش میں رہنے والے
وقت کی آنچ میں آ جائیں تو جل کر رہ جائیں
ہم کسی اور شب و روز سے مانوس نہیں
اپنی اقلیم سے نکلیں تو نکل کر رہ جائیں

اسی خطرے سے نہ ماضی کی طرف آنکھ اُٹھی
مڑ کے دیکھیں گے تو بن جائیں گے ہم سنگِ نمک
نہ کوئی غم، غمِ آخر، نہ مسرت بے لوث
اپنے امروز پہ تنقید نہ فردا پہ کسک
یہ جھجکتی ہوئی باتیں، یہ دھڑکتے ہوئے ذہن
محض خطرے کی عنایات فقط نوکِ پلک

صرف میرے دلِ شوریدہ و ناشستہ کو
کچھ نہ کچھ بننے کی حسرت تھی مگر بن نہ سکا
ایک شعلے کو بھی حاصل نہ ہوا رقصِ دوام
ایک آنسو بھی، مقدر سے، گہر بن نہ سکا
میں نے ہر چند ہواؤں میں بچھائے نشتر
کوئی چوکھٹ، کوئی گوشہ، کوئی گھر بن نہ سکا

جس نے دیکھی مری پرواز، تمسخر سمجھا
اپنے بھی مجھ پہ ہنسے غیر سے بیگانے بھی
میری اس بے پروبالی کا تماشہ کرنے
اہل ادراک بھی آجاتے تھے دیوانے بھی
اس کے یونان کے بت دیکھ کے سب بھول گئے
ورنہ اطراف میں ہیں میرے صنم خانے بھی

کتنے ہنگامے ہیں اس شہر میں سب جانتے ہیں
کتنے ہنگامے ہیں اس قصر میں کس کو معلوم
اس کے دربار کے پالے ہوئے بدشکل غلام
اس کی بے نام حسیناؤں کا حسنِ محروم
اس کی راہوں میں سلگتے ہوئے عنبر کا دھواں
اس کی خدمت میں مذاہب کے طلسمانہ رسوم

لوگ سائے کی طرح چلتے ہیں، کھو جاتے ہیں
قافلے چلتے ہیں، دوکان بھی رہتی ہے
برف جم جاتی ہے ہر راہ پہ لیکن جس میں
میری بچی کی لحد ہے وہ ندی بہتی ہے
اس کے نغموں میں جو آہنگ ہے اس کی بابت
میں نہیں کہتا، مری نوحہ گری کہتی ہے

میں وہ کردار ہوں جس کو غمِ دل کے باوصف
لوگ کہتے ہیں کہ بے حس ہے خراباتی ہے
سانس چلتی ہے تو بے لذتِ رفتارِ خرام
موت آتی ہے تو بے زحمتِ سفر آتی ہے
میرا جو کام ہے وہ نقص ہے اور نقص ضعیف
اس کی جو بات ہے وہ وصف ہے اور ذاتی ہے

میری سازش پہ تو راتوں نے گواہی دی ہے
اس کی سازش کو نسیمِ سحری سے پوچھو
کون دیوانہ تھا، اور کون نہایت ہشیار
پوچھنے والوں کی افسانہ گری سے پوچھو
کون سے جرم میں برباد ہوا روزنکرانتز
میرے ہیرو کی فراستِ نظری سے پوچھو

آج کی رات پھر اسٹیج پہ رونق ہوگی
اولڈوک شہرِ طلسمات نظر آئے گا
دیکھنے والوں کو ہر سازشِ خوں کے پیچھے
میرا خنجر اک، مرا ہاتھ نظر آئے گا
اور میں رسم و روایات کی ضد کے باوصف
آج اک جست کو سیماب کی سیرت دے کر
اپنی افسانوی ہیئت کو بدل ڈالوں گا
جب مری روح برافگندہ نقاب آئے گی
لوگ گھبرا کے چلے جائیں گے اور میں چپ چاپ
ان نئے زخموں کو ویرانے میں سہلاؤں گا!

اشارات:۔

۱۔ پولونیس: شیکسپیر کے ڈرامے "ہیملٹ" کا جہاں دیدہ وزیر
۲۔ روزنکرانتز: ہیملٹ کا دوست جو بعد میں ہیملٹ کے ہاتھوں ہی مارا گیا
۳۔ اولڈوک: لندن کا شیکسپیرین تھیٹر۔ انگلستان کا قومی اسٹیج۔

منیر نیازی

اشارے

شہر کے مکانوں سے

سرو سائبانوں کے

دلربا نکلے سائے

خواہشوں سے گھبرائے

رہروؤں سے کہتے ہیں

رات کتنی ویراں ہے

موت بال افشاں ہے

اس گھنے اندھیرے میں

خواہشوں کے ڈیرے میں

لاکھ دل دھڑکتے ہیں

ان کے پاس جانے کے

لاکھ چور رستے ہیں؟

بے وفائی

رنگ کی بیل کو اُٹھا کر
دور تک جانا بہت دشوار ہے
ہر در و دیوار سے مل کر جدا ہوتی ہوا سے
دیر تک نظریں ملانا بھی بہت دشوار ہے
آنکھ کے آنسو کو
ہیرے کی طرح دل میں چھپانا بھی بہت دشوار ہے

دُوریوں پر بیٹھ کر ہنستی ہیں سکھ کی دُلہنیں
شرم کے فانوس سے جلتے ہیں شہروں کے مکاں
جذبۂ شب کی کلی ابھری ہوئی
کھولتی ہے عشرتوں کے سیل کا قفلِ گراں
رینگتے چلتے ہیں دشتِ شوق میں
حسن کے جادو میں ڈوبے محلوں کے کارواں

لاکھ کوئی دوریوں پر بیٹھ کر روتا رہے
رنگ کی بیل کو اُٹھا کر
دُور تک جانا بہت دشوار تھا
ہر در و دیوار سے مل کر جدا ہوتی ہوا سے
دیر تک نظریں ملانا بھی بہت دشوار تھا

وحید قریشی

کوئی نہ چاہنے والا تھا حسنِ رسوا کا
دیارِ غم میں رہا دل کو پاس دنیا کا
فریبِ صبحِ بہاراں بھی ہے قبول ہمیں
کوئی نقیب تو آیا پیامِ فردا کا
ہم آج راہِ تمنا میں جی کو ہار آئے
نہ درد و غم کا بھروسا رہا نہ دنیا کا
تری وفا نے دیا درسِ آگہی ہم کو
ترے جنوں نے کیا کام چشمِ بینا کا
الجھ کے رہ گئی ہر تان سے نوائے لرزش
طلسم ٹوٹ گیا حسنِ نغمہ پیرا کا
شبِ فراق میں تارے گنے تو نیند آئی
یہ حال ہو گیا آخر تمھارے شیدا کا
وحید گرمیِ اندیشہ نے غضب ڈھایا
سلگ رہا ہے ابھی ہاتھ خامہ فرسا کا

تعبیر

حمایت علی شاعر

کس بزم میں لے آئی اے دل تری ویرانی
دیواروں کی رنگت فق، دروازوں پہ چپ طاری
مبہوت سی خاموشی، گم سُم سی فضا ساری
ہر دل پہ گراں دھڑکن، ہر روح پہ تن بھاری
کعبہ ہو کہ بت خانہ، پتھر کی عمل داری

کیا چشم و لب و عارض، کیا زلف، گلو، شانے
ہر رخ پہ منقش ہیں تہذیب کے ویرانے
دم توڑتے جاتے ہیں جلتے ہوئے پروانے
اور شمع نہیں جانے اپنے ہیں کہ بیگانے

یہ بزم طرب اور یہ آداب عزاداری
نغموں کی کشاکش سے ہر ساز کا دل عاری
ساقی ہے تو ساقی کی نظروں میں وہ پُرکاری
ہر رند تہی ساغر اور فیض کرم جاری

جس سمت نظر کیجے، اک عالم حیرانی
یا زیست کی ویرانی، یا موت کی ارزانی
نے زہد شراب آگیں، نے کفر مسلمانی
کس بزم میں لے آئی اے دل تری ویرانی!

یہ اُونچے دریچے

احمد ریاض

یہ اونچے شبستاں یہ گلرنگ چلمن
یہ کھلتے کبھی بند ہوتے دریچے
وفا سے جفا تک کئی روپ بدلیں
کبھی گل بکھیریں، کبھی خوں رُلائیں
کبھی دامنوں میں ستارے سمیٹیں
کبھی آنسوؤں سے چراغاں منائیں

اجڑتے زمانوں کے دکھ درد بانٹیں
گراں بار صدیوں کے نوحے سنائیں
پراسرار خوابوں کے اسرار کھولیں
چھپی آرزوؤں کے گھونگھٹ اٹھائیں

یہ گلرنگ چلمن یہ تابندہ چلمن
ہزاروں شکستوں کے افسانہ خواں ہیں
ہزاروں دبی خواہشوں کے دفینے
ہزاروں تباہ وحشتوں کی زباں ہیں

یہ کھلتے کبھی بند ہوتے دریچے
سناتے ہیں دام و قفس کی کہانی
دکھاتے ہیں تصویرِ مرگِ محبت
سناتے ہیں جور و ہوس کی کہانی

یہ اُونچے شبستاں یہ خوشیوں کے مقتل
یہاں عاشقی خونفشاں نیم جاں ہے
یہاں کوئی آنچل نہ دامن مقدس
یہاں دلبری صیدِ قہرِ شہاں ہے

یہ اونچے شبستاں دریچے کہ چلمن
محبت کو آواز تک دے نہ پائے
کبھی حسن پر نغمہ بن کر نہ برسے
کبھی عشق کو ساز تک دے نہ پائے

انھیں عشق نے مرکزِ دل سمجھ کر
یہاں اپنی خوشیوں کے سجدے لٹائے
انھیں بارگاہِ تمنا سمجھ کر
عقیدت کا خوں دے کے گلشن کھلائے

گو عشق تو عشق ان محفلوں میں
کبھی حسن نے اپنا منصب نہ پایا
کبھی عظمتِ گلعذاراں نہ چمکی
کبھی شوق نے عرضِ مطلب نہ پایا
وفا سے جفا تک کئی روپ بدلیں
یہ زریں شبستاں یہ اونچے دریچے

تعبیر

آغا صادق

میں نے پھولوں کے خواب دیکھے تھے　　میرا کانٹوں سے بھر گیا دامن!
میں نے جینے کی آرزو کی تھی　　مجھ کو پہنایا زندگی نے کفن!

روشنی کے لئے پکارا تھا!　　مجھ کو تاریکیوں نے گھیر لیا!
میں نے آبِ حیات مانگا تھا　　خضر نے اس میں زہر گھول دیا!

میں نے چاہا تھا پونچھ لوں آنسو　　پھوٹ نکلے لہو کے فوارے!
ابرِ رحمت پہ تھی نظر میری　　مجھ پہ برسے فلک سے انگارے!

منتظر تھا بہارِ جنت کا!　　مجھ پہ لپکے شرارِ جہنم کے!
سازِ عشرت کے تار چھیڑے تھے　　اس سے نالے نکل پڑے غم کے!

کیا خبر تھی کہ نو عروسِ بہار　　یوں لٹا کر سہاگ نکلے گی!
رس بھری کونپلوں کے ہونٹوں سے　　کیا خبر تھی کہ آگ نکلے گی!

میں نے کلیوں کے ہار گوندھے تھے　　طوقِ آہن بنا دئے کس نے؟
دوستی کو جو ہاتھ اُٹھے تھے　　اُن میں خنجر تھما دئے کس نے؟

پریم واربرٹنی

ہو گیا ہوں ہر طرف بدنام تیرے شہر میں
یہ ملا ہے پیار کا انعام تیرے شہر میں

تو نے جب پہلے پہل شرما کے دیکھا تھا مجھے
ہائے کیا رنگین تھی وہ شام تیرے شہر میں

ایک میں ہی تھا کہ اس عالم میں بھی زندہ رہا
مجھ پہ آئے سینکڑوں الزام تیرے شہر میں

اس قدر پابندیاں آخر یہ کیا اندھیر ہے
لے نہیں سکتے ترا ہی نام تیرے شہر میں

اب تو یادوں کے افق پہ چاند بن کو مسکرا
روتے روتے ہو گئی ہے شام تیرے شہر میں

کب کھلے گا تیرے میخانے کا در میرے لئے
پھر رہا ہوں لے کے خالی جام تیرے شہر میں

کیا کبھی تو نے بھی سوچا ہے کہ دیوانہ ترا
ہو گیا کیوں اس قدر بدنام تیرے شہر میں

تیری عظمت نے کیا آذر کے فن کو شرمسار
یوں تو تھے کچھ اور بھی اصنام تیرے شہر میں

ہم نے دیکھا حسن کو چھپ کر لہو روتے ہوئے
ہم نے دیکھا عشق کا انجام تیرے شہر میں

تیرے در پہ ایک سجدہ کی اجازت بھی نہیں
زندگی ہے موت کا پیغام تیرے شہر میں

جانتا تھا کون مجھ سے شاعر گمنام کو
تجھ سے ہی روشن ہے میرا نام تیرے شہر میں

جب سنہری چوڑیاں بجتی ہیں دل کے ساز پہ
ناچتی ہے گردش ایام تیرے شہر میں

پھر چلا ہوں میں تری دھن میں غزل گاتا ہوا
پھر کھلے ہیں گیسوؤں کے دام تیرے شہر میں

نگارِ شہر

مظہر امام

نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے
(غالب)

مری نگارِ دل آرا! گراں ہے سنگِ حیات
غمِ وفا سے بہت چُور ہو گیا ہوں میں
فسونِ عشق سلامت، مگر یہی ہے مآل
کہ تم سے ہو کے قریں، دور ہو گیا ہوں میں
تمھاری چارہ گری پر نہیں ہے کچھ الزام
جو قلبِ وقت کا ناسور ہو گیا ہوں میں

مجھے خبر ہے کہ تم کو بھی کچھ قرار نہیں
سکونِ دل تھا، علاجِ فسردگی تھا میں
ہے رنگ و نور سے عاری اگرچہ میری حیات
تمھارے عارضِ گلگوں کی دلکشی تھا میں
چراغِ کشتۂ ایام ہی سہی، لیکن
تمھاری محفلِ عشرت کی روشنی تھا میں

مجھے گلہ ہے خود اپنے ہی دل کی وحشت سے
بجائے خار، جو پھولوں کو چُبھنے لگتا ہے
وہ نغمے آج تلک ہیں جو نا سرائیدہ
یہ خود فریب ہے، ان کو بھی سننے لگتا ہے
بس ایک سادہ و بے لوث مسکراہٹ سے
نئی اُمید، نئے خواب بُننے لگتا ہے

بُجھی بُجھی سی ہے شوخی، بُجھا بُجھا سا حجاب
بُجھی بُجھی سی خموشی، بُجھی بُجھی آواز
بُجھی بُجھی سی جوانی، بُجھا بُجھا سا جمال
بُجھی بُجھی سی ادائیں، بُجھے بُجھے انداز
بُجھی بُجھی سی تمنّا، بُجھی بُجھی سی اُمنگ
بُجھے بُجھے سے ہیں نغمے، بُجھے سے ہیں ساز

ہوئی نہیں ہو شگفتہ بہ قدرِ ذوقِ نظر
یہ اور بات ہے سلطانۂ بہار ہو تم
خبر نہیں کہ ہیں دامن پہ خون کے چھینٹے
غرورِ بے گنہی کی گناہ گار ہو تم
کمند چاند ستاروں پہ ڈالتی ہو مگر
خود اپنی ظلمتِ ماحول کا شکار ہو تم

یہ بزمِ نازِ نگارانِ شہر ہے جس میں
مرے کلام، مری شاعری کا چرچا ہے
مرے شعور کی، میری خرد کی باتیں ہیں
مرے جنوں کا، مری عاشقی کا چرچا ہے
مگر یہ روح، کہ ہے تشنہ کام ہی اب تک
ہزار بادۂ آسودگی کا چرچا ہے

جو بارِ خاطرِ نازک نہ ہو تو عرض کروں
تمھاری راہ ہے مسدود، میری نامسدود
قدم قدم پہ ہے احساسِ خستگی تم کو
ملے گی کیسے تمھیں اپنی منزلِ مقصود؟
دلوں کے ساز میں آہنگ کیسے پیدا ہو؟
تمھاری فکر ہے محدود، میری لامحدود

کہاں کا ذکرِ بہاراں، کہ اپنے گلشن میں
فریب خوردۂ جوششِ نمو رہا ہوں میں
خزانہ ہائے محبت لٹا دیے میں نے
مگر خود اپنے سکوں کا عدو رہا ہوں میں
نہ کیف یاب ہوا وصفِ انکسار و خلوص
کہ مے کشِ قدحِ "ما و تو" رہا ہوں میں

میں چاہتا تو نہ تھا غم کا تذکرہ کرنا
مگر میں غم کی شکایت کروں تو کس سے کروں؟
ستا رہا ہے یہ احساس مجھ کو برسوں سے
بیانِ دل کی حقیقت کروں تو کس سے کروں؟
یہ سچ سہی کہ جنونِ وفا نہ راس آیا
مگر میں ترکِ محبت کروں تو کس سے کروں؟

جمیل ملک

کھلا کھلا سا ہر اک گام پر چمن دیکھا
تمھارے شہر کی گلیوں کا بانکپن دیکھا

جو اپنی سمت نظر کی تو دل کے پاس ملا
دمن دمن جسے ڈھونڈھا چمن چمن دیکھا

تجھی سے محفلِ کون و مکاں میں ہنگامے
کہاں کہاں نہ تجھے جانِ انجمن دیکھا

ہماری قدر جو ہونا تھی سو ہوئی لیکن
ٹھٹکا سا تجھے بھی عروسِ فن دیکھا

نہیں تھا اذنِ تکلم مگر سرِ مقتل
ہر ایک دل میں تلاطم سا موجزن دیکھا

یہ خوابناکیِ وحشت بہ شورِ بربط و چنگ!
کبھی حضور نے دنیا کا بھی چلن دیکھا!!

چلو جمیل چلو دیں جنوں کی رسمِ کہن،
سبھی کو خاک بسر چاک پیرہن دیکھا

اختر ہوشیارپوری

ہم سے پوچھو کہ بے کراں تھے پھول
کبھی دل تھے کبھی جہاں تھے پھول
بوئے گل لوٹ کر نہیں آئی !
کن بہاروں کے رازداں تھے پھول
ہم ہیں اب اور اُجاڑ تنہائی
اپنے دل کا بھی نشاں تھے پھول
کوئی سمجھا کوئی نہیں سمجھا
زندگی کے فسانہ خواں تھے پھول
رنگ ہی رنگ تھا نگاہوں میں
آنکھ جھپکی تو پھر کہاں تھے پھول
تھے جہاں پر وہیں رہے کانٹے
اور ہر انجمن کی جاں تھے پھول
چاکِ دامن ہی دل کا تھا غمّاز
اور کیا کرتے بے زباں تھے پھول
مجھ کو ایسا کبھی گماں بھی نہ تھا
حرفِ تعمیرِ آشیاں تھے پھول
اک تبسم تھی زندگی ان کی
پھر رہینِ غمِ خزاں تھے پھول
ماہ و انجم تو تھے تماشائی
میری راتوں کے ہم زباں تھے پھول

شکیب جلالی

زنجیر کی جھنکار کو سنگیت میں ڈھالا
زنداں میں بھی جینے کا عجب ڈھنگ نکالا

اک آپ کہ زلفوں میں پروتے ہیں ستارے
اک ہم کو میسر نہیں اشکوں کی بھی مالا

وہ خاک نکھاریں گے خد و خال سحر کے
جو چہرۂ مہتاب پہ بنتے رہے جالا

تپتے ہوئے صحرا کے کسی کام نہ آیا
گلگشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

ہم نے جسے آزاد کیا حلقۂ شب سے
حاصل نہیں ہم کو اسی سورج کا اجالا

انسان کی عظمت کی گواہی کے لئے ہو
کعبہ ہو کہ بت خانہ، کلیسا کہ شوالا

مظہر امام

ہوں خندہ بلب، زورِ الم یوں تو بہت ہے
روشن ہے نگہ، ظلمتِ غم یوں تو بہت ہے
اے کاش! ترے سایۂ گیسو میں کٹے عمر
آرام ترے سر کی قسم یوں تو بہت ہے
کس کام کی مے جب دلِ ساقی سے نہ چھلکے؟
ہونے کو مئے ساغرِ جم یوں تو بہت ہے
ہونٹوں تلک افشردۂ انگور نہ آیا
ساقی کی نگاہوں کا کرم یوں تو بہت ہے
ہے ہیچ وہ تسلیم رہِ صنم خانہ بہ دستور
آرائشِ گیسوئے صنم یوں تو بہت ہے
تیری نگہِ لطف بھی کچھ کم تو نہیں ہے
اے دوست! زمانے کا ستم یوں تو بہت ہے
سورج کے نکلنے پہ بھی رہ جائیں تو جانیں!
رہنے کو اندھیروں کا بھرم یوں تو بہت ہے
ہو آئیں امام! آج ذرا اُن کی گلی سے
مشہور گلستانِ ارم یوں تو بہت ہے

باقر مہدی

کون بھلا یہ کہتا ہے خود آ کے ہم کو منائیں آپ!
ٹوٹا دل اب کیسے جڑے گا جھوٹی قسمیں نہ کھائیں آپ!

پتھر سینے پر رکھ لیں گے، جیتے جی مر جائیں گے
آپ کو قاتل کون کہے گا، کیوں ناحق گھبرائیں آپ؟

راہِ وفا پر چلتے چلتے اپنی عظمت بھول گئے تھے
چھوڑی ہم نے رسمِ پرستش اب نہ کرم فرمائیں آپ

سحر کیا، اعجاز کیا ہے، درد کا شعلہ برف بنا ہے
ترکِ محبت ہم کو مبارک، کیوں ناحق پچھتائیں آپ؟

جوشِ جنوں کا دور نہیں ہے دل کے سکوں کا دور نہیں ہے
غم ہے بنا کیسے کم ہوگا آئیں آپ نہ آئیں آپ

تشنہ لبی کچھ اور بڑھی ہے میخواری کی دھوم مچی ہے
آخر ہم سے رندِ بلاکش کیسے پیاس بجھائیں آپ؟

جلیل حشمی

جو تیری افشاں سنواریں زندگی اے زندگی
روز و شب ایسے گزاریں زندگی اے زندگی
بڑھ گیا دریا کا پانی کف اڑاتا موج موج
اڑ گئیں کونجوں کی ڈاریں زندگی اے زندگی
ہر طرف چھایا ہوا ہے اک سکوتِ بے کراں
پھر بھی ہم تجھ کو پکاریں زندگی اے زندگی
تیری صورت پر گمانِ دشت و صحرا ہائے ہائے
تیرے قدموں میں بہاریں زندگی اے زندگی
سر اٹھائیں دار پر یا دیں سرِ مقتل صدا
نقش تیرے ہی اُبھاریں زندگی اے زندگی
جن کے ہونٹوں پر سدا بجتے ہیں تیرے زمزمے
اُن کے سینوں میں کٹاریں زندگی اے زندگی
شہر ہے آخر یہ کوئی دشت و ویرانہ نہیں!
جینے والے دم نہ ہاریں زندگی اے زندگی
دیں جو تجھ کو فرصتِ یک دو نفس کی تہمتیں
اُن سے بھی ہم لوگ ہاریں زندگی اے زندگی
دور تک ملتا نہ ہو نام و نشاں تیرا جہاں
ہم وہاں دامن پساریں زندگی اے زندگی

تقریظ

مولانا محمد علی جوہر

۱۸۹۰ء کی گرمیوں میں جبکہ میری عمر ساڑھے گیارہ برس کی تھی میں اپنے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ جنہوں نے اسی سال انٹرنس یا آجکل کی اصطلاح میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا تھا، بریلی کے اسکول سے علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم میں پڑھنے کے لئے آیا۔ میرے منجھلے بھائی مولانا ذوالفقار علی صاحب گوہر غالباً مجھ سے پہلے ہی علی گڑھ آچکے تھے۔ اس "نیچر گڈھ" میں تقریباً سبھی طلبا کی ایک ہی سی وضع قطع تھی۔ شیروانی، اچکن، ترکی ٹوپی، سیدھا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ، قمیص، جراب، انگریزی جوتا یہی سب کا لباس تھا۔ کوئی شیروانی کی جگہ تنگ کوٹ پہنا کرتا تھا، ترکی ٹوپی کی جگہ کوئی سیاہ ایرانی ٹوپی اوڑھا کرتا تھا، کوئی کبھی کبھی کرتہ بھی پہن لیا کرتا تھا مگر داڑھیاں سوائے ایک آدھ کے سب کی منڈی ہوئی ہوتی تھیں گو مونچھوں کے بھی صفایا کرانے کا فیشن اس وقت تک رائج نہیں ہوا تھا۔ بال سب کے آگے سے چھوٹے ہوتے، پیچھے سے بتدریج زیادہ کترے ہوئے ہوتے تھے جو آج سارے ہندوستان میں رائج ہیں اور جنہیں ولایت تک کی عورتوں نے اسی طرح کتروانا قبول کرلیا ہے اور جو "انگلش کراپ" کے نام سے موسوم ہیں لیکن جس کچی بارک میں ہم تینوں بھائی رہتے تھے اسی کے پاس والی کچی بارک میں اور اس بیچ والے کمرے میں جہاں ایک مدت سے "[illegible] ہاؤس" بن گیا ہے ایک صاحب سادات سنت گھرانے کے بڑے پڑھے صاحب، رہتے تھے جو خالص ہندوستان کی پرانی وضع کی اچکن پہنا کرتے تھے" ٹوپی ان کے وطن امروہہ کی ساخت کی کشتی نما[1] ہوتی تھی جسے اب "گاندھی کیپ" کہا جاتا ہے۔ جوتا دہلی کا سلیم شاہی وضع کا مگر سادہ ہوتا تھا اور جن کے بال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح لانبے تھے اور اگرچہ "بر دوش" نہ سہی لیکن "تا بناگوش" ضرور آتے تھے، مگر ان لمبے بالوں کے باعث اچکن پر تیل وغیرہ کا دھبہ نہ پڑ جائے تو وہ گردن میں ایک سپید جامے کا رومال اسی طرح ضرور باندھا کرتے تھے جس طرح سرسید رحمۃ اللہ علیہ اپنے گلے کی رسولی چھپانے کے لئے استعمال فرمایا کرتے تھے۔ یہ وضع قطع اس زمانے کے بزرگوں کی اس وقت تک باقی تھی لیکن علی گڑھ جیسے "نیچر گڈھ" کے کسی طالب علم کا اس وضع قطع کو برقرار رکھنا اس زمانہ میں اس سے بھی زیادہ

---

[1] امروہہ (یو۔پی) کی کشتی نما ساخت کی ٹوپی میں اور "گاندھی کیپ" میں نمایاں فرق یہ تھا کہ گاندھی کیپ تو عموماً سپید کھدر کی ہوتی تھی اور امروہہ ساخت کی ٹوپی ریشم اور کلابتون کی کڑھی ہوئی ہوتی تھی۔

نمایاں تھا جیسا کہ کسی پروین بیٹی کا کرچ بڑے بال رکھتا، نیچا سایہ پہنتا اور سینہ اور گردن، بازوؤں اور پاہوں سب کو کپڑے سے ڈھانپنا نمایاں ہو گا اس لئے میری نظر بھی آتے ہی ان بزرگ پر پڑی اور اگر انہیں کسی اور طرح کا امتیاز نہ بھی حاصل ہوتا تب بھی میں ضرور اپنے بھائیوں سے پوچھتا کہ یہ اس عجیب وضع قطع کے بزرگ کون ہیں لیکن محمود داؤد صاحب کو کون نہیں جانتا تھا۔ علی گڑھ کالج میں اس وقت سب سے زیادہ ممتاز اور ہردلعزیز جو جماعت تھی اور جس میں محمد حبیب اللہ[1] خاں صاحب، احمد حسنین[2] مرحوم، نسیم[3] بیگ صاحب چغتائی جیسے طلبا شامل تھے اس کے سردار یہی پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کے کمرے پر جیسیوں ممتاز ترین طلبہ کا مجمع رہا کرتا تھا۔ جن میں میرے بھائی ذوالفقار علی[4] خاں گوہر بھی ہوتے تھے، حیدر آباد کے ممتاز افسر مال قطب الدین[5] صاحب دہلوی (شوخ) بھی ہوتے تھے، چودھری ممتاز حسنین[6] صاحب بھی ہوتے تھے اور چریا کوٹ کے ایک صاحب جن کا نام غالباً احمد مظفر[7] صاحب تھا اور شہر کے باہر اپنے والد بزرگوار خاں بہادر سید زین العابدین[8] صاحب کی کوٹھی پر رہنے والے سید زین الدین[10] بھی ہر روز وہیں آیا کرتے تھے۔ میں ان ممتاز طلبہ کی جماعت کے پاس ہی رہنے سے خوش بھی تھا مگر ساتھ ہی ساتھ تنگ بھی آ گیا تھا کیونکہ ان حضرات کو کسی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے گدگدی بے حد لگتی ہے اور مجھے پکڑ کر بے حد گدگدایا کرتے تھے۔ مولانا طفیل احمد[9] صاحب اور داؤد صاحب تو اس قدر متقی اور سنجیدہ بزرگ تھے کہ وہ کسی کو کیا دق کرتے مگر حبیب اللہ خاں صاحب، نسیم بیگ صاحب اور زین الدین صاحب مجھے بے حد پریشان کیا کرتے تھے۔ ایک میرے دوش [illegible]

---

[1] یعنی خان بہادر الحاج محمد حبیب اللہ خاں صاحب بی۔ اے (علیگ) سابق کلکٹر یو۔ پی جنہوں نے مدت العمر اپنے مادر علمی کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی اس پیرانہ سالی میں انجام دے رہے ہیں اور علی گڑھ ہی میں مقیم ہیں۔

[2] احمد حسنین بی۔ اے مرحوم [illegible] میں کالج میں داخل ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے پاس کر کے ریاست رام پور کے اسٹیٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہوئے عرصہ ہوا انتقال ہو گیا۔

[3] مرزا نسیم بیگ چغتائی بی۔ اے (علیگ) آگرہ کے رہنے والے [illegible] میں کالج میں درجہ سوم میں داخل ہوئے [illegible] میں بی۔ اے پاس کر کے اول علی گڑھ کے ایک کلکٹر کیٹلی کے جن کی آنکھیں خراب تھیں پرسنل اسسٹنٹ ہوئے پھر وہیں ملازم ہو گئے اس کے بعد آگرہ کالج میں رہ کر بہادر پھر اتفاق سے ڈپٹی کلکٹر ہوئے خان بہادر کا خطاب حاصل کیا آخر میں جودھپور میں ہی رہے۔ بڑے لطیفہ گو تھے ان کے کئی بیٹے تھے جن میں مرزا عظیم بیگ چغتائی نے ادبیات و افسانہ نویسی میں بڑی شہرت حاصل کی۔

[4] یہ قادیانی فرقہ میں شامل ہو کر قادیان ہی میں مقیم رہے ان کے ہمعصروں کا قول ان کے بارے میں ہے کہ بڑے خوش گو تھے۔

[5] یہ دہلی کے رہنے والے تھے [illegible] میں کالج میں آئے اور [illegible] میں بی۔ اے کیا ابتداءً فوج میں ملازمت کی پھر ریاست حیدر آباد میں تعلقداری کا عہدہ ملا اور افسر مال رہے۔

[6] چودھری ممتاز حسنین ولد علی بخش خاں ساکن پانی پت۔ [illegible] میں داخل ہوئے اور [illegible] میں انٹرمیڈیٹ کر کے نائب تحصیلدار پھر تحصیلدار رہے پھر عرصہ ریاست دوجانہ میں منیجر بھی رہے۔

[7] مولوی احمد مظفر عباسی ساکن چریا کوٹ علی گڑھ سے جا کر حیدر آباد میں کسی منصب پر فائز ہوئے۔

[8] خان بہادر سید زین العابدین مرحوم سر سید کے احباب خاص میں تھے۔ علی گڑھ میں عرصہ تک سب جج رہے۔

[9] مولانا طفیل احمد مرحوم [illegible] میں داخل ہوئے اور [illegible] میں فورتھ ایئر سے آنکھوں کی خرابی کی وجہ سے تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوئے طبیعت کی یکسانیت کی وجہ سے داؤد صاحب سے ان کے بڑے گہرے تعلقات مدت العمر تک رہے۔ کالج و یونیورسٹی و کانفرنس کی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔

[10] سید زین الدین ایم۔ اے (علیگ) ابتداءً ڈپٹی کلکٹر ہوئے پھر کلکٹر۔ ریٹائر ہو کر ریاست رام پور میں ریونیو منسٹر رہے۔ شروع شروع میں بڑے فٹ بال کے کھلاڑی تھے آخر میں اعمال مذہبی کے صوم و صلوٰۃ کے پابند صوفی منش ہو گئے تھے۔

دوسرا دونوں ٹانگیں، جب میں اس طرح "پابدست دگرے دست بدست دگرے" ان رندانِ باصفا کی صحبت میں گرفتار رہتا تو تیسرا پیٹ میں گدگدی کرتا اور میں بیتاب ہو جایا کرتا۔ اس کے بعد تو میری پریشانی نے اس قدر ترقی کی کہ حبیب اللہ خاں صاحب مجھے دور ہی سے دیکھتے تو اس طرح اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے کہ گویا مجھے گدگدا رہے ہیں اور میں دور ہی سے بیتاب ہونے لگتا۔

اس زمانہ میں یونین کے افسروں کا انتخاب ہوا اور چونکہ اس وقت تک اسکول کے طلبہ بھی یونین کے ممبر ہو سکتے تھے ہم بھی انتخاب میں رائے دینے کی غرض سے ممبر بنائے گئے اور مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے بھی داؤد صاحب کی پوری پارٹی کے لئے بالکل اسی فہرست کے مطابق رائے دی جو ہم سب کو پہلے سے دے دی گئی تھی تاکہ ہم اس کے نام یاد کرلیں۔ بیسیوں نئے ممبر دونوں طرف سے بنائے گئے تھے اور بیک[1] صاحب خوش خوش پھر رہے تھے کہ یونین[2] کی آمدنی بھی بڑھی اور غیر اسی وجہ سے کئی نئے ممبر تو داخل ہو گئے۔ اس سال غالباً مظہر الحق[3] صاحب بجلی بھٹو جن کے اس وقت کے مٹے کالج کے لڑکوں کا یہ شعر گھڑا گیا تھا۔

عجب ہے جھنگ کا پیالہ ! ! ! ! ! ہو ہو ہو
ہوا بھٹو کا منہ کالا ! ! ! ! ہو ہو ہو

وائس پریذیڈنٹ اور محمد داؤد صاحب سیکرٹری منتخب ہوئے۔ دوسرے سال احمد حسین صاحب مرحوم اور حبیب اللہ خاں صاحب ان عہدوں کے لئے منتخب ہوئے اور غالباً تیسرے سال سید زین الدین صاحب اور مولانا شوکت علی۔ یونین نے ایک نظم کے لئے انعام کا بھی اعلان کیا تھا اور جن دو نظموں کے لکھنے والوں میں مقابلہ تھا ان میں سے ایک گورکھپور کے محمد اسمٰعیل[4] صاحب عرف "بیکار" مرحوم نے لکھی تھی اور ایک اس خاکسار نے اور غالباً کسی کو یہ سن کر تعجب نہ ہوگا کہ انعام "بیکار" صاحب ہی کے حصہ میں گیا اور ہم یوں ہی رہ گئے اور مولانا شبلی مرحوم کی سخن دانی پر ایک عرصہ تک بے حد شک کرتے رہے کیونکہ انعام کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں تھا۔

شعر نے جس شخص کے سپرد اپنی کم عمری میں بقول غالب خود خواہش کی ہو کہ "گرد دفن او" وہ بھلا داؤد صاحب پر کس طرح عاشق نہ ہوتا جبکہ اسے اسی زمانہ میں معلوم ہو گیا ہو کہ داؤد صاحب کا بھی یہی فن تھا۔ میں نے سنا تھا کہ چودھری ممتاز حسین صاحب کو آج کل کے کلکٹر سید زین الدین صاحب کے ساتھ خاص الفت تھی مگر زین الدین صاحب جس طرح ۱۹۲۱ء میں ملک کو انگریزوں[5] پر ظلم کرنے میں مشہور تھے اسی طرح اس زمانہ میں چودھری صاحب پر یہاں تک ظلم فرمایا کرتے تھے کہ بیچارے چودھری صاحب نے خودکشی کی ٹھان لی تھی۔ اس قصہ کو داؤد صاحب نے ایک مثنوی کی شکل میں نظم کیا تھا اور ۱۸۹۱ء سے مجھے اس کا ایک شعر یاد تھا جس میں زین الدین صاحب کا اپنی کوٹھی سے یہ سنتے ہی گھبرا کر باہر نکل آنا بیان کیا گیا ہے۔

نہ ہوا سر پہ تھی دستہ پہ چھاؤں
اس پہ طرہ یہ تھا کہ ننگے پاؤں

---

[1] مسٹر ڈی بیک ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۹ء تک کالج کے پرنسپل رہے۔

[2] علی گڑھ کالج کی مشہور یونین کا نام "سڈنس یونین" ہے جو مسٹر سڈنس ہیڈ ماسٹر ۱۸۷۷ء تا ۱۸۸۳ء کے ریٹائر ہونے کے بعد مسٹر بیک نے ان کے نام سے قائم کی تھی۔

[3] ۱۸ جنوری ۱۸۸۸ء میں کالج میں داخل ہوئے ۱۸۹۳ء میں بی اے کر کے پہلے نائب تحصیلدار پھر اسسٹنٹ انسپکٹر اور بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔

[4] محمد اسمٰعیل مرحوم ولد نور الحق ساکن مچھلی شہر جون ۱۸۹۱ء کو فرسٹ ایر میں داخل ہوئے تھے۔

[5] یعنی تحریک عدم موالات و مقاطعہ جو کانگریس نے حکومت کے خلاف چلائی تھی۔

اس مثنوی کو میں بھلا کیونکر دکھاتا لیکن کسی دلکشی کی زبانی میں نے یہ شعر سن لیا تھا اور گو کہ پیری کے باعث اب حافظہ بالکل برباد ہو گیا ہے لیکن الحمد للہ یہ بھی کچھ سنے سنائے شعر اب تک یاد ہیں۔ جب میرے عزیز دوست محمود احمد عباسی نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ اپنے مرحوم بڑے بھائی کی اس مثنوی کو وہ پھر شائع کرائیں گے اور تقریظ لکھنے کی مجھ سے فرمائش کر کے مجھے وہ مثنوی دکھائی تو میں نے سب سے پہلے اسی شعر کی تلاش کی اور عجیب مسرت ہوئی جب اس کو اسی طرح مثنوی میں اسی موقع پر جس کا میں نے اپنے حافظہ سے اوپر ذکر کیا ہے پایا۔ افسوس کہ رخت سفر باندھنے اور "ہمدرد" سے رخصت ہونے اور زندگی کی شادی کرنے میں اتنا وقت بھی نہ مل سکا کہ اس مثنوی کو پڑھ سکتا البتہ "گلزار جاوید" میں جو چند غزلیں اور متفرق اشعار اور یوسف خان مرحوم کا ترجیع شائع ہوا ہے ان کو پڑھ کر داؤد صاحب مرحوم کی بے تکلف شاعری اور ان کے سہل ممتنع کا لطف اٹھایا۔ ان اشعار میں سے بھی بچپن کے حافظہ نے ایک شعر کا اور دفعتہ مجھے عطا کیا تھا چنانچہ اس کو بھی اسی مسرت سے پڑھا ؎

یہ جھوٹ اور وہم ہے، بس اب رہنے دیجئے
ہم بھی تو رات جاگ رہے تھے دو بجے

البتہ اب جبکہ میری عمر داؤد صاحب مرحوم کی عمر سے بھی زیادہ ہو گئی ہے اس شعر کے "معاملہ" پر نظر پڑی تو تعجب ہوا کہ ان جیسا سنجیدہ اور متقی بزرگ بھی کم از کم شعر میں رات دو بجے تک جاگ سکتا تھا انصاف کرے کہ یہ شعر بھی مثنوی کی طرح صوبجات متحدہ کے نام کو آپ ڈروں پر ایک تہران مسلمان کلکٹر کی شان میں ادا کیا ہوا مگر باوجود ایسی سنجیدگی کے داؤد صاحب مرحوم کی طبیعت نہایت شگفتہ تھی اور مولانا حالیؔ کی ایک مشہور غزل کے مقطع پر جو تضمین انھوں نے لکھی تھی اس نے تو مولانا حالی تک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ داؤد میری ساری غزل لے لیں صرف میرا تخلص مقطع سے نکال ڈالیں تو میں خوش میرا خدا خوش مگر تضمین بھی بلا کی تھی۔ ایک ہی مصرعہ نے مولانا مرحوم کے شعر کا ستیاناس کر دیا ملاحظہ ؎

گر کرے قصد کسی کام کا دل میں انساں — چاہیے دیکھے وہ اس کام کے ہے بھی شایاں
گھر کے لوگوں سے کہا روٹھے تھے آقا کہ — ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

بزرگوں کی شان میں داؤد صاحب نے صرف یہی ایک گستاخی نہیں کی تھی۔ کالج میں ایک عرصہ تک "برنسل" میں ایک طالب علم کو "بوم" کا لقب عطا ہوا تھا۔ اس "نسل کے بوم" کو مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کا عشق تھا۔ جب کالج کا گروپ فوٹو کھینچنے لگا تو "بوم" صاحب فوراً مولانا شبلی کی کرسی کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے جس پر داؤد صاحب نے اسی وقت لکھ دیا ؎

آج کالج میں مچی ہے دھوم — طلبہ کا ہے ہر طرف سے ہجوم
بول اٹھی روح سعدی مرحوم — "کس نیاید بزیر سایۂ بوم"
الا مولانا شبلی مخدوم

چودھری خوشی محمد خان صاحب[2] کالج کے "پوئیٹ لاریٹ" اور اپنے قد کے لحاظ سے "لانگ فیلو" تھے اور ناظر صاحب اور مولانا شبلی [illegible]

---

[1] داؤد صاحب مرحوم کے کل مجموعہ کلام کو شائع کرنا مقصود تھا۔

[2] چودھری صاحب نے ۱۸۹۵ء میں علی گڑھ سے فرسٹ ڈویژن میں انگریزی و فارسی میں آنرز کے ساتھ بی۔ اے کیا۔ عرصہ تک ریاست کشمیر میں اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔ قومی نظمیں بہت بہت لکھی ہیں۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسوں میں خاص طور سے پڑھتے تھے۔

ان کے مذاق سے تو مگر چودھری صاحب کو زبان پر پوری قدرت نہ تھی اس لئے کبھی نظم میں داؤد صاحب اور کبھی نثر میں عبدالحق صاحب[1] (جو آج کل اورنگ آباد سے اردو کی خدمت کر رہے ہیں اور اس زمانہ میں کالج میں سینٹ پال کے عرف سے معروف تھے) چودھری صاحب کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ چودھری صاحب نے ٹامسن کی نظم "سیزنس" (مختلف موسم) پڑھ کر جو ان کے کورس میں داخل تھی ایک نظم لکھی تھی جس پر مولانا شبلی کے مشورے سے آرنلڈ صاحب نے انہیں ایک انعام مرحمت فرمایا تھا۔ اس میں ایک مصرعہ پر چودھری صاحب لکھ گئے تھے کہ ع ناظر اب سیر سبزہ کر ڈالو ۔۔۔ ناظر آپ کا تخلص تھا اور قد میں ناظر صاحب کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ "انظر الی الابل کیف خلقت" اس لئے ناممکن ہو گیا کہ اس مصرعہ کی داد نہ دی جائے جو اس پر داؤد صاحب نے لگایا تھا:

ناظر صاحب فرماتے ہیں ——— ناظر اب سیر سبزہ کر ڈالو
داؤد صاحب اس پر فرماتے ہیں ——— اپنے آگے کی گھاس چر ڈالو

نواب محسن الملک مرحوم جب حیدرآباد چھوڑ کر علی گڑھ چلے آئے اور وہ طلبہ جو سر سید کے ڈنڈے سے ڈرتے تھے اب نواب صاحب کے پاس جانے لگے اور علی گڑھ کے سدا بہار کھانے کی حسب دستور شکایت کرنے لگے تو نواب صاحب نے بھی "حسب دستور" اصلاح کے بہت سے وعدے کئے۔ ان وعدوں سے خوش ہو کر چودھری صاحب نے فارسی میں ایک نظم لکھی جس کا قافیہ "جہان" اور "زبان" تھا اور مولوی شبلی کے شاگرد رشید اور محبوب خاص نے اسے مولانا ہی کے انداز سے پڑھا۔ ان کے بہت سے شاگرد آج نقل اتار سکتے ہوں گے۔ اسی بحر اور قافیہ میں داؤد صاحب نے بھی فوراً ایک شعر لکھ دیا اور اسی انداز سے اپنے خاص حلقہ میں پڑھ کر سنا بھی دیا وہ یہ تھا ۔

"خوب رقصد داؤدی می کند
اشتر پنجاب در ہندوستان"

اب قارئین کرام داؤد صاحب کے لگائے ہوئے مصرعہ کا لطف پوری طرح اٹھائیں گے ۔

ناظرا اب سیر سبزہ کر ڈالو
اپنے آگے کی گھاس چر ڈالو

مگر جہاں تک مجھے یاد تھا اسی قسم کی ایک اور گستاخی کا تعلق ضلع مظفر نگر کے مشہور رئیس خاندان کی شادی میں داؤد صاحب نے نہیں کی تھی بلکہ وہ بھی بڑے بھائی ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر[2] کی شرارت تھی۔ محمد سلطان صاحب اس زمانہ میں بورڈنگ ہاؤس کے بیا ... تھے تو اس وقت ان کا لقب

---

[1] ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب (بابائے اردو) ولد شیخ علی حسین مرحوم ساکن ہاپوڑ ضلع میرٹھ ۲۰ اپریل ۱۸۸۸ء کو مدرسۃ العلوم میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۴ء میں فرسٹ ڈویژن بی۔ اے کیا۔ عرصہ دراز تک ریاست حیدرآباد میں بسلسلہ ملازمت رہے اور اورنگ آباد کالج کی پرنسپلی کے زمانہ میں انجمن ترقی اردو کے ذریعہ اردو زبان کی بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر وہاں سے دہلی چلے آئے اور انجمن ترقی اردو کا دفتر، کتب خانہ اور پریس بھی دہلی منتقل کیا جو فسادات کے زمانہ میں سب لٹ گیا۔ اس تباہی کے بعد کراچی آ گئے اور یہاں از سر نو انجمن کا دفتر، کتب خانہ، پریس قائم کیا اور اردو کالج کی بنیاد ڈالی جو اب ایک اعلیٰ پایہ درس گاہ ہے۔

[2] یہ گوہر کی شرارت نہ تھی داؤد صاحب مرحوم ہی کی بذلہ سنجی تھی۔ گوہر کے کالج میں آنے اور ۱۸۹۷ء میں داخلہ لینے سے بقول خان بہادر مولوی محمد حبیب اللہ خاں صاحب برسوں پہلے سے داؤد صاحب کا یہ لطیفہ کالج میں مشہور اور زبان زد خاص و عام تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب نے جو گوہر صاحب سے سات سال پہلے سے کالج کے طالب علم تھے اپنے اخبار زمیندار کی ایک اشاعت میں ایک نوٹ میں لکھا تھا:

"محمد داؤد مرحوم کو جو راقم الحروف کے زمانہ طالب علمی میں مدرسۃ العلوم کے ایک تلمیذ رشید تھے مبداء فیاض سے سخن گوئی کا ایک خاص ذوق مرحمت ہوا تھا شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور ظرافت تو مرحوم کا خاص حصہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ان کا حصہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

"ہیڈ" تھا جسے وہ اس طرح لکھا کرتے تھے کہ عام طور پر طلبا اسے "ہجڑ" پڑھا کرتے تھے۔ مولوی سید احمد صاحب خاں صاحب تھے۔ مولوی بدر الحسن صاحب مرحوم (بھائی بدو) بڑے درجہ کے استاد تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی علاء الحسن صاحب اس وقت تک طالب علم ہی تھے اس خاندان کو کالج کے ساتھ عشق تھا اور متعدد منتظمین اور طلبا اس نے کالج کو بنتے دیکھا تھا کالج کے ساتھ اس عشق کے ساتھ ہی ساتھ ایک خاصہ اس خاندان کا اور بھی تھا۔ جس کو گوہر نے اس طرح باندھا تھا ؎

آتا ہے جو وہاں سے وہ لاتا ہے سر پہ گنج
قاروں نے کاندھلے میں بسایا خزانہ کیا

قارئین کرام کو یقیناً آتش کا مشہور شعر یاد ہوگا ؎

نکلا جو گل زمیں سے سو آیا وہ زر بکف — قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

یہ اسی مشہور شعر کی خرابی کی گئی ہے اور علاء الحسن صاحب مرحوم کی شان میں یہ تصرف کیا گیا تھا۔ محمود احمد صاحب عباسی کا خیال تھا کہ یہ ان کے مرحوم بھائی کا تصرف تھا کیونکہ انہوں نے داؤد صاحب کو ضرور اسے پڑھتے سنا ہوگا مگر مجھے یاد تھا کہ یہ تصرف میرے بڑے بھائی نے کیا تھا چنانچہ میری لڑکی کی شادی میں جب وہ تشریف لائے تو خود ان سے پوچھا گیا اور میرا حافظہ صحیح نکلا۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ) جتنے لوگ علی گڑھ آئے سب کے سب امام شرافی کی ضد واقع ہوئے تھے اور قدرت نے ان کے جسم کو تو بیشک بیسیوں کو ضرور نظر معترض سے فارغ البال کر رکھا تھا اس پر مرحوم کو زیل کی پھبتی سوجھ گئی جو اسی وقت کالج کے ہر بچے لڑکے کی زبان پر تھی ۔

آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج — قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا"

خود مولانا شوکت علی مرحوم نے اپنے مضمون میں جو داؤد صاحب مرحوم کے حالات پر لکھا تھا اس لطیفہ کو مرحوم ہی سے منسوب کیا ہے۔

ل مولانا ظفر علی خان، نواب بہادر محمد حبیب اللہ خان، مولانا خلیل احمد صاحب مرحوم وغیرہ جو بہ نسبت مولانا محمد علی مرحوم کے اس زمانہ کے حالات سے زیادہ واقف تھے اور ان سے دس بارہ سال پہلے کالج میں موجود تھے اس لطیفہ کو داؤد مرحوم ہی کی شگفتہ طبعی سے منسوب کرتے رہے ہیں علاوہ بریں گوہر صاحب کے کالج میں داخل ہونے سے بارہ برس پہلے سے کاندھلہ کا یہ خاندان وہاں موجود تھا۔ مولوی محمد اکبر مرحوم ۱۸۷۶ء سے عربی کے استاد تھے اور ان کے چھوٹے بھائی محمد سلیمان مرحوم بورڈنگ کے منیجر تھے۔ یہ دونوں بھائی سرسید کے استاد مولوی نور الحسن کے فرزند تھے اور مولوی نور الحسن مفتی الٰہی بخش مرحوم ساکن کاندھلہ کے پوتے تھے۔ مفتی صاحب نے مثنوی مولانا روم کا ساتواں دفتر لکھا تھا جو طرز ادا میں مولانا روم کے کلام کے برابر تھا۔ مفتی صاحب اپنے زمانہ کے جید عالم ہونے کے باوجود بڑے سادہ مزاج اور سید احمد شہید کے دست گرفتہ تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ساری عمر ہم نے مذہبی علوم کو پیسا، وہ دلیہ تھا سید احمد شہید سے بیعت کرنے کے بعد وہ میدہ ہوا۔ سرسید کو چونکہ اس خاندان سے نسبتی تعلق تھا انہوں نے کالج کے ابتدائی ارادے کے وقت سے ہی مولوی محمد اکبر اور مولوی محمد سلیمان کو کالج میں ملازم رکھا۔ مولوی محمد اکبر کے بڑے بیٹے بدر الحسن (بھائی بدو) ۲۶ جون ۱۸۸۴ء کو کالجیٹ اسکول میں داخل ہوئے ۱۸۹۲ء سے قرآن سے تعلیم چھوڑ کر کچھ عرصہ اسکول میں مدرس رہے پھر سید محمود مرحوم کی سفارش سے منصف ہوئے اور سب جج تک ترقی کی۔ علاء الحسن ۱۸۸۴ء میں جب داؤد صاحب مرحوم نے داخلہ لیا ہے کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۹۳ء میں بی اے پاس کیا سید محمود مرحوم کی سفارش پر ڈپٹی کلکٹر ہوئے ان کے فرزند نذیر الحسن بی اے رئیس کاندھلہ یہ [illegible]

سلیم نے شعر بھی غلط نقل کیا ہے بعض الفاظ کا رد و بدل ہو گیا ہے۔ مولانا ظفر علی خان صاحب نے صحیح لکھا ہے دونوں کے ذوق کا اندازہ اہل ذوق خود ہی لگا سکتے ہیں۔
آتش کے مشہور شعر کا پہلا مصرعہ بھی مولانا غلط لکھ گئے ہیں اصل مصرعہ یہ ہے "زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف"۔ اسی میں تصرف کرکے داؤد صاحب نے فرمایا تھا ؎

"آتا ہے کاندھلے سے جو لاتا ہے سر پہ گنج ، قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

یہ سب اس گئے ہوئے پر لطف زمانہ کی یاد تھی جو آ گئی اور علی گڑھ کی موجودہ تباہی پر ایک بار دل افسردہ کر گئی۔ بھلا اس کو کس طرح الفاظ میں کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قارئین کرام داؤد صاحب مرحوم کے اشعار کو خود ہی پڑھیں گے اور ان کا مطلب سمجھیں گے، میں حاجب اور دربان بن کر ان کو زیادہ دیر تک روکنا نہیں چاہتا۔ پردہ اٹھا دیا گیا، دروازہ کھلا ہے آگے بڑھئے اور داؤد صاحب کی شگفتہ ترین طبیعت سے ملاقات کیجئے اور ان کی روح پر فاتحہ پڑھ جائیے۔ میں بھی دست بدعا ہوں اور اشک ریز، لیکن اس دیدۂ تر کے ساتھ ہی ساتھ اس وقت ہونٹوں پر تبسم آئے بغیر بھی نہیں رہتا جب اس کا خیال آتا ہے جو کہ آج سے ۴۰ برس پیشتر داؤد صاحب کی وضع قطع پر تعجب کرتا تھا کہ علی گڑھ جیسے مقام پر وہ کیوں لمبے بال رکھتے ہیں اور امردوں کی کشتی نما ٹوپی اوڑھتے ہیں گلے میں رومال باندھتے ہیں اور دیسی اچکن پہنتے ہیں اور دہلی کا سلیم شاہی جوتا۔ آج اس کے بال بھی ان ہی کی طرح لمبے ہیں، وہ بھی گاڑھے کا کرتہ اور پاجامہ پہنے بیٹھا ہے، ایک نئی وضع کا جوتا پیروں میں ہے، داڑھی بھی ہے اچکن بھی نہیں بلکہ عبا پہنے ہوئے ہے اور علی گڑھ ہی نہیں آکسفورڈ میں پڑھ چکا ہے اور اس وقت پی اینڈ او کمپنی کے جہاز پر صاحب لوگوں اور میموں اور فیشن ایبل ہندوستانیوں کے درمیان "ڈیک" پر بیٹھا ہوا یہ تقریظ لکھ رہا ہے اور مرتے مرتے یورپ کے دست شفا کو بھی آزما دیکھنے کی غرض سے عازم انگلستان ہے۔

ع رہے نہ دل میں ہوس آؤ یہ بھی کر دیکھیں

(غیر مطبوعہ)

ے مولانا مرحوم نے یہ تقریظ ۱۹۲۰ء میں لکھی تھی جب وہ بغرض علاج انگلستان کے سفر پر جا رہے تھے۔

قول و قرار

یہ عدم کا مجموعہ کلام ہے۔ عدم اردو کا ایک ایسا غزل گو شاعر ہے جو بڑے سادے سے انداز میں عشق و محبت کے معاملات کو پانی کر کے رکھ دیتا ہے۔ بھاری بھرکم ترکیبوں اور استعاروں سے ان کا ذہن اور قلم بغاوت پر آمادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر غزل میں بناوٹ نہیں ہے بلکہ فن کی تمام لطافتوں کے ساتھ ایک حقیقت ہے۔

قیمت ۳/۰

ادارہ فروغ اردو۔ لاہور

نذیر احمد کا ایک ناول

مولانا عبدالماجد دریابادی

اب آپ چاہے اسے پسند کریں یا ناپسند، عیب کہیں یا ہنر، بہرحال ہے یہ کہ نذیر احمد ان لوگوں میں نہ تھے، جو ادب کو برائے ادب پسند کرتے ہوں، یا ناول کے لئے قلم اٹھاتے ہوں، تو بس اس شغل کو [illegible] ہے۔ نذیر احمد مولوی تھے، مسلمان تھے، مشرقی تھے اور یہ بات کہ زندگی کے بامعنی ہونے کے قائل تھے۔ زندگی کا ہر سانس ایک سمت لئے ہوئے، عمل کی ہر حرکت ایک غایت و مقصد لئے ہوئے۔ یہ نہیں کہ جس جب بولنے کو جی چاہا زبان کھول دی، حد سے ماری اور جب لکھنے کی رو آئی تو قلم اٹھا کاغذ پر گھسیٹنا شروع کر دیا ——— تو اس ایسے فنکار نے جب ناول لکھے گا تو سوچ سمجھ کر منزل و نشان منزل کی طرف آنکھیں گاڑ کر۔

ناول کا جو اصطلاحی مفہوم بعد کو متعین ہوا، اور اس کا فنی معیار بعد کو قرار پایا، اس کے اعتبار سے پوچھئے تو نذیر احمد کے ناولوں کو ناول کہنا ہی مشکل ہے، لیکن اصطلاحی نام جو کچھ بھی رکھئے اسی زمانہ میں تھیں اس قسم کی کتابیں کچھ نئی سی، نئے خیال والوں کو اپنی جدتوں سے، ندرتوں سے لبھانے والی، رجھانے والی، پرچانے والی۔ اور پرانے دماغ والوں کو وحشت سے جھنجھوڑ کرنے والی، چونکانے والی، بھگانے والی ——— یہ جدید و قدیم کی پرانی آویزش بھی ایک عجب رنگ ہے۔ شاید روز ازل ہی سے چلی آ رہی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ کبھی ادھر ہو جاتا ہے، کبھی ادھر۔ کبھی باپ کے مقابلہ میں ابراہیم خلیل کے ساتھ اور کبھی بیٹے کے مقابلہ میں نوح نبی کے ساتھ! ——— اچھا تو نذیر احمد تھے مصلح، اور انہیں بھی ہر دوسرے مصلح کی طرح قوم کی اصلاح سوجھی اور وقت کی نظر کی اس میں کمی۔ اس سے پہلے کئی اصولی کتابیں لکھ ہی چکے تھے، نام سنئے تو رعب داب اور ہیبت سی، مراۃ العروس، اور پڑھنے بیٹھئے تو بیٹھے بیٹھے چل، اور دلوں میں اتر جانے والا انداز۔ اب جدت کا قدم اس سے کہیں بڑھ کے کام کے لئے اٹھایا۔

حکمت ایمانی نے کام میں جو سلیقہ سکھایا، ساری شگفتگی اس کی [illegible] قوت خدا ہے۔ اور ہزاروں اصلاحوں کی ایک اصلاح یہ ہے کہ بندہ کے دل میں سبق اخلاق کا احساس تو آپ کی منفعت کے خیال سے مریض کے لئے جو شربت شفا تیار کیجئے، اس کی تلخی کو خوب افسانہ کی شکر میں لپیٹئے اور حسن بیان کا وہ رنگ چڑھائیے کہ مریض لپک کر لے اور لطف کے ساتھ دوا کی تلخی سے ناواقف ہو جائے ——— غالب نے مدد طلب کی تھی "نگاہ" معمولی سی چیز تھی تو کیا، نذیر احمد تقریباً ہر ملاقات نئے نئے انداز نگارش کے حربے سے ہمیں لگے ہی رہتے تھے۔

نصوح کا نام ریڈی میڈ ادیب کے لئے تیار تھا۔ صدیوں پیشتر مولانائے روم اپنی مثنوی معنوی میں ایک نصوح اور اس کی توبہ کا قصہ سنا چکے تھے اور اس سے بھی قبل خود قرآن مجید میں لفظ توبۃً نصوحًا خالص توبہ کے معنی میں آچکا تھا۔ تو نذیر احمد کو کتاب کے نام کے لئے غور و تامل کی ضرورت نہ پڑی۔ اچھا خاصا ترشا ترشایا پھلا پھولا نام توبۃ النصوح از خود ہاتھ آگیا۔ اور اسی نام کو مرکز بنا کر مصنف کے قلم نے تین سو صفحہ کے پلاٹ کا پورا دائرہ اسی کے اردگرد کھینچ دیا۔

قصہ کا خاکہ سادہ بھی ہے اور ذرا سا پیچیدہ بھی۔ پرانی بولی میں "سادگی و پرکاری" اسی کو کہتے ہیں۔ نصوح نام کے دہلی کے ایک شریف خوش باش ہیں۔ لڑکے بالے گھر بیٹھکوں میں سب کچھ ہوا ہوا۔ اتفاق کہ ایک سال شہر میں ہیضہ کی وبا پھیلی اور نصوح مبتلا ہو کر یہ سمجھے کہ اب چل چلاؤ کا وقت آگیا۔ اسی عالم ہراس میں خواب آیا اور وہاں کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ میدان حشر کا منظر ہے اور سب لوگوں کے علاوہ خود نصوح سے محاسبہ شروع ہوا [illegible] نصوح کے پاس سرمایۂ عمل تھا ہی کیا۔ ایک بات کا بھی جواب نہ بن پڑا۔ خوف و جرم سے [illegible] لگ گئی۔ عالم یاس میں آنکھ کھل گئی۔ لیکن اب خواب حقیقت بن کر سامنے تھا اور آنکھ کے ساتھ دل بھی بیدار ہو چکا تھا۔ دیکھی اور سنی ہوئی ایک ایک بات حافظہ پر نقش کی طرح کھنچ کر رہ گئی تھی۔ غرض صدق دل سے اپنی اور اپنے گھر کی اصلاح کی کوشش شروع ہوئی۔ گھر میں بیوی کے علاوہ دو بیٹیاں تھیں اور تین بیٹے۔ بیوی اور کم سن اولاد کا معاملہ تو آسان رہا۔ بڑی لڑکی اور بڑے لڑکے سے نپٹنے میں دیر لگ گئے اور صاحبزادے تو پورا خرام ہو کر رہے۔ صاحبزادہ خیر سے شاعر بھی تھے اور "کلیم" تخلص کرتے تھے۔ ان کا بگڑا ہوا ہی کسی طرح قابو میں نہ آیا۔ اور ان حضرت نے وہ وہ "[illegible]" [illegible] باپ سے روٹھ کر گھر سے نکل گئے اور باہر ہر طرح کی ٹھوکریں کھا کر بہت دنوں کے بعد آخر جب خستہ و زار اور ذلیل اور جسم فگار واپس آئے ہیں تو موت کے مہمان ہو کر۔ علاج معالجہ ہزار کیا لیکن موت مقرر ہو چکی تھی۔ کلیم اس باپ کی آنکھوں کے سامنے دنیا سے رخصت ہوا۔ لیکن اب تائب و نادم ہو کر [illegible] اس کے آگے جھکا ہوا گیا اور کس ناگزیر اس کی رحمت و مغفرت سے لگائے ہوئے۔

قصہ کے ہیرو بڑے میاں یعنی خود نصوح ہیں، اور ان کا خواب جس پر بنا ہے بنیاد یاں قرأت بھی کتاب کی جان —— اور چونکہ قصہ حسن و عشق کی داستان سرائی سے خالی ہے اس لئے ہیرو کے ساتھ کسی ہیروئن کی تلاش بھی بے حاصل ہے لیکن کردار کی معنویت کی جو پوچھئے تو میاں کلیم اور ان کے یار آشنا مرزا ظاہر دار بیگ اور میاں فطرت کے کردار بڑے ہی جاندار ہیں اور بے جان تو کتاب کے چھوٹے بڑے سارے کرداروں میں بھی کوئی بھی نہیں۔ اور اسے نذیر احمد کے قلم کا اعجاز کہئے یا جو کچھ کہ کتاب ہے عربی الفاظ، عربی ترکیبوں، عربی محاوروں سے [illegible] ہوئی۔ اس پر بھی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ کہیں سے کوئی ورق کھول لیجئے، پھر بند کرنے کو دل نہ چاہے گا، بس یہی چاہے جائے گا کہ ابھی کچھ اور، ابھی کچھ اور۔

آپ تو خیر اس وقت کتاب کھول کر سامنے رکھنے سے رہے۔ آپ کی فرصت یہ بات چیت کرنے والا ہی آپ کے لئے اہتمام کئے دیتا ہے اور آپ کی نظروں سے ادھر ادھر چند ایک مقاموں کی سیر آپ کو کرائے دیتا ہے۔ منزل قصے کے ذخیرہ کا اندازہ تو خیر دیگ کے ایک چاول سے لگایا جاتا ہے۔ بس آپ بھی اسی چاول کی سیر پر قناعت کیجئے اور دس بیس سطروں ہی ادھر ادھر سے [illegible] ذوق معنویت و جدت کا اندازہ دل ہی دل میں قائم کیجئے۔ نصوح کے چھوٹے صاحبزادہ میاں سلیم ابھی دس سال کے ہیں اور [illegible] کی صحبتوں میں رہ کر خود بھی آوارگی کے [illegible] سے دور تو پہنچے نہیں۔ ایک دن محلہ کے ایک لڑکے سے نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ اس کا ماجرا انہی کی زبان سے سنئے:۔

"میں ابھی کے [illegible] سخت گالی کے [illegible] بھر کر ناک بھرنے لگی۔ [illegible] اللہ جانتا ہے [illegible] بھولا بھی تو [illegible] میں [illegible] ان کو [illegible] تھا [illegible] شاباش بیٹے شاباش [illegible] سامنے [illegible] تھا پھر گتھم گتھا ہو گئی۔ [illegible] سے آواز دی۔ [illegible] میاں جانے بھی دو، یہ [illegible] اندر چلا گیا۔ [illegible] خدا کی قسم [illegible] یاد بھی تو [illegible]"

یہ عبارت صفحہ ۹۱ کی تھی۔ [illegible] شاعر اور شاعر مزاج [illegible] کلیم کی بھی ذہنیت کی ایک جھلک

ملاحظہ فرمائیے۔ اور یہ اس وقت کا جب وہ اپنے والد کی پند و نصیحت سے بگڑ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ اب صفحہ ۲۵۳ کھول رہا ہوں۔

"کلیم کے ذہن میں ازخود یہ خناس سمایا ہوا تھا کہ گو تمام ہندوستان سرکاری ہیں اس کے تمدن معیشت رسوم کی سختی اور مشکل ہیں اور جس وقت کہ وہ چل نکلا ہوگا وہاں کا والی ملک اس کی تشریف آوری کو بس غنیمت سمجھے گا۔ گھر سے نکلا، تو مٹھی تہی دست، لیکن اس خیال میں مگن کہ اب کوئی دم جاتا ہے والیٔ ملک خدا کی مار جھنڈا بھیجنے والا ہوگا۔ جیا جتوئی بیٹھ کر بجا اور اس شہر میں مستقر کرنے کو بیگم بھی ہو رہی ہے اس کی سواری کے لئے آرہی ہے۔ باوجودیکہ شب خوابی کے کپڑوں کے سوا بدن پر کچھ نہ تھا، تاہم خلعت ہفت پارچہ کی امید میں تھا۔"

کلیم کی یہ جھلکیاں ہیں اور سرسری سہی، پھر بھی آپ نے صاف دیکھ لیا کہ گویا کلیم کو پڑھ لیا۔ اب ذرا قدم بڑھاتے ہوئے کلیم کے مثل تیجیے یار، ہم نے صحیح ظاہردار بیگ کے چہرہ مہرہ کا حلیہ بھی اس آئینہ میں دیکھتے چلیے۔ جہاں تک تعلق شیخی اور بناوٹ کا تعلق ہے، یہ حضرت کلیم سے بھی دو ہوتے آگے تھے۔ صفحہ ۲۵۴ پر کھولیے تو مرزا کی سج دھج میں ہی منظر کے سامنے آجائے۔

"مرزا کو جب دیکھو پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی جوتی، سر پر بھاری بیل کی کامدار ٹوپی، بدن میں ایک جھونڈ مد گھیر کے اور پشمینہ یا ململ کی انگرکھا نیچے کوئی گرم یا سادہ جامے کا تہبند۔ جاڑا ہو تو بانات گرمیاں ہو تو دلی گرم ہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام، اور تیسرے پہر کا شانی قطع کی آصف خانی جس میں سوئی کی صنعت کے علاوہ گلہ گلے بھر کی صد چل گئی ہوئی، سرخ فیتہ۔ پاجامہ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو بھی وہ اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے وہ دو قدم تنگے اور اگر تنگ ٹخنے کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں، اور اوپر جلیبی کی طرح چڑھا ہوا۔ ریشمی ازار بند گھٹنوں میں لٹکتا [illegible] میں ریشم کی کچھ کا گچھا۔ غرض دیکھو تو مرزا صاحب اسی ہیئت کذائی سے جیسے سجے ہوئے سر بازار گھوم گھام کرتے چلے جاتے ہیں۔"

اب کوئی عیب جوئی کی خوردبین لگا کر دیکھنے پر جائے تو دنیا کی کس بند بستی کتاب کو لغزشوں، ناہمواریوں سے پاک صاف کہہ سکتی ہے؟ بازار واقعی زبان کے معیار سے دیکھئے تو، اور لطف زبان، حسن بیان کے اعتبار سے جانچئے تو کتاب سونے میں تولنے کے قابل، اور مرزا اکبری پر رکھتے ہیں کہ داد کیا آسکے گی۔ اور جہاں تک سبق آموزی کا تعلق ہے، یوں سمجھئے کہ کتاب کا شمار مثنوی مولانا روم اور گلستان سعدی کے خاندان سے جاملتا ہے۔ انہی کی حکایتوں کا ایک لمبا چوڑا ضمیمہ، انیسویں بیسویں صدی کے اڈیشن کے حسب حال، یا اسی قسم کے پھولوں کی ایک پھلجھڑی۔ کلیم کی گفتگو ایک ریاست کے دیوان سے یا ظاہر دار بیگ کی زبانی چٹکلے ہوئے، جھوٹی کی داستان لذیذ، اور سب سے بڑھ چڑھ کر نصوح کا پر اثر اور دل ہلا دینے والا خواب۔ یہ سب بھی اگر کہیں چھڑ گئے تو دیر سے نہ ادھر سنانے والے کا جی بھرے گا نہ ادھر سننے والوں کا۔ خیریت اسی میں ہے کہ یہ نامکمل داستان یہیں تمام ہو جائے۔

غالب کی مقبولیت کے اسباب

شیخ محمد اکرام

کلامِ غالب کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ اس کا حیرت انگیز تنوع ہے۔ مرزا کی شاعری زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے لیکن دقیق اور پیچیدہ خیالات کے طالب کے لیے یہاں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے وہ نمونے ہیں جو دیوانِ بیدل میں بھی مشکل سے ملیں گے۔ شگفتہ طبع لوگوں کے لیے شوخی و ظرافت ہے اور انسانی فطرت کی داستان سننا ہو تو یہاں وہ پتے کی باتیں ہیں کہ جوں جوں چشمِ بصیرت کھلتی جائے گی ان کا لطف بڑھتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے۔

اس ساز میں بے شمار نغمے ہیں اور ہر نغمہ دل آویز ہے۔ اس دل آویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلامِ غالب محض سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں بلکہ قلبِ غالب کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پر دستِ قدرت نے سارے سُر ایک ایک کر کے بجائے ہیں اور دیوانِ غالب انہی نغموں کی صدائے بازگشت ہے۔

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم
کس چہ داند تا چہ دستاں میزنم

سر والٹر ریلے نے شیکسپیئر کے متعلق لکھا ہے: وہ کمیاب ترین چیز تھا، یعنی ایک پورا انسان۔ شیکسپیئر کے متعلق تو یہ رائے اس کی کتابوں کے مطالعے سے بنتی ہے لیکن جن گوناگوں تجربوں سے مرزا کو واسطہ پڑا تھا اگر ان کا مقابلہ شیکسپیئر کے حالات سے کریں تو مرزا کا پلہ شیکسپیئر سے ہلکا نہیں رہے گا۔ مرزا کی زندگی میں ان کے ایک مخالف نے ان کے متعلق طنزاً لکھا تھا: آپ انتخابِ زمانہ ہیں، یکتائے دوراں ہیں۔ جس طرف طبیعت آئی اسی کی خاک اڑائی۔ چنانچہ دخترِ رز سے جونک لگائی تو وہ ظرف پیدا کیا کہ دنیا کے گرگوں میں شراب نوشی کا تمغۂ آفتاب بادہ پیش کش لیا اور قمار بازی پر جو دھیان کیا تو وہ پچھلے جواری ہو کر پیر بساط اور بکھرے داؤں کھانے لگے۔ (زرگستانِ بیخبراں)

لیکن یہ تصویر کا فقط ایک پہلو ہے۔ مرزا اگر مے خانے اور قمار خانے کی پوری طرح خاک چھان چکے تھے تو شرع اور تصوف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے۔ دہلی کے دو بڑے عالم فضل حق خیرآبادی اور مولانا صدر الدین ان کے عزیز دوست تھے اور جس نفاست سے صوفیانہ راز و نیاز کی باتیں ان کے اشعار میں ادا ہوئی ہیں اردو کے بہت تھوڑے شعرا کے کلام میں ملیں گی۔ وہ رنگ رلیاں جن پر قربان ہوتے تھے لیکن زمانے نے ایک ایک کر کے اپنے رنگ کے

سارے تیر ان پر چلائے اور اگر وہ بزم نشاط اور محفل عشرت میں اجنبی معلوم ہوتے تھے تو وہ رندوں کے معائب بھی خوب سمجھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ خواہ کوئی زاہد ہو یا محتسب، صوفی اور ظرافت کا دلدادہ ہو یا غمزدہ، فلسفی ہو یا عاشق مزاج، ان سب کے لئے کلام غالب میں کچھ نہ کچھ موجود ہے۔

مرزا کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ نئے طرز کے آدمی تھے اور ان کے خیالات کا جو اسلوب تھا آج زمانہ اس کی تائید کر رہا ہے ہم بیان کر چکے ہیں کہ مرزا تقلید کے قائل نہ تھے۔ اپنی سمجھ پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے۔ ان کی جدت پسندی نئے مضامین اور نئی تشبیہیں تلاش کرنے تک محدود نہ تھی بلکہ لغت، اشعار، انشا اور دوسری علمی و ادبی باتوں کے علاوہ وضع قطع اور لباس میں بھی وہ اپنے پیشروؤں اور معاصروں کی پیروی کرنا ضروری نہ سمجھتے اور ان پر کڑی نکتہ چینی کرتے تھے۔ جب کلکتے میں ان کے اشعار پر یہ اعتراض ہوا کہ انھوں نے قتیل کے وضع کردہ اصولوں کا خیال نہیں رکھا تو انہوں نے بڑے جوش سے کہا تھا ؎

زلہ بردار کس چرا باشم
من بکام انگس چرا باشم

یہ آزاد خیالی اور تقلید سے نفرت مرزا غالب کی امتیازی خصوصیت رہی اور ترقی خیالات کے موجودہ عصری دور میں بھی یہی طرز عمل زیادہ مقبول ہے۔

اسی طرح مرزا نے اپنے دوستوں کی کتابوں پر جو تبصرے لکھے وہ عام طور پر اگرچہ جنبہ دارانہ ہیں لیکن ان میں اور مغربی طرز کی تقاریظ میں یہ بات مشترک ہے کہ وہ کتاب اور مصنف کی تعریف میں مبالغے سے پاک ہیں۔ اس کے علاوہ زبان اور محاورے پر مضمون اور خیال کو مقدم رکھنے کی جو خصوصیت کلام غالب میں موجود ہے مغربی شاعری کے اصول تنقید بھی اس کے حامی ہیں۔ مرزا نے اردو مکتوب نویسی میں جو رنگ اختیار کیا وہ فارسی فن انشا کی نسبت انگریزی خطوط نویسی سے زیادہ قریب تھا ان سب باتوں کی وجہ سے موجودہ نسل جس کی تعلیم مغربی اصولوں پر ہوتی ہے مرزا کے کلام اور اپنے خیالات میں دوسرے مشرقی شعرا کی نسبت بہت زیادہ باتیں مشترک پاتی ہے۔

دور حاضر میں غالب کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ عام خیال کہ غالب کے معاصرین نے اس کی بالکل قدر نہ کی، واقعات کے غلط اندازہ پر مبنی ہے۔ اگر غالب کی شاعری اور نثر نگاری کی تدریجی تبدیلیوں اور ترقیوں کو ذہن میں رکھیں تو خیال آتا ہے کہ اگر غالب کے اردو کلام کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تو اس کا سبب کلام غالب کے اصلاح طلب پہلو تھے۔ ایک مدت تک مرزا رنگ بیدل پر فریفتہ رہے۔ پھر جب ذرا سنبھلے تو اردو چھوڑ کر فارسی شاعری شروع کی اور ایک ایسے گلستان کی آبیاری کی جس میں عوام الناس کو بار نہ تھا۔ فارسی نثر نگاری میں غالب نے ان اساتذہ کی پیروی کی جن کی پرتصنع اور پرتکلف نثر بیدل کی مصنوعی شہرت کا جواب تھی۔ اگر معاصرین غالب نے ان چیزوں کو سر آنکھوں پر نہ رکھا اور انہیں قبول عام کی سند نہ ملی تو ہمیں حیران نہ ہونا چاہئے کیونکہ انہیں تو اب بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں اور اگر تمام حالات کو غور سے دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ بعض اہم امور میں زمانہ غالب کی نہیں بلکہ معاصرین غالب کی تائید کر رہا ہے۔

عوام الناس مرزا کا یہ مصرع

ع شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں کہ مرزا کا وہی کلام آج الہامی سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق ان کے معاصرین کہتے تھے ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے   مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے   مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

یہ رباعی حکیم آغا جان عیش کی ہے جو شعر کا اچھا مذاق رکھتے تھے لیکن شعر فہمی میں ان کا وہ مرتبہ نہ تھا جو اس رباعی سے اختلاف رکھنے والے کئی دوسرے معاصرین (مثلاً نواب مصطفیٰ خان شیفتہ) کو حاصل تھا اور یہ رباعی اسی منتخب دیوان کے متعلق نہیں جس کے سب شعر ہم حرز جاں بنائے ہوئے ہیں بلکہ ان اشعار کے ذہنی ہونے کی شکایت ہے انہیں خود مرزا نے مطبوعہ دیوان میں شائع کرنے کے قابل نہ سمجھا اور نکال کر منتخب دیوان سے باہر پھینک دیا

انھیں بے راز سمجھا جائے۔ اگر مرزا کی اس تحریر کے بعد بھی اس مسئلہ میں اختلاف کی کوئی گنجائش تھی تو اس کا جواب نسخۂ حمیدیہ ہے جس میں خارج شدہ اشعار شائع ہو سکے ہیں اور جنھیں دیکھ کر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ مرزا کے معاصرین نے اگر ان اشعار کو الہامی نہ سمجھا تو ان پر کفر کا فتویٰ عائد نہیں ہوتا بلکہ اردو ادب ان کا ممنون ہے کہ انھوں نے تنقید اور تمسخر سے مرزا کو مغلق و پیچیدہ طرز ریختوں کے جمع کرنے سے روکا اور ان کی توجہ اس بحر شعر و سخن کی طرف کھینچی جس میں غواصی کا صلہ وہ بیش بہا موتی ہیں جو اردو ادب کے لئے مایۂ ناز ہیں۔

موجودہ نسل کو پرانے طرز کے غزل گو شعرا میں سے غالب سب سے زیادہ پسند ہے لیکن جن لوگوں نے فنی تنقید کے عام اصولوں سے گزر کر جزئیات اور فروعی امور میں بھی مغربی شاعری کی تقلید کو شاعری کی معراج سمجھا ہے۔ انھوں نے غالب کے کلام پر بھی اعتراض کئے ہیں۔ بالعموم یہ اعتراض خاص غالب کے متعلق نہیں بلکہ تمام مشرقی شاعری پر کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ غالب نے بیشتر غزلیں لکھیں اور غزل شاعرانہ جذبات کے اظہار کا ایک ناقص ذریعہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ غزل کے اشعار میں ربط، ردیف اور قافیے کی وجہ سے ہوتا ہے، مضمون کی وحدت سے نہیں اور غالب کی اکثر غزلیں الگ الگ اشعار کے گلدستے ہیں اور ایک وجدانی کیفیت کے مسلسل اظہار کی بجائے مضمون آفرینی اور خیال آرائی کے لئے وقف ہیں لیکن آخر یہ غالب کی بدقسمتی تھی کہ جب اس نے شعر گوئی شروع کی تو غزل کے علاوہ اور کوئی صنف شاعری مقبول نہ تھی۔ اس کے علاوہ اس امر کا اعتراف نہ کرنا بھی بے انصافی ہے کہ غالب کے دیوان میں مسلسل غزلیات اور قطعہ بند اشعار کی جو کثرت ہے وہ کسی اور اردو شاعر کے کلام میں شاید ہی ہوگی اور اس کی بہترین غزلوں میں کچھ قافیہ ردیف کی ہم آہنگی سے اور کچھ شاعر کی اپنی شخصیت کے پرتو سے ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں مختلف اشعار کی انفرادیت کھپ گئی ہے اور کوئی تال بے جا معلوم نہیں ہوتی۔

غزل پر ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اس میں معنوی وحدت تو کوئی ہوتی نہیں۔ اس لئے غزل گو شعرا اپنے سامنے چند قافیے رکھ لیتے ہیں اور ان کے مطابق اس وقت جو مضمون ذہن میں آتے ہیں انھیں نظم کر کے غزل مکمل کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو شعر میں آمد ہوتی ہے اور نہ غزل میں شاعر کے کسی تاثر کا اظہار ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال کسی ادنیٰ غزل گو شاعر کے متعلق صحیح ہو لیکن کلام مرزا اس سے مستثنیٰ ہیں۔ انھوں نے خود ایک خط میں بڑے زور سے اس خیال کی تردید کی ہے۔ منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

> "مجھ کو ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لئے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ بچپن سے جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لئے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا اور اس زمین میں غزل، قصیدہ لکھنے لگا۔"

ایک اور خط میں غزل کے لئے عشق و محبت اور معشوق کی ضرورت کے متعلق لکھا ہے:

> "شعر کیا کہوں گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا۔ معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے۔ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے انوری! گویا یہ میری زبان سے کہتا ہے:
>
> اے دریغا نیست ممدوحے سزاوار مدیح
> اے دریغا نیست معشوقے سزاوار غزل"

قطع نظر اس امر کے کہ مرزا قافیہ پیمائی سے خود متنفر تھے، ان کے کلام سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان کی غزل گوئی ان کی اپنی دلفریب شخصیت کا اظہار ہے۔ ایک شاعر کے جذبات میں بھی عام انسانوں کی طرح تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے اور اگر آج ایک بات کا ایک پہلو نظر آتا ہے تو کل دوسرا۔

چنانچہ دیوانِ غالب میں بھی یہ تنوع موجود ہے۔ لیکن اس میں مشکل سے کوئی شعر ایسا ملے گا جسے غالب کی اس عظیم اور متنوع شخصیت سے منسوب نہ کیا جا سکے جس سے ہم یادگارِ غالب اور اردوئے معلّیٰ کی بدولت خوب واقف ہیں۔ مرزا غالب کا زاویۂ نگاہ عام لوگوں سے کئی باتوں میں مختلف تھا اور ان کے زاویۂ نگاہ میں ان کے اشعار کی ترجمانی ہوتی تھی۔ مرزا نے بہشت کا ذکر ہمیشہ استہزا سے کیا اور یہ ان کے شخصی نقطۂ نظر کا اظہار معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح فرہاد کا ذکر ان کے اشعار میں کئی جگہ آیا ہے اور سب جگہ طنزاً۔ مذہب کے متعلق ان کے جیسے اشعار ہیں اور ہر شعر ان کی وسعتِ نظر اور طبعی تشکک کا اظہار ہے۔ اسی طرح زندگی کے مضامین ہوں یا انسان کی فطری مجبوریوں کا ذکر، طرزِ اظہار کے اختلاف سے قطع نظر وہ مرزا ہی کے اسلوبِ خیال کو نمایاں کرتے ہیں۔ بالعموم یہ خیال نہیں ہوتا کہ مرزا نے کوئی مضمون قافیے سے مجبور ہو کر باندھا ہے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزل ایک جامۂ موزوں ہے جو مرزا کی شخصیت پر راست آیا اور جس نے اس دلفریب شخصیت کو اور نمایاں کر دیا۔

پرانی طرز کے نقادوں نے مرزا کے کلام پر جو اعتراض کئے ہیں وہ یا تو زبان کے متعلق ہیں یا بقول سرور صاحب کے "یہی کہ آم والوں کی نقادی" یعنی سرقہ اور توارد کی بحث۔ مرزا یاس اور مولانا آرگسی (مولانا عبدالباری آسی) نے محنت و تحقیق سے اساتذۂ قدیم کے کلام سے بعض شعر ایسے ڈھونڈ نکالے ہیں جن کے مضامین غالب کے اشعار سے ملتے جلتے ہیں۔ کسی زمانہ میں ملٹن کے اشعار کے متعلق بھی اسی طرح کا حساب کتاب ہوا کرتا تھا لیکن اس سے اس کی شہرت کو کوئی ضعف نہیں پہنچا۔ کیونکہ ایک تو بقول گوئٹے "کائنات میں کوئی چیز بالکل نئی نہیں" اور دوسرے کسی شاعر کے چند اشعار میں توارد یا سرقہ ثابت کرنے سے اس کے باقی اشعار کی خوبیاں ضائع نہیں ہوتیں۔

آبلے

یہ احمد ندیم قاسمی کے چار طویل افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اگر ان افسانوں کو معیار کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو سوائے کرشن چندر کے طویل افسانوں کے ان کا پورے ادب میں کوئی جواب نہیں ہے۔ ان افسانوں میں رومان کی دبی دبی چنگاریوں کے ساتھ فن اور زندگی کے وہ رموز پنہاں ہیں جنہیں ایک بڑے فن کار کا قلم ہی بکھیر سکتا ہے۔

قیمت ۳/-

آنچل

یہ احمد ندیم قاسمی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پریم چند کے بعد جس انداز سے دیہاتی زندگی اور اس کے مسائل کو احمد ندیم قاسمی نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے وہ اردو کے کسی اور ادیب کو نصیب نہ ہو سکا۔ ندیم خود دیہات کا رہنے والا ہے۔ اس لئے وہ دیہاتیوں کی زندگی اور ان کے تمام مسائل کو بخوبی جانتا ہے اور ان کے اٹوٹ اور بھولے رومانس سے بھی آشنا ہے۔

قیمت ۳/-

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

احتشام حسین کی تنقید[1]

کلیم الدین احمد

میں نے کہا ہے کہ نوجوان نقادوں میں خود نمائی اور خود پرستی اور دل جیزی ضرورت سے زیادہ ملتی ہیں۔ وہ سب برنارڈ شا کے ہمنوا ہیں: "میں اپنی تعریف کے لئے دوسرا آدمی کیوں ڈھونڈوں جب میں خود اپنی تعریف کر سکتا ہوں۔" احتشام حسین صاحب لکھتے ہیں: "میں نے کبھی کسی تعارف یا تبصرہ کو اپنے ادبی و تنقیدی مضامین کے مجموعوں میں شامل نہیں کیا۔ اس سے ایک دیانت دار مبصر کو میرے تنقیدی نقطۂ نظر کے سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔" لیکن وہ بار بار اپنے مضامین کا تعارف اور ان کی تعریف آپ ہی کرتے جاتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے مضامین کا دوسرا، تیسرا، چوتھا یا پانچواں مجموعہ ہے۔ اس پر بس کرتے تو مضائقہ نہ تھا لیکن وہ لکھتے ہیں۔

۱۔ "زیر نظر مجموعہ کے مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ...... دو ایک زیادہ صفحے ان کو آخر زمانے کے لئے ان میں بعض ضروری تبدیلیاں کر دی گئی ہیں۔"

(ادبی جائزے)

۲۔ "جو مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں ان میں سے بہت سے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ...... میں نے ایک مختصر سا مضمون انگریزی میں لکھا تھا ...... سے لوگوں نے پسند کیا ...... نئے ادب کے طالب علم کے لئے یہ مضمون بہت مفید ہوگا ...... میں نے کوشش کی ہے کہ اس مجموعے میں وہی مضامین شامل کروں جو میرے مطالعے اور غور و فکر کا بہترین ثمر ہیں ...... اس مجموعے کو بھی اس امید سے پیش کرتا ہوں کہ یہ بھی پچھلے مجموعوں کی طرح مقبول ہوگا۔" (روایت اور بغاوت)

۳۔ "ادھر تین چار سال کے اندر بعض حضرات نے میری تنقید نگاری کی جانب خاص طور سے توجہ کی ہے ...... اس مجموعے کے اکثر مضامین چھپ چکے ہیں۔"

(ادب اور سماج)

---

[1] یہ "اردو تنقید پر ایک نظر" کا ایک حصہ ہے۔

۴۔ مجھے خوشی ہے کہ اس مجموعہ میں میرے بعض اہم مضامین شامل ہیں ..... یہ مجموعہ اس لئے شائع کیا جا رہا ہے کہ تنقید سے دلچسپی رکھنے والوں کو تنقید کی رفتار کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ مضامین بھی ایک جگہ محفوظ ہو جائیں ——" (تنقید اور عملی تنقید)

۵۔ "تنقید کے نظریاتی اور عملی پہلوؤں سے بحث ادب کی ایک اہم خدمت ہے .... جو مضامین اس مجموعہ میں شامل ہیں وہ کسی نہ کسی شکل میں یہ فرض انجام دیتے ہیں ...... جو مضامین مجموعہ میں شامل ہیں وہ اپنی اہمیت آپ ظاہر کریں گے لیکن قبل اس کے کہ آپ ان کا مطالعہ کریں چند مضامین کے متعلق دو چار الفاظ عرض کر دینا چاہتا ہوں ——" (ذوق ادب اور شعور)

۶۔ "امید ہے کہ میرے ادبی اور تنقیدی مضامین سے دلچسپی رکھنے والے اب اسے زیادہ مفید پائیں گے۔" (روایت اور بغاوت)

یہ مختصر فقرہ از خود ادا سے ہے۔ اپنے نظریئے کا اعادہ بھی بار بار کیا جاتا ہے:۔

۱۔ ان مضامین کا مصنف غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ادب مقصدی ہے۔" (تنقیدی جائزے)

۲۔ "جو شخص بھی میرے مضامین پڑھے گا اسے خود اندازہ ہو گا کہ میں انسانوں کی فلاح و بہبود اور اقتصادی انصاف کا ذکر کس شدت اور خلوص سے کرتا ہوں۔"
(روایت اور بغاوت)

۳۔ "اس مضمون میں اصول تنقید اور تنقید کے ارتقا کے متعلق کچھ لکھنا نہیں ہے۔ ان کے لئے راقم الحروف ہی کے مضامین 'اصول نقد' اور 'ادبی تنقید' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ان کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے ——" (تنقید اور عملی تنقید)

۴۔ "پہلا مضمون "میں کیوں لکھتا ہوں" ادبی تخلیق اور تنقید کے متعلق میرے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتا ہے" (ذوق ادب اور شعور)

یہ بھی مختصر فقرہ از خود ادا سے ہے —— "یہ بات زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی نقاد اپنا اصول پہلے بیان کر دے ——"

احتشام صاحب کو بھی یہ احساس کھٹکتا رہتا ہے کہ انہوں نے کوئی مفصل اور مبسوط کتاب نہیں لکھی ہے۔ وہ کتابوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن اپنے مقالوں کو کتابوں پر بھاری نہیں بتاتے ہوئے بھی بھاری بتاتے ہیں:۔

۱۔ "ادب اور تنقید پر مبسوط اور مفصل کتاب لکھنے کے بجائے محض مختصر اور طویل مضامین لکھتے رہنا چاہے وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں کسی مستقل علمی کارنامے کی حیثیت نہیں رکھتا ——" (تنقید اور عملی تنقید)

۲۔ مضامین کا یہ تیسرا مجموعہ مرتب کرنے کے بعد اب بعض موضوعات پر مستقل کتابیں لکھنے کا خیال ہے۔ (ادب اور سماج)

۳۔ بارہا یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ ایسے مختصر مضامین تنقید پر مبسوط تصانیف کا بدل نہیں قرار دیئے جا سکتے۔ یہ تو صرف مسائل کو چھیڑتے اور ذوق کو آگے کو بڑھاتے ہیں ...... ایک مقالے یا تقریر میں محض اشارے کئے جا سکتے ہیں۔ (ذوق ادب اور شعور)

لیکن "ان میں سے بعض مضامین مختصر ہونے کے باوجود برسوں کے مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ اگر ان کو توجہ سے پڑھا جائے تو خیال و فکر کے لئے کافی مواد مل سکتا ہے ——"

ایک دوسری کمزوری کا بھی احساس بار بار ہوتا ہے۔ اور وہ تکرار ہے۔ ایک قسم کی باتیں ایک قسم کے لفظوں میں اتنی بار ملتی ہیں کہ طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔ تکرار ترقی پسند تنقید کی اہم خصوصیت ہے۔ ہر نقاد نیا کم ایک ہی قسم کی باتیں کرتا ہے الفاظ اور فقروں کی بھی تکرار کرتا ہے لیکن شاید ہی کسی نقاد میں تکرار کی ایسی صورت ہو جیسی احتشام صاحب کے یہاں پائی جاتی ہے۔ اور انہیں اس کا احساس بھی ہے۔

۱۔ "بعض باتیں ایک سے زیادہ دفعہ مختلف مضامین میں آ گئی ہیں ——" (تنقیدی جائزے)

۲۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ان میں دوسرے مضامین کے خیالات ہی نہیں بلکہ الفاظ اور فقرے بھی آ گئے ہیں۔ (روایت اور بغاوت)

۳۔ کئی مضامین ...... بعض حصوں میں یکساں نظر آتے ہیں۔ (تنقید اور عملی تنقید)

اس اعتراف کے بعد اس کی توجیہ بھی ہے: "وہ (باتیں) اتنی ضروری ہیں کہ ان کی تکرار میں میرے مقصد کی وضاحت بھی مقصود ہے۔ . . . . . میں اصل نقد کو ہی سائنٹفک اور مفید سمجھتا ہوں اس لحاظ سے ایسا ہونا ناگزیر تھا . . . . . مختلف اوقات میں لکھے ہوئے ایسے مضامین میں خیالوں اور جملوں کی تکرار ناگزیر ہے۔" تکرار کوئی بری بات نہیں۔ بعض وقت یہ بہت ضروری بھی ہوتی ہے۔ لیکن نامعقول تکرار ذوق سلیم پر گراں ہوتی ہے۔ اب اصولوں پر آئیے۔ زندگی، تہذیب، ادب، تنقید، نقاد جیسے اہم اور بنیادی مسائل اور موضوعات دام تنقید میں کیا آتے ہیں۔ دیکھئے:

دنیا: . . . . . تہذیب اور تغیر کے ارتقائی عمل سے ہر لمحہ نئی صورت پذیر ہوتی رہتی ہے . . . . . زندگی ایک ارتقا پذیر حقیقت ہے جو . . . . . انواع اور جماعت کے ارتقائی شکل میں اپنے رنگ دکھاتی ہے . . . . . سماج کے اندر طبقات کی کشمکش بڑی حقیقت ہے . . . . . انسان کا شعور ان اجتماعی، معاشی اور معاشرتی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے جن میں ایک شخص حرکت کرتا ہے۔ شعور کی پیدائش ان مادی حالات سے ہوتی ہے جن سے ایک انسان کا اس سماجی زندگی میں گزر ہوتا ہے . . . . . ادب کو انفرادی نہیں اجتماعی خواہشات اور صحت بخش تصورات کا آئینہ ہونا چاہئے . . . . . حقائق اشیاء کا حقیقی علم صرف ذاتی تجربوں سے ممکن ہے . . . . . ادیب کے تخلیقی کارنامے ان حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں جو سماج میں پائی جاتی ہیں . . . . . ہر لحظہ بدلتی ہوئی اور متحرک دنیا میں حقائق کی اصل ذہنیت کا گرفت میں لانا آسان نہیں . . . . . وہی فن کار یا ادیب اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو جدلیاتی نقطۂ نظر رکھتا ہے اور حقائق کے سمجھنے میں اس سے کام لیتا ہے . . . . . تجربہ عمل کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا اور یہ عمل انفرادی نہیں سماجی شکل رکھتا ہے . . . . . ادب بغیر سماجی اظہار کے ادب نہیں ہوتا۔ علیحدہ حقیقت نگاری ہے سماجی حقیقت نگاری بھی کہہ سکتے ہیں۔ تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں۔ ان چند جملوں سے جو ادھر ادھر سے چن لئے گئے ہیں معلوم ہوتا ہے احتشام صاحب بھی کوئی نئی بات نہیں کہتے۔ وہی باتیں جو اختر حسین رائے پوری نے کہی تھیں، وہی باتیں جو مجنوں گورکھپوری نے کہی تھیں، وہی باتیں جو ہر ترقی پسند نقاد کہتا ہے وہی باتیں احتشام صاحب بھی کہتے ہیں۔ انھی حقائق کی روشنی میں وہ تنقید کے مسئلوں اور نقاد کے فرائض پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

تنقید: ادبی تنقید کی صلاحیت براہ راست اس عام شعور کا ایک عکس ہوتی ہے جو سماج میں پیدا ہو جاتی ہے . . . . . اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ تنقید کو تاریخ کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی جائے اور اس کے اصولوں کو اس طرح مرتب کیا جائے جس کی مدد سے زیادہ سے زیادہ انسان ادب سے لطف اندوز ہو سکیں، اس کی حقیقت کو بھی سمجھ سکیں اور اسے انسانی مفاد کے کام میں بھی لا سکیں . . . . . اصل نقد پر نظر رکھتے ہوئے ان تاریخی قوتوں کو ہمہ وقت پیش نظر رکھنا چاہئے جن سے ادب وجود میں آتا ہے جن سے انسان کی تمنائیں اور خواہشیں پیدا ہوتی ہیں جن سے تنقید کی صلاحیت وجود میں آتی ہے۔ جن سے انسانی تمدن بنتا ہے اور جن سے ان قدروں کا تعین کیا جاتا ہے جو انسانوں کو مادی مسرت اور ترقی کی اس منزل تک پہنچا سکتی ہیں جس کے لئے انسان ہر دور میں بے قرار ہے . . . . . تنقید نگاری ان تمام علوم سے وابستہ ہو جاتی ہے جن سے انسانی تہذیب و تمدن کی تخلیق اور تعمیر ہوتی ہے . . . . .

نقاد: اس کا فریضہ ان حالات کا تجزیہ ہے جن میں شاعری پیدا ہوتی ہے، ان خیالات کی تنقید ہے جو شاعر کے تجربے میں آ کر فنی شکل میں پیش ہوئے ہیں، ان تصورات کا احتساب ہے جنہیں وہ ایک ذمہ دار انسان کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے . . . . . اس کے سامنے یہ نہیں ہے کہ کتاب کی اچھائی یا برائی بیان کرے بلکہ وہ یہ دکھانا چاہتا ہے کہ کتاب سماج کی کن اچھائیوں اور برائیوں کی آئینہ دار ہے، اس میں زندگی کے کن حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور کس نقطۂ نظر سے۔ . . . . . وہ پہلی نگاہ میں اس امر کو پرکھتا ہے کہ مصنف کی کاوش زندگی کے دھارے میں کیا اہمیت رکھتی ہے۔ نقاد کے لئے فن کار اور اس کے خیالات کی روشنی پر نظر رکھنا بھی ضروری ہے . . . . . وہ ادب اور زندگی کے تعلق کا مطالعہ خاص طور سے کرتا ہے اور اسی تعلق کی روشنی میں ادبی کارناموں کی اہمیت کا اندازہ لگاتا ہے۔ ادیب کے خلوص کا پتہ چلاتا ہے۔ ادب کے بہترین اور پائدار قدروں کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ اور انہیں قدروں کا جزو بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ رطب و یابس میں تمیز کرنا، کھرے کھوٹے اور اچھے ادب میں فرق پیدا کر دکھانا، اجالے کو اندھیرے سے الگ کرنا نقاد کا کام ہے . . . . . جس طرح بغیر ایک مخصوص فلسفۂ حیات رکھے ہوئے اچھا ادیب نہیں بن سکتا اسی طرح ایک اچھا مفکر اور مدبر ہوئے بغیر کوئی شخص اچھا نقاد نہیں بن سکتا . . . . . نقاد کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی نگاہ حقیقتوں کے اس پیچیدہ راستے سے گزر کر سکے اور وہ ان تمام اثرات کا پتہ لگائے جنہوں نے ادیب کے شعور کو مرتب کیا ہے۔

یہ منتشر باتیں جو احتشام صاحب کے خیالات کی طرف اشارہ کرتی ہیں ایسی نہیں کہ ان پر تنقید کی عمارت کی تعمیر کی جا سکے۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ اصولِ نقد پر غور کرتے ہوئے کون سی باتوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ ”نقاد کا فریضہ تو وہ یہ ہے کہ وہ مارکسی ڈھنگ میں ادب کا تجزیہ کرے۔ خیالات و نظریات کا احتساب کرے۔“ خیال لفظوں سے زیادہ اہم ہے۔“

لکھتے ہیں: ”ایک اچھا حکیمانہ دماغ رکھے بغیر کوئی شخص اچھا نقاد نہیں ہو سکتا۔“ ”ان مضامین میں ایک حکیمانہ شعور کو رہنما بنانے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ...... بہ حیثیت نقاد کے میں ادراکِ حقیقت کے عام اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، جو متعدد علوم کی مدد سے ہاتھ آتے ہیں اس کی ادبی قدر کے سماجی مقصد کی تبدیلی میں مثلاً کسی کی تصنیف کی صحیح اہمیت دریافت کر سکوں۔ ...... وہ اصولِ تنقید ...... جس کی اشاعت کرنا اور جس کو عام بنانا میرا مقصد ہے۔ ادب مخصوص خارجی حالات کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ بات ساری دنیا کے ادب میں مشترک ہے۔ اس لیے اگر خارجی حالات کا مطالعہ عالمانہ شعور کے ساتھ کسی خاص اصول کو مدِ نظر رکھ کر کیا جائے تو پھر نقالی کی بحث ہی نہیں رہ جاتی۔ ...... ان مضامین کا مصنف غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ادب مقصد نہیں ذریعہ ہے، ساکن نہیں متحرک ہے، جامد نہیں تغیر پذیر ہے اسے تنقید کے چند مقررہ فرسودہ اصولوں اور نظریوں کی مدد سے نہیں سمجھا جا سکتا بلکہ ایک فلسفیانہ تجزیہ ہی کام آ سکتا ہے جس کی بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہو۔ ...... یہ میری عادت نہیں کہ دوسروں کا نام لے کر اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ ...... بعض مضامین برسوں کے مطالعہ اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ ...... جہاں تک ہو سکا ہے میں دیانت داری برتنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

حکیمانہ دماغ ...... عالمانہ شعور کا نتیجہ نہیں ہو سکتا، مارکسی فلسفہ کی غیر حکیمانہ اور غیر عالمانہ تکرار۔ کیا احتشام صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ مارکس سے الگ ہو کر وہ اپنی غور و فکر کے بل بوتے پر اس فلسفہ تک پہنچے ہیں جس کی ”بنیاد تاریخ کی مادی ترجمانی اور ارتقا بالضد کے اصولوں پر رکھی گئی ہے۔“ کیا وہ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ انہوں نے جس حکیمانہ شعور کو رہنما بنانے کی کوشش کی ہے، وہ مارکس کا دیا ہوا نہیں ہے؟ کہاں ان کا کہنا ہے کہ ادراکِ حقیقت کے عام اصول۔ یہ کون سے اصول ہیں جو متعدد علوم کی مدد سے ہاتھ آتے ہیں۔ ان کی حکیمانہ بصیرت اور عالمانہ شعور کا نتیجہ ہیں؟ کیا وہ پڑھنے والوں کو اس بات کا یقین دلا پاتے ہیں کہ وہ اصولِ تنقید جن کی اشاعت کرنا اور عام بنانا ان کی زندگی کا مقصد ہے، وہ بغیر کسی غیر کی شرکت کے ان کے دماغ کے زائیدہ ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو یہ کہنے کا فائدہ کیا: ”میں ادب کو زندگی کے عام شعور کا ایک حصہ سمجھتا ہوں جس میں طبقاتی رجحانات سانس لیتے اور تمدن کے مظاہر اثر انداز ہوتے ہیں۔“ ”ان مضامین کا مصنف غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ادب مقصد نہیں ذریعہ ہے۔“ احتشام صاحب دیانت دار آدمی ہیں پھر وہ کیسے لکھتے ہیں: ”اگر خارجی حالات کا مطالعہ عالمانہ شعور کے ساتھ کسی خاص اصول کو مدِ نظر رکھ کر کیا جائے تو پھر نقالی کی بحث ہی نہیں رہ جاتی۔“ عالمانہ شعور، خاص اصول، اپنے نہیں، مانگے کے ہیں پھر نقالی ناگزیر ہے۔ نقالی کہنے سے خفا ہوتے ہیں تو تتبع کہیے، تقلید کہیے، پیروی کہیے۔ ”یہ میری عادت نہیں کہ دوسروں کا نام لے کر اپنے خیالات کا اظہار کروں“ لیکن اپنے نام سے دوسروں کے خیالات کی تشہیر؟

لکھتے ہیں: ”اچھی تخلیقی قوت اچھی تنقیدی قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے ...... تخلیقی عمل ہی میں تنقید کا عمل بھی ہو جاتا ہے اور دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ...... تنقید کی ایک شکل تخلیق کے اندر ہی چھپی رہتی ہے اور تقریباً ہر ادب کی بنا کے ساتھ ہی وجود میں آتی ہے۔ ......

ایک بھدی اور مسخ شکل میں تنقید کا ادب کے ساتھ ہی پیدا ہونا ضروری ہے۔“ یہ ایلیٹ ہے لیکن صورت کچھ مسخ ہو گئی ہے۔ ”تقریباً ہر ادب کی بنا کے ساتھ ہی وجود میں آتی ہے۔“ تقریباً کیوں؟ ”بھدی اور مسخ“ کیوں؟ اگر اچھی تخلیقی قوت اچھی تنقیدی قوت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں، مارکس کی زبان سے لکھتے ہیں۔ جو کچھ دیکھتے ہیں مارکس کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

(۱) ”زندگی کے پیچیدہ پہلوؤں کو سمجھنے کی طاقت اور انہیں واضح کرنے کا یقین اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان شعوری طور پر سماج کی رفتار، ارتقاء اور فلسفۂ تغیر سے واقف ہو۔ مارکس کے فلسفہ اور دوسرے فلسفیوں کے افکار میں ایک امتیازی فرق یہ ہے کہ اور لوگ فلسفہ کی مدد سے محض دنیا کو سمجھنا چاہتے ہیں اور

مارکسی اس کی مدد سے دنیا کو بدلنا چاہتا ہے۔"

۲۔ "جس فلسفے نے مکمل طور پر دونوں کو الگ کر دیا ہے اور تغیر کا ایسا مادی اور سائنٹیفک نظریہ پیش کیا ہے جس سے ہر جگہ اس کی شکلیں پہچانی جا سکیں وہ مارکسزم ہے۔ اس وقت تک جس مادی نقطۂ نظر کا ذکر کیا گیا ہے وہ کم و بیش اسی پر مبنی ہے۔"

۳۔ "ذرائع پیداوار اور انسانی شعور کے عمل اور رد عمل سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔"

۴۔ "لینن نے کہا ہے کہ طبقاتی شعور حقیقی یا پیدائشی نہیں ہوتا بلکہ حاصل کیا جاتا ہے۔"

۵۔ "حقیقت کو اس کی مختلف شکلوں میں پہچاننے کے لئے ہر فسانے کے مواد کا مطالعہ سماجی اور معاشی رجحانات، طبقاتی تضاد اور جدوجہد حیات کی روشنی میں کرنا چاہئے۔"

۶۔ "مادی انقلاب کے بغیر تمدن کی قدریں نہیں بدلتیں۔"

یہ مثالیں بالتخصیص پیش کی گئی ہیں۔

سرور صاحب سے بہت سی باتوں میں احتشام صاحب اختلاف کرتے ہیں۔ سرور صاحب تخلیقی تنقید کا پرچار کرتے ہیں۔ احتشام صاحب تخلیقی تنقید کو تنقید نہیں سمجھتے۔ وہ تنقید کو تشریح اور تفسیر بھی نہیں بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تنقید کا اصل کام ان کیفیات کی بازآفرینی نہیں جو کسی شاعر یا ادیب پر گزری ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نقاد کا کام ان کیفیات کو دہرانا نہیں ہے جو ادیب پر تخلیق کے وقت گزری ہیں بلکہ ادب کے متعلق فیصلہ کن انداز میں رائے دینا ہے۔ نقاد فیصلہ یا رائے کی ذمہ داری سے بچ نہیں سکتا۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اصول تنقید مغرب اور مشرق کے نہیں ہوتے۔ ان میں عالمگیری اور ہمہ گیری ہوتی ہے۔ ایسی بہت سی باتیں ملتی ہیں اور ان باتوں کے پیچھے وہی مارکسی نظریہ کارفرما ہے۔ "نقاد شاعر کا سینہ اور ادیب کا دل چیر کر اندر جھانکتا ہے اور دیکھتا ہے کہ اس نے کہاں تک حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی جرأت کی ہے۔ وہ فن کار اور اہل ہنر کے خیالات کی درستی پر بھی نظر رکھتا ہے۔ رطب و یابس کی تمیز کرتا ہے، کھوکھلے پن کا پول کھول دیتا ہے۔" —— یعنی وہ دیکھتا ہے کہ ادیب یا شاعر نے مارکسزم کا مطالعہ کس حد تک کیا ہے اور اس کو کہاں تک پچایا ہے۔ اس کے خیالات کہاں تک درست یعنی مارکسی ہیں۔ اور اس نے "امر واقعات" کو کس حد تک فاش کیا ہے۔ کیونکہ "مادی فلسفہ، تاریخی شعور اور سماجی تجزیے کی کسوٹی پر پورے اترنے والے خیالات ہی امر واقعات کو فاش کرنے والے خیالات سمجھے جا سکتے ہیں۔" اور وہ اصول جن میں عالمگیری اور ہمہ گیری ہوتی ہے "جو مغرب و مشرق میں یکساں رہیں" وہ مارکسی اصول ہیں۔

دوسرے ادبی مسئلوں کی طرح، مواد اور ہیئت پر بھی بار بار اظہار خیال ہوتا ہے: کیا پیش کیا جائے اور کیسے؟

"اگر خیال کو دور دور تک پہنچانا ہے تو اس کے لئے ایسے اسلوب بیان کی ضرورت ہے جس سے عوام واقف ہوں اور ایسی ہیئت اور شکل کی ضرورت ہے جو اظہار کی سماجی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ...... دنیا کو ترقی کی راہ دکھانے میں ادب کا بھی ہاتھ ہے اور یہ جمالیاتی ہیئت سے نہیں صحت بخش خیال ہی سے ہو سکتی ہے۔ ہیئت کا کام یہ ہے کہ وہ خیال اور مواد کو بہترین شکل میں پیش کرے ...... وہ ادیب اسے سوچ کر لکھتا ہے کسی مقصد کے ماتحت لکھتا ہے، وہ کچھ لوگوں کے لئے لکھتا ہے۔ اس طرح اس کا تعلق سماج کے مقصد و رجحان اور تقاضوں سے ہو جاتا ہے اور یہی بات اس کے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کرتی ہے۔ جس وقت وہ اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ کوئی لفظ غلط نہ استعمال کرے اس وقت اس کے دل میں کیا یہ خیال نہیں ہونا چاہئے کہ وہ کوئی بات ایسی نہ کہے جو اس کی ذمہ دار حیثیت کی منافی ہو؟ ہر حال میں خیال لفظوں سے زیادہ اہم ہے ...... نقاد صرف ہیئت اور صورت کے حسین ہونے سے آسودہ نہیں ہو سکتا۔ مواد اور معنوں کے صحت بخش عناصر کا تجزیہ بھی اس کے فرائض میں داخل ہے ...... مواد کی حقیقت کا جائزہ لینے کے بعد تخلیقی ادب کے سماجی اظہار کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ مواد اور ہیئت میں جو تعلق ہے اس کی آمیزش سے ادب بنتا ہے ...... نقاد کو اس پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ مواد کے پیش کرنے کے طریقے کو بھی دیکھے ...... ہیئت مواد کی بھی ایک سماجی حیثیت ہے ——"

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں بھی وہی مارکسی خیالات کا ایک روپ ہے۔ وہ کہتے تو یہی ہیں کہ مواد اور ہیئت میں جو تعلق ہے اس کی ابتری سے ادب ادب بنتا ہے لیکن وہ "مواد اور معنی" کے صحت بخش عناصر پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ ہیئت کی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ وہ مواد کی حقیقت کا جائزہ لیتے ہیں اور ہیئت کا جائزہ نہیں لیتے۔ ان کی تنقیدوں پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی ——— یہ مارکسی نقاد کی عام کمزوری ہے۔ وہ فنی خوبیوں کا محض ضمناً ہی ذکر کرتا ہے لیکن ان خوبیوں کا تجزیہ نہیں کرتا۔ وہ کسی فن پارے میں اپنے ڈھنگ کے خیالات ڈھونڈتا ہے۔ اگر ایسے خیالات مل گئے تو وہ اس فن پارے کی تعریف کرتا اور نہ ملے تو مذمت کرتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ اگر اس میں فنی خوبیاں نہیں تو وہ ادب نہیں۔ پھر اس کے مواد کا تجزیہ بیکار ہے۔

میں نے کہا ہے کہ احتشام صاحب 'محققانہ' اور 'عالمانہ' کا بڑا استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کی محققانہ اور عالمانہ کاوشوں کا کوئی ایسا نتیجہ نہیں نکلتا جس سے پڑھنے والے مرعوب ہو سکیں۔ وہ باتیں بڑی بڑی کرتے ہیں: "تنقید نگاری ان تمام علوم سے وابستہ ہو جاتی ہے جس سے انسانی تہذیب و تمدن کی تخلیق اور تعمیر ہوئی ہے ...... تجزیہ کے لئے ان تمام علوم کی ضرورت ہے جو انسانی فطرت اور شعور کی فطری اور ارادی تشکیل سے تعلق رکھتے ہیں ...... نقاد کو ماہر نفسیات، ماہر عمرانیات، ماہر سیاسیات، ماہر اخلاقیات وغیرہ کی حیثیت سے ادب کو دیکھنا چاہئے۔ اگر تنقید کوئی علمی کام ہے اور محض تاثرات کا بیان نہیں تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا۔ جن سے زندگی اور ادب کو سمجھا جا سکتا ہے ...... ہر علم سے مدد لے کر ادب کو سمجھنا چاہئے ...... اگر تاریخ، نفسیات، معاشیات اور سائنس کی مدد سے اصول نقد معین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش رائیگاں نہ جائے گی ...... ایک اچھے نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر سوال کا جواب فراہم کرے اور ہر مسئلہ کا حل ڈھونڈ نکالے ———" بول بڑے ہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ نقاد کو مارکسی فلسفہ سے واقف ہونا چاہئے۔ احتشام صاحب اس فلسفہ سے آگے نہیں دیکھتے کیونکہ ان کے خیال میں یہی تمام علم ہے۔ پھر جدید علوم کی باتیں صرف ایک دھوکہ ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور پڑھنے والوں کو بھی۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں کوئی ناانصافی کر رہا ہوں۔ وہ خود کہتے ہیں: "اس فلسفہ (مارکسزم) کے بانیوں اور مبلغوں نے اس کو سماج کے سبھی مظاہر پر منطبق کرکے دیکھا ہے اور خاص کر ادب کی مادی بنیادوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے جب بھی ادب کے مادی تصور پر غور کرنے کی ضرورت ہوگی تو اس فلسفے کے اصولوں کو سامنے رکھنا ہوگا کیونکہ دوسرے مادی اور عمرانی فلسفے فکر کے تمام پہلوؤں کو ایک مسلسل حرکت کرتے ہوئے نہیں دیکھتے۔"

اسی طرح وہ بعض اہم موضوعات کو اپنے تحلیلی شعور کا نشانہ بناتے ہیں لیکن بار بار کا نشانہ خطا ہو جاتا ہے اور ہر موضوع ان کے پنجہ سے بچ نکلتا ہے۔ دیکھئے، وہ شعور اور لاشعور کی باتیں چھیڑتے ہیں: "فرائڈ اور اس کے ہم خیال ماہرین علم النفس نے انسانی اعمال اور افعال کی نئی تشریح پیش کی۔ شعور اور لاشعور کے محرکات کا پتہ لگایا۔ ادب اور دوسرے فنون لطیفہ کو جنسی میلانات کے بعض پوشیدہ، نامعلوم اور دبائے ہوئے اثرات کا نتیجہ بتایا۔ انفرادی طور پر شاعر یا ادیب کی زندگی میں جنسیت کو جو جگہ حاصل ہوتی ہے اس میں جنسی دباؤ، جنسی الجھن، تحت شعور اور لاشعور میں جنسی خواہشات کا علامات کی شکل میں اس قدر قوی کا ظاہر ہونے کی کوشش کرنا اور پھر اس جا بجا کا ارتقاء، ان خواہشات کے ماتحت ادیب کے کارنامے کی تشریح اور تحلیل کی جاتی ہے ———" پھر یہ مانتے ہوئے کہ یقیناً ایک حد تک اس سے مدد لینے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی کیونکہ محرکات شعور کی پیدائش میں شاعر کی پوری شخصیت بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔" وہ اس سے مدد نہیں لیتے، اسے رد کر دیتے ہیں، صرف اس لئے رد کر دیتے ہیں کہ اس سے مارکسزم کی توہین ہوتی ہے: "جب کوئی نقاد صرف لاشعور کو حقیقت مان کر ادب و شعر کے سارے سرمائے کو اسی پر ڈھالنے لگتا ہے تو انسانی شعور کی قوت تخلیق کی بڑی توہین ہوتی ہے اور مادی زندگی کے وہ محرکات جو افراد کو نہیں تو عوام اور جماعتوں کو جہد حیات کا سبق دیتے ہیں بے کار اور معلوم ہوتے ہیں۔" پھر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ لاشعور پر بھی خارجی حالات کا اثر ہوتا ہے: "اگر خارجی حالات، جن کے متعلق تہذیب، اخلاق اور سماج ہیں، لاشعور پر اثر انداز نہیں ہوتے تو وہ مایوسیاں پیدا کہاں سے ہوتی ہیں جنہیں کیوں پیدا ہوتا ہے خارجی حالات سے بالکل بے نیاز کیوں نہیں ہوتا ———؟"

بس اسی قدر۔ وہ مارکسزم کو حقیقت مان کر آگے بڑھتے ہیں پھر کسی موضوع پر وہ غیر جانبداری کے ساتھ نہ سوچ سکتے ہیں اور نہ لکھ سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لاشعور کا تجزیہ بھی خارجی حالات کی روشنی میں ہونا چاہئے لیکن وہ لاشعور کا تجزیہ نہیں کرتے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "محرکات شعور کی پیدائش میں شاعر کی پوری

شخصیت بہت دور رس رکھتی ہے"۔ لیکن پوری شخصیت کا بھی تجزیہ نہیں کرتے کیونکہ وہ نفسیات اور تحلیلِ نفسی سے پوری واقفیت نہیں رکھتے۔ وہ شعور، تحت شعور اور لاشعور کا نام لیتے ہیں لیکن فرائڈ کی مدد سے بھی یہ نہیں بتا سکتے کہ انسان کی زندگی میں شعوری محرکات میں ان کی کیا اہمیت ہے۔ انہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ فرائڈ کے نظریے کے مطابق لاشعور کا تجزیہ ممکن نہیں۔ لاشعور فرائڈ کے نزدیک تہ خانہ میں چھپا ہوا ہے اور بچپن کی اثر انداز ہوتا ہے کسی خاص جانب دھکیل دیتا ہے۔ اور ہمیں خبر نہیں ہوتی کہ ہم اس جانب کیوں جا رہے ہیں۔ یہ ایک زبردست میلان ہے اور ہم نہیں جانتے کہ یہ میلان کہاں سے آ گیا ہے اور کیوں اس کا اثر ایسا ہوتا ہے کہ اس سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ اگر یہ میلان شعور کی سطح پر نہیں ابھرتا تو اس کا تجزیہ بھی خارجی حالات کی روشنی میں ممکن نہیں ——

میں فرائڈ کے نظریے کی تائید نہیں کرنی چاہتا —— کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ کسی کی باتیں سمجھ لینے کے بعد ہی اس پر اعتراض ممکن ہے۔ احتشام صاحب یہ بھی نہیں بتاتے کہ تحت شعور کی شعری تخلیق میں کیا اہمیت ہے۔ یہ کہنا کہ تحت شعور بھی خارجی حالات سے متاثر ہوتا کوئی بات نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ شعری تخلیق کے وقت خیالات، جذبات، افکار تحت شعور سے ابھرتے ہیں یا نہیں۔ اس موضوع پر بھی کوئی روشنی ڈالی جاتی۔ شعور آزاد ہے یا گرفتار، مالک ہے یا غلام —— احتشام صاحب یہ بھی نہیں بتاتے۔ یعنی اس موضوع کو اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں۔ لاشعور نہیں شعور کے اندھیرے میں دھکیل دیتے ہیں۔

وہ ادب اور اخلاق پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن اسے بھی اندھیرے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے طویل مضمون کا لب لباب یہی ہے۔ "ادب کو انفرادی نہیں اجتماعی خواہشات اور صحت بخش تصورات کا آئینہ ہونا چاہیے ...... اخلاق کا ایک عام اور یکساں معیار بنایا جائے اور جب اس کی خلاف ورزی ہو تو لوگ گرفت بھی کریں۔ ...... علم الاخلاق کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہے کہ جنسی تعلقات کو منضبط کرے اور ہر مرد عورت کی زندگی میں ایسا توازن قائم کرے جس کی تلاش میں انسان ابتدا سے آج تک سرگرداں ہے ...... ادب اور اخلاق دونوں کا مقصد یہی ہے کہ ایک ایسے نظامِ زندگی کی بنیاد ڈالی جائے جس میں گندگی نہ ہو، حسد نہ ہو، نفرت نہ ہو، ایسا نظام فکر اور عمل کے اتحاد سے قائم ہو سکتا ہے۔"

حالی کی طرح احتشام صاحب بھی اخلاق کو اس کے محدود اور عملی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ آرنلڈ کے اخلاق اور وائلڈ کے اخلاق کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اخلاق کچھ اور معنی بھی رکھتا ہے۔ ایک ہمہ گیر اصول ہے جو اخلاق کی محدود اور عملی صورتوں کے پیچھے کار فرما ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنی اندرونی زندگی میں توازن حاصل کر سکے اور اس کی انفرادی اور سماجی زندگی ہم آہنگ ہو جائے۔ اخلاق کا ایک عام اور یکساں "معیار" بنانے کی ضرورت نہیں —— اخلاق کے ہمہ گیر اصول کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اخلاق کا کام صرف جنسی تعلقات کو منضبط کرنا نہیں۔ بات یہ ہے کہ اخلاق کو بھی اسی عینک یعنی مارکسزم سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسا نظامِ زندگی جس میں گندگی نہ ہو، فحاشی نہ ہو، حسد نہ ہو، نفرت نہ ہو، مارکسزم ہی قائم کر سکتا ہے۔ جہاں یہ نظام قائم ہو گیا پھر سب مسئلے —— اخلاق کے بھی مسئلے حل ہو جائیں گے —— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احتشام صاحب کی "انفرادی" خصوصیت یہ ہے کہ وہ باتوں کو چھیڑتے ہیں لیکن ان پر کافی روشنی نہیں ڈالتے۔ مسئلوں کو الجھاتے ہیں سلجھاتے نہیں، بحث کرتے ہیں لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔

"ادب برائے ادب کا اور ادب برائے زندگی کا کیا مفہوم ہے؟" "ادب میں مقصد اور افادیت سے کیا مطلب ہے؟ پروپیگنڈا کسے کہتے ہیں اور ادب اور پروپیگنڈا میں کیا رشتہ ہے؟ کیا کائنات کا کوئی مقصد ہے؟ کیا زمان و مکان کی عظیم الشان وسعت میں انسان کی کوئی حقیقت اور اہمیت ہے؟ وہ کسی مقصد اور منزل کی طرف بڑھ رہا ہے یا اس میں بڑھنے کی طاقت ہے؟ ...... ادیب عام انسانوں کی طرح ہوتا ہے یا کوئی غیر معمولی طاقت اس کے پاس ہوتی ہے۔ وہ ماحول سے بنتا ہے یا ماحول اسی کی تحریر سے بنتا ہے؟ ادیب اور ماحول میں کیا تعلق ہے؟ وہ ماحول سے بیگانہ ہو کر بھی کچھ لکھ سکتا ہے؟ ...... یہ مختصر سا نمونہ ہے۔ نتیجہ جو نکلتا ہے وہ یہ کہ "تفصیلات میں جانے کا وقت نہیں ورنہ ہم دیکھتے کہ ...... ہو سکتا ہے کہ ان سوالوں کے عملی اور یقینی جواب ڈھونڈے جا سکیں ......"

دوسری "انفرادی" خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیدھی سادی بات نہیں کر سکتے۔ ان کا دماغ پیچیدہ ہے اور ہموار راستے پر چلنا پسند نہیں کرتا۔ وہ ٹیڑھا میڑھا پیچ و خم کھاتا ہوا چلتا ہے۔ "بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی" ہمیشہ بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ ان کے مضمون "میں کیوں لکھتا ہوں" کو دیکھئے۔

"کیوں" کے ساتھ وہ "کس کے لئے" کا سوال بھی اٹھاتے ہیں: "اس سوال سے یہ دوسرا سوال بھی وابستہ ہے: میں کس کے لئے لکھتا ہوں؟ جواب یہ ہے کہ میں اس حقیقت کو سامنے رکھتا ہوں کہ ہر ادیب اور شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے ...... بہ حیثیت نقاد کے میں ادراکِ حقیقت کے عام اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ...... اس کی (فن کار کے سماجی مقصد کی) جستجو کرتا ہوں تاکہ کسی تصنیف کی اہمیت واضح کر سکوں۔ خود بھی اور دوسروں کو بھی سمجھا سکوں ...... ادب کے فنی اور جمالیاتی عناصر کا تجزیہ اور ذوق کے ارتقا اور نشو و نما کی تاریخ بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ پہلو ادب کی اثر پذیری میں اضافہ کر کے مصنف اور قاری کے رشتہ کو مضبوط کرتے ہیں انہی مسائل کو جانچنے پرکھنے اور واضح کرنے کے لئے لکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس سے دوسرے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں ——"

پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر صرف اس قدر کہنا تھا تو چار صفحوں کی کیا ضرورت تھی۔ دوسری کتابوں کا ذکر کیا ضروری تھا؟ پھر آگے کہتے ہیں: "سچ تو یہ ہے کہ ان کا بہت تھوڑا سا حصہ میری سمجھ میں آیا" تو انہیں یہ نتیجہ نکالنے کا کیا حق تھا کہ "یہ خیالات کمزوریوں پر پردہ ڈالتے ہیں اور منزل کو کھو دینے کی کوشش ہیں"؟ پھر جیسے دو سو روپے کی ملازمت ہے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ کیوں اور کس کے لئے کا صاف جواب نہیں ملتا۔ کس کے لئے؟ دوسروں کے لئے اپنے لئے نہیں —— یہ دوسرے کون ہیں؟ پڑھنے والے ہیں؟ مزدور، کسان، مستری صاحب، بھیرو؟ کیوں کیا سمجھتے ہیں کہ "اس سے دوسرے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں"؟ "اب رہا کیوں کا مسئلہ تو اس کا جواب یہ کہ وہ انہی مسائل کو جانچنے پرکھنے اور واضح کرنے کے لئے لکھتے ہیں، اس لئے کہ دوسرے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں یعنی وہ دوسروں کے لئے لکھتے ہیں۔ احتشام صاحب "کیوں" اور "کیسے" اور "کیا" اور "کس لئے" میں فرق نہیں کرتے —— سوال ہے "کیوں"؟ جواب ہے کیا لکھتے ہیں اور کس کے لئے، کہہ کر اس پر پردہ ڈال دیتے ہیں۔

اس طرح وہ بہت سی باتیں کہتے ہیں اور ان میں تضاد ہوتا ہے اور اس تضاد کو محسوس نہیں کرتے۔ "ایک شخص کی بہت سی شخصیتیں نہیں ہو سکتیں۔ کم سے کم اس کی ذمہ دار شخصیت ایک ہی ہوگی" یعنی اس کی بہت سی شخصیتیں ہو سکتی ہیں۔ وہ یہ جانتے ہیں مواد اور ہیئت میں جو تعلق ہے اس کی آمیزش (تعلق کی آمیزش کیسی ہوتی ہے؟) سے ادب ادب بنتا ہے۔ وہ مواد اور ہیئت کے ساتھ امتزاج کا بھی نام لیتے ہیں پھر مواد کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں: "خیال لفظوں سے زیادہ اہم ہے" —— یہ نہیں سمجھتے کہ اچھے ادب میں خیال اور لفظوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے اور پیچھے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا —— کہتے ہیں: "فن پاروں میں کیفیات کی باز آفرینی بھی تو نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی ادیب پر گزرے ہوئے اثرات کو پوری طرح اپنے اوپر طاری کرنا مشکل ہے۔ یہ کیفیات جذبات خاص قسم کے محرکات اور پیچیدہ حالات کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔" اور پھر کہتے ہیں: "اپنے ذوق اور وجدان کے سہارے کسی ادیب یا شاعر کی روح میں اتر جانا آسان ہے ...... نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام اثرات کا پتہ لگائے جنہوں نے ادیب کے شعور کو مرتب کیا تھا ——" کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

"نقادوں سے مراد وہی نقاد ہیں جو کسی مخصوص اصول کی بنا پر نقد کرتے ہیں ......" "آمروں کا تصور بغیر حقیقت اور قطعیت کے جامد و لایتبدل نہیں کیا جا سکتا" لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "اصول تنقید ہر زمانے میں بدلتے رہتے ہیں اور پرکھنے کے قدریں بدلتی رہتی ہیں ...... مطلق قدر زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی ——" "جب زندگی تبدیل ہوگی تو قدریں کیوں نہ تبدیل ہوں گی؟" وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ نقاد ادیبوں کو مختلف "چشموں" سے دیکھتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اصولوں کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی پھر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مارکس نے زندگی کے اسرار کو پایا ہے۔ جن اصولوں کی مارکسی فلسفہ پر بنیاد رکھی جائے گی کیا وہ بھی کالعدم ہوں گے؟ "خیال مادہ ہی سے پیدا ہوتا ہے چاہے قوت تخلیق اس میں کتنی ہی رنگ آمیزی کرے" ...... "قوت تخلیقیت آزاد قوت ہے لیکن اس کی آزادی بھی فرد کے شعور سے باہر جا کر دم توڑ دیتی ہے" —— خیال مادہ سے پیدا ہوتا ہے کیا قوت تخلیق مادہ سے نہیں پیدا ہوتی؟ اگر خیال بھی مادہ ہے اور قوت تخلیق بھی مادہ ہے تو قوت تخلیق میں رنگ آمیزی کرنے کی قوت کہاں سے آئی؟ کیا قوت تخلیق فرد کے شعور سے باہر ہو سکتی ہے؟ "جب خیال مادہ کا عکس ہو گا تو پھر خیال میں کسی نہ کسی شکل میں حقیقت ضرور موجود ہوگی، خواہ وہ ایسی صورت میں پیش کی گئی ہو، خواہ بری ہو" —— "اگر خیال مادہ کا عکس ہے تو وہ حقیقت کو بری شکل میں کیسے پیش کر سکتا ہے؟ پھر خیال مادہ ہے، مادہ سے پیدا ہوتا ہے، مادہ کا عکس ہے، مادہ کو بری شکل میں پیش کرتا ہے۔ یہ تو وہی تصوف کی باتیں ہوئیں جس سے مارکسی نقاد دور رہنا چاہتے ہیں۔

کچھ اور باتیں سنئے: "غزل کے ہر شعر کا پس منظر اور روایت ہوتی ہے اس سے شعر فہمی کے قاعدے متعین نہیں کئے جا سکتے ——" "ایک تہذیب وقتی

کا دور پہلے گزشتہ تہذیب و تمدن کے دور سے جدید سے آگے بڑھتا ہے چاہے وہ اثبات ہی سے یا منفی ہیں۔ ..... " ماضی کی تعریف میں سب سے بڑی بات یہی جا سکتی ہے کہ اگر اس کا وجود نہ ہوتا تو حال بھی پیدا نہ ہوتا۔ ..... " شاعری کا وجود کب ہوا کوئی نہیں بتا سکتا لیکن انسانی تہذیب نے بہت سی منزلیں طے کر لی ہوں گی اس وقت شاعری پیدا ہوئی ہوگی ——" " فنون لطیفہ کی تاریخ میں ایسے فنکار اور ایسے فنی نمونے دکھائی دیتے ہیں جو ہر اصول کو توڑ دیتے ہیں تاہم اصول بنانے میں زیادہ سے زیادہ اشتراک کی کوشش ہونا چاہئے ——" " یہ وہ چیزیں پہلے انسانی فطرت کا جزو نہیں حالات سے پیدا ہو سکتی ہیں ——"

شعر ہی کے نادر سے معتبر نہیں ہو سکتے تو شعر لکھنا بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ایک قسم کا اعلان ہے۔ حقیقی میں جو دیکھی جاتی ہے وہ ایک تنقید دوسرے نقوش پر اثر ڈالتا ہے لیکن کون سی نئی بات ہوئی؟ ماضی سے حال پیدا ہوتا ہے، حال سے استقبال پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی کون بات ہوئی جو اس طالب علم پر بھی جانے؟ پھر ماضی کی "تعریف" کی ضرورت کیا اور بڑی تعریف اور چھوٹی تعریف کا تفرقہ کیسا؟ شاعری کا وجود کب ہوا —— اگر اس بات کا علم نہیں تو پھر اس کا ذکر کیا اور ان سی حالات ہوئی کہ انسانی تہذیب نے بہت سی منزلیں طے کر لی ہوں گی اس وقت شاعری پیدا ہوئی ہوگی ——" اگر فنکار ہر اصول کو توڑ دیتے ہیں تو اس کا منطقی نتیجہ کیا ہوا؟ اصول بنانے میں زیادہ سے زیادہ اشتراک کی کوشش کیوں ہونا چاہئے؟ یہ وہ چیزیں پیچھے انسانی فطرت کا جزو نہیں رہ گئے کہاں سے؟ حالات، انسانی حالات سے؟ زندگی کے حقائق سے؟

احتشام صاحب جانتے ہیں کہ روسو کا نظریہ ہے کہ انسان معصوم ہے، ساری برائیاں سماج سے آئی ہیں۔ کیا وہ بھی "شریف وحشی" کے خیال کو تسلیم کرتے ہیں؟

ترقی پسند نقادوں کی ہر تنقید میں حضرت آدم سے شروع کرتے ہیں۔ " زندگی ایک جدلیاتی حقیقت ہے جو تغیر و تخریب کے ارتقائی عمل سے ترقی پذیر ہے۔" یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقیدوں میں اس قدر تکرار ہے۔ وہ نظیر پر لکھیں یا غالب پر، اختر شیرانی یا مجاز پر ایک ہی قسم کی باتیں ملتی ہیں۔ جدلیاتی زندگی، طبقاتی کشمکش، حقیقت و خیال کی مادیت۔ غرض اس قسم کی باتیں وہ اشارے میں ہوں یا تفصیل کے ساتھ کہہ لیتے ہیں تب موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے جب ابتدا میں ہم لوگوں کو گھر پر پڑھایا کرتے تھے بہت تفصیل کے ساتھ پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز مولوی شرف الدین صاحب نے مجھ سے پوچھا "کیا پڑھ رہے ہو؟" میں نے کہا "گلستاں"۔ کچھ دنوں کے بعد اختر صاحب نے پھر دریافت کیا "اب کیا پڑھ رہے ہو؟" میں نے کہا: "گلستاں"۔ وہ بول اٹھے "یہ گلستاں ہے ایک کتاب کیوں نہیں ختم ہوتی؟" میں سمجھتا ہوں کہ اگر سارے ترقی پسند نقاد مل کر ایک کتاب لکھ ڈالیں۔ اس میں وہ ساری باتیں لکھ ڈالیں جن کی وہ تکرار کرتے ہیں۔ وہ سارے امور حیات واضح کریں جو ان پر منکشف ہوئے ہیں تو پڑھنے والے اس نامعقول تکرار سے نجات پا سکیں گے۔ کم سے کم احتشام صاحب ہی یہ تکلیف گوارا کریں۔ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ ایک ہی قسم کی باتوں کی تکرار کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ وہ اشاروں میں باتیں کرتے ہیں اور تفصیل میں نہیں جاتے۔ اگرچہ وہ تفصیل کی شدید ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں۔ بہر کیف ایک طرف تو زندگی کی جدلیات کی بات اٹھائی جاتی ہے اور دوسری طرف نعرہ لگی۔ وہ کسی شاعر یا نقد کے بعد کے شاعر کا ذکر ہو۔ بغیر ضد کے ذکر کئے بات ہو ہی نہیں سکتی۔ ضد کا سہارا ضروری ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب بچے پہلے پہل حروف تہجی سیکھتے ہیں تو وہ الف سے ی تک یاد کر جاتے ہیں اور اگر آپ پوچھتے تو وہ الف سے ی تک فر فر سبق سنا دیتے ہیں۔ لیکن آپ دال پر انگلی رکھ کر پوچھئے کہ یہ کیا ہے تو وہ اکثر نہیں بتا سکتے ہیں۔ وہ شروع سے سبق دہرانے لگتے ہیں: ا، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ، د —— یہ دال ہے۔ ترقی پسند نقاد بھی کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں!

احتشام صاحب کہتے ہیں کہ نقاد غیر جانب دار نہیں ہو سکتا۔ لیکن وہ ہر طرف سے نکل کر جوش کی شخصیت کو سمجھنا اور سمجھانا چاہتے ہیں —— ہاں تو نقاد جانب دار ہوتا ہے۔ پھر جب ترقی پسندی اور ترقی پسند شاعری کی بات ہوتی ہے تو وہ جانبداری سے کام لیتا ہے۔ "لیکن ایک جماعت ایسے ادیبوں کی بھی ہے، جنہوں نے راستہ پا لیا ہے چاہے وہ تیز رو ہوں، سبک خرام ہوں، لیکن انہیں اپنی منزل کا نشان معلوم ہے۔ وہ ان راہوں سے واقف ہیں جو ادھر نہیں جاتا چاہئے ——"

"ان اشاروں سے بھی کم از کم یہ اندازہ ہوتا ہی ہے کہ مجاز، سردار جعفری، جذبی، مخدوم محی الدین، فیض، [illegible] سب کے سب انقلاب کی رفتار سے واقف ہیں۔ انہیں تاریخی طور پر سماج کے تضاد اور ہیجان کا احساس معلوم ہے۔ انہوں نے دنیا میں انقلابات کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے۔ انہیں زندگی کے وہ موڑ معلوم ہیں جہاں انسانیت کروٹ بدلتی ہے ...... ان لوگوں نے آتی منزل دیکھ لی ہے، اپنا راستہ پہچان لیا ہے ...... اردو ادب میں اشتراکی حقیقت نگاری کا دور آگیا ہے اور اس میں زندگی بجلی کی طرح کوندتی ہے ——"

بلکل جانب داری ہے۔ لیکن صرف اس قدر ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے مارکسیت کو اپنا لیا ہے۔ احتشام صاحب نے کہا ہے کہ جو نقاد ہر ادبی کارنامے پر سر دھنتا ہے اس کا حال بھی اصل میں اس نیلام کرنے والے کا سا ہے جو ہر مال کی تعریف کرتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ احتشام صاحب بھی اس نیلام کرنے والے کی طرح ہر ترقی پسند مال کی تعریف کرتے ہیں اور خریداروں پر اپنی دیانت داری ثابت کرنے کے لئے کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیتے ہیں: "یہ چاہے وہ ذرا ہلکے ہوں، چاہے وہ بالکل خام ہی ہوں۔"

پھر ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ مارکسزم کا اتنا زیادہ پرچار کرنے کے بعد وہ اتنی ادیبوں کے ذکر میں [illegible] کسی قسم کی باتیں کہہ کر پھر روایتی طرز میں تعریف کرنے لگتے ہیں، جیسے اختر شیرانی پر: "........ انہوں نے محبت اور آزادی کے لئے مرمٹنے کا پیغام دیا۔ اگرچہ اسے آج کی سیاسی اور سماجی کش مکش میں پیغام کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ انہوں نے اردو شاعری کو نئے انداز اور نئے قسم کی شعری دولت عطا کی جس کی بدولت جدید شاعری کے ارتقاء میں ہمیشہ اہم جگہ دی جائے گی۔ شاید اب اردو میں ایسے رومانی شاعر پیدا نہ ہوں گے لیکن آنے والی نسلیں اپنی امنگوں اور اپنے غضب انھیں کے اظہار کے لئے اختر کی شاعری سے پیار کی جرأت، والہانہ پن، سرمستی اور کیف مستعار لیتی رہیں گی اور بہت سے نوجوان عمر کی اس منزل میں جب محبوبہ گمشدہ خواب جوانی اور سماجی حقیقت معلوم ہوتی ہے، ان کی نظمیں گائیں گے اور انھیں پڑھتے رہیں گے کیونکہ جوش کے وہ مستحق ہیں وہ ایک پائندہ جذبہ ہے۔" اور یہ بھی کہتے ہیں: "مختصر یہ کہ [illegible] ہندوستان میں [illegible] اپنی خصوصیتیں اپنے ساتھ لئے ابھرتا ہے۔ وہ اپنی تہذیب کا علمبردار ہے۔ اس کا اقبال ہی آگے [illegible] ہونے سے، اور اس کا یقین اسے شکست کھانے سے بچاتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہماری آنکھوں میں زندگی کے بڑے بڑے سوال بے معنی نظر آنے لگتے ہیں اور اس کے بے اصل ماحول پر تبسم آ جاتا ہے۔ اس کی بجائی ہوئی دنیا میں ہم سب سے الگ ہو کر نکلتے ہیں اور ہمیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کس قدر غیر حقیقی ہو گئے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ وقتی طور پر قصہ بیان کا احساس معطل ہو گیا ہے۔ نقاد ابھی نوجوان عمر کی اس منزل میں ہے جب محبوبہ گم شدہ خواب جوانی اور سماجی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ حقائق کی دنیا سے گریز کر کے ایک خیالی دنیا میں پہنچ گیا ہے اور اسے یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کس قدر غیر حقیقی ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ شعوری طور پر لوگ کسی فلسفہ کو اپنا لیتے ہیں لیکن ان کی قوت حاسہ میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ احتشام صاحب کی قوت حاسہ روایتی قسم کی ہے۔ شعوری طور پر وہ مارکسیت کا راگ گاتے ہیں لیکن دل میں چور چھپا بیٹھا ہے۔

تنقید [illegible] کی گفتگو میں سائنس سے بالکل قریب ہوتی ہے۔ اس کا اسلوب بیان ایسا ہونا چاہئے جس سے صاف واقفیت ہو اور اس میں جذبیت اور گنجلک پن ہو تو ابہام کی ساری ضرورت کو بیکار کر دیتی ہے۔ احتشام صاحب بار بار اسلوب کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب اور تنقید کی زبان کو عوام کی سطح پر لانا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ جو کچھ بھی ہیں ان کا اپنا اسلوب عوام کی سطح سے بہت بلند ہے۔ مزدور اور کسان اسے مدتوں تک نہیں سمجھ سکیں گے۔ بہرکیف، وہ سیدھے سادے ڈھنگ سے لکھتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں وہ شگفتگی، وہ شاعرانہ لطف و انبساط نہیں جو سرور صاحب کے اسلوب کی نمایاں خصوصیت ہے۔ کبھی کبھی جب وہ جانب دارانہ طور پر ترقی پسندی کی تعریف کرتے ہیں تو کچھ خطابت کا لطف آ جاتا ہے۔ اور کبھی وہ بے ارادہ خود ہو جاتے ہیں تو اسی ڈھنگ سے لکھتے ہیں: "ان لکھنے والوں سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا انہوں نے کبھی اپنے شہروں میں فلسفہ، شراب خانے اور چکلے نہیں دیکھے ہیں؟ کیا انہوں نے لوگوں کو فٹ پاتھوں پر سوتے نہیں دیکھا ہے؟ کیا انہوں نے سڑک پر لوگوں کو فحش گالیاں بکتے نہیں سنا ہے؟ کیا انہوں نے میاں بیوی کے خراب تعلقات خود اپنے خاندان میں یا اپنے جاننے والوں میں نہیں کھنکتے دیکھے ہیں؟"

یہ ان کا عام اسلوب نہیں۔ وہ صرف سادگی کا دامن پکڑتے ہیں جو بے معنی کی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ کبھی کبھار وہ رومانی کے روپ میں بھی نظر آتے ہیں اور قصداً شاعرانہ بولی بولنے لگتے ہیں:

"قوس و قزح کے رنگوں پر رقص کرتے ہوئے اور شفق کی نیلی رنگینی [illegible] سے گزرتے ہوئے کوئی رنگینیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے اور کوئی شفق زاروں کے پیچھے کسی اور دنیا کی جستجو میں جا نکلتا ہے۔ کوئی فطرت کو اپنا محبوب سمجھ کر [illegible] ہو جاتا ہے۔ کوئی انسانی حسن کے ذریعے کائنات کو حاصل کرنا چاہتا ہے، کوئی محبوب کے جسم کو اس کی روح ہی سمجھنا چاہتا ہے۔

جیسے رنگ و بو کی لہروں کو نسیم سحر کے جھونکے چھیڑتے ہیں۔ کوئی اسے آغوش میں اس طرح بھینچ لینا چاہتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے میں حل ہو جائیں —"

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زبان احتشام صاحب کی نہیں۔ شاید وہ قصداً سرور صاحب کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اس اسلوب کو اپنا نہیں سکتے۔ وہ دانشورانہ اور بھاری بھرکم طریقے سے لکھتے ہیں۔ وہ نرمی، لچک اور روانی نہیں جو سرور صاحب کے اسلوب میں نظر آتی ہے اور جب وہ اس طرز میں لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش فعلیاں کر رہا ہے۔

احتشام صاحب نے ابھی کوئی نئے اصول تنقید نہیں بنائے۔ وہ مارکسی ہی سہی۔ ان کی تنقیدوں میں اصول کی دھجیاں اور پرزے ملتے ہیں لیکن ان دھجیوں اور پرزوں کو ملا کر وہ کوئی اچھا لباس نہیں بنا سکتے ہیں۔ وہ تفصیلات کی ضرورت سمجھتے ہوئے بھی تفصیلات سے گریز کرتے ہیں۔

"جوش اور خیام ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگتے ہیں ...... کیا ہزار سال کی شکست اور ارض و سماوی گردش نے مرادوں کے سانچے نہیں بدلے ہیں؟ میں اس فلسفیانہ بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور جوش و خیام کے افکار و خیالات کا تقابلی مطالعہ کرنا چاہتا ہوں لیکن دونوں میں کوئی اندرونی مماثلت ضرور ہے اگر کوئی ذہنی رشتہ ہے جو میرے ذہن کو بار بار ادھر لے جاتا ہے اور جوش کے خوبصورت چہرے کو خیام کی ڈاڑھی میں الجھا دیتا ہے ......"

"میں اس فلسفیانہ بحث میں الجھنا نہیں چاہتا" — پھر اس کا ذکر کیا ضروری تھا۔ احتشام صاحب کو کسی سائنٹفک اپروچ سے مشورہ لینا ہے۔ وہ ہمیں بتائے گا کہ وہ کیا غیر شعوری دباؤ ہے جو ان کے ذہن میں جوش کے خوبصورت چہرے کو خیام کی ڈاڑھی میں الجھا دیتا ہے۔ یہ جملہ معترضہ تھا۔ کہنا یہ ہے کہ ہر بار وہ کسی بحث کی تفصیل و شرح میں الجھنا نہیں چاہتے ہیں — "ایک مقالے یا تقریر میں محض اشارے کئے جا سکتے ہیں —" "اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بہت تشریح چاہتا ہے۔" "اب تک فیصلہ نہیں ہوا ہے لیکن آئندہ امید ہے کہ اردو ادب کا کوئی مورخ ان حقیقتوں پر روشنی ڈالے گا۔" "اس پر زیادہ لکھنا اس وقت ممکن نہیں۔" "ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر اگر تاریخ، نفسیات، معاشیات اور سائنس کی مدد سے اصول نقد متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش رائیگاں نہیں جائے گی —"

وہ اصول نقد متعین نہیں کرتے اور وہ کر بھی نہیں سکتے۔ ان کی زبان اشتراکیت پر ٹوٹتی ہے۔ لکھتے ہیں: "اصول سازی کی دشواریوں کے باوجود مغربی نقادوں کی دیدہ دلیری سے وہ کوئی فیصلہ کر دیتا ہے —" وہ بھی اسی طرح دو ٹوک فیصلہ کر دیتے ہیں اور جیمس جوائس کی رائے نقل کرتے ہیں: "آرٹ اس مخفی بصیرت کا نام ہے جس کی مدد سے آرٹسٹ کسی چیز پر ترجیح یا زور دیئے بغیر سب کچھ ایک ہی طرح میں ظاہر کر دیتا ہے۔" اور بغیر غور کئے ہوئے وہ اسے رد کر دیتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ جیمس جوائس کے فلسفۂ خیال کی تنقید مقصود نہیں وہ تنقید کرتے ہیں: "عدم مقصدیت ایک طرح کا فریب ہے۔" اسی طرح یہ جانتے ہوئے بھی کہ محض قیاسی موشگافی ہے وہ لکھتے ہیں: "حسرت کے یہاں سرخ رنگ سے اتنی وابستگی بھی اس زندہ اور انقلابی رجحان کا پتہ دیتی ہے۔ محبوب کا جسم بھی سرخ ہے اور لباس بھی سرخ۔" یہ قیاسی موشگافی نہیں بلکہ ہنسی کی بات ہے اور نفسیات کی توہین ہے۔

لکھتے ہیں: "آج اس کی ضرورت ہے کہ ساری تنگ نظر انسانی ذہن کی تخلیقات اور تعمیرات پر رائے دیتے ہوئے انگشت نمائی کرتے ہیں اور ذمہ داری کا احساس تقاضا کرتا ہے کہ اعلیٰ عالمی ادب کے ساتھ ساتھ ارسطو، ڈرائڈن، میتھیو آرنلڈ، رچرڈس، ایلیٹ، [illegible]، اسپنگارن، [illegible]، [illegible]، برک، سینٹ بیو، [illegible]، [illegible]، لانگ، سارتر، [illegible]، [illegible]، [illegible]، بیلنسکی، [illegible]، [illegible]، [illegible] اور دوسرے نقادوں کے تنقیدی خیالات اور ادبی تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اگر تنقید کوئی علمی کام اور محض تاثرات کا بیان نہیں ہے تو ان تمام جدید علوم سے کام لینا ہوگا جس سے زندگی اور ادب کو سمجھا جا سکتا ہے۔"

کاش احتشام صاحب ان لوگوں کے تنقیدی خیالات اور ادبی تجربات سے فائدہ اٹھاتے۔ ان مفکروں اور مستقل نقادوں نے [illegible] کام کے خیالات چنے ہیں۔ یہ مشکل اور ذمہ دارانہ کام ہے۔ اور احتشام صاحب اس کے اہل نہیں۔ وہ کھیت کے تاریک کونے میں [illegible] کاٹتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی ساری دنیا ہے۔

مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ احتشام صاحب اصول کے بجائے ان تین باتوں پر بھی غور کریں۔ یہ باتیں اتنی [illegible] کی گئی ہوئی ہیں۔

۱۔ "زندگی کے اقتصادی پہلو پر جو مارکس نے زور دیا تھا وہ ایک خاص عصری چیز ہے ...... اقتصادیات کل زندگی نہیں بلکہ اس کا صرف ایک عنصر ہے جو لاکھ اہم سہی لیکن دوسرے عنصر پر غالب نہیں ہو سکتا۔ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا ـــــ" (مجنوں گورکھپوری)

۲۔ "ادب یا کلچر کو معاشیات کا ایک شعبہ نہ بنا دینا چاہئے اور نہ اس تعلق کو جو معاشی عناصر اور تصوراتی ڈھانچے کے درمیان میں کام کرتا ہے۔ ریاضیاتی تناسب سے جیسا تعلق سمجھنا چاہئے ـــــ" (احتشام صاحب)

۳۔ "شخصیت ایک دقیق گتھی ہے۔ ابھی ہمارے علم میں اتنی گہرائی نہیں آئی ہے کہ ہم اس کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں ـــــ" (ڈاکٹر حسین رائے پوری)

عسکری صاحب لکھتے ہیں: "انصاف کا تقاضا ہے کہ اس تحریک کے بعض علم برداروں میں بڑی سطحیت، بڑی رعونت، بڑی تنگ نظری، بڑی قطعیت ہے یہ زندگی کو مارکسی نعروں اور اقتصادی اصولوں کے سوا کچھ نہیں سمجھتے ...... اور مارکس کو انسانیت کا حرف آخر ......"

سرکنڈوں کے پیچھے

یہ منٹو کی آخری کتاب ہے جو مرحوم کی زندگی میں چھپی تھی۔
منٹو وہ بے باک اور نڈر افسانہ نگار ہے جس نے بڑی سے بڑی حقیقت کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا۔
یہی وجہ تھی کہ اس پر مقدمے چلے اور "زیادہ سنجیدہ" حضرات نے ناک بھوں چڑھائی مگر وہ لکھتا رہا۔ ادب کی بقا کی خاطر لکھتا رہا۔
اس کتاب میں بھی ان کے کئی زندہ رہنے والے افسانے شامل ہیں۔

قیمت ۳/-

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور

متفرقات

قاضی عبدالودود

(۱) تقریظ سید احمد خاں۔ حکیم محمد اکرام الدین خاں دہلوی ابن حکیم ضیاء الدین احمد خاں نے سنہ ۱۲۹۲ھ میں ایک رسالہ "ارمغان[1]" (تاریخی نام) لکھ کر مطبع انصاری دہلی میں چھپوایا تھا۔ اس کا موضوع حکمت عملی ہے اور اس پر بعض اصحاب نے تقریظیں لکھی ہیں[2]۔ ان میں سید احمد خاں بھی ہیں۔ ان کی تقریظ جو کتاب کے صفحۂ آخر (۱۲۸) میں ہے بجنسہٖ مع عنوان درج ذیل ہے:

"نقل تقریظ از ذہن رسا سید احمد خاں صاحب بہادر۔ سی۔ ایس۔ آئی"

"میں نے اس رسالے کو دیکھا جو ایک برہان مصنف کی جودت ذہن و شائستگی خیالات کی ہے۔ عبارت اردو نہایت صاف و شستہ ہے۔ مشکل مضامین کو نہایت سہل عبارت میں بیان کیا ہے۔ اگلے حکما کے خیالات جو عبارات و تین میں مندرج تھے، اس رسالہ کو نہایت تہذیب و درستی سے ادا کیا ہے۔ حاصل یہ رسالہ عمدہ و مفید عام ہے۔ راقم سید احمد علی گڈھ، ۲۵ مارچ ۱۸۷۵ء"

ذیل میں ارمغان کے تیسرے مقالے کی فصل اول کا ایک ٹکڑا درج ہوتا ہے۔ فصل کا عنوان ہے "تمدن کی ضرورت کے بیان میں":

"ہر ایک موجود کے واسطے ایک طرح کا کمال ہے۔ بعض موجودات کا کمال ہے۔ بعض موجودات کا کمال ابتدائے حصول کے وجود کے ساتھ لاحق ہوتا ہے، وہ اجسام علوی ہیں، اور بعض موجودات کا کمال ان کے وجود کے بعد عارض ہوتا ہے، وہ اجسام سفلی ہیں۔ جس موجود کا کمال اس کے وجود کے بعد عارض ہوتا ہے، اس کو نقصان سے کمال کی طرف بھی حرکت ہے۔ اس حرکت میں آپس کی اعانت مطلوب ہوتی ہے۔ اعانت کے تین طریقے ہیں: بالمادہ، بالآلہ، بالخدمت۔ بالمادہ وہ ہے کہ مصدر اعانت کے بعد معین کا جزو ہو جائے۔ مثلاً غذا کی امداد اجسام نامیہ میں۔ بالآلہ وہ ہے کہ کوئی شے امداد کا وسیلہ و واسطہ ہووے، مثلاً پانی کی امداد قوت

---

[1] ارمغان کا ایک نسخہ کتب خانۂ ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ میں ہے۔

[2] ارمغان پر مرزا محمد سلیمان شاہ بہادر گورگانی اور ذکاء اللہ نے بھی تقریظیں لکھی تھیں جو اس میں شامل ہیں۔

ظاہر ہیں — بالخدمت وہ ہے کہ ایک کا فعل دوسرے کے کمال کا موجب پایا جائے مثلاً آفتاب کی امداد موالید ثلاثہ میں۔ لیکن بالخدمت دو قسم ہے: ایک وہ کہ جس کے فعل کی غایت خدمت ہو — مثلاً غلام کی خدمت اپنے صاحب کے لئے۔ یہ خدمت بالذات ہے اور دوسرے وہ کہ جس کے فعل کی غایت کوئی اور امر ہو، مثلاً چرواہے کی خدمت اپنے مواشی کے واسطے۔ یہ خدمت بالعرض ہے۔" ص ۹۲ تا ص ۹۳

(۲) مقبول الدولہ احسان الملک مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر ثابت جنگ متخلص بہ قبول کا دیوان[1] مسمّیٰ بہ نتائج الالہام بزمانِ اختر واجد علی شاہ کے حکم سے ۱۲۶۸ھ میں مطبع سلطانی لکھنؤ نے چھاپ کر شائع کیا تھا۔ اس دیوان میں وفات آتش کا حسب ذیل قطعۂ تاریخ درج ہے۔ مصنف ناسخ کا جو آتش کے حریف سمجھے جاتے تھے، شاگرد ہے؛ اس لئے اس قطعے میں آتش کی جو تعریف کی گئی ہے، شایانِ توجہ ہے:

خواجہ آتش کہ تھا اشعار پُر سوز و گداز — اٹھ گیا دنیا سے اب ویسا کہاں دنیا میں ہے
ایسا شاعر تھا کہ بزمِ شاعری ہے جس جگہ — ہر کوئی جس کی غزل کے زمزمہ خواں دنیا میں ہے
شعر کہنے میں زمینِ عشق کا سلطان تھا — نقدِ معنی صورتِ سکّہ رواں دنیا میں ہے
جب کلام اس کا نظر آتا ہے کہتا ہے دل — وہ نہاں ہے خاک میں دیواں عیاں دنیا میں ہے
دیکھ کر دیوان یہ تاریخ لکھ دے اے قبول — اب فنا آتش نہیں سوزِ زباں دنیا میں ہے

(۳) دیوانِ قبول سے معلوم ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ نے "علم اختر" کے نام سے شمس الدین فقیر کے رسالۂ عروض و قافیہ کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ طبع کتاب کا مادۂ تاریخ یہ ہے: "بحرِ شمس و دُرِ نظم از شمس فقیر" ۱۲۶۹ھ۔

(۴) دیوانِ قبول میں منشی میر حسن صاحب صابر تخلص "داغِ حسین" کا قطعۂ تاریخ وفات بھی ہے۔ مادہ یہ ہے: "وہ حلیم حسینی حسن رفتہ ہائے وائے" ۱۲۶۶ھ

(۵) فیوچر آف اسلام کے نام سے ولفرڈ اسکاون بلنٹ نے انیسویں صدی کے عشرۂ ہشتم کے اوائل میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کا ترجمہ سید اکبر حسین رضا بلگرامی متخلص بہ اکبر نے "اسلام کی حالت آئندہ"[2] کے نام سے جب وہ علیگڑھ میں مصنف تھے کیا تھا، اور ۱۸۸۳ء میں کنور لطف علی خاں وغیرہ کی مدد سے مطبع جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ میرٹھ لمیٹڈ میں اسی سال چھپوایا تھا۔ اکبر نے اپنی تمہید میں لکھا ہے کہ "ہنوز زیرِ ترجمہ رہا تھا کہ مسٹر بلنٹ خود ہندوستان میں تشریف لائے اور مقام کلکتہ مجھ کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہوئی۔ انہوں نے ایک دوسرا دیباچہ بطور ضمیمہ دیباچہ اوّل کے تحریر فرما کر عنایت کیا، جس کا ترجمہ میں اس کتاب کے ساتھ شامل کرتا ہوں۔ سلطنت ترکی کے قائم رہنے کی نسبت مصنف کو جو مایوسی تھی، یہ دیباچہ اس مایوسی کو ضعیف کرتا ہے۔ مصنف نے مجھ سے یہ بھی زبانی کہا کہ سلطنت ترکی کی نسبت بعض حالات میں ان کو خود علمائے مصر و عرب سے حاصل ہوئی ہیں اور وہ ان کی صحت کے ذمہ دار نہیں۔" ترجمے کے سرورق سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی کتاب کا زیبِ عنوان "ایک عربی شعر کیا تھا" وہ اور اس کا اردو ترجمہ جو غالباً خود اکبر کا ہے درج ذیل ہے: مترجم قارئین دل شکستہ بھر لکھتے ہیں اگر یہ زیادہ ترسیدہ عمل سے گذریں گے بار دگر۔ ذیل میں مصنف کے دیباچۂ ثانی کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے:

"کتاب فیوچر آف اسلام کو زبان اردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی میں اپنی بے انتہا مسرت ظاہر کرتا ہوں کہ میری ناچیز تصنیف کو ایک لائق اور تعلیم یافتہ مسلمان نے دنیا میں سب سے بڑی مسلمانوں کی جماعت کے پڑھنے کے لائق سمجھ کے پسند اور منتخب کیا۔ اور میرے دل پر اس بات کا بھی بڑا اثر ہوا کہ میری مشقت کو مسلمانانِ ہندوستان نے تسلیم کیا اور مجھ کو ایک بیگانہ شخص اور خود غرض اور غلط معترضات کرنے والا نہیں سمجھا بلکہ دوست سمجھا، لیکن اس کے ساتھ ہی میرے دل میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید میں نے اپنی کتاب میں ایسے الفاظ اور فقرات مندرج کئے ہیں، جو اب تین سال کے بعد اس عرصہ میں جو کہ اسلام

---

[1] و [2] دیوانِ قبول اور اسلام کی حالت آئندہ کتب خانۂ ادارۂ تحقیقات اردو میں ہیں۔

سے زیادہ ترقی الفت اور محبت پیدا ہو گئی ہے۔ مجھ کو افسوس کرنا چاہئے، جیسا کہ میں جانتا ہوں کہ اس کتاب میں بعض ایسی عبارتیں موجود ہیں۔ جب میں نے ان مضامین کو کسی قدر عجلت سے لکھا تھا اس وقت میرے دل کا مشتعل ہونا مجھ کو ایک تیز تند اور بے لجام گھوڑے کی طرح ایک خطرناک زمین پر کھینچ لے گیا تھا ایسی خطرناک زمین کہ اس پر زیادہ حزم و احتیاط کا آدمی اس درمائیت سے راہ طے کرنے کی امید نہ کرے۔ بعض الفاظ بالخصوص خلافت عثمانیہ کی نسبت مجھ کو یاد آتے ہیں جن کو میں نے کسی قدر ناشائستگی اور سختی کے ساتھ تحریر کیا ہے اور میں اب تہ دل سے ان کو واپس لیتا ہوں، کیوں کہ اب مجھ کو زیادہ تر امید اس بات کی پیدا ہو گئی ہے کہ سلطان عبدالحمید اس گیارھویں گھنٹے یعنی ساعت آخر میں بھی شاید اس مذہبی اصلاح کے جوش تحریک کی افسری و پیشوائی پر راغب ہو سکتے ہیں کہ جس میں ایک ذرہ اس کا شبہ نہیں کہ وہ ان کی خاص حالت کو اسلام میں ملحوظ رکھنے کا ہے۔ جب میں ان حالات کو یاد کرتا ہوں تو میں عجیب عجیب امیدوں اور جوش مسرت کے ساتھ میں نے ابتدا تا انتہا اس کتاب کا پہلا دیباچہ لکھا تھا تو نہایت رنج و الم مجھ پر طاری ہو جاتا ہے۔ اس وقت میرے چاروں طرف جو دنیا تھی وہ نشۂ دل سے بھری ہوئی تھی اور اسلام کی شام غم صبح امید کی مسرت ہوتی نظر آتی تھی۔ میں اس خیال میں دیباچہ لکھا تھا کہ میں آزادی کی آب و ہوا میں اس وقت ہوں جس کا پتا مدتوں سے مسلمانوں کے خیالات میں رہتا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ چند برسوں میں بلکہ شاید چند مہینوں میں ہی خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا کہ ٹرکی یا ترکی نے اپنی تمام شوکت و عظمت پھر حاصل کر لی اور تمام دنیا کے لئے روز افزوں ترقی کرنے والے علوم و فنون کا مرکز ہو گئی۔ مگر افسوس وہ سب امیدیں خواب و خیال ہو گئیں۔ افسوس ہم کو پھر صبر کرنا پڑا اور صحیح نتیجہ ہونے کے انتظار کا مزہ رہا۔ تاہم یہ بات ہمیشہ تسلی کی ہوگی کہ جو ملک بہم خیر نتیجے کی نسبت ناامید ہو جاتی ہیں اور جا ہیں جو باتیں بھروسے کے ساتھ میں نے اس وقت کہی ہیں، میں ہرگز ان کو نہیں چھوڑتا۔ اب بھی مجھ کو اسلام کی حالت آئندہ بہ دنیا میں اعلیٰ ہونے کا یقین اور بھروسا ہے جیسا کہ ۱۸۸۳ء کی فصل بہار میں تھا اور اگرچہ لوگوں کو کل شے سے پھل پانے میں کچھ تاخیر ہو گئی ہے لیکن میں بھولا نہیں ہوں۔ گو مسرت ناکامی ہوئی ہے لیکن ہم کو خدا پر بھروسا اور یقین رکھنا چاہئے۔ الحق یعلو ولا یعلیٰ۔"

(۶) تاریخ ولادت ناسخ۔ کلیات ناسخ مطبوعہ میں ایک شعر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ ۵ رمضان[1] کو پیدا ہوئے تھے۔ سال ولادت بصراحت کسی تذکرے میں نہیں اور نہ کلیات اس پر روشنی ڈالتا ہے، لیکن دیوان رشک[2] مطبوعہ میں ایک قطعۂ تاریخ ہے جس کا مادہ یہ ہے: "مرد استاد بسال شصت و ہفتم" ناسخ کی وفات جیسا کہ اسی کتاب سے پتہ چلتا ہے چہارشنبہ کے دن چوبیسویں جمادی الاول کو ۱۲۵۴ھ میں واقع ہوئی تھی اس حساب سے سال ولادت ۱۱۸۷ھ ٹھہرتا ہے۔ رشک ناسخ کے شاگردان خاص میں تھے، اس مسئلہ میں شبہے کی مطلق گنجائش نہیں۔

(۷) آب حیات میں ناسخ کا سال وفات ۱۲۵۴ھ درج ہے اور سند میں رشک کا یہ مادۂ تاریخ پیش کیا ہے: "وہ شور کی اقلیم سخن ہے"۔ ۱۲۵۳ مگر اس سے ۱۲۵۳ نکلتا ہے۔ رشک نے اپنے عہد کے املا کے مطابق "وہ تھی" لکھا تھا اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں مصرع مرقوم سے ۱۲۵۴ مستخرج ہوگا۔ دیوان رشک میں جو غالباً آزاد کی نظر سے نہیں گزرا، ذیل کا قطعۂ تاریخ بھی ہے جو سنہ وفات کے علاوہ روز و ماہ و تاریخ پر بھی مشتمل ہے:

"داور ملک سخن ناسخ معجز بیاں — انتقالش داد عالم را غم جانکاہ وائے
یک ہزار و دو صد و پنجاہ و چہارم سال بود — بود از ماہ جمادی اولیں آں ماہ وائے
رشک سال و روز و تاریخ و سنین و ماہ گفت — بست و چہارم بود و چہارشنبہ آہ وائے"

رشک کے ایک مادۂ تاریخ سے سنہ عیسوی بھی نکلتا ہے: "صد حیف ہائے ہائے ناسخ" = ۱۸۳۸

---

[1] یہ شعر میں نے ایک مضمون میں جو العلم کراچی میں چھپا ہے نقل کر دیا ہے۔ رشک کا ایک شعر بھی اسی پر مشعر ہے۔

[2] رشک کے دو دیوان ایک ساتھ چھپے تھے اور کتب خانۂ رضائیہ رامپور میں موجود ہیں (دیکھئے حواشی تذکرۂ ابوالحسن صفحہ)

(۸) یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ آتش سنہ ۱۲۶۲ھ میں راہی عدم ہوئے تھے، لیکن کسی تذکرے یا تاریخ ادب میں میری نظر سے یہ نہیں گزرا کہ وہ کس دن اور کس مہینے کی کس تاریخ میں فوت ہوئے تھے، حالانکہ دیوانِ رشک سے بصراحت پتہ چلتا ہے کہ وہ بدھ کی صبح کو بتاریخ ۱۰ محرم اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔

(۹) دیوانِ رشک میں نسیم (پنڈت دیا شنکر) کی وفات کا قطعۂ تاریخ بھی ہے:

حسرت و یاس ہوائے دنیا   مرد نسیم زہے حیف ہے ہے
بزمِ مشاعرہ بود و شنیدم   مرد نسیم زہے حیف ہے ہے
فی مصرعِ مادّہ گفتم   "مرد نسیم زہے حیف ہے ہے" = ۱۲۶۱

(۱۰) میر خلیق (والد میر انیس) کی وفات کا مادۂ تاریخ یہ ہے: "وائے صد ہے خلیق بود استاد" = ۱۲۶۰ (دیوانِ رشک) اس سنہ کی تصدیق تذکرۂ ناصر سے بھی ہوتی ہے (معاصر ص ۳۴)

(۱۱) دیوانِ رشک سے معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم شاہ الٰہ آبادی ذیقعدہ سنہ ۱۲۵۶ھ میں بمرضِ ہیضہ فوت ہوئے تھے۔ مادۂ تاریخ: "بود ہجری سال بجا و دو ششم افسوس ہائے"

(۱۲) جلال لکھنوی کے دیوان "کرشمہ گاہِ سخن" سے معلوم ہوتا ہے کہ رشک سنہ ۱۲۶۷ھ میں کربلا چلے گئے تھے، مادۂ تاریخ: "کربلا جاتے ہیں دیکھو قبلہ و کعبہ مرے" (رجوع بہ حواشی تذکرۂ ابن طوفان ص ۹۹)

(۱۳) نور لکھنوی برق تلمیذ ناسخ کے شاگرد تھے، ان کا دیوان "ضیائے نور" مطبع کارنامہ لکھنؤ نے سنہ ۱۲۹۶ھ میں چھاپا تھا۔ اس میں برق کی وفات کا مادۂ تاریخ اس طرح درج ہے: "شاعرِ بے مثل بود حیف آہ" = ۱۲۷۳

(۱۴) ضیائے نور سے معلوم ہوتا ہے کہ آتش بتاریخ ۹ جمادی الاولیٰ وقت شام سنہ ۱۲۶۴ھ میں راہی عدم ہوئے تھے، مادۂ تاریخ: "حیف بود آہ شاعرِ بے مثال"

(۱۵) نور نے غالب کی وفات پر قطعۂ ذیل میں خراجِ تحسین ادا کیا تھا، مصرعِ آخر سے ۱۲۸۵ نکلتا ہے:

صد افسوس خورشیدِ اوجِ کمال   بہ پیکِ اجل جانِ خود را سپرد
پئے سالِ آں استادِ بے عدیل   فلک زد ندا آہ غالب بمرد

(۱۶) نور[۱] نے محمد بخش شہید کی وفات کی تاریخ اس مصرع سے نکالی تھی: "در جہاں بود بہشت مرجا" = ۱۲۷۷ (رجوع بہ حواشی تذکرۂ ابن طوفان ص ۹۹)

(۱۷) ریاضِ صابر[۲] نادر بخش صابر دہلوی شاگرد احسان و صہبائی کا دیوان ہے، جس کا دیباچہ مائل دہلوی نے لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۱۲۲۲ھ میں ہوئی تھی اور وفات بمقام بنارس سنہ ۱۲۹۹ھ میں واقع ہوئی تھی۔ تذکرۂ گلستانِ سخن جس پر راقم کا ایک طویل مقالہ اورینٹل کالج میگزین کے ایک خاص نمبر میں شائع ہو چکا ہے، انہی سے منسوب ہے۔ صابر کا ایک قطعہ دیوان کے ص ۲۹۱ سے نقل کیا جاتا ہے:

فقط ہے واقفہ گوئی پہ ناز بے معرفت   کہ زورِ طبع بھی لازم ہے نکتہ داں کے لیے
جو ہے کمال تو صابر کہو آگے بڑھ کے سناؤ   زبان فخر نہیں صاحبِ زباں کے لیے

(۱۸) صابر کے بیٹے قیصر بخت ذرہ نے ان کا سالِ وفات یوں نکالا ہے (درمِ سوزاں - نقاں):

ظاہر ہوئی رحلتِ سلطاں جا بخت   ترجمہ جائے کہا "درمِ سوزاں" "جوہر نقاں" ہیں

---

[۱] و [۲] نور و صابر کے دیوان اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے کتب خانے میں ہیں۔

(۱۹)

ذاکر عالی نسب والا حسب یعنی ضمیر رفت حسب الحکم خالق چوں ز عالم آہ و وائے
سال فوتش مصرعی دیم معنوی گفتم بقول شد بہ جنت وسیم بود از محرم آہ و وائے = سنہ ۱۲۷۲ھ

بجہان رفت ذاکر آفاق ضمیر جستم از وصف کمالش تام
سال تاریخ قبول الکن گو آہ افسوس حسینی ذاکر

مشہور مرثیہ گو میر مظفر حسین ضمیر کی وفات کے یہ قطعات تاریخ دیوان قبول میں ہیں۔ سنہ ۱۲۷۲ھ کی تصدیق دیوان حاتم علی بیگ مہر سے بھی ہوتی ہے۔ (معاصر ۲ صفحہ ۲۲۳)۔

(۲۰) آب حیات صفحہ ۲۱۱ میں ہے: "لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ ۔۔۔۔ آج کل شاعر کون کون ہے؟ کہا کہ ایک تو سودا دوسرا یہ خاکسار ہے اور پھر تامل کرکے کہا آدھے خواجہ میر درد۔" میر نے یہ کہا ہو یا نہ کہا ہو، ایک قصیدے کی تشبیب[1] میں مصحفی نے میر و مرزا کو پورا اور درد کو آدھا شاعر شمار کیا ہے:

ہو چکا وہ دور میر اور مرزا اب زمانے میں ہے مرا دورہ
تذکرہ شاعروں میں سمجھا ہیں یہ تو جھوٹا نہیں ہے وا دردا
لیکن دہلی کے بیچ گزرے ہیں ڈھائی شاعر سرآمد شعرا
ان کی تفصیل یوں کہ کہتے ہیں میر و مرزا دو اور درد آدھا
یہ مسلم کہ ہے فصیح و بلیغ جو کچھ اس نے غزل کا قسم کہا
لیک اب جو تمام ہو رہے اٹکا شاعروں میں کچھ نہ پورا (کذا)

(۲۱) آب حیات میں استاد کے ایک قصیدے کے کچھ اشعار نقل ہوئے ہیں جن میں انگریزی الفاظ بکثرت مستعمل ہوئے ہیں۔ مصحفی کے ایک قصیدے میں بھی جو نواب علی خاں کی مدح میں ہے بہت سے انگریزی الفاظ آئے ہیں۔ یہ قصیدہ دیوان قصائد مصحفی میں نامکمل شکل میں ہے۔ ذیل میں وہ اشعار جن میں انگریزی الفاظ ہیں نقل کئے جاتے ہیں:

حال دفتر عشق[2] نہ دیکھی تری خدمت بخشی ہو وہ سلطان جہاں جس کو تو دیوے پرمٹ
صاحب حکم و عدالت ہے تو ہر شام و سحر آکے مریخ ترے سامنے بولے ہے رپٹ
ملک گیری میں تو روز لگے ہے جو تلک ہوویں پھر کیوں نہ کلکٹر ترے بیٹ اور لیٹ
سارے عالم میں ترا حکم ہے دارا ساڑ کیوں نہ حاضر رہیں در پہ ترے اپیل اور کورٹ
دیکھے گر تقریر عطفے کی ترے رنگینی اپنی کرسی کو کرے اس پہ تصدق ارزٹ

آگے چل کر جو قصیدہ سینیہ نقل ہوگا اس میں بھی ایک انگریزی لفظ آیا ہے مگر تبدیل شدہ شکل میں۔

(۲۲) ذیل کا قصیدہ جو کلب علی خاں ابن سعادت علی خاں کی مدح میں ہے، دیوان قصائد مصحفی سے نقل کیا جاتا ہے، اس میں کتابت کی اغلاط بہت ہیں۔ ان کی تصحیح کی میں نے کوشش نہیں کی۔

بیٹھ خیاط زہے ہو اس گل کا کبھی جو سی جس جاڑے میں ساٹن بدن پر رنگ الی پرس

---

[1] یہ قصیدہ دیوان قصائد مصحفی (کتب خانہ رضیہ رامپور) میں ہے۔

[2] اس وقت نسخہ رامپور کی نقل پیش نظر ہے۔

خندۂ گل کے ہیں ترسے ایسے وہ مشتاق نہیں
ہم صفیروں سے نہ کی یاد اسیرانِ قفس

صاف لاشے کے بھی کی گرم روی مجنوں نے
پیش ریگِ بیاباں سے گئے بانگِ جرس

کشتی چرخ نہ طوفاں میں کہا جائے کہیں
دل میں برسات کے لے ابر قطرہ آرزو میں

بخیاست کبھی پیدا نہ ہو وہ موسم
اس میں زلف بتاں جیسی کہ تیغیں چلتے نفس

دیں زلف میں اس گل کی تمنا بھی نہیں
دل بیتاب مرا تشنۂ رنگ بوئے ہوس

برق اور باد سے خفتہ ہیں نہیں اہلِ نجات
گوئی مندوں کے چلتے سے بھی اٹھتی ہے مگس

شادی وحشت رواں کھلتے کب رہتا ہے
بال زلفوں کے جھٹ کھلتے ہیں جو شہپر ہیں گئی

بسکہ میں ضبط غم عشق کیا ہجراں میں
پھر مٹی کی طرح سے سینہ گیا ایک الفت مجلس

تو دبو بو مرض عشق نہ معلوم ہو کچھ
دیر تک وحشت بیاباں میں رہے گرم تلاش

میں دستگیری پہ جو ناظم نہ ہوئے مہر ساں
دشمن جاں ہوئی اور کر ہوس وصل و عدس

رنگ اڑ جاتے ہیں بیچ ہیں جسے اس کی خنت
مصحفی ہیرا ازاز ہوئے ملک رنگ رس

سو دو میں مجھ علی خاں بہادر کی مدح
دیکھ حیراں رہے ہم حسن کے جناب اقدس

پاسبانی پہ زمانے کی جو رائے اس کی لگے
دزد معنی کے لئے خامہ کرے کار عسس

شخص تسلیم پہ ہو اس کی توجہ جو فزوں
خلق کہتی ہے سدا اس کو کس ہر بیکس

عہد میں اس کے ستمگاری کا جو نام نہیں
نالے میں دستی میں کبھی فریاد جرس

کیوں نہ ہو مرجع امید جہاں میراب
ہے رواں وحشت جواد اس کا باد فرس

صاحب علم و حیا کوہ وقار و تمکیں
منبع جود و کرم داور کس ہر بیکس

مومن پاک محب علی و آل نبی
جس کی خدمت میں کمربستہ ہے ہر ایک جلس

پھیر دے پنجۂ رستم کو جو وہ زور کے وقت
ہم کے ہجراں وہ بچے تو ادری تیر مگس

تیغ نے اس کی جو اس پاک سر مانیں میں کیا
شعلہ جس شعلہ وہ زمیں ہر کہیں پیک ہیں

یہ فصاحت ہے زباں میں دم توضیح سخن
جس کی تقریر کے مرآت ہیں اہلِ نفس

دیکھ کر رنگ میرے دل کا تیرے مدح
شب ہر دور کجی کشش غیرت میں جلس

آپ ہے وہ شب تاریک نہ ہو جس میں کا
خوش جمالی میں نہ ہو سرمہ کا مل سے عرس

پھول اس مدح کی اور حاجت کو جو معنی کو
ہر ستارے میں دکھا دے شعر کا قبس

آدمی علم سے صورت میں نظر کا ہے
دانت پر رکھے تو پھر وہ رنج کی کھوٹے مارس

آسیب جو وہ کیوں اس کو تو بیاں ہے مجھے
کیونکہ گل علم ابرو ہے یہ اس کا نفس

دل میں اک شیشہ درخشاں کے ہے دو چار ہوئے
اس سے دیکھا تھا میں اس کو تماشا کا قفس

آگے گوش سے کیں میں تعریف کروں کیا کہ مجھے
تیرگی میں ہوا توت تن میں دل کس

نفس پر اسپ جہاں ہے وہ اس کا رگ سوار
چھیتے صورت ہے اسے جانب مشرق ہو کس

وہ دم میں وہ کرے جو کہ ایام کرے بلکہ ہو طول ازل تا بہ ابد نیم نفس
کہ نہ بجلی کو بھی کوندی ہوا میں اس کو وحشت میں ڈھونڈھنے چھلاوے کا اٹھا آہو [illegible]
اس کے پنجوں پہ صفا ہے کہ بھی پر پروم پیچھے پیچھے جاتا ہے پھل پائے مگس
بس کہ رہتا ہے کسا اور گٹھا جسم اس کا وحل کیا ہے کہ پڑے جیسے جلاجل میں ٹنک جیسے جرس
آبداری جو تری تیغ کی تقریر کرے وہیں شاعر کے تئیں تیغ زباں دیوے جس
نیزہ ابجری کرے اک دم میں وقت برش کے وہ شمشیر ہے ایسی جوں رس
مصحفی اب طرف خاتمہ ہے اپنا خیال شیخ ان خاتموں میں [illegible] ہے کہ بس
جلد اس برجی میں جاتا ہوں اڑا کے گھوڑا ہے زمیں جس کو [illegible] کی سطح پر بس
کرۂ خاک پہ جب تک کرۂ آب ہے محیط جب تلک چاہ سے بھر بھر کے نکلتا ہے چرس
زیر افلاک شب و روز ہیں جب تک ہے بقا جب تلک مرد کو اک دل سے ہو عورت پہ ہوس
جب تلک کلغی کے سر پہ ہے ترنگی ترچھی جب تلک پاؤں سے ہے چپکے کے گلا ہی جرس
جب تلک بجھڑ نہ عالم رہے دست رنج دوں رنگی کرے جب تلک کہ نشہ نرگس
عید قرباں کی مبارک ہو تجھے اے ممدوح گل امید ترا ہو وے ہمیشہ نو رس
مس پیشانی کریں اس پہ طلا اہل نیاز آستانے کا ترے سنگ ہو رشک پارس
جو ترے دوست ہیں وہ شاد رہیں اے جاں وہ جو دشمن ہیں انہیں کنج غم ہو جائے محبس
صدہا سال رہے حسن اقبال پہ تو یہ دعا ہے مری بستی ترا ایسی ہو بس "

(۲۲۱) امرود ایک پھل ہے جس کو ambrot اور amrot لکھتے ہیں (حاشیۂ برہان قاطع مرتبہ ڈاکٹر محمد معین ص ۱۴۱) اس کی فارسی میں کئی شکلیں ہیں جن میں سے امرود سب سے زیادہ مشہور ہے۔ فارسی نثر میں اس کے استعمال کی قدیم ترین مثال غالباً ترجمۂ تاریخ طبری میں ملتی ہے: "سیب و امرود و بہی" (ص ۱۴۷) اور فارسی نظم میں ابو الفرج رونی کے مصرعۂ ذیل سے جو [illegible] اصفہانی سے ماخوذ ہے قبل کی کوئی مثال میرے علم میں نہیں: "شاخ امرود گرفت از امرود"۔ بعض کچھ مثالیں یہ ہیں: نصاب الصبیان ابو نصر فراہی (طبع نولکشور) "چوں عنب انگور و تین انجیر و کمثری امرود" (ص ۹)، [illegible] نظامی (طبع نولکشور): "گرچہ امرود شب گلگراست" (ص ۴۵)، مطلع السعدین جلد ۲ (کتب خانۂ خدا بخش): "زشفتالو و سیب و امرود و بہ" (ورق ---)، دیوان فوقی (نسخۂ کتب خانۂ خدا بخش): "[illegible] امرود دل" (ورق ---)، دیوان جلال عضد (نولکشور): "[illegible] امرودے" (ص ۹۰)، تحفۃ الذوق: "شاخ امرود [illegible] روئیست بہار" (گنج شایگان، طبع ایران ص ۴۵)، ملک الشعرا بہار: "گلہائے سیب و گردآلو و آمرود" (ادبیات معاصر از رشید یاسمی ص ۳۱)۔ [illegible] دیوان نعیم اصفہانی میں بجائے امرود "امرو" آیا ہے۔ [illegible] (نسخۂ خدا بخش)، اختیارات بدیعی اور مجمع الجواہر میں کمثری کی فارسی امرود لکھا ہے اور کتب خانۂ خدا بخش کی [illegible] قدیم کتاب سیرت فیروز شاہی (ورق ---) میں بھی یہی ہے۔ امہات اللغۃ (نسخۂ [illegible] ڈھاکہ) میں اسے ایک خراسانی پھل لکھا ہے اور عہد جہانگیر کی ریاض الادویہ (نسخۂ خدا بخش) اور عہد شاہجہاں کی الفاظ الادویہ (نسخۂ خدا بخش) میں امرود کمثری کی فارسی بتایا گیا ہے۔ کمثری وہی پھل ہے جو انگریزی میں Pear کہا جاتا ہے (اسٹائن گیس کی عربی انگریزی لغت)۔ لفظ امرود ایران میں تو اب بھی کمثری کے لئے آتا ہے لیکن ہندوستان میں زیادہ تر اس پھل کے لئے مستعمل ہے جسے انگریزی میں Guava کہتے ہیں۔ یہ پھل نہ ہندوستانی ہے نہ ایرانی، اصلاً امریکہ یا جزائر ویسٹ انڈیز کا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا (طبع [illegible]) سے معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں یہ پھل اہل یورپ لائے ہوں گے۔

لیکن اردو کی اصل سے بہت کم ہندوستانی واقف ہیں۔ چنانچہ امیر اللغات، نور اللغات وغیرہ کے مطالعے سے بالکل اس کا پتہ نہیں چلتا کہ ان کے مؤلف اس سے باخبر تھے کہ اردو لشکر کا ایک ہی ہے، وہ اسے گھوڑے کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں۔ میر محمد حسین مرشد آبادی نے [illegible] مخزن الادویہ لکھی تھی جس کا نسخہ مطبوعہ کلکتہ (کتب خانۂ خدا بخش) اس وقت پیش نظر ہے۔ ان کا قول ہے کہ اردو "مشترک میان ترکیہ و زابلی لشکر کی مانند ...... و ترکیہ در بنگالہ ہیثہ رو" (صفحہ ۱۲۶)۔ انجیل نے لشکر کی فارسی اردو اور ہندی ناشپاتی لکھی ہے (صـــ) اور ترجمانکے جو تفاصیل دیئے ہیں ان سے واضح ہے کہ ان کی مراد گڑ اسے ہے۔ میرے علم میں یہ قدیم ترین کتاب ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اردو گھوڑا کے لئے بھی مستعمل ہے۔ ناشپاتی کا ہندی ہونا میرے نزدیک مشتبہ ہے، اس سے بحث کبھی اور کی جائے گی۔ ڈاکٹر عبد الحق نے اُردو کے دخیل الفاظ کے متعلق جو مقالہ رسالۂ اردو میں لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں کہ اردو مصطلح بھی کے لئے مخصوص ہے اگرچہ یہ بات بے اصل ہے۔ جیسے ابر اور آب کو عربی میں سحر جیں (احتمالات، ابجر، اعضاء وغیرہ) اور انگریزی میں [illegible] (استانگیس) لکھتے ہیں۔ جانسن بھی اپنی لغت میں یہی معنی بیان کرتا ہے لیکن یہ اضافہ کرتا ہے کہ یہ ہند میں گھوڑے کے لئے بھی مستعمل ہے۔ بظاہر ڈاکٹر عبد الحق کو اسی سے دھوکا ہوا ہے۔

(۲۴) مولا بخش اشفق کا دیوان مطبع انصاری دہلی نے ۱۳۰۸ھ میں چھاپا تھا۔ اس میں گلاب سنگھ مشتاق شاگرد اشفق کا قطعۂ تاریخ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات ۱۳۰۷ھ میں بتاریخ ۲ رشعبان واقع ہوئی تھی۔ بیت آخر (مصرع آخر = ۱۲۹۰ + غم مرا مید = ۱۷):

بولا مشتاق بے سرامید ——— حیف ہے اب سخن یتیم ہوا ۱۳۰۷ھ

(۲۵) آثار الشعرا مصنفہ سید محمد مختار ۲۸۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ یار محمد خان متخلص بہ شوکت (جد محمد خان [illegible] رئیس ٹونک کے بیٹے) بتاریخ ۱۲۳۴ھ پیدا ہوئے تھے۔ اور غالب کے شاگرد تھے۔ شوکت نے ایک مختصر سا تذکرۂ شعرا فرح بخش کے نام سے لکھا ہے جس میں ایک جگہ غالب کو "خسرو ملک سخن، بہ زبان دری دہلوی" اور دوسری جگہ "فردوسی دوم، خسرو دوم، حکیم کلام، نظامی نظام ...... مشاہیر علماء کے بی سے تھے۔ تعریف و توصیف ان کی بیان سے مستغنی ہے۔" شوکت نے غالب کا صرف ایک شعر ترکاً نقل کیا ہے۔ "دیوئے گل نالہ دل الخ" لیکن اس میں عباس رفعت کا تصنیف کیا ہوا قطعۂ تاریخ وفات ملتا ہے:

جان ارباب سخن غالب [illegible] ——— ناظم سحر بیاں ناثر والا فطرت
وارث فردوسی و خاقانی و ملا اکمل ——— ثانی خسرو و سعدی و عرفی و شوکت
اہ ...... کمالات ...... و دانش ——— ماہر علم معانی و بیان و حکمت
از جہاں کرد سفر سوئے بہشتی منزل ——— گفت عباس کہ شایاں مہر جنت

(۲۶) حکیم رضا محمد متخلص بہ صہبا، حکیم میر رضا حسین متخلص بہ صہبا کے بیٹے اور لکھنؤ کے مشہور شاعر صبا شاگرد آتش کے نواسے تھے۔ ان کی ایک کتاب مطبع گلزار محمدی لکھنؤ کی چھپی ہوئی کتب خانۂ ادارۂ تحقیقات اردو میں ہے جس کے سرورق پر مرقوم ہے: "قاعدۂ نغمہ، مجموعۂ قانون راگ المعروف بہ حصہ اول معروف بہ خیر [illegible] ۱۳۰۰ھ در ترانۂ دلچسپ و حصہ دوم معروف بہ غزل [illegible] حصہ سوم غزل [illegible]" حصہ ۱ کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ صہبا نے موسیقی سے متعلق رسالہ ۱۲۹۶ھ میں لکھا تھا اور قاعدۂ نغمہ نام رکھا تھا۔ لیکن اس میں صرف [illegible] نہیں، [illegible] ٹھمری، غزل وغیرہ بھی ہیں۔ [illegible] مشکل ہے کہ یہ چیزیں کب جمع ہوئیں۔ کتب خانۂ ادارۂ تحقیقات اردو میں جو نسخہ ہے وہ طبع اول نہیں، طبع دوم کا ہے اور [illegible] سے متعلق کوئی بات اس سے معلوم نہیں ہو سکتی۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ آزاد [illegible] اشعار کی اس قسم میں جو نقوش ([illegible]) نے شائع کی ہے، صہبا کی جس غزل سے بحث ہوئی ہے وہ اس کتاب میں [illegible]

سے دیوان اشفق، تذکرۂ فرح بخش، دونوں [illegible] میں ہیں۔
سے آثار الشعرا، قاعدۂ نغمہ، اور دیوان ادارۂ تحقیقات اردو کی ملک ہیں۔

«ظفر بادشاہ دہلی» کے نام سے مندرج ہے (صفحہ ۱۰۸)۔ متن میں جابجا اختلافات ہیں: «بہادر شاہ ظفر» کا شعر: «کبھی جادہ و ماتم الخ» اس سے خارج ہے اور شعر ذیل جو اس میں ہے «عنوان دہلی» اور «بہادر شاہ ظفر» میں نہیں ہے:

«نہ دبایا زیر زمیں انہیں، نہ دیا ہے غسل و کفن انہیں
گیا یار کس نے ہے دفن انہیں ہے ٹھکانا جن کا مزار ہے»

(۴۷) ادیب نامی ایک ماہنامہ سنہ ۱۸۹۶ء میں خیال عظیم آبادی کی نگرانی میں پٹنہ سے نکلتا تھا جس کے غالباً صرف ۴ شمارے شائع ہوئے۔ شمارۂ ۳ میں سید علی سجاد «سجاد» (مصنف محلات) کا ایک مضمون «زبان اردو» شامل ہے جو ناتمام رہ گیا۔ اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

«قاضی محمد صادق خاں اختر ہگلی کی خاک سے اٹھے اور دہلی میں شہرت حاصل کی۔ لکھنؤ میں جب لکھنؤ گئے تو وہاں کے منصف مزاج فصحا نے ان کے کمال کی صرف زبانی ہی تعریف نہ کی بلکہ ان کو اردو کی شاعری میں مسلّم الثبوت مانا اور بعضوں نے زبان اردو پر ان کے دخل و تصرف کو جائز جان کر انہیں استاد سمجھا۔ ایک موقع پر وہ خود تحریر فرماتے ہیں: «روزے بحسب امر در خدمت نواب مستطاب حسن رضا خاں بہادر حاضر شدم و جناب ایشاں بعد از فراغ صلوٰۃ جمعہ با جماعت کہ از ادائے آں در مسجد جامع خود فارغ شدہ بودند با چند رفقائے خود [illegible] شناس کہ یکے از آں میاں فراغ نیز بودند ایشاں خود دار ز مرہ اساتذۂ شعرائے اردو می شمردند، نشستہ بودند۔ فقیر را با کمال گرم جوشی پذیرا گشتند۔ بعد مزاج پرسی ادا ساختہ چند حسب ارشاد قصیدہ تازہ تصنیف را کہ در زبان اردو بود با کرم [illegible] بعد استماع قصیدہ تحسین ہائے دل از خوش طبعی ارشاد کردند و حضار بزم آں را نواب مستطاب گردیدند۔ از آں اقوال میاں فراغ مع بعد از آنکہ خواندن غزلیات اردو خود فرمایش کرد در صحبت صعبۂ مشاعرہ کہ با تفاق خواندن [illegible] بودند۔ بہمیں اشارت نواب نامدار نیز با ہم ترتیب دو دو غزلیات بعرض رسانیدم و مقبول افتاد۔ میاں فراغ در جواب محاورۂ اردو حرف گیری نمودند یکے در لفظ «عقل کا چرچا» کہ آں را خود از فقیر تسامح رو داده بود و در عمل ایشاں با عجب بود دیگر لفظے است «بھلا» در صحبت دہلی و لکھنؤ در اکثر مقام بمعنی محبت مستعمل است اعتراض شدند و ایں عبارت مکابرہ محض ایشاں بود۔ چنانچہ نواب والا جناب و دیگر فصحائے لکھنؤ در صحبت جناب ایشاں کہ تا این حال سے بود ارشاد فرمودند کہ شیخ [illegible] ایشاں اشارہ بطرف فقیر اختر بود، تمدت بر تصانیف و شعر گوئی اردو خواہ دیگر زباں ہیچ رسد [illegible] ایں پسر یا پنجاب باشد مگر ملتا ختر نشد [illegible] سپارد و بر تواں خردہ گرفت و بپایہ منصفانہ استادی رسد و پذیرفت کہ مرسے در کاوش و تحقیق الفاظ اسیر کردہ در پایہ اش بکمال رسیدہ اند چنانکہ عامیانہ جادو بیا بر کلام [illegible] حرف زنی کرد بر ترین عیوب و نقص نام خود عرض گیر است از آں زباں آں ہمیں اختر کردہ در سال کامل است میاں فراغ ہمارہ در اثبات اعتراضات فقیر گوشاں و کسے بیرا کہ در لکھنؤ قدم بالخیر دارند بعضے با دلائل از آں جوں مساعدۂ تفویض نگار خاں قابلیت علم و اخلاق نیستند با فقیر مہرباں اند حتیٰ در بعضے مسائل کہ متعلق بمحاورۂ اردو بودند دخل فقیر را منصفانہ پذیرا کردند۔ میاں فراغ گاہے نتوانستند از پیش برد»

فارسی عبارتیں جو اختر کی طرف منسوب ہیں، ان کے اعتراض کی دو برس بعد کی جعلی گئی ہیں۔ حسن رضا خاں کی وفات سنہ ۱۲۱۶ھ میں ہوئی تھی (آب حیات ص ۱۵۳)، اور یہ مسلّمات سے ہے۔ اختر نے حدیقۃ الارشاد (مصنفہ سنہ ۱۲۳۶ھ، نسخۂ کتب خانہ خدا بخش) کے دیباچے میں اپنی عمر ۲۰ سال کی لکھی ہے، اور عامر نے اپنے تذکرے میں تحریر کیا ہے کہ لفظ «اختر» سے (۱۲۱۰) سے ان کا سال ولادت معلوم ہوتا ہے (نسخۂ خدا بخش)۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عبارات فارسی اسی سال میں رقم ہوئے ہیں، جب حسن رضا خاں کا انتقال ہوا تھا، تو اختر کی عمر اس وقت چھ سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ وہ اس زمانے میں لکھنؤ میں تھے۔ اگر سجاد کا یہ بیان بھی کہ «اختر شہرت حاصل کرنے کے بعد کلکتہ سے» ہگلی سے لکھنؤ گئے تھے صحیح نہیں۔ حدیقۃ الارشاد جیسا کہ اس کے دیباچے سے ثابت ہے، لکھنؤ میں سپرد قلم ہوئی تھی۔ فارسی عبارات کے لکھنے والے اختر نہیں ہو سکتے، یا کسی ایسے شخص کے قلم سے نکلے ہیں جس نے آب حیات (نو [illegible]) میں انشا کا حال دیکھا ہے اور جو یہ سمجھتا ہے کہ تاریخ کے ابتدائی زمانے میں اختر لکھنؤ کے مسلّم الثبوت شعرا میں منسوب ہوتے تھے۔ واضح رہے کہ فراغ جن کا [illegible] انشا و جرأت کے ہم مشق تھے (آب حیات ص ۱۴۳)، وہ سنہ ۱۲۱۲ھ میں عہد پیری میں ہوں گے، اور جو پیدا ہوئے ہوں گے تو ان کا زمانۂ طفولیت ہوگا۔

فارسی عبارات سجاد کے لکھے ہوئے ہوں یا کسی اور کے، مصلحتاً تحریر ہوئے تھے۔ مقصد اصلی یہ دکھانا تھا کہ ایک بنگالی خاص لکھنؤ میں مستند قرار پایا، اور اگر کسی شعر میں کچھ غلطیاں سرزد ہوئی ہوں تو ان کی وجہ سے وہ غیر معتبر نہیں سمجھا جاتا۔ سجاد شاگرد شاہ عظیم آبادی تھے، اور شاہ اُس زمانے میں اپنے ہم وطنوں کے اعتراضات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔

(۲۸) ہم نکالیں گے سن اے موجِ ہوا بل تیرے ۔ اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہوں گے

نقد غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا ایک مقالہ بعنوان "غالب ___ معتقد میر" شامل ہے۔ اس کے ص ۴۹ میں شعر مذکور غالب کے نام سے درج ہے، لیکن یہ مومن کا ہے اور مومن کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے۔

(۲۹) دیوانِ شفق نفس احمد کیف لکھنوی کا خاتمہ تسلیم نے لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیف کی وفات بعمر ۲۱ سال، شب جمعہ بتاریخ ۱۶ ربیع الثانی سنہ ۱۲۹۲ھ میں ہوئی تھی۔

(۳۰) دیوانِ قمر بنگالی میں قربان علی بیگ سالک دہلوی کی وفات کا مادۂ تاریخ یہ درج ہے: "ذاتِ قربان علی سالک بجاں افسوس مرد" = ۱۲۹۷

---

[1] سیف و قمر کے دیوان کتب خانۂ دانش گاہ دہلی میں ہیں۔

عزیز کے نام

یہ خطوط کا مجموعہ ہے جو ڈاکٹر تاثیر نے اپنے ایک شاگرد کے نام کیمبرج سے لکھے تھے۔ خطوط بذاتِ خود ایک دلچسپ چیز ہیں اور اگر کوئی صاحبِ طرز لکھنے والا ہو تو ان کی افادیت کے ساتھ ان کی دلچسپی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہ خطوط کا مجموعہ بے حد دلچسپ، بڑا معلومات افزا، ابتہاج کا [illegible] اور حد درجہ نازک اور علمی مسائل پر تبصرہ بھی ہے۔

قیمت ۳/-

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

فقہ ہندی

اختر اورینوی

میں، پروفیسر حسن عسکری، پروفیسر سید حسن اور پروفیسر ذکی الحق مختلف پرانے خاندانوں کے کتب خانوں کو دیکھنے بہار شریف گئے تو ہمیں اور قیمتی نسخوں کے علاوہ فقہ ہندی کے دو گراں قدر نسخے ملے۔ ان میں سے قدیم تر غالباً سید شاہ محمد اسحٰق حسین چشتی نظامی المتخلص بہ فقیر و المعروف بہ پیر دریا کا نقل کردہ ہے۔ (آپ شاہ مجتبیٰ حسین صاحب کے پردادا، اٹھارھویں صدی عیسوی کے اواخر اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل کے بہار کے صوفی بزرگ تھے۔) فقہ ہندی کا یہ نسخہ بوسیدہ اور کرم خوردہ ہلکے زرد رنگ کے پرانے کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی مذہبی رسالوں کے مخطوطات نظم و نثر میں ہیں۔ ان سب کو ملا کر جلد بندی کی گئی تھی۔ اجزا پریشان، شیرازہ بکھرا ہوا، جلد اکھڑی اور کیڑا لگی ہوئی، اوراق اکثر الگ اور کنارے پارہ پارہ ہیں۔ آخری صفحہ پر لکھا ہے:

"تمام شد نسخہ فقہ ہندی واقعہ بتاریخ ہشتم شہر رجب سنہ ۱۲۱۰ فصلی"

نسخہ کے ہر صفحہ کے حاشیہ پر اور بین السطور بہ زبان فارسی حتی تشریح و تفسیر درج ہے۔ اس وجہ سے صفحات پر تحریر بہت گنجان ہو گئی ہے۔

فقہ ہندی کا دوسرا نسخہ مخطوطات کی دوسری جلد میں ہے۔ اس جلد میں کچھ عملیات کے نقوش اور چند فارسی زبان میں مذہبی رسالے بھی ہیں۔ آخری رسالہ فقہ ہندی ہے۔ کاغذ صاف تر ہے۔ تحریر بھی بہت صاف اور خوبصورت ہے مگر سارے نسخہ کی تحریر میں یکسانی نہیں۔ فقہ ہندی کا یہ نسخہ کرم خوردہ اور بوسیدہ حال بھی ہے۔ اس میں کوئی تشریح و تفسیر نہیں۔ اشعار کی سطریں بہت علیحدہ علیحدہ ہیں۔ آخری صفحہ پر مثنوی کے اختتام کے بعد درج ہے:

"تمام شد نسخہ فقہ ہندی واقعہ بتاریخ سیوم شہر رجب المرجب سنہ ۱۲۴۵ فصلی از خط خام عاصی گمنام
سید نور علی اختتام یافت"

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فقہ ہندی کے یہ دونوں نسخے کسی قدیم تر بہاری نسخہ سے ہی منقول ہیں کیونکہ مثنوی فقہ ہندی کے ان نسخوں کی زبان پر بہاری زبان کا صاف اثر ہے۔ اس کی شہادت بعد میں پیش کروں گا۔ فقہ ہندی عہد عالمگیری کی تصنیف ہے۔ میری تشفی اس امر میں اب تک نہیں ہوئی کہ

مؤلف و مصنف کا پورا نام کیا تھا اور وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ مجھے اب تک فقہ ہندی کے پانچ نسخوں کی اطلاع ملی ہے۔ ایک پنجاب میں، دوسرا گجرات میں، تیسرا اودھ میں، چوتھا و پانچواں بہار میں۔ بنیادی طور پر یہ سب نسخے ایک جیسے ہیں۔ ان کی زبان ایک ہے، ان نسخوں میں مقامی بولیوں کا اثر موجود ہے لیکن فقہ ہندی کے ہر نسخہ پر پنجابی بولی کا اثر نمایاں ہے۔

سب سے پہلے فقہ ہندی کا نسخہ کتب خانہ اودھ میں اسپرنگر کو ملا لیکن بقول پروفیسر محمود شیرانی: "اسپرنگر[1] نے فہرست کتب خانہ اودھ میں اس کو حشر نامہ کے نام سے موسوم کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کتاب کا نام حشر نامہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ فقہ ہندی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اس رسالہ کے ناظم کا نام محمد جیون عرف محبوب عالم متوطن جھجر بیان کرتا ہے اور خاتمہ سے دو شعر نقل کرتا ہے:

فقہ ہندی کو کہاں اُو زباں پر یار　　　مسلہ آوے دین کا حاصل نہ ہووے فساد
سن ہزار چھ تھے تریخ رمضان (کذا)　　　اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اور شعر افتتاحی حسب ذیل نقل کرتا ہے:

اللہ مولا پاک جو جگ سرجن ہار　　　جن دنیا پار صدق سوں سو سے تھے پار

میرے زیر نظر فقہ ہندی، مملوکہ پروفیسر سراج الدین آذر ایم۔ اے، ہے جو ۱۲۳۲ھ کی نوشتہ ہے۔ اس میں خاتمہ کا پہلا شعر اسپرنگر کے منقولہ اولا شعر کے مطابق ہے اور شعر دوم یوں ہے:

سن ہزار چھ تھے تریخ ماہ رمضان تمام　　　اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

مگر شعر افتتاحی یوں ہے:

حمد ثنا سب رب کوں خالق کل جہان　　　لائق حمد ثنا کے اور نہ کوئی جہان

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسپرنگر کے سامنے دو مختلف رسالے ایک ہی جلد میں ساتھ بندھے ہوئے تھے جن میں فقہ ہندی کا نمبر دوم تھا۔ اسپرنگر نے دونوں رسالوں کو ایک سمجھا۔ اس لئے ابتدائی شعر پہلے رسالے کا دیا اور خاتمہ فقہ ہندی سے نقل کر دیا۔ اسی لئے اس نے مصنف کے نام میں غلطی کھائی ہے۔

فقہ ہندی کا مصنف عبدی ہے نہ کہ محمد جیون۔ عبدی کا نام اس شعر میں آتا ہے:

کہئے مسلہ دین کے عبدی کہے امین　　　فقہ ہندی زباں پر بوجھ کرو یقین

اس کے علاوہ رسالہ کی زبان اس قدر پنجابی آمیز ہے کہ اس کو ہریانی زبان میں کسی طرح داخل نہیں کیا جا سکتا۔"

(پنجاب میں اردو)

---

[1] "پنجاب میں اردو" شیرانی ص ۲۲۳، تا ص ۲۲۴ نیز ص ۲۴۴ پر پروفیسر شیرانی لکھتے ہیں: "شمالی ہندوستان میں جس میں دہلی بھی شامل ہے اردو کی قلمی یادگاریں گیارھویں صدی ہجری سے زیادہ قدیم نہیں ملتیں۔ پنجاب میں بھی اسی صدی سے تالیفات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنجاب میں مولانا عبدی کی تصنیف رسالہ فقہ ہندی سب سے قدیم ہے جو ۱۰۶۶ھ میں عہد اورنگ زیب عالمگیر لکھا جاتا ہے۔" (پنجاب میں اردو ص ۲۲۵)

ظاہر ہے فقہ ہندی فضلی کی "دہ مجلس" سے پہلے کی تصنیف ہے۔ "دہ مجلس" بعہد محمد شاہ بادشاہ دہلی ۱۱۴۵ھ مطابق ۱۷۳۲ء میں لکھی گئی یہ کتاب فارسی کی روضۃ الشہداء کا ترجمہ ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے۔"

(رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اردو، مقدمہ ص ۳)

بعد ازاں شیرانی نے فقہ ہندی کے اٹھائیس شعر نقل کیے ہیں۔ آخر میں فیصلہ یوں کیا ہے:

"عبدی پنجابی میں بھی ایک شاعر گزرا ہے جو رسالہ ہندی کا مصنف ہے۔ اب رسالہ ہندی اور فقہ ہندی کی زبان میں قرابت قریبہ موجود ہے جس سے میرا خیال ہے کہ دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی شخص ہے۔ مثلاً:

فقہ ہندی	ــ	مسئلہ آویں دین کے حل نہ ہووے فساد
دیگر	ــ	کہتے مسئلے دین کے عبدی کہے آئین
رسالہ ہندی	ــ	اکھاں وقت سوال دے حل نہ ہووے فساد
دیگر	ــ	واجبات نماز دے عبدی کہے آئین

دونوں رسالوں کا وزن بھی ایک ہے اور جملوں کی ترکیب اور بندش بالکل پنجابی طرز میں ہے۔" (پنجاب میں اردو صفحہ ۲۲۳-۲۲۴)

فقہ ہندی کے اور نسخوں کی زبان کے مطالعہ کے بعد میں اس فیصلہ پر پہنچا ہوں کہ غالباً عبدی کے پنجابی رسالہ ہندی کو سامنے رکھ کر کسی نے فقہ ہندی اس عہد کی اردو زبان میں مرتب کر لیا۔ گویا یہ پنجابی سے اردو میں ترجمہ کا کام تھا۔ اس لئے عبدی کا نام رہنے دیا گیا۔ افسوس کہ رسالہ ہندی میری نظر سے نہیں گزرا ورنہ میں زیادہ قطعیت کے ساتھ کسی فیصلہ پر پہنچتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بقول پروفیسر شیرانی دونوں رسالے خود عبدی نے لکھے ہوں مگر قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرکیف فقہ ہندی کے اولین نسخے کی بنیاد پر اس کے اور نسخے بلا واسطہ یا بالواسطہ منقول و مرتب ہوئے ہوں گے۔ پہلے مسائل مذہبی عربی و فارسی میں ملتے تھے۔ ایک ہندوستانی زبان میں فقہ اسلامی کے مسائل پیش کر کے فقہ ہندی کے مصنف نے بڑا انقلابی قدم اٹھایا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ پنجاب، ہریانہ، گجرات، اودھ اور بہار میں اس کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی کیونکہ صوفیائے کرام عوام کو مسائل اسلامی سے اچھی طرح واقف کرانا چاہتے تھے۔ فقہ پر اور رسالے بھی اسی عہد میں لکھے گئے۔[1]

مطلب مسئلہ بوجھنا فرض ہیں سب کے جان عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

(پنجاب میں اردو)

مطلب مسئلہ بوجھنا جو کچھ سمجھے زبان عربی ترکی فارسی ہندوی یا افغان

(نسخہ ۴ بہار شریف و نسخہ ۵ ایضاً)

مختلف ناقلوں نے مقامی زبان کا لحاظ کرتے ہوئے فقہ ہندی کی نقل کی اور تھوڑے رد و بدل کیا کیونکہ مقصود عوام کو مسائل سمجھانا تھا۔ مصنف کا نام عبدی ہی رہا، تھوڑے تغیر کے ساتھ عبدی، عبید یا عبدو، کیونکہ مسائل مذہبی اسی سے منقول تھے۔ ذمہ داری اور ساکھ اسی کی تھی۔

فقہ ہندی کے مختلف نسخوں میں جس حد تک پنجابی اثر موجود ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ عہد عالمگیری یا اس کے قریب ترین زمانہ میں فقہ ہندی کے اولین نسخے اودھ، بہار اور گجرات میں منقول ہو گئے تھے ورنہ بعد کے زمانہ میں بہار کے نسخوں میں وہ پنجابی اثر ہرگز نہ ہوتا کیونکہ بہاری اردو سے پنجابی اثر اواخر عہد مغلیہ میں بالکل ختم ہو گیا تھا۔ یاد رہے کہ فقہ ہندی کا مقصود ہی لوگوں کو فقہ اسلامی کے مسئلے سمجھانا تھا اور اسی لئے مقامی زبان کے مطابق نسخوں میں رد و بدل ہوا ہے۔ مثلاً ــ

علم شریعت بوجھنا فرض ہیں سب کے جان بالغ عورت مرد کوں جو ہووے مسلمان

(پنجاب میں اردو صفحہ ۲۲۳)

---

[1] خدا بخش مشرقی لائبریری، بانکی پور کا ایک نسخہ۔

دیگر: —
علم شریعت بوجھنا فرض ہمیں کی جان　　　بالغ جورو و مرد کوں جو ہوئے مسلمان
(نسخہ ط، بہار شریعت ص ۲)

لہٰذا اگر فقہ ہندی کا نسخہ بعد میں بہار پہنچتا تو پنجابی الفاظ ضرور ہٹا دیے جاتے۔ قرینہ یہی کہتا ہے کہ رسالہ فقہ ہندی تصنیف کے فوراً بعد ہی بہار، گجرات اور اودھ میں پہنچ گیا تھا اور وہاں اچھی طرح سمجھا جاتا تھا۔ غرض یہ کہ عہد عالمگیر تک شمالی اور جنوبی ہند میں تھوڑے فرق کے ساتھ لسانی یکسانی پیدا ہو گئی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب صوبہ بہار میں دہلی اور نواح دہلی کی زبان اچھی طرح جڑ پکڑ چکی تھی یعنی سترھویں صدی عیسوی کے اواخر اور اٹھارھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں ——

فقہ ہندی کا گجراتی نسخہ علامہ سلیمان ندوی کو سفر گجرات کے دوران ملا تھا۔ علامہ "نقوش سلیمانی"[1] میں لکھتے ہیں:

> "بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ انکلیشور ہے جو سورت کے سفر میں کبھی بیچ کی ایک منزل تھا۔ یہاں عہد شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے۔ خاندان کے بانی شاہ عبدالعلیم صاحب ہیں جو اکبر کے معاصر تھے۔ ۹۸۲ھ میں انھوں نے وفات پائی ہے …… خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حیدر علی غلام علی انعام دار ہے۔ موصوف کے پاس خاندان کی پچھلی آبرو کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے۔ اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں۔ گجراتی اردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں۔"

علامہ موصوف نے کئی گجراتی اردو کے رسالوں کا تذکرہ کیا ہے۔ منجملہ ان کے رسالہ فقہ ہندی بھی ہے۔ علامہ لکھتے ہیں[2]:

> "…… یہ فقہی مسئلوں کے بیان میں ایک نظم ہے۔ آغاز کے اشعار یہ ہیں ؎

محمود ثنا سب سب کوں خالق کل جہان　　　لائق حمد ثنای کے اور نکو نہ جان
علم شریعت کل دین بھیجا پاک رسول　　　جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول
یا رب اپنے کرم سوں بھیج بھیج درود　　　نبی محمد مصطفےٰ تسوں ہوں خوشنود
ان بھیجوں کی آل پر اور اصحاب تمام　　　تس بھیجا احباب پر بہت ہزار سلام
کیتے مسئلے دین کے جدہ کے آئین　　　فقہ ہندی زبان سے بوجھو کرو یقین
مطلب مسئلے بوجھنا جو کچھ بھی ہے زبان　　　عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

اس کے بعد فقہی ابواب ہیں اور ان کے تحت ہر قسم کے مسائل ہیں۔ خاتمہ میں تصنیف کا سال ۱۰۷۵ھ عہد اورنگ زیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے۔ خاتمہ میں ہے ؎

فقہ ہندی کوں ہوشاں کرو زباں پر یاد　　　مسائل آویں دین کے کچھو نہ ہوے فساد ——
سن ہزار پچھتر ہجری ماہ رمضان تمام　　　اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

---

[1] "سفر گجرات کی چند یادگاریں" نقوش سلیمانی ص ۳۹۶

[2] نقوش سلیمانی ص ۲۷۲۔ حیرت ہے کہ علامہ ندوی نے پنجاب میں اردو، ۱۹۲۸ء کا حوالہ بالکل نہیں دیا۔ علامہ کا مضمون پہلے پہل معارف نومبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس سے بہت قبل پروفیسر شیرانی کی کتاب نکل چکی تھی۔

اس فقہی نظم میں خاص چیز نظم کا وزن ہے، جو عربی و فارسی کے بجائے ہندی وزن کی پیروی میں ہے ......"

بہار شریف کے نسخوں کے ابتدائی اشعار حسب ذیل ہیں:۔

حمد ثنا سبھ رب کوں خالق کل جہان ۔۔۔ لائق حمد و ثنا کی آور نگہ تے جہان
علم شریعت آل کی بھیجا پاک رسول ۔۔۔ جو کچھ بھیجا رب نے سبھ ہم کیا قبول
یارب اپنی کرم سوں بیحد بھیج درود ۔۔۔ نبی محمد مصطفیٰ تس ستیں ہوئے خشنود
دیچھوں اسکی آل پر آور اصحاب تمام ۔۔۔ تس پچھوں احباب پر بہت درود سلام
کیتی مسلے دین کی ہندوی کی امین ۔۔۔ فقہ ہندی ئے زبان پر جو بوجھ کر ہو یقین
مطلب مسلہ بوجھنا جو کچھ ہوئے زبان ۔۔۔ عربی ترکی فارسی ہندی ہے یا افغان
علم شریعت بوجھنا فرض ہیں کی جہان ۔۔۔ باقی جورو مرد کوں جو ہوئے مسلمان

پنجابی اور بہاری نسخوں کا فرق ملاحظہ ہو:

		بہاری نسخہ	پنجابی نسخہ
شعر ۱	م ۱	سبھ	سب
	م ۲	ثنا کی	ثنا کے
شعر ۲	م ۱	کوئی فرق نہیں	......
	م ۲	سبھ	سب
شعر ۳	م ۱	کرم	فضل
	م ۲	...... تس ستیں ہوئے خشنود	...... تجھ سوں ہو خوشنود
شعر ۴	م ۱	دیچھوں اسکی	پیچھوں اوس کی ......
	م ۲	تس پیچھوں	تس پیچھوں ......
شعر ۵	م ۱	...... ہندوی	...... ہندی ......
	م ۲	...... ہندوئے ...... کرہو	...... ہندی ...... کرو ......
شعر ۶	م ۱	...... جو کچھ ہوئے زبان	...... فرض ہیں کے جہان
	م ۲	...... ہندوی	...... ہندی ......
شعر ۷	م ۱	کوئی فرق نہیں	......
	م ۲	...... جورو مرد ...... ہوئے	...... عورت مرد ...... ہوئے ......

فقہ ہندی خاصا بڑا رسالہ ہے۔ کل تیس اوراق نسخہ ۱ میں موجود ہیں اور ہر صفحہ پر کم و بیش ۹ اشعار درج ہیں۔ رسالے کے مختلف ابواب ہیں

---

[۱] بہار شریف کے نسخہ ۱ کے حاشیہ پر "عبدو دن کے پاس لکھا ہے" نام صاحب مصنف"۔ مصنف کہاں کے رہنے والے تھے یہ اطلاع نہیں ہو سکی۔

ادارہ

مثلاً فصل دربیان اسلام، فصل دربیان…… نماز، فصل دربیان تیمم، وغیرہ وغیرہ۔ اختتامِ رسالہ میں ذیل کے اشعار درج ہیں:

کعبہ آوے نظر میں پڑھ درود و دعا　　اور تکبیر و تہلیل کر پڑھی الحمد اللہ
فقہ ہندی کے کوں مومناں کو زباں پہ یاد　　مسئلا دین دین کے مول نہ ہوئے فساد
سنہ ہزار چوہتر پنج رمضان تمام　　اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا اتمام

میری رائے یہ ہے کہ بہاری نسخہ گجراتی نسخہ سے قدیم تر ہے جو قدیم تر نسخہ سے منقول ہے۔ بہاری، اودھی اور پنجابی نسخوں میں زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے۔ سنہ تصنیف میں بھی گجراتی نسخہ علیحدہ ہے۔ اس میں "سنہ ہزار پچھتر" لکھا ہوا ہے اور بقیہ نسخوں میں "سنہ ہزار چوہتر"۔ —— گجراتی نسخہ کے خاتمہ کے اشعار دوسرے نسخوں کے انہی اشعار کے مقابلہ میں ملاحظہ ہوں:

فقہ ہندی کوں مومناں کرو زباں پہ یاد　　مسائل آویں دین کے بوجھ بچے فساد
(گجراتی نسخہ)

فقہ ہندی کو مومناں اٹھو زبان پہ یاد　　مسئلا آشے دین کا مول نہ ہوئے فساد
(اودھی و پنجابی نسخہ)

فقہ ہندوی کوں مومناں آنو زبان پہ یاد　　مسئلا آوے دین کے مول نہ ہوئے فساد
(بہاری نسخہ ۱)

بہاری نسخوں میں بہاری زبان کے اثرات ملتے ہیں۔ مثلاً "سب" کے بجائے "سبھ"، "بیچ" کے بجائے "بیچھ"، "ہات" کے بجائے "ہاتھ"

---

[1] بہار شریعت کے دونوں نسخوں میں بڑی یگانگت ہے۔ اغلب یہی ہے کہ نسخہ ۲ نسخہ ۱ سے نقل کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں خفیف اختلاف پایا جاتا ہے جو نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ نسخہ ۱ "فصل دربیان سنت" کے پانچ اشعار کے بعد کچھ اوراق غائب ہیں۔ نسخہ ۲ سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اس شعر سے سلسلہ ٹوٹتا ہے ؎

دونوں ملا کر انگلیاں سجدے بیچ کر ہاتھ　　منہ برابر بیٹھ رکھ رکوع کے ساتھ

[2] نئی ہند آریائی زبانوں میں سے وسطی زبانیں یعنی مغربی ہندی، مشرقی ہندی اور بہاری زبانیں "ہ" کی آواز Aspirate کو شروع، بیچ یا آخر میں قائم رکھتی ہیں۔ "ہ" کی مرکب آواز بھی قائم رکھی جاتی ہے اور اس کا اعلان ہوتا ہے مثلاً گھ، بھ، دھ، ڈھ، جھ کی آوازیں۔ برخلاف اس کے بنگالی، پنجابی اور سندھی میں "ہ" کی آواز گر جاتی ہے یا بنیادی طور پر بدل جاتی ہے۔ (انڈو آرین اینڈ ہندی: چٹرجی صفحہ ۸۰ بحوالہ بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز، لندن حصہ سوم صفحہ ۲۴۸) ڈاکٹر گراہم بیلی نے اس سلسلہ میں پنجابی پر کام کیا ہے، آر۔ ایل۔ ٹرنر نے سندھی پر اور چٹرجی نے بنگالی پر۔

بنگالی		بہاری
بون	=	بہن
باگ	=	باگھ
لاب	=	لابھ
بائی	=	بھائی

پنجابی		بہاری
پُکھ	=	بھوکھ
چاڑو	=	جھاڑو
کوڑا	=	گھوڑا
پابی	=	بھابھی

ہیں' کے بجائے 'ویں' ۔ 'جاوتا' کے بجائے 'جاوت' ۔ 'پانچ' یا 'پنچ' کے بجائے 'پانچ' ۔ 'پیچھے' کے بجائے 'پیچھیں' وغیرہ وغیرہ ۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ نقد ہندی کے بہاری نسخہ میں مقامی زبان کا لحاظ رکھتے ہوئے تھوڑی تبدیلی کی گئی ہے ۔ 'ہ' کی آواز کا اعلان بہاری بولی میں ہائے الف کے ساتھ دیر تک ہوتا رہا ۔ پنجابی نسخہ میں 'ہ' کی آواز گر گئی ہے ۔ لیکن نقد ہندی کے پانچوں نسخوں کی زبان کا عام تحول اور ڈھانچہ کھڑی بولی ہندستانی کا ہے ۔ صرف پنجابی اثر کی وجہ سے نہ تو ہم اسے پنجابی بولی کا رسالہ کہیں گے اور نہ یقینی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نقد ہندی کو ہندوستانی مثنوی کا روپ دینے والا کوئی پنجابی ہی تھا ۔ بہرکیف یہ بڑے مرکز کا رسالہ ثابت ہوا اور ملک کے دور دراز علاقوں میں معروف، مشہور و مرغوب ہوا ہے ۔

اوپر کے بیانات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عہد عالمگیری میں کھڑی بولی ہندوستانی بہار میں گھر کر چکی تھی اور عام فہم ہو گئی تھی ۔ نیز یہ کہ بہاری زبان میں ریختہ بھی پیدا ہو چکا تھا ۔ انہی دو عناصر سے معیاری اردو زبان بنی ہے ۔ یہ زمانہ بہار میں اردو زبان کے ارتقا کا ایک اہم سنگ میل ہے ۔

پیچ و خم

یہ عدم کی ایک سو سے زائد مترنم، مدل، آورد اور پیاری پیاری سی غزلوں کا ایک سادہ سا مجموعہ ہے جسے اب پچاس نئی غزلوں کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے ۔ اس کی ہر ہر غزل اور ہر ہر شعر پر جھوم جھوم اٹھنے کو جی چاہتا ہے ۔

داغ کے بعد جو چستی، روانی اور سلاست ان کے حصے میں آئی وہ اور کسی کو میسر نہیں ہے ۔

قیمت ۳/-

جانِ عالم

انگریزوں نے اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کو جب معزول کر دیا تو انہوں نے اپنے آخری چند سال مٹیا برج میں گذارے تھے ۔ وہ دن کس طرح کاٹے اور وہاں وہ کس حالت میں رہے اور ان کا وہاں کیا مشغلہ رہا، ان تمام باتوں کا آنکھوں دیکھا حال اردو کے مشہور مؤرخ عبدالحلیم شرر نے اس کتاب میں پیش کر دیا ہے ۔

قیمت ۲/۸

اصحابِ کہف

نیاز فتحپوری نے مصر کے ایک بڑے مشہور ڈرامہ نگار توفیق الحکیم کے ایک نادر ڈرامے کو اردو میں منتقل کیا ہے ۔ یہ ڈرامہ قرآن کے ایک مشہور واقعہ سے متعلق ہے جو قرآن سے قدرے مختلف ہے لیکن جو کچھ اس میں ہے اور اسے جس طرح پیش کیا گیا ہے، وہ بعید از عقل نہیں ہے ۔ یہ ڈرامہ مصر میں بے حد مقبول ہوا ۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اردو میں بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ۔

قیمت ۱/۱۲

ادارۂ فروغِ اردو لاہور

نئے ادبی رجحانات اور ان کا تجزیہ

راجندر ناتھ شیدا

اردو ادب آج ایک انتشار کے عالم میں ہے اور یہ انتشار بھی کچھ عجیب طرح کا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے ہندوستان تیزی سے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ ملک کے گوشے گوشے میں علاقائی ادب کو فروغ دینے کا احساس موجود ہے۔ ادیب پہلے کی نسبت زیادہ آسودہ حال ہے۔ اس کے لئے روزی کے وسائل ہی نہیں ترقی کی صورتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ نئی ادبی اور قومی سطح پر شہرت حاصل کرنے کے لئے جو موقعے آج مل رہے ہیں کبھی پہلے ممکن نہ تھے۔ اس کے باوجود ادب کی تخلیق مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے مضمحل ہے۔ یوں کہنے کو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو ادب سے محبت رکھنے والے ہر شخص کے دل میں ایک طرح کی بے اطمینانی ہے۔ ان حالات میں قدرتی طور پر دل میں کئی طرح کے سوالات ابھرتے ہیں۔ یہ صورت حالات کیوں پیدا ہوئی؟ کیا قومی زندگی کی کچھ تحریکیں اور رجحانات ادب کی ترقی میں مزاحم ہوئے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو کس حد تک؟ ہم خود کہاں تک اس کے ذمہ دار ہیں؟ اور اس کا تدارک کیا ہے؟

کچھ دوست کہتے ہیں ادب میں جمود نہیں ہے۔ تصنیفات برابر ظہور میں آ رہی ہیں۔ دیکھئے فلاں افسانہ نگار نے وہ ناول لکھا۔ اس شاعر کا مجموعہ شائع ہوا۔ وہ ناشر برابر کتابیں شائع کر رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے میں نے یہ لکھا وہ لکھا مگر ان میں سے یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اب ادبی پیداوار پچھلے کے مقابلے میں زیادہ ہے یا کم اور جو کچھ لکھا بھی گیا ہے اس کا ادبی معیار کیا ہے۔ تاریخ ادب میں سنگ میل ہو سکنے کی بات چھوڑیئے۔ ان کتابوں میں کتنی کچھ عرصے تک بھی زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتی ہیں؟ اس پر فرماتے ہیں، حالات ناموافق ہیں، ماحول سازگار نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ بات یہ کہی جاتی ہے کہ جب زندگی فطرتاً ارتقا پذیر ہے اور ادب اس کا عکس ہوتا ہے تو وہ زوال پذیر کیسے ہو سکتا ہے؟ اس طرح یہ ادبی بحث فلسفیانہ بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے اور ساری حقیقتیں نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

زندگی فطرتاً ارتقا پذیر رہتی ہے اس میں شک نہیں لیکن کسی زبان کا ادب بھی ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے یہ بے بنیاد مفروضہ ہے۔ زندگی اور ادب کے خطوط ہمیشہ متوازی نہیں چلتے۔ اکثر اوقات یا تو اپنے حالات کی وجہ سے جو ادیبوں کے دسترس سے باہر ہیں یا ادیبوں کی اپنی کوتاہی اور کج روی کے سبب ادبی سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ ادیب زندگی سے اپنا رشتہ منقطع کر کے ذاتی تصورات کی دنیا میں جا بستا ہے اور وہ ادب کو فراموش کر کے محض

نتیجہ یا تعمیم کو مسرت یا کمال سمجھنے لگتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی اور ادب کا باہمی تعلق اُن کا ایک دوسرے پر عمل اور ردِ عمل کے طریقے بہت پیچیدہ ہیں جن کی کوئی مشینی تشریح درست نہیں ہو سکتی۔

جو لوگ سنجیدگی سے ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ حقائق ہی کو نہیں دیکھتے اُن کے اسباب و علل کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، نتائج نکالتے ہیں، اصول وضع کرتے ہیں اور اجتماعی زندگی اور ادب کے رموز و ابلاغ کو سمجھ کر ادب کے لئے ترقی کی راہیں متعین کرتے ہیں۔ ادب کے رجحانات اور میلانات اٹل تقدیر مبرم نہیں ہوتے۔ انہیں دانشمندی سے بدلا، سنوارا، ابھارا اور صحیح راستوں پر ڈالا جا سکتا ہے۔

اردو ادب کی موجودہ حالت تشویشناک ہے اور اس کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کرنا ضروری ہے۔ یوں ملک میں مشاعروں کی کمی نہیں۔ چھوٹے بڑے ادبی ادارے بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً جلسے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کانفرنسیں بھی ہوتی ہیں۔ سرکاری اور ریاستی حکومتیں کسی حد تک ادیبوں اور اداروں کی امداد اور ہمت افزائی بھی کرتی رہتی ہیں۔ کچھ لوگ حکومت سے شکوہ و شکایت بھی کرتے رہتے ہیں اور شاید یہ کام ہوتے رہنے بھی چاہئیں لیکن ان سب کی حیثیت ثانوی ہے۔ ادب کی ترقی محض ان چیزوں پر منحصر نہیں ہوتی (خواہ ذاتی طور پر ادیبوں کی ترقی ان پر منحصر ہو) ادبی ترقی حقیقت میں منحصر ہوتی ہے اعلیٰ پایہ کے ادب کی تخلیق پر اور یہ تخلیق منحصر ہوتی ہے کچھ حالات پر جو آج کل اطمینان بخش نہیں ہیں۔ آج پہلے سے لکھنے والے معروف شاعروں اور ادیبوں میں ضعف آ گیا ہے۔ ان میں سے اکثر لکھنا پڑھنا تقریباً ترک کر چکے ہیں۔ یا اگر کبھی کبھار لکھتے بھی ہیں تو تحریروں میں توانائی اور کوئی جدت نہیں ہوتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے اُن کا فکری ذخیرہ ختم ہو چکا ہے۔ جو ابھی دو چار رہ گئے ہیں اُن کی صحت پر خود اُن کو شبہ ہے۔ اس لئے اب جب کسی بات پر اظہار رائے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو اس میں عجیب طرح کا الجھاؤ ہوتا ہے اور اکثر اوقات پڑھنے والا بلاوجہ الجھنوں میں پریشان خیالی اور متضاد بیانی کا پتہ چلا لیتا ہے۔ فنی اعتبار سے اظہار بیان، اسالیب، تکنیک اور اصناف کے جو نئے تجربے پچھلے سالوں میں ہوئے تھے ان میں بھی دلچسپی کم ہو گئی ہے۔ انفرادی رنگ اور دلکشی و خلاقی کا ذوق، جس کے بغیر زندگی نہیں جھلکتا، اس میں حقائق اور کوشش پیدا نہیں ہوتی۔ شکست خوردہ سا ہو گیا ہے۔ جیسے ذہن میں ایک طرح کی بے دلی اور ٹھہراؤ آ گیا ہے۔

ایسے حالات میں سب سے بڑی کوشش ان بزرگوں کی یہ ہوتی ہے۔ کہ اپنے پچھلے ارشادات پر نظر ثانی کرتے رہیں یا اپنے اہم مسئلوں کی خدمات کی یاد تازہ کراتے رہیں۔ نئے حالات کی روشنی میں اپنے پیش کردہ نظریات کی تاویلیں کریں، نیز مطلق قارئین کی دل جوئی کے لئے کچھ نئے خیالات وضع کریں۔ خواہ وہ کتنے ہی سطحی کیوں نہ ہوں اور جب یہ نہ ہو سکے تو پھر باتوں سے لوگ زیادہ برہم نظر آئیں انہیں اپنی "غلطیوں" اور "انتہا پسندی" کے پردوں میں چھپا دیں۔ یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ ان کے فکر و خیال کے نئے زاویوں نے خود بخود اپنا راستہ بدل لیا ہے یا کہیں سے فہم و فراست کی کوئی نئی لہر آ گئی ہے بلکہ بات یہ ہے کہ حالات سے مجبور ہو کر ایسی باتیں کرنے کے سوا کوئی چارہ کار اب انہیں نظر نہیں آتا۔

اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ نئے ادیبوں کی پیداوار گھٹ گئی ہے۔ جن ادیبوں نے حال ہی میں لکھنا شروع کیا ہے اُن میں شاذ و نادر ایسی صلاحیتوں کا احساس ہوتا ہے۔ جن کی بنا پر مستقبل میں بھی اُن سے کوئی خاص توقعات وابستہ کی جا سکیں۔ پھر ادب کی اشاعت کی صورتیں بھی کم ہو گئی ہیں۔ اچھے ادبی رسائل دم توڑ رہے ہیں یا توڑ چکے ہیں۔ مکتبوں اور ناشروں کی کمی نہیں ہو گی۔ جو ہیں وہ ایسی چیزیں چھاپنا پسند کرتے ہیں جن سے جلد منافع حاصل ہو جائے اور اگر کسی ادیب یا شاعر کو کبھی معاوضہ دیتے بھی ہیں تو زکوٰۃ سمجھ کر۔ یہی حال کتابوں کے ناشرین کا ہے۔ انہیں اچھی کتابوں کی ادبی قدر و قیمت یا ادبی اہمیت سے اتنی غرض نہیں ہوتی جتنی اپنے منافع سے۔ لہٰذا وہ تیسرے درجے کی تصنیفات شائع کرنا پسند کرتے ہیں جن کے جملہ حقوق برائے نام قیمت پر حاصل ہو سکیں۔ کوئی مصنف بننے کا شوقین اپنی کتاب بالکل مفت نذر کر دے تو وہ اور بھی بہتر ہے۔ کچھ ناشرین کبھی کبھار اگر ایسے مستند ادیبوں کی کتابیں جن کی فروخت کے متعلق کسی اندیشے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا، شائع کرتے بھی ہیں تو اُن کے لئے رائلٹی دینا اور ادیب کے لئے حاصل کرنا ایک مستقل دردِ سر بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے ان سب باتوں سے اچھے ادب کی پیداوار پر بہت برا اثر نہیں پڑتا بلکہ قارئین کا ذوق مطالعہ بھی بُرے اثرات قبول کرتا ہے۔ لوگوں کو ناقص اور معمولی ادب پڑھنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

کبھی کبھی ان حقائق کو یہ کہہ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ یہ سب کچھ پہلے بھی ہوتا تھا۔ اس میں دور حاضر کی کیا خصوصیت ہے؟ اور

ایک مدت سے یہ بات محسوس ہو رہی ہے۔ مگر جتنا ادب پہلے بھی تخلیق اور شائع ہوتا تھا۔ ناشروں کی یہ ذہنیت بھی کچھ نئی نہیں ہے مجھے اس سے انکار نہیں۔ در اصل میں جس چیز کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پچھلے برسوں کی کمیت پسندی اور ناشروں کی خود غرضی کے دھاروں کے ساتھ اقتصادی تنگی بھی ہوگی اور ادبی صحت کے ساتھ ذوق کے معیار بھی بدلتے تھے اور اسی کے ساتھ ادب کا مستقبل بھی آنکھوں کے سامنے گھومتا تھا اب وہ رجحانات کمزور پڑ گئے ہیں اس لئے ادب بے سمت ترقی کی بجائے ایک طرح کے گرداب میں پھنسا ہے۔

کچھ لوگ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ اس کا ذمہ دار ادیبوں یا ماضی قریب میں ادبی رجحانات کو نہیں، دوسرے خارجی حالات کو ٹھہراتے ہیں کہتے ہیں پچھلے برسوں میں اردو کے لئے غیر معمولی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں جن کے سبب پڑھنے والوں کی ایک بڑی اکثریت کا ربط کسی نہ کسی صورت سے اردو سے منقطع ہو گیا، اقتصادی پریشانیاں، بیکاری یا کم از کم انہیں ترقی کی راہیں مسدود نظر آنے لگیں۔ ان باتوں کا اثر ادب کی تخلیق اور اشاعت پر بھی پڑنا لازمی تھا مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ یہ باتیں بھی ٹھوس حقائق پر مبنی ہیں۔ یہ ادب کی ترقی اور اشاعت پر اثر انداز ہوئی ہیں اور انہیں ہونا ہی چاہئے تھا۔ لیکن ادب کو نقصان پہنچانے والی صرف یہی چیزیں نہیں ہیں۔ کچھ اور بھی چیزیں ہیں جن سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اردو کے لئے مذکورہ دقتیں پچھلے چند برسوں میں پیدا ہوئی ہیں اور اب بھی فضا بدل رہی ہے جبکہ ادب میں غلط رجحانات اس سے کہیں پہلے سے موجود ہیں اور انہی رجحانات میں موجودہ جمود کی جڑیں پوشیدہ ہیں۔

میں پہلے بھی یہ بات کہیں لکھ چکا ہوں کہ موجودہ صدی کے ربع ثانی کے آغاز میں ہمارے ملک میں زندگی کے معاصر مسائل کو سمجھنے کی ایک بڑی وسیع خواہش محسوس ہوتی ہے۔ در اصل پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر حصول آزادی کے لئے جو بے پناہ جذبہ عوام میں پیدا ہو چکا تھا اس نے رفتہ رفتہ ایک نئی صورت اختیار کی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ سنجیدگی سے سوچنے لگا آزادی کے حقیقت میں معنی کیا ہیں؟ ہماری سیاسیات کا عالمگیر تحریکات اور حالات سے کیا تعلق ہے؟ وہ کس حد تک ایک دوسرے پر منحصر ہیں؟ مغرب اور مشرق کی تہذیبوں میں بنیادی فرق کیا ہے؟ انسانی راحت اور فلاح پر کس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ عمل زندگی میں روحانیات کا کیا مقام ہے؟ اقتصادی زندگی کے حقائق جذبات اور نظریات پر کس صورت سے اثر انداز ہوتے ہیں؟ قومی زندگی کی تشکیل میں فرد کیا رکھتا ہے؟

میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ اس وقت جو کچھ سوچا گیا وہ صحیح ہی تھا۔ سوچنے والوں کی نظر میں بھی طرح طرح کے حقائق تک پہنچنے سے قاصر رہیں۔ اس دور کے ادبی، فکری نظریات پر [illegible] بہت بڑی موجود ہیں۔ ایک دو کی نشاندہی کی جا سکتی ہے چند دوسری سطروں پر بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے مگر پھر بھی حقیقت یہ ہے کہ اس وقت لوگ سنجیدگی سے غور و فکر کرتے اور پڑھتے تھے، بصیرت حاصل کرنے کے لئے واقعات کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کون دنیا کیسے حرکت عمل دنیا کی حیات ہی کا شاخسانہ تھی۔ لوگ عمل سے کنارہ کشی اختیار کر کے تصورات کے عالم میں کھو جانے کے آرزومند نہیں تھے بلکہ وہ یہ جاننا چاہتے تھے کہ کن مقاصد کے لئے سرگرم عمل ہونا مناسب ہے۔ ہمارے اعمال و افعال کا زندگی پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟

قدرتی طور پر زندگی کی یہ کروٹ ادب کے لئے بہت سازگار ثابت ہوئی۔ اسی زمانے میں قوم کی مختلف زبانوں نے کئی بڑے ادیب پیدا کئے۔ اقبال اور پریم چند کا تخلیقی ادب بھی زیادہ تر اسی دور کی پیداوار ہے۔ ان ادیبوں نے ہم عصر رجحانات کی جدید اور مسائل پر اپنی ادبی تحریریں قائم کیں۔ انہوں نے اپنی نظر سے زندگی کو دیکھا سمجھا، اپنے مزاج کے مطابق نتائج نکالے اور انہیں قارئین کے سامنے پیش کیا۔ ادبی کام کو مشن سمجھ کر انہوں نے سنجیدگی سے دلچسپی لینا ہی [illegible] خصوصیت تھی ان ادیبوں کی۔ اسی لئے ان کا ادب فکری اور فنی اعتبار سے قدر کے قابل ہو پایا ہے۔

زندگی کی جس جھلک نے اردو میں اقبال اور پریم چند وغیرہ کے ادب کو جنم دیا اسی نے ترقی پسند مصنفین کے قیام اور کام کو ممکن بنایا۔ بالعموم نوجوانوں نے ادب کو مروجہ روایتوں سے پاک کرنے اسے زندگی سے قریب لانے اور انقلابی جدوجہد میں استعمال کرنے کے جوش میں اپنے چند رہنماؤں کی حسب خواہش اسے تمام کیا۔ چونکہ اس وقت ملک میں ماضی کی بہت سی باتوں سے بیزاری، واقعات کو سمجھنے کی خواہش اور آگے بڑھنے کا احساس موجود تھا اور انجمن کے اعلان کردہ مقاصد میں کوئی بات ایسی تھی نہیں جو عوام کی یا اعلیٰ ترقی کے خواہش مند طبقوں میں بددلی کا باعث ثابت ہو اس لئے کچھ مشہور ادیبوں اور نقادوں

قلم، جوانوں کی نیک خواہشات تحریک کے شریکِ حال ہو گئیں۔ پریم چند نے پہلی کانفرنس کی صدارت کی۔ اس کے قیام کو نیک فال سمجھا۔ اس کے حق میں کلمۂ خیر کہے۔ خلوصِ دل سے کہے۔ انجمن نے ایک قلیل عرصے میں اپنے لئے ایک ممتاز جگہ پیدا کر لی۔ آئندہ برسوں میں کم از کم اردو ادب پر اس تحریک کا گہرا اثر پڑا۔

رفتہ رفتہ انجمن نے اپنا سیاسی رُخ دکھانا شروع کر دیا۔ ادیب کی نظر سیاست کار کی نظر بننے لگی۔ سیاسی مقاصد کی ترجمانی اس کا مقصد بن گئی۔ اس کے جلسوں میں خالص سیاسی نوعیت کی قرار دادیں منظور کی جانے لگیں۔ اس طرح ادیب نے اپنا مقام کھو کر ایک اشاعت کار کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس کا کام دوسروں کی بتائی ہوئی باتوں کو اپنے ادب کے ذریعے قارئین تک پہنچانا رہ گیا۔ ادیب کی فنی صلاحیتیں محبوس ہو گئیں۔ علانیہ کہا جانے لگا کہ ادیب کی انفرادیت اس کے خیالات سے نہیں اس کے اندازِ بیان اس کے اسلوب سے قائم ہوتی ہے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ اراکینِ انجمن میں سے کچھ ان باتوں سے پوری طرح متفق نہیں تھے لیکن ان کی آواز دب گئی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو دوسری باتوں میں میانہ روی کے قائل ہوتے ہوئے بھی سیاسی مقاصد کے لئے ادبی تحریک کے استعمال کو اصولاً غلط نہیں سمجھتے تھے لیکن اس کا اظہار خلافِ مصلحت تصور کرتے تھے۔ کچھ نادانستہ طور پر یا ارزاں شہرت حاصل کرنے کے جذبے سے بے سوچے سمجھے ان کے ہم نوا ہو گئے۔ اگرچہ بظاہر ان کو سیاسیات میں ذرا بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے فضائے ادب میں ایک عجیب طرح کا خلفشار اور انتشار پیدا کر دیا۔ جو صلاحیتیں اور جوشِ طبیعت گیسوئے ادب سنوارنے میں صرف ہونا چاہئے تھا لا یعنی بحث و تکرار، باہمی رقابت، گروہ بندیوں اور سرگرمیوں میں صرف ہونے لگا۔ ادیبوں کی نظروں میں تنگی آ گئی۔ ان میں بے خوفی سے حق گوئی کی جرأت کم ہو گئی۔ ان کی زبانیں اور دل متضاد باتیں کہنے لگے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انجمن کی صفوں میں مخلص اور سمجھدار ادیب موجود نہیں تھے یا انہوں نے اپنے ہم مسلکوں کی بے راہ روی پر کبھی ٹوکا نہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ حالات کی روز افزوں ابتری کو روک نہیں پائے۔ یا ہو سکتا ہے انہیں بھی انجمن اور ادب کے مفادات لازم و ملزوم نظر آتے ہوں اور اس کے طریقۂ کار کی اصلاح کے سلسلے میں کوئی بڑا قدم اٹھانے میں کچھ دوسرے خدشات ذہن نشین ہوں۔ بہرکیف حقیقت کچھ بھی کیوں نہ ہو نتائج ہمارے سامنے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۶ء کے آس پاس جن نوجوانوں نے لکھنا شروع کیا ان میں کئی نہایت ذہین تھے۔ محسوس ہوتا تھا کہ ان میں اعلیٰ تخلیقی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ماحول کے محرکات انہیں نئی زندگی سے روشناس ہی نہیں کرا رہے تھے بلکہ ان کے دلوں میں لکھنے پڑھنے کی اُمنگ بھی پیدا کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ادب کے سرمایے میں کچھ قیمتی چیزوں کا اضافہ کیا۔ پچھلی نسل کے کچھ حساس ادیب بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔ اقبال اور پریم چند کی وفات کے کچھ عرصے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن جیسے جیسے سیاستِ عملی کا زہر ادب کی شریانوں میں سرایت کرتا گیا اس کے تار و پود متاثر ہوتے گئے۔ متوسط طبقے کے نوجوانوں کی جنسی بھوک نظم و نثر میں عنصرِ غالب بن کر نمودار ہونے لگی۔ کھوکھلی نعرہ بازی، انفرادی عصبیت، صحت مند روایات کے خلاف غیر دانشمندانہ بغاوت، وحشت انگیزی، محض تشکیک، ابہام، انتشار، سنجیدہ غور و فکر اور فنی ریاضت کی جگہ لینے لگے۔ خود ترقی پسندوں میں کئی ذہین نقاد موجود تھے۔ ان کا نئے ادیبوں پر اثر بھی تھا لیکن انہوں نے بھی صرف ناگزیر نکاتی باتیں کہیں۔ ادیبوں کو تحریک کے دوستوں اور دشمنوں میں منقسم تصور کر لیا۔ لہٰذا وہ معترضین کو ناشائستہ خطابات سے سرفراز فرماتے رہے اور دوستوں کی بدعنوانیوں کے خلاف پوری طاقت سے آواز بلند کرنے سے کتراتے رہے۔ ان کی گرم جوشی [illegible]

ایک دور ایسا بھی آیا جب یہ کہا جانے لگا کہ ادیب کا انقلابی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ انقلابی ہی عمل میں سرگرم عوام کے جذبات کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ جو ادیب عملی سیاست میں شریک نہیں ہیں ان کا ادب ناقص ہے۔ وہ متحرک زندگی کے حقائق پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ یہ بات تو ایک حد تک سمجھ میں آتی ہے کہ انسان زندگی کے جس پہلو کو زیادہ قریب سے دیکھتا ہے جس کے واردات خود اس پر طاری ہوتے ہیں اس کا بیان قابلِ وثوق بھی اسی کو ہونا چاہئے لیکن ان واقعات کی نوعیت اور اہمیت کو سمجھنے اور منتقل کرنے پر بھی اس کو قادر ہونا چاہئے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آنکھوں کے سامنے سے گزرنے والے واقعات کا تجزیہ کرنے اور انہیں وسیع ترجیحات کے پس منظر میں رکھ کر دیکھنے کے لئے کچھ ذہنی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ذہنی دنیا کے واردات کو زیبِ قرطاس کرنا بھی فنی قدرت اور مہارت چاہتا ہے۔ محض سیاسی ہنگامہ آرائی اور خامہ فرسائی سے کام نہیں چلتا

پھر یہی ہے کہ اچھا ادیب کسی قدر فاصلے پر رہ کر بھی اپنی تخیلی اور دوسری قوتوں کے سہارے واقعات کو اپنے ذہن میں زندہ کرنے اور ان کی صحیح تصویریں کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ادب اور سیاسیات کے باہمی روابط پر مختصر ذکر میں ایک حالیہ مضمون میں کر چکا ہوں۔ یہاں تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ اختصاراً اتنا عرض کر دوں کہ اگر سیاسی جماعتیں اپنے قومی ادب کو زندہ پانے اور ترقی کرتے دیکھنے کی تمنا رکھتی ہیں تو وہ اپنے عصری مقاصد کے لئے ادبی اداروں کا استعمال کرنا ترک کر دیں۔ ادیبوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی آزادیٔ فکر و بیان کو خارجی مقاصد پر قربان نہ ہونے دیں۔ ان کا اصلی فرض زندگی کو تنقید کے ذریعے صحیح راستے پر ڈالنا ہے۔ اس بڑے فرض کو تنظیم پرستی سے اوجھل نہ ہونے دیں۔ میدانِ ادب کو تمام دنیا کے سیاسی مہم بازوں کی جولاں گاہ بننے دینا ادیبوں کے شایانِ شان نہیں۔

ادبی سیاست بازی میں، جیسا کہ ذکر کر چکا ہوں، حالات بدلنے پر ادیب کو اپنے خیالات اور بیانات واپس لینا پڑتا ہے۔ اگر حالات میں کوئی بڑا انقلاب آجائے تو نقطۂ نظر کا بالکل ہی بدل جانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ آج تک ترقی پسند یہ نہیں بتا سکے کہ ترقی پسندی کیا چیز ہے۔ وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر ادب کو پرکھ کر ترقی پسندی کا پتہ چلایا جا سکتا ہے؟ شروع شروع میں ترقی پسندی کچھ عرصے تک عام غلط باتوں کے خلاف، کچھ بے ہودہ رسموں اور اصنافِ ادب کے خلاف علمِ جہاد بلند کرنے کا نام تھی۔ ان باتوں کی تقریباً تمام سیاسی جماعتوں میں اور ان کے باہر بھی ایسے لوگ تھے جو ان باتوں پر متفق تھے لیکن رفتہ رفتہ جب تفصیلات سے متعلق بحث ہونے لگی تو اختلافات رونما ہونے لگے۔ کچھ لوگ مسائل کے مادی اور اقتصادی پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دینے لگے، کچھ اخلاقی، روحانی اور مذہبی کو۔ اس طرح نظریات کے دھارے مختلف سمتوں میں بہتے نظر آنے لگے۔ ترقی پسندی عموماً ادب کی مارکسی تفسیر سمجھی جانے لگی۔ مارکس اور اینگلز کے اقوال سے متعلق بھی دنیا بھر میں اختلافاتِ رائے موجود ہے جن کی تفصیل زیادہ تر کچھ باتوں پر کم روشنی ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ ترقی پسندوں کی صفوں میں بھی ایک حد تک اختلاف رہا۔ مگر پھر بھی ترقی پسندی عموماً ایک مخصوص سیاسی جماعت کے کھینچے ہوئے خطوط پر چلتی رہی۔ اس لئے ترقی پسندوں کے موجودہ اخلاقی بگاڑ کے اسباب بھی سیاسیات میں تلاش کرنے چاہئیں۔ اس کی زیادہ تر جڑیں وہیں ملیں گی۔

میں یہ مانتا ہوں، اور میں نے لکھا بھی ہے کہ اپنے چند نظریات کے ذریعے مارکس نے انسانی علم میں قیمتی اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر کوئی ادیب مارکس کے ان نظریات کو اپنے تجربوں کی بنا پر صحیح سمجھتا ہے۔ زندگی کے تجربات میں اسے ان کی صحت کی شہادت ملتی ہے اس لئے ان کا قائل ہے تو اس کی تحریرات میں یقیناً ان کو اہمیت حاصل ہوگی۔ ایسی صورت میں اس کے قول اور عقیدے میں کوئی تضاد نہیں ہوگا اسے ایسا سوچنے سمجھنے کا پورا حق حاصل ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ادیب کو نظریات کی روشنی میں زندگی کو دیکھنا شروع نہیں کرنا چاہئے۔ زندگی کی روشنی میں نظریات کو پرکھنا اور رد یا قبول کرنا چاہئے کیونکہ زندگی سے نظریات پیدا ہوتے ہیں اور زندگی ہی سے ان کے صحیح یا غلط ہونے کا علم ہوتا ہے۔ جو ادیب نظریے کی روشنی میں زندگی کو دیکھتا ہے وہ خیال پرست ہو جاتا ہے۔ جو میکانکی طور پر نظریے اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کرنے لگتا ہے۔ اور اس کا ادب بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگی ایک متحرک چیز ہے اس میں حیرت انگیز تنوع ہے اور بے پناہ صلاحیت ہے نشوونما کی۔ وہ آج تک بے شمار نظریوں اور عقیدوں کو باطل ثابت کر چکی ہے۔ مارکس کے نظریات میں اس گہرائی کے باوجود انہیں انسانی علم کا حرفِ آخر تصور کرنا ایک مغالطہ خیز بلکہ مہلک حرکت ہے۔ جماعت بندی حق شناسی کی قوتوں کو سخت نقصان پہنچاتی ہے کیونکہ انسان کے خیالات کو فرقہ داری کے قالب میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ پھر جماعت کو مقبول رکھنے کے لئے قدم قدم پر لوگوں کی ناخوشی اور خوشنودیٔ مزاج کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔
اس کی ایک مثال میں پیش کرتا ہوں۔ ایک زمانے میں کچھ دوست محض نیک نیتی اور خلوص پر انسان دوستی کو منحصر تصور نہیں کرتے تھے۔ وہ ان متعلقہ باتوں کا زندگی پر اثر دیکھتے تھے اور اسی واسطے ان باتوں کی افادیت اور مضرت کا اندازہ لگاتے تھے۔ اصولاً اس میں کوئی قباحت بھی نظر نہیں آتی۔ لیکن ظاہر ہے کہ روحانیات کے قائل لوگ جن کا مشرق کے اکثر ملکوں کے سماج پر آج تک بھی بڑا اثر ہے۔ زندگی میں دل کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور واقعات کی صداقت کے لئے ایسی تحقیق کرتے ہیں جو ان سے متعلق نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کو ہمارے ملک میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انہیں ان دوستوں کا تجزیہ غلط معلوم ہوتا تھا کیونکہ اس سے اکثر اوقات ان کے عقیدے کے خلاف نتائج نکلتے تھے اور علماء اور گوشہ نشینوں کی حیثیت کم ہو رہی تھی۔ چنانچہ اب ان دوستوں

نے اس حقیقت کو چھوڑ کر افادیت اور ترقی پسندی کا معیار انسان دوستی کو قرار دے دیا۔ جو انسان دوستی پہلے ایک مبہم تصور سمجھی جاتی تھی، اب ادب کی افادیت اور اہمیت ناپنے کا پیمانہ بن گئی۔

مشکل کی بات یہ ہے کہ یہ خیال کرنا کہ ہم بہت مدت سے جو باتیں کہتے ہیں لوگ ہماری باتوں کو الہام اور وحی سمجھ کر ایمان لے آئیں گے محض خود فریبی ہے۔ آج کا انسان بہت بیدار ہو چکا ہے۔ وہ اپنے رہنماؤں کے لبوں کی حرکت ہی کو نہیں دیکھتا ان کے شعور اور تحت الشعور میں بھی جھانک کر دیکھتا ہے۔ دور حاضر کے انسان کو مطمئن کرنے کے لئے بہت دماغ سوزی کی ضرورت ہے۔ انہوں نے تو غالباً سمجھا اب قصہ پاک ہو گیا۔ پہلا تو یہی ہوا کہ اس نے اختلاف پیدا کر دیا۔ ملکی ادبی رجحانات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والے کو اس انسان دوستی نے نئی الجھنوں میں ڈال دیا۔ اس کے ذہنی افق پر کئی چیزیں مثلاً قول، نیت، اثر گردش کرنے لگیں۔ وہ سوچنے لگا آخر انسان دوستی سے ان کی مراد کیا ہے۔ انسان دوستی کا انحصار کسی شخص کے قول پر ہے یا اس کے محسوسات اور اس کے حرکات پر؟ یا اس بات پر کہ اس نے جو کچھ کہا ہم عصر سماج پر اس کا کیا اثر پڑا؟ انسان کیا کہتا ہے یہ جاننا تو قدرے آسان ہے مگر یہ سمجھنا کہ وہ ایسا کیوں کہتا ہے کن جذبات کے زیر اثر وہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے کسی قدر مشکل ہے۔ یہ سمجھنے کے لئے ہمیں نفسیاتی تجزیے سے کام لینا ہوتا ہے اور نفسیاتی بصیرت کے بغیر ممکن نہیں۔ بہر کیف اگر کسی نہ کسی صورت سے ادیب کے ذہنی تہ خانوں کے دھندلکوں میں بھی جھانک لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادیب کن حالات کے سبب ایسا سوچنے اور محسوس کرنے پر آمادہ یا مجبور ہوا۔ اس منزل پر سماجی تقاضوں اور ذاتی افتاد کے درمیان حد فاصل کھینچ کر اس کی بے غرضی اور خود غرضی، ایمانداری اور خلوص نیت کا تعین کرنا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کی انسان دوستی یا دشمنی کے بارے میں کچھ کہنا محال ہے۔ فرض کیجئے ہمیں ادیب کے خلوص نیت پر بھی کوئی شبہ نہیں مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے ادب نے بحیثیت مجموعی انسانی زندگی پر اچھا اثر نہیں ڈالا تو ایسے ادیب کو انسان دوست کہنا کہاں تک صحیح اور مناسب ہوگا؟

پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان دوستی کہنا آسان ہے اس کا ادب میں برتنا بہت دشوار ہے۔ زندگی ایک پیچیدہ حقیقت ہے اور انسانی دماغ کا عمل اس سے بھی پیچیدہ تر۔ جب تک انسان دوستی کا کوئی واضح اور سائنٹفک تصور پیش نظر نہ ہو یہ بے معنی بات ہے اور ادب میں سیاسی نعروں کی طرح اس کا استعمال کرنا روشنی نہیں تاریکی پیدا کرتا ہے۔ جس میں ٹٹولتے پھرنے سے کچھ ہاتھ نہیں آتی۔

اس ضرورت کے تحت اب کلاسیکی ادب کے بارے میں بھی اپنی پچھلی کہی ہوئی باتوں پر نظر ثانی کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے، مارکس نے مادی زندگی اور شعور کے باہمی روابط کو چند موثر ادیبوں پر منطبق کرتے ہوئے بھی واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ ادیب کے ذہن پر زندگی اور اس کی کشمکش کا عمل جن پیچیدہ طریقوں سے ہوتا ہے اور انسانی شعور کو متاثر کرتے ہیں، ادب کو جو اہمیت حاصل ہے اسے تسلیم کرتے ہوئے بھی اس نے جو یہ کہا تھا کہ ادب کا تعلق شعور سے ہے اور شعور بحیثیت مجموعی اوپری ڈھانچے میں، بدستور اقتصادی ڈھانچے کا ساتھ دیتا رہا ہے، اس کے پیش نظر ایک زمانے میں کچھ ترقی پسند دوستوں نے (سب نے نہیں) قدیم ادب پر غلط حکم لگانے شروع کر دیئے تھے۔ اسے رجعت پرستانہ اور ناقابل اعتنا قرار دیا گیا۔ جن لوگوں کی نظر میں اپنے قدیم ادبی سرمائے کی بڑی قیمت تھی، جو اسے صدیوں کے فنی تجربوں کا نچوڑ سمجھتے تھے اور کلاسیکی شہکاروں کو انسانی فکر کی بلند ترین چوٹیاں تصور کرتے تھے انہیں یہ بات خطرناک حد تک مضحکہ خیز معلوم ہوتی رہی تھی۔ چنانچہ جو لوگ قدیم اساتذہ کے احترام سے معمور تھے وہ بھڑک اٹھے۔ ظاہر ہے کہ جو باتیں کی جا رہی تھیں وہ زیادہ تر محض جذباتی تھیں چنانچہ ان باتوں سے اکثر کی جذباتیت کھل گئی۔ ابتدائی دنوں میں جو بدمزگی پیدا ہو گئی تھی وہ باقی رہی۔ ترقی پسندوں کی تحریک پر اس کا گہرا اثر پڑا۔ دوسرے خارجی حالات بدل گئے اس سے ان دوستوں کو اس سلسلے میں بھی اپنا انداز گفتگو بدلنا پڑا۔

لگتا ہے کہ کلاسیکی ادب کے بارے میں ان کا نظریہ نہ پہلے صحیح تھا، نہ اب صحیح ہے۔ پہلے وہ جذباتیت کا شکار تھے اب مصالحت کا شکار ہیں جبکہ ادب کی قدریں نہ جذباتیت سے متعین ہو سکتی ہیں، نہ صلح صفائی کی اسپرٹ سے۔ اس کے لئے تو وسعت نظر اور سائنٹفک تجزیے کی ضرورت ہوتی ہے۔ قدیم ادب کے متعلق کسی فیصلے میں اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت وقت اور محنت چاہتی ہے۔ فی الحال شاید اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ قدیم ادب جو ہم تک

رہتا ہے جو سیکڑوں ہزاروں برس کے طوفانوں سے گزرتا چلا آیا ہے۔ اگر آج بھی اس میں وہ تازگی محسوس ہوتی ہے تو وہ کچھ فکری اور فنی خوبیوں کا حامل ضرور ہے۔ اس کی عظمت اور اہمیت کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ کسی قوم کا قدیم ادب اس کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے۔ جس میں مختلف زمانوں میں اس قوم کی زندگی، اس کے خیالات و جذبات اور تہذیب و تمدن کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ وہ ایک عجیب و غریب لذت کا بھی سرچشمہ ہوتا ہے۔ اس سے نظر کو دلکشی اور روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر دور کا کلاسیکی ادب اپنے ہم عصر سماج کی خوبیوں ہی کی نہیں خامیوں کی تصویریں بھی پیش کرتا ہے۔ اس میں انسانی روح کی فتح و شکست دونوں منعکس ہوتی ہیں۔ اس میں جہد حیات بھی ہوتی ہے، کشمکش حیات سے فرار بھی۔ اس میں وہ مقامات بھی آتے ہیں جہاں ادیب کی نظر ماحول کی تاریکی کو چیر کر نئی راہ و صبح نکالتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور ایسے مقام بھی آتے ہیں جہاں نگاہ زندگی کی تاریک راہوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ انسانوں پر کلاسیکی ادب کے اچھے برے دونوں طرح کے اثرات پڑے ہیں اور پڑتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ میں نے محض اثر کا ذکر کیا ہے نیت کا نہیں۔ نیت کی نظر سے دیکھا جائے تو شاید ہی ایسی مثالیں مل سکیں جہاں ادیبوں نے شعوری طور پر لوگوں کو گمراہ کرنے یا انہیں راحت و مسرت سے محروم کرنے کی کوشش کی ہو۔ البتہ ایسی شاعری کی کمی نہیں جہاں خلوص نیت کے باوصف ادیبوں نے عوام کی صحیح راہ نمائی نہیں کی۔ اُن کے سامنے غلط تصورات کو اہمیت دے کر پیش کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں دوسری چیزوں کے سمجھنے میں کسی قدر دشواری پیش آئے لیکن قصیدوں کے اس انبار میں جو سلاطین اور امراء کی بے بنیاد اور غلط مدح طرازی کے لئے معرض وجود میں آیا اس کی ایک بیّن شہادت موجود ہے۔ شعوری طور پر نہ سہی مگر اس قصیدہ گوئی کا مقصد کم از کم غیر شعوری طور پر ضرور شاہ پرستی کے کردار اور قوت سے لوگوں کو مرعوب کیا جائے۔

کچھ لوگ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے لیکن وہ کہتے ہیں کہ ادب میں ہمیشہ ایک لہر ملتی ہے جس سے نظام زندگی اور داب و استبداد کے خلاف ان کے اہل و کردار کے خلاف ایک طرح کے احتجاج کا پتہ چلتا ہے۔ یہ بات بے بنیاد نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ادب کسی نہ کسی صورت سے زندگی کی ہمیشہ ترجمانی کرتا ہے۔ اور خواص کے ساتھ ساتھ عوام کے جذبات بھی اس میں بار بار جھلکتے رہے ہیں۔ عوام کی راحت و مسرت، ان کے غم و الم، ان کی امنگیں اور تمنائیں، مایوسی اور بیزاری سب کی پرچھائیاں ادب میں موجود ہیں۔ اونچے طبقے کے تعیش و استبداد پر وقتاً فوقتاً زہریلے تیر بھی برسائے گئے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو بحیثیت مجموعی یہ احتجاج عالمگیر عمومی حقائق کی صورت میں نظر آئے گا جس سے عملی طور پر اعلیٰ طبقہ کی عیش طلبی، خود رائی اور خود غرضی کی روش پر بہت کم اثر پڑا ہے۔ البتہ عوام کو صبر و شکر کا درس برابر ملتا رہا۔ تکلیف، پریشانی اور مایوسی کے عالم میں زندگی کے حقائق سے فرار میں مدد بھی ایسے ادب سے ملتی تھی۔ آدمی اپنے غم کو عالمگیر غم سمجھ کر ایک طرح کا ذہنی سکون ضرور محسوس کر لیتا تھا۔

اگر ترقی پسندی کے معنی سماجی ترقی کو ادب کے ذریعے تقویت پہنچانا ہیں تو سماجی ترقی کی وضاحت کے بغیر کلاسیکی ادب میں اس کی تلاش ایک بے معنی بات ہے وجہ یہ ہے کہ آج انسانی ترقی کا تصور بہت کچھ بدل گیا ہے۔ کلاسیکی ادب جس ماحول کی پیداوار ہے اس میں انسانی ترقی سے مراد روحانی ترقی ہوتی تھی جو عموماً زندگی کی مادی ترقی کے خلاف پڑتی تھی۔ مادی طور پر اس کے باوجود زندگی ارتقا پذیر رہی یہ بات الگ ہے۔ مادی زندگی کے تقاضے کہیں کہیں روحانی نظریات سے ٹکراتے ہوئے بھی محسوس ہوتے ہیں لیکن عام فضا اس وقت روحانیات ہی کی تھی۔ روحانی نظریے ہی اس زمانے کے رائج سکّے تھے۔ لہذا اس وقت روحانی مسائل ہی ادب کا غالب رجحان رہے۔

اس ضمن میں شاید فارسی اور اردو کے تصوف زدہ شاعروں اور ہندی کے سنت کویوں کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔ ان تحریکوں کے اہم شاعروں کے کلام میں جو حلاوت ہے اُس سے انکار کرنا بھی جذبۂ دل کو بے نقاب کرنا ہے۔ ان کے یہاں جا بجا زندگی کے چند تلخ حقائق کی غمازی ملتی ہے اور ہم پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری کرنے کی صلاحیت بھی ان میں ہے۔ لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ زندگی کو کس نظر سے دیکھتے تھے تو ان کی روایت پسندی سے

کون انکار کر سکتا ہے؟ تصوف کی شاعری فنا فی اللہ ہونے اور بھگتی دھارا کی کویتا نراکار یا ساکار ایشور سے جا ملنے کی تلقین کرتی ہے۔ اسی عمل کے واردات اور والہانہ ذوق کے سہارے اُن کی شاعری کا جادو چلتا ہے۔ وہ دنیوی زندگی کو وہ غیر حقیقی، ناقابلِ اعتنا اور حجاب سمجھتے تھے۔

اس کے باوجود قوموں کا قدیم ادب ان کا ایک نہایت گراں قدر ورثہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے قومیں فخر سے اپنا سر بلند کرتی ہیں۔ وہ اس بات پر ناز کرتی ہیں کہ ہمارے ادب نے ملکی اور قومی حدود پار کر کے دور دراز خطوں میں علم و تہذیب کے چراغ روشن کئے ہیں۔ قوموں کے مزاج بنانے میں مدد دی ہے۔ اگرچہ ادب کی فکری اور فنی روایات امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں مگر اس کے وہ عناصر جو انسان کی عالمگیر فطرت سے ہم آہنگ ہیں آج بھی اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ قدر کی نظر سے دیکھے جانے کے مستحق ہیں۔ قدیم ادب کے جو رجحانات ارتقا پذیر زندگی سے ٹکراتے ہیں ان کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا کوئی دانش مندی نہیں ہے اس سے ادب کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

ادب کی تاریخ میں کبھی کبھی ایسے دور آتے ہیں جب ادیب کا منصب اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ موجودہ دور بھی ایسا ہی ایک دور ہے۔ ہم نے اپنے اعلیٰ مقاصد کیوں فراموش کر دیئے اس کا کچھ ذکر ان سطروں میں کیا گیا ہے لیکن غالباً یہ صورتِ حالات بھی عارضی ثابت ہوگی۔ اردو ادب اب تک برابر آگے بڑھتا رہا ہے وہ آج بھی تیزی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے موجودہ مسائل حل کرے۔

امراؤ جان ادا

اردو ادب میں سب سے دلچسپ اور
سب سے معیاری ناول اگر کوئی ہے تو وہ صرف
امراؤ جان ادا ہی ہے۔ یہ ایک بیسوا کی داستانِ
حیات ہے جسے مرزا رسوا نے لکھ کر غیر فانی
شہرت حاصل کر لی اور ادا کے کردار کو بھی لافانی
کرداروں میں شامل کر دیا۔ اس ناول کو اگر زبان
کے اعتبار سے ہی پڑھا جائے تو بہت کچھ
سیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ناول اپنی تمام تر دلچسپی
کے ساتھ لکھنوی معاشرت کا مرقع بھی ہے۔
خورشید الاسلام کا معرکۃ الآرا دیباچہ بھی اس
کتاب کی زینت ہے۔ قیمت -/۴

بازارِ حیات

یہ احمد ندیم قاسمی کے خوبصورت
افسانوں کا نیا مجموعہ ہے۔ قیامِ پاکستان کے
بعد جتنے معیاری افسانے ندیم نے لکھے ہیں
اتنے اور کسی افسانہ نگار نے نہیں لکھے۔
اس مجموعے میں ان کے وہ تمام
"تازہ افسانے شامل ہیں جن پر ندیم کو اور
اردو افسانے کو فخر ہونا چاہئے۔
افسانوی ادب میں یہ مجموعہ ناقابلِ
فراموش ہے۔
کتابت و طباعت نہایت عمدہ
قیمت ۳/۸

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

آزاد نظم، غزل اور ترقی پسند شاعری

ڈاکٹر محمد حسن

آج کی شاعری کے بارے میں اِن دنوں تین باتیں عام طور پر کہی جاتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ آزاد نظم کا زوال ہو چکا ہے۔ اس دور کے سرپھروں نے وزن اور بحر کے جو الٹے سیدھے تجربے کئے تھے وہ سراسر احمقانہ تھے اور ان کا یہی انجام ہونا تھا۔ چھوٹے بڑے مصرعے لکھنا شاعری نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ آج کی شاعری غزل کی طرف واپس لوٹ رہی ہے۔ غزل کا احیا شروع ہو چکا ہے۔ غزل کے قائل یہ بھی کہتے ہیں کہ یہی دراصل مناسب اور موزوں ادبی میلان ہے اور ادھر ادھر بھٹکنے کی بجائے سیدھی سادی غزلیں کہنا اور ان پر قدرت حاصل کرنا ہی بہت کافی ہے۔

تیسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ ترقی پسندوں نے ادب میں سماجی شعور کی جو بات اٹھائی تھی وہ سراسر بکواس تھی۔ شاعر کو سماجی بصیرت، فکر یا نظام وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اسے تو بس یہ کرنا چاہئے کہ جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے اسے پورے خلوص کے ساتھ بیان کر دے۔

یہ تینوں بیانات مختلف حلقوں میں مختلف طریقوں سے سننے میں آتے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ ان سب بیانات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے لیکن یہ سچائی ادھوری اور ناتمام ہے اور ادھوری سچائی اکثر جھوٹ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے کیونکہ جھوٹ کا فریب آسانی سے ظاہر ہو جاتا ہے، ادھوری سچائی کا فریب مشکل سے دور ہوتا ہے۔

(۱)

اب پہلے بیان کو لیجئے "آزاد نظم کا زوال ہو چکا ہے"۔ اگر زوال سے یہ مراد ہے کہ اب آزاد نظم غالب صنفِ شعر نہیں رہی ہے اور جس طرح ایک زمانے میں اس نے دانشوروں کی تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کر لی تھی وہ کیفیت ختم ہو چکی ہے تو اس بیان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں۔ اچھی آزاد نظمیں ہمیشہ کم لکھی گئی ہیں اور اب آزاد اور معریٰ نظمیں تو اچھی ہوں یا بری بہت کم رسالوں میں نظر آتی ہیں، لیکن کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آزاد اور معریٰ نظم صنف کی حیثیت سے بری ہے اور وہ تجربہ جسے چند نوجوان شعراء نے شروع کیا تھا سراسر احمقانہ تھا؟ آزاد اور معریٰ نظموں کی مقبولیت کم ہو جانے کے یہ معنی تو نہیں ہو سکتے کہ ہم صنفِ شعر کی حیثیت سے انہیں مردود قرار دے کر پھانسی کے تختے پر لٹکا دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آزاد نظم محض ذریعۂ اظہار ہے اور کوئی ذریعۂ اظہار فی نفسہٖ اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ زبان سے لوگوں کی توصیف و تعریف بھی کی جاتی ہے

اور ان کو گالیاں بھی دی جاتی ہیں۔ الفاظ کی مدد سے دوستی اور محبت کے پاک رشتے بھی قائم کئے جاتے ہیں اور ذاتی جھگڑے میں بھی الفاظ کام آتے ہیں۔ اس بنا پر زبان یا الفاظ کے وجود ہی کو ناپاک قرار دینا کہاں کی عقلمندی ہوگی؟ آزاد نظم بھی اسی قسم کا ذریعۂ اظہار ہے۔ شاعری میں ذریعۂ اظہار عام طور پر دو وجوہ سے زندہ رہتے ہیں۔ یا تو انہیں قبولِ عام کی سند مل جائے یا وہ اپنے عہد کے فکری اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ دراصل یہ ایک ہی بات کی دو شکلیں ہیں لیکن کبھی کبھی فوری قبولِ عام کو شعر و تنقید کا معیار سمجھ لیا جاتا ہے۔ ہر چلتی ہوئی چیز سکہ نہیں ہوتی اور ہر اقلیم کی طرح شاعری اور فن میں بھی نئے سکے چلانا بڑی ریاضت کا کام ہے جو عام طور پر عظیم فنکاروں ہی کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔

اگر سرسری طور پر بھی آزاد نظم کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس کی تخلیق خیالات، تلمیحات اور روایات کے بندھے ٹکے ڈھرے سے بچ نکلنے کی کوشش کی مرہونِ منت تھی۔ آزاد اور معریٰ نظم اسالیبِ اظہار کی سکہ بندی سے گریز کی کوشش تھی۔ قافیہ کا کھٹکا اپنے ساتھ قدیم اساطیر، استعارے اور تشبیہات کی ایک دنیا لئے کر چلتا ہے۔ اس سے آزاد نظم نے دامن بچانا چاہا۔ مثال کے طور پر بہار کا بیان کرتے ہوئے اگر شاعر بہار آئی کے قافیے کے ساتھ خیالات نظم کر رہا ہے تو بہت ممکن ہے کہ اس کا ذہن قافیے کی تلاش میں "تماشائی" تک پہنچے اور ہماری شاعری کی بندھی ٹکی روایت اسے مہر و ماہ تک لے اڑے اور وہ بہار کا خارجی نقشہ کھینچنا بھول جائے اور ہوا کی مستی، سبزے کی لہلہاہٹ اور پھولوں کی خوشبو کا یا تو سرے سے ذکر ہی نہ کرے اور اگر کرے بھی تو تشبیہ و استعارے سے اس طرح مزین کر دے کہ اس کی بیان کی ہوئی بہار سودا اور انشا کا تو کیا ذکر قاآنی اور عرفی کی بہار سے بہر طور مختلف نہ ہو۔ اس الزام سے ہمارے بڑے سے بڑے شاعر خود غالب کے کلام میں یہ خارجی منظر روایتی اسلوب کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

اس کا یہ مطلب نہیں کہ قافیہ اور ردیف کی پابندی میں رہ کر کوئی شاعر اسلوبِ اظہار اور اندازِ فکر کی قدیم سکہ بندی سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ یہ کام اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ قافیہ بجائے معنی کا پابند ہونے کے معنی کا رہنما ہو جاتا ہے۔ آزاد اور معریٰ نظم نے اردو شاعری کو اس سکہ بندی سے نکالنے کی کوشش کی تھی اور یہ کوشش بیک وقت بڑی مستحسن بھی اور بڑی دشوار بھی۔

مستحسن اس وجہ سے کہ اس طرح ہمارے شاعر ان عام تشبیہوں، پامال تلمیحوں اور فرسودہ مضامین کی دلدل سے کچھ باہر نکلے۔ یہ وہ مضامین تھے جنہیں دہرانے کے لئے کسی انفرادیت، ذاتی فکر و کاوش یا مطالعے اور محنت کی ضرورت نہ تھی۔ آزاد اور معریٰ نظم سے کم سے کم ہمارے شاعروں کو یہ فکر تو ہوئی کہ انہیں اس سکہ بند خیال کے دائرے سے باہر نکل کر کچھ کہنا ہے اور فرسودہ انداز سے الگ ہو کر قدیم وزن و قافیے کی ترتیب سے ہٹ کر کہنا ہے۔

دشوار اس لئے کہ اسالیبِ بیان کا حسن اور ترنم، موسیقی اور گیت اردو شاعری میں صدیوں سے قافیے کے ذریعے ظاہر ہوتا آیا ہے۔ اب اس ترنم کی جگہ پر دوسرا انداز استعمال کرنا اور اس طرح استعمال کرنا کہ شاعری شعریت اور موسیقی سے محروم نہ ہو بڑا دشوار کام تھا۔ ابھی تک موسیقی اور قافیہ کو مترادف الفاظ سمجھا گیا تھا۔ شاید اب بھی ایسے لوگ موجود ہوں گے جو قافیہ ہی کو موسیقی سمجھتے ہیں اور اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قافیہ نظم میں موسیقی پیدا کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے، خود موسیقی نہیں ہے۔ یہ ذریعہ بڑا پرانا اور بے حد مقبول ہے لیکن اس کے علاوہ دوسرے ذرائع بھی ممکن ہیں اور انہیں اختیار کرنا کفر نہیں بشرطیکہ نظم کی موسیقی میں فرق نہ آئے۔

آزاد اور معریٰ نظم نگاری نے خیال اور تصور کی اہمیت واضح کی۔ شاعر کے انفرادی خیال اور تصور کو شاعری کے لئے ضروری قرار دیا اور بات یہ ہے کہ ہمارے شعرا اس جھونک میں انفرادیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے لگے۔ آزاد نظم لکھنے والوں کو یہ بھی سوچنا پڑا کہ صرف نظم کی ظاہری ٹیپ ٹاپ اور لفظوں کا اچھی طرح صرف ہونا یا بندش کی چستی، صحتِ زبان اور تشبیہ و استعارے کی سجاوٹ ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اس نظم میں شاعر نے براہِ راست اپنے تجربے کو بیان کیا ہے یا کہیں سے مستعار لیا ہے۔ اس کا بنیادی تصور کیا ہے؟ اس کا مرکزی خیال یا احساس کیا ہے؟ یہ بات اردو ادب

میں پہلی بار ہمیں کہی گئی تھی۔ "آبِ حیات" "مقدمۂ شعر و شاعری" "شعرالعجم" اور "کاشف الحقائق" شاہد ہیں کہ پہلے بھی اسے دہرایا جا چکا تھا اور اقبال تک آتے آتے نہ جانے اس پر کتنے عمل کرنے والے شاعر گزر چکے تھے۔ پھر بھی آزاد نظم کی ابتدا کے وقت اس یاد دہانی کی شدید ضرورت تھی۔ یہ یاد دہانی بروقت بھی تھی اور انقلابی انداز کی بھی تھی۔

آزاد اور معریٰ نظم نگاری ایک اور لحاظ سے بھی بابرکت ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ نئے تجربے اردو شاعری کے اسلوب کو تشبیہ و استعارہ اور مرصع کاری سے نجات دلا کر خارجیت، بیانیہ انداز اور سادگی کی طرف رجوع کر سکتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات کے دیباچے میں فارسی اور بھاشا کی انشاپردازی کا جو موازنہ کیا تھا وہ آج بھی بڑی حد تک ہماری شاعری پر منطبق ہوتا ہے:

> "فارسی اور اردو کی انشاپردازی میں جو دشواری ہے اور ہندی کی انشا میں جو آسانی ہے اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے۔ وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے اس کی کیفیت ہمیں اس خوش حالی سے سمجھاتی ہے جو خاص اسی شے کے دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغے کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزا آتا وہ سننے سے آجاتا ہے۔
>
> —— برخلاف شعرائے فارس کے کہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں صاف اس کی برائی بھلائی نہیں دکھاتے بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا برا سمجھا ہوا ہے اس کے لوازمات کو شے اوّل پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ . . . . غرضکہ اب ہماری انشاپردازی ایک پرانی یادداشت ان تشبیہوں اور استعاروں کی ہے کہ صدہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دستمال ہو کر ہم تک میراث پہنچی ہے۔"

سادہ نگاری مشکل کام ہے۔ سادگی کا حسن شعر کاری کی آخری معراج ہے۔ اگر آزاد نظم کی زبان پوری طرح روزمرّہ اور سادہ زبان نہ ہو سکی لیکن پھر بھی مرصع کاری اور تشبیہ و استعارہ زدگی سے شاعری بچ نکلی تھی۔ یہ وہ خصوصیات تھیں جو ابھی تک اردو شاعری کے اکثر ادوار میں بدقسمتی کی طرح اس پر سوار رہی ہیں۔ علاوہ بریں ہر چیز کو داخلی انداز میں قدیم مرصع کاری کے ساتھ بیان کرنے کا التزام بھی کچھ کم ہوا اور بیانیہ اور خارجی انداز کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ خارجیت، غیر مبہم بیان میں شعریت پیدا کرنے کا کام شروع ہوا۔

آزاد نظم کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کی ابتدا کرنے والوں کو امام سمجھ لیا گیا اور ان کی رائج کی ہوئی صنف کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوبِ سخن اور انداز نگارش بھی لازم و ملزوم سمجھے جانے لگے۔ یہاں اس بحث میں پڑنا بے سود ہے کہ آزاد اور معریٰ نظموں کی ابتدا تصدق حسین خالد نے کی یا ن م راشد نے یا کسی اور نے، لیکن اس میں شک نہیں کہ راشد اور میراجی کا نام جس طرح اس صنف سے وابستہ ہو گیا ہے اس نے غیر ضروری طور پر اسے نقصان پہنچایا ہے۔ اس سے ان شعراء کی تنقیص مقصود نہیں لیکن یہ سمجھنا یقیناً غلط ہے کہ آزاد نظم میں صرف اسی قسم کے خیالات کا اظہار ممکن ہے جو راشد اور میراجی نے ظاہر کیے۔ جو لوگ یا تو ان خیالات سے متفق نہیں تھے یا انہیں سمجھنے سے معذور رہے انہوں نے ان خیالات کو ناپسند کرنے کے ساتھ ساتھ آزاد نظم کو بھی مردود قرار دے دیا۔

اس طرح آزاد نظم کے ساتھ انفرادی مزاج اور مردم بیزاری کی فضا منسلک ہو گئی۔

یہاں دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہماری شاعری میں آزاد اور معریٰ نظم کے چلن کو انگریزی اور فرانسیسی ادب کی FREE VERSE سے وابستہ سمجھ لیا گیا ہے۔ یہ بات آسانی سے نظرانداز کر دی جاتی ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی ادبیات میں عہدِ جدید سے قبل بھی بلینک ورس کا رواج تھا اور صفِ اوّل کے شعرا معریٰ نظم کو استعمال کرتے رہے تھے۔ ہاں فری ورس یا نظمِ آزاد کا رواج عہدِ جدید میں شروع ہوا

اور ۱۹۱۳ء میں تصوریت (IMAGIST) تحریک نے منشور سے آزاد نظم کی ہیئت اور موضوع دونوں حیثیتوں سے حد بندی کر دی۔ اس منشور کے چھ نکات تھے۔

۱۔ "عام بول چال کی زبان استعمال کرنا، ہمیشہ معنوی اعتبار سے مناسب ترین لفظ استعمال کرنا اور آرائشی الفاظ سے پرہیز کرنا۔

۲۔ نئے اوزان و آہنگ پیدا کرنا جن سے نئے موڈ کا اظہار ہو سکے۔ ہم آزاد نظم ہی کو شاعری کا تنہا ذریعہ اظہار قرار دینے پر اصرار نہیں کرتے ...... مگر ہمارا عقیدہ ہے کہ شاعر کی انفرادیت جتنے بہتر طریقے پر آزاد نظم میں ظاہر ہوتی ہے اتنی روایتی اصناف میں نہیں ہو سکتی۔

۳۔ موضوع کے انتخاب میں مکمل آزادی کی حمایت۔

۴۔ تصویر پیش کرنے کی کوشش۔ ہم مصور نہیں ہیں لیکن ہمارا عقیدہ ہے کہ شاعری مخصوص تصورات کو ظاہر کرنے کا ذریعہ ہونی چاہئے۔ اسے مبہم اور عام باتوں سے پرہیز کرنا چاہئے۔

۵۔ ایسی شاعری کو رواج دینا جو صاف اور سنگین ہو اور غیر واضح اور معتدل نہ ہو۔

۶۔ آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ ہم میں سے اکثر کا عقیدہ ہے کہ ارتکاز ہی شاعری کی اصل ہے۔"

اس منشور سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں آزاد نظم کو صرف دو بنیادی تقاضوں کو پورا کرنے کا ذریعہ سمجھا گیا تھا۔ ایک یہ کہ براہ راست تجربے کا غیر آرائشی اور براہ راست اظہار ہو سکے اور روایتی تاثر اور دوسروں کے مانگے ہوئے تجربوں کی بجائے شاعر اپنی انفرادیت اور اپنے تجربات کا برملا اظہار کر سکے اور دوسرے یہ اظہار شاعری کے جانے بوجھے پیرایے کے بدلے روزمرہ کی زبان میں کیا جائے۔

بعد کو سمبالزم (اشاریت)، امپریشنزم (تاثریت)، اور سوریلزم (ماورائیت) کی تحریکوں نے آزاد نظم کو فرائڈ کے زیر اثر لاشعور کا ذریعہ اظہار بنانا چاہا اور اس کے رشتے انفرادیت اور نفسیاتی الجھنوں سے جا ملائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد نظم مایوسی، انفرادیت پرستی اور کلبیت کی آماجگاہ بن گئی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی طویل نظم ویسٹ لینڈ (WAST LAND) غالباً اس کا سب سے نمائندہ اظہار ہے اور اس مایوسی اور کلبیت کو ایلیٹ نے "کسی نظام حکومت کے خلاف احتجاج کے بجائے انسانی تہذیب کے جواز پر شبہ کرنے" سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ اردو میں آزاد اور معریٰ دونوں قسم کی نظموں کا چلن اس دور سے قبل نہیں ہوا تھا۔ مولوی اسمٰعیل، شرر، عظمت اللہ خاں وغیرہ کے تجربے محض برائے نام تھے۔ موجودہ دور میں نظم معریٰ اور آزاد کے جو بھی تجربے ہوئے انہیں بلینک اور فری ورس کے امتیاز کے بغیر فری ورس کی تحریک سے منسلک قرار دے دیا گیا اور ان پر آزاد نظم کے شعراء کی فکری چھاپ تلاش کی جانے لگی۔

اردو میں آزاد اور معریٰ شاعری کی روایت پر نظر ڈالئے تو راشد کا نام سرفہرست ملتا ہے۔ راشد کی شاعری میں فکری عنصر کا انکار ممکن نہیں۔ ان کے احساسات اور تصورات کی دنیا بلاشبہ قدیم روایتی سکہ بندی سے الگ ہے ان کا احساس ہرا بھرا نہیں اور ان کے تصورات خلوص سے عاری نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو ٹکڑے قابل توجہ ہیں:

آ مری جان مری آنکھوں کے جمال
میز کی کانچ درخشندہ کو دیکھ
کیسے پیالوں کا عکس سیم گوں
اس کی بے اندازہ گہرائی میں ہے ڈوبا ہوا
جیسے میری روح، میری زندگی
تیری تابندہ سیہ آنکھوں میں ہے

مے کے پیالے تو ہٹ سکتے ہیں پر عشق نہیں

یا :

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں

کی ساری فضا نئی سی ہے۔ قدیم خیال میں بھی یہاں انفرادی تجربے کی شمع روشن نظر آتی ہے اور اس خیال کے اظہار کے لئے نئے ذرائع اور پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔

علاوہ بریں، راشد کو معریٰ اور آزاد نظم میں قافیے کی مدد کے بغیر موسیقی برقرار رکھنے کا وہ ہنر آتا ہے جو ان کے ہمعصروں میں اور شاید ہی کسی کو آتا ہو۔ وہ آزاد اور معریٰ نظم کو پورے ضبط و احتیاط کے ساتھ برت سکتے ہیں لیکن ان کے افکار میں قنوطیت، گھٹن اور انفرادیت پرستی کی وہ یاسیت موجود ہے مگر نوجوانی کی سی جنبش اور تبدیلی کرن تک کے اس اعلان کے باوجود :

خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحر بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں ہے!
یہ انساں کی برتری کے نئے دور کے شادیانے ہیں سن لو
یہی ہے نئے دور کا پرتو اولیں بھی!

راشد اس گھٹن اور مایوسی کا شاعر ہے جو "خودکشی" "دریچے کے قریب" اور "اجنبی عورت" میں اس قدر کامیابی کے ساتھ ظاہر کی گئی ہے۔ انھوں نے زندگی کو محض جنسیاتی ہیجان سمجھا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی آج تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور یہ آج بھی صرف اس موجودہ لمحے کا نام ہے جس میں وقتی طور پر لذت نصیب ہو سکے اور یہ لذت گاہ انہیں اصل حیات ہے۔

بھولے بسرے روح کا اظہار تجھے
روح تو اظہار ہی سے زندہ و تابندہ ہے
ہے اسی کی یاد سے حاصل مجھے قرب حیات
روح کا اظہار کیسے بھول جاؤں

یہاں راشد کے نظریۂ حیات پر تفصیلی تنقید کی گنجائش نہیں۔ یہ کہنا صحیح ہو گا کہ راشد کو اسی مخفی احساسِ شکست کا شکار کہا جا سکتا ہے جس کا اظہار "ویسٹ لینڈ" میں ہوا ہے اور جس نے آزاد نظم کے لہجے کو مردم بیزاری، شکست خوردگی اور مریضانہ قنوطیت سے ہم آہنگ کر دیا۔

میراجی نے ان نفسیاتی پیچیدگیوں کو فرانسیسی انحطاطیوں کی نہج پر حل کرنے کی کوشش کی اور تہذیب اور شعور سے فرار اختیار کیا۔ فرائڈ کے زیر اثر جنس کو اپنی شاعری کا موضوع حقیقی قرار دیا اور شعور کی دنیا سے بھاگ کر لاشعور اور منتشر احساسات کی بھول بھلیوں میں پناہ لی۔ یہ دنیا صاف الفاظ اور اونچی آواز میں بولنے کے بجائے اشاروں اور سرگوشیوں کی دنیا ہے اور یہی سرگوشی اور سمبالزم کی آواز میراجی کی شاعری ہے۔

میراجی کی شاعری پر نفس مضمون اور انداز اظہار دونوں حیثیتوں سے تنقید کی جا سکتی ہے لیکن اس کا انکار ممکن نہیں کہ میراجی نے شاعری میں ظاہری لیپ پوت اور آرائشی الفاظ کو اہمیت نہیں دی اور اصل احساس اور انفرادی تجربے کو جگہ دی۔ میراجی شاعری اس لئے کرتے تھے کہ شاعری ان کے لئے ایک ضرورت تھی۔ انھیں چند احساسات کو خارجی شکل میں ظاہر کرنا تھا۔ ان کی شاعری ریشم کے اطلس جیسی کسی آرائش کی چیز نہیں تھی۔

شاعری ان کے لئے محض اظہارِ ذات کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ تسکینِ ذات کا ذریعہ بھی تھی۔ اگر وہ اس طرح اپنے جذبات کو ظاہر کرتے تو ضبط اور گھٹن ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔

بہر حال میراجی نے ابہام اور اشاریت کے باوجود جنسی احساس پر زور دیا۔ بیان کی ملمع کاری یا تشبیہ و استعارے کی روایتی سجاوٹ سے بہت کچھ دامن بچایا۔ اپنے موضوع کے بارے میں ایک جگہ انھوں نے خود لکھا ہے:

> "مشاہدے کے لحاظ سے اگرچہ بحیثیت مجموعی زندگی کے ہر پہلو کی طرف میرے تجسس نے مجھے راغب کیا لیکن موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش (سیاسی، سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میرا مرکزِ نظر رہا اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشان خیالی کو جنسی رنگ دے دیا۔"
>
> (میری بہترین نظم۔ مرتبہ حسن عسکری صفحہ ۸۵)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ "موجودہ صدی کی بین الاقوامی کشمکش" سے زیادہ میراجی کے ہاں نجی الجھنوں ہی کی داستان ملتی ہے اور اس داستان میں تجربہ کا خلوص بھی ہے اور کسی حد تک اس کا براہِ راست اظہار بھی ملتا ہے۔ "اونچا مکان" کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

اپنے احباب کو آسودہ بنانے کے لئے
بھول کر تیری گلی روح کو میں آپہنچا
اس بلندی کے قدم میں نے لئے
جس پہ تو سیکڑوں آنکھوں کو جھپکتے ہوئے استادہ ہے
تیرے بارے میں سنا رکھی تھیں لوگوں نے مجھے
کچھ حکایاتِ عجیب

"دور قریب" کا ایک بند دیکھئے۔ اس بند میں بھی بیان کا براہِ راست انداز اور تشبیہ و استعارے کے بدلے علامتوں (SYMBOLS) سے کام لینے کا طریقہ قابلِ توجہ ہے:

قوانینِ اخلاق کے سارے بندھن شکستہ نظر آ رہے ہیں
حسین اور ممنوع جذبے مرے دل کو پھسلا رہے ہیں
یہ ملبوسِ ریشم کے اوراق کی لرزش
یہ غازہ ـــــ یہ ابٹن
نسائی نفس کی ہر اک موج آج کرتی ہے سازش
مرے دل کو بہکا رہی ہے!
مرے ذہن میں آ رہی ہے
رسیلے جرائم کی خوشبو!

میراجی کے تحت الشعوری تجربے کی وقتی کامیابی نے نئی نسل کو بے حد متاثر کیا اور مختار صدیقی، قیوم نظر اور دوسرے شاعر داخلیت کے اس خول میں اسیر ہو گئے جہاں صرف اشاروں اور علامتوں ہی میں باتیں کی جا سکتی تھیں اور شعور کی گرفت بے حد کمزور تھی۔ مختار صدیقی نے ہیئت اور مصرعوں کی ترتیب کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی اور شاعری ریاضی کا سوال ہو کر رہ گئی۔ سلام مچھلی شہری نے البتہ کافی حد تک تجربے کا اظ

وہ واضح شعور کا شکار بھی نہیں ہوئے۔ کبھی انھوں نے مصرعوں کے آہنگ سے معنوی کا اثر پیدا کرنے کی کوشش کی (برسات، پیش خواب)، کبھی قصص اور کہانی کے بیان کو اسی انداز سے بیان کرنا چاہا (جنگل کا ناچ)، کبھی آزاد اور معریٰ نظم میں مکالموں کی بے ساختگی، بے تکلفی اور ڈرامائی انداز پیدا کیا لیکن سلام کا کوئی واضح نظریۂ حیات نہیں ہے جس کا فقدان اور فلسفیانہ شعور کی کمی نے انھیں اس تجرباتی منزل سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

سردار جعفری کی شاعری مخدوم کے بعد اس عہد کا سب سے ممتاز و منفرد مسئلہ ہے۔ یہاں اس پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں صرف اس اثر کا ذکر کرنا ہے جو جعفری نے آزاد اور معریٰ نظم کے مضمون اور ہیئت پر چھوڑا ہے۔ سردار جعفری نے اس صنف کو داخلیت کے تنگ دائرے سے نکال کر عصری مسائل کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس میں "خودکشی" اور "دریچے کے قریب" کے مسائل ہی پر بات نہیں ہوتی بلکہ دریچے کے باہر کی باتیں بھی ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ اندر آ گئیں۔ سردار جعفری کی آزاد اور معریٰ نظم زندگی کے اور خاص طور پر سیاست کے ہر مسئلے پر اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ ہے۔ اس میں یہ شعور ملتا ہے کہ آزاد اور معریٰ نظم راشد اور میرا جی کے انداز میں اسیر نہیں ہے بلکہ اسے ان سے بالکل مختلف جذبات کا آئینہ دار بھی بنایا جا سکتا ہے۔

سردار جعفری سے قبل بھی معریٰ اور آزاد نظم کی سرحدوں کو وسیع کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ مخدوم، فیض کی چند معریٰ نظمیں اور اختر الایمان کی چند نظمیں اس سلسلے میں خاصی کامیاب ہیں لیکن یہ لوگ اس صنف کو نئی فضا بخشتے ہیں اس قدر جہد آزما ثابت نہیں ہوئے۔ سردار جعفری نے ہر سیاسی اور صحافتی موضوع پر شاعری کی اور اس کے لئے معریٰ اور آزاد نظم کا استعمال کیا۔ یہ کوشش یقیناً مستحسن تھی (حالانکہ وہ خود اپنی تنقیدی تحریروں میں موضوعات کو اچھے اور برے، مفید اور غیر مفید کے خانوں میں تقسیم کرتے آئے ہیں) لیکن ہر موضوع کو شاعری میں اپنا لینا اور اس میں شعریت پیدا کرنا کٹھن مرحلوں میں سے ہے اور سردار جعفری سے یہ مجموعی سر انجام نہ ہو سکا۔

معریٰ اور آزاد نظم میں خارجی اور بیانیہ شاعری کرنے کے جوش میں سردار جعفری کو سادگی ہی سے ہاتھ دھونے پڑے اور اس صنف نے سکّہ بند اندازِ بیان اور تشبیہ و استعارہ زدگی سے جو گریز اختیار کیا تھا سردار جعفری کے زیرِ اثر اسے پھر قدیم روش کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ سیدھی سادی باتوں کو مرصع کاری سے حسین بنانے کی کوشش کی گئی اور ایک ہی بات کو ہزار طرح سے سجایا گیا۔ زیوروں سے لاد کر، استعارہ در استعارہ کے نقابوں سے آراستہ کر کے دہرایا گیا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ ایک ہی بیان پھیل کر تین تین چار چار صفحات پر محیط ہو گیا اور نظم سے ضبط و احتیاط ختم ہو گئی۔ مثال کے طور پر "سیلابِ چین" کا ابتدائی حصہ دیکھئے۔ شاعر برق رفتار لمحوں سے پوچھتا ہے "انقلاب اب کہاں ہے؟"۔

"چین میں"
کوہساروں سے آواز آئی
مرغزاروں
گرجتے ہوئے آبشاروں
دہکتے ہوئے لالہ زاروں سے آواز آئی
"چین میں، چین میں"
وادیاں گونج اٹھیں
کوہ کی چوٹیاں گونج اٹھیں
ندیاں چین کا نام لے کر سمندر میں دوڑیں
چین کا نام لے کر سمندر سے کالی گھٹائیں اٹھیں
شرق اور غرب میں

چین کا نام بارش کے قطروں کی صورت میں ٹپکا
پیاسی دھرتی نے اس نام سے اپنے لب تر کئے

اسی نظم کا ایک اور حصہ بھی قابلِ غور ہے:

چین سب سے بڑا گیت، سب سے حسین نظم ہے
چین ایک حوصلہ، اک امنگ اور ایک عزم ہے
چین اک وحی ہے ایک اپدیش ہے ایک پیغام ہے
ایشیا کے لئے ایک انعام ہے
چین کیا چیز ہے بیچاروں سے پوچھو
چین کیا چیز ہے غم کے ماروں سے پوچھو
چین بھوکوں کی روٹی ہے
ننگوں کا کپڑا ہے
بے گھروں کا گھر ہے
چین مفلس کے زخموں کا مرہم
امیروں کا زخمِ جگر ہے
چین لاکھوں کروڑوں غلاموں کی آزادی
اور قیدیوں کی رہائی کا اعلان ہے
چین سرمایہ داری کی جلتی ہوئی دھوپ میں
اک گھنے پیڑ کی چھاؤں ہے"

اسی قسم کے بہت سے ٹکڑے "نئی دنیا کو سلام" "مغرب" اور "آنسوؤں کے چراغ" میں ملتے ہیں جن کی تکرار نظم کی تاثیر اور اس کی وحدت کو مجروح کرتی ہے۔

اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ سردار جعفری نے شاعری کے تخلیقی عمل کو تعمیم سے تخصیص تک آنے کا عمل قرار دیا اور اس لئے معمولی حادثات کا رشتہ ابدی اور عام انسانی مسائل سے جوڑنے کے بجائے اس عمل کو الٹ دیا۔ اپنی نظموں کو ہنگامی اور وقتی موضوعات تک محدود کر لیا۔ چنانچہ ان کی شاعری عام واقعات، عصرِ حاضر کی تاریخ اور سیاست کا آئینہ تو ہو گئی لیکن اس کے رشتے فلسفیانہ فکر سے منقطع ہو گئے۔ انسانی زندگی کا مدعا کیا ہے؟ کائناتی مسائل اور انسانی وجود کا استفہامیہ اور اس قسم کے دوسرے سوال ان کی شاعری کے لئے اجنبی ہیں۔ اگر ان کے کلام میں انسانی زندگی کے متعلق کسی عام نظریے کی تلاش کی جائے تو زیادہ کامیابی نہ ہو گی حالانکہ انہی تصانیف سے پاکستان کی تخلیق، اگست ۴۷ء اور اسٹالن کی موت کے بارے میں شاعر کے ردِ عمل کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

فکر کی اس کمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاد اور معریٰ نظم میں خطابت کا عیب آ گیا اور الفاظ و بیانات کی تکرار میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے سردار جعفری کو قدیم تشبیہات سے کام لینا پڑا۔ "مغرب کی جھیل سے پھر شعاعیں پھوٹنے لگیں"۔ "بربط و طاؤس پھر انگڑائی لینے لگے اور پرانی (۷، ۱۲، ۵، ۱۳) پھر اسی آن بان سے واپس آ گئی۔ کہیں کہیں مزدور، ہڑتال کے الفاظ اور گورکی، میکائسکی وغیرہ کے ناموں کی پیوند کاری کی گئی لیکن یہ انداز بیان میں

پوری طرح گھل مل کر نہیں آ سکے بلکہ اس کی سجاوٹی شکل میں نووارد اجنبی معلوم ہونے لگے۔

"استالن کی آواز پر" "چارہ گر" اور "آج کی رات نہ جا" کے باوجود مخدوم محی الدین کو آزاد اور معریٰ نظم نگاری میں کسی منفرد طرز کا موجد نہیں کہا جا سکتا۔ ایک تو ان کی آزاد اور معریٰ نظموں کی تعداد بہت کم ہے دوسرے ان کی نظموں کا آہنگ ابھی تک واضح شکل اختیار نہیں کر سکا ہے۔

آزاد اور معریٰ نظم نگاری کی اس چھوٹی سی عمر میں اس کے اسالیب کو راشد، میراجی اور سردار جعفری کے اسالیب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور اب ان کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ آزاد نظم کا تجربہ کیا واقعی بے ہودگی اور طفلانہ پن کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگر آزاد اور معریٰ نظم کے ساتھ راشد اور میراجی کے خیالات کو لازم و ملزوم نہ سمجھا جائے تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اس صنف میں ابھی کافی لچک اور گنجائش موجود ہے۔ ابھی تک غزل کی سنگ بندی یہاں عام نہیں ہوئی ہے اور لازمی نہیں ہے کہ آزاد نظم کا نام سنتے ہی لکھنے والے کا قلم ایک خاص روش پر چل نکلے۔

ابھی تک اس بادل میں نہ جانے کتنی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ آزاد نظم نے صنف کی حیثیت سے جو سہولتیں پیش کی تھیں ابھی تک ان سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ قدیم سکہ بند خیالات و مضامین سے الگ ہٹ کر نت نئے سائنٹیفک، فلسفیانہ اور عمرانی مسائل پر اظہار خیال کا جو موقع ملا تھا اسے بد قسمتی سے بے پروائی، مطالعے کی کمی اور تن آسانی کی وجہ سے پوری طرح کام میں نہیں لایا گیا۔ تشبیہ و استعارے کے سہارے اور قدیم مرصع کاری کی بیساکھی سے الگ ہو کر صرف خیال کی ندرت اور گہرائی سے لالہ زار کھلانے کی جو گنجائش پیدا ہوئی تھی اسے ہنوز نہیں برتا گیا اس لئے یہ کہنا کہ آزاد نظم کا تجربہ ہی بنیادی طور پر غلط تھا، عامیانہ بات ہے اسی قدر عامیانہ جیسے آزاد نظم کو صنف کی حیثیت سے تکنیک پسندی یا بیہودہ قرار دینا——

(۲)

غزل کی طرف ابھی پچھلے چند دنوں سے نئی نسل کا میلان بڑھ گیا ہے۔ آزاد نظم نگاری کے دور میں کچھ شعراء نے سوچ سمجھ کر اور کچھ نے بے سوچے سمجھے غزل کی صنف کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا اس کے خاص اعتراضات دو تھے۔ ایک یہ کہ غزل میں پریشاں خیالی ہوتی ہے اور بجائے اس کے کہ شاعر اپنی تخلیق میں کسی ایک خیال، جذبے یا تصور کو پیش کرے وہ محض قافیوں کی رہنمائی میں مختلف قسم کے مضامین کو بندش کی چستی کے ساتھ باندھ دینے ہی کو کمال فن سمجھتا ہے اس طرح اکثر غزل گو دوسروں کے خیالات اور جذبات سے کام چلا لیتے ہیں اور انفرادی فکر اور ذاتی کاوش کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ اس سے ایک قسم کی ذہنی غیر ذمہ داری، لاابالی پن اور لفاظی کے ساتھ ساتھ فکری انتشار اور تن آسانی پیدا ہوتی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ تھا کہ صدیوں کی روایات اور مخصوص تلمیحات کی بنا پر غزل کا اپنا ایک خاص مزاج بن گیا ہے اور ہر لکھنے والے کو اسی روایتی (imagery) کا سہارا لینا پڑتا ہے جو زمانہ قدیم سے استعمال ہوتی رہنے کی وجہ سے انفرادیت کے اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ نئے مضمون یا انفرادی تجربے کو ظاہر کرنے کے لئے غزل گو شاعر کو گھسے پٹے تشبیہ و استعارے، تلمیح اور انداز بیان سے کام لینا پڑتا ہے اور اس بنا پر بیان کی وضاحت اور تجربے کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے سننے والے کا ذہن معنی کے بجائے انداز بیان کی سجاوٹ میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

غزل کے احیاء کا ذکر کرنے سے پہلے ان سوالوں کا جواب دینا ضروری ہے۔ کیا نئی غزل ان اعتراضات کی گرفت سے باہر نکل آئی ہے؟ کیا اس میں فکری عنصر کی آمیزش زیادہ ہوتی ہے؟ کیا اس میں خیال اور انفرادی تجربے کے اظہار کو مناسب جگہ مل گئی ہے؟ کیا انداز بیان کے پرانے روایتی اسلوب کی جگہ پر کوئی ایسا اسلوب پیدا ہونے لگا ہے جو تجربے یا تاثر کی انفرادیت کو مجروح نہ کرے؟

جدید غزل کا تذکرہ عام طور پر حسرت موہانی، اصغر گونڈوی اور فانی سے شروع ہوتا ہے اور یگانہ اور جگر سے ہوتا ہوا فراق پر آکر ختم ہو جاتا

جاتا ہے۔ حسرت کو غزل کا مجدد کہا گیا ہے لیکن اگر انہیں مجدد کہا جا سکتا ہے تو صرف ان معنوں میں کہ انہوں نے غزل کو پھر سے تغزل سے آشنا کیا، اور داخلی سوز و گداز اور بقول صاحب "کاشف الحقائق" "واردات قلبیہ" کے بیان سے پھر معمور کر دیا۔ حسرت کی غزل میں نکھری ہوئی داخلیت اور سوز ہے، شیرینی اور کیفیت ہے لیکن اگر ان کی غزلوں میں کسی جدید ذہن کا پتہ لگانا ہو تو اس میں ناکامی ہوگی۔ حسرت کا ذہن وہی قدیم صوفیانہ، نیم شاعرانہ ذہن ہے۔ قدیم صوفی اگر اس عہد میں ہوتے تو شاید ان کی انسان دوستی اور جمہور سے جذباتی وابستگی انہیں بھی اسی قسم کے متضاد رویے کی طرف لے جاتی جو حسرت کی غزل اور ان کی سیاسیات میں ملتا ہے۔ "چکی کی مشقت" اور گاندھی جی اور تلک سے عقیدت کے اظہار کے باوجود حسرت کی غزل جدید مسائل سے دور ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حسرت، اصغر اور فانی تینوں کے کلام میں ایک قدر مشترک ملتی ہے۔ ان کا اپنا ایک فکری کردار ہے جو حسرت میں کم تر اور باقی دونوں میں واضح طور پر ملتا ہے۔ حسرت کا کوئی واضح فلسفہ حیات معلوم نہیں ہوتا لیکن ان کے سارے کلام پر صوفیانہ رنگ کی ایسی چھاپ ہے جس نے ان کے زاویہ نگاہ کو بڑی حد تک متعین کر دیا ہے۔ اصغر نے تصوف کو واضح طور پر استعمال کیا اور فانی نے اپنے آہنگ کو اس قدر انفرادی بنا دیا کہ ان کی آواز پورے دور کی آوازوں میں الگ سنائی دیتی ہے۔ اصغر اور فانی کے فلسفہ حیات سے کسی کو اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن ان دونوں کی غزلوں پر انتشار ذہنی کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ دونوں کی غزلیں مخصوص فلسفیانہ مزاج رکھتی ہیں اور یہی جدید غزل کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصغر اور فانی نے بھی غزل کی پرانی (IMAGERY) اور زبان کا سہارا لیا ہے۔ پرانی تلمیحات کو بھی نئی وسعت بخش کر کام میں لائے ہیں۔ قدیم علامتوں کو نئی گہرائی دی ہے لیکن پھر بھی انہوں نے متاخرین کی غزل سے پریشان خیالی کا عنصر دور کر کے اسے مربوط نظریہ حیات کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ فانی یا اصغر کے لئے غزل محض خوش وقتی نہیں تھی ان کی شخصیت کے اظہار کا لازمی جزو تھی۔ یگانہ اور جگر مراد آبادی کی شاعری میں یہ فکری کردار تو باقی نہ رہا لیکن یگانہ نے لہجے اور فضا سے غزل میں نیا جادو جگایا اور جگر نے مے کو نئے شیشوں اور نئے پیالوں میں پھر پیش کیا۔ یگانہ کے تیور یا ان کی انفرادی آن بان اور غم کے طوفانوں کے مقابلے میں کج کلہی کی شان — گو مربوط نظریہ حیات کا بدل نہیں ہو سکتے، پھر بھی اس شاعری میں ایسے مشروب کی کیفیت تھی جو نشہ نہیں لاتا مگر جسم میں تازگی اور چستی پیدا کرتا ہے۔ یہ چستی زیادہ دیرپا نہیں ہوتی اس سے ہمت ضرور ملتی ہے مگر بصیرت حاصل نہیں ہوتی۔

غزل میں نئے احساس کو جگہ دینے والوں میں سر فہرست فراق، جذبی، مجروح اور فیض کا نام ہے۔ فراق کی غزلوں میں حسن و عشق کے معاملات کے پردے میں اس جذباتی کرب، اذیت اور درد خود آگہی کا احساس ملتا ہے جو نئی نسل کو ورثے میں ملا ہے۔ عصر حاضر کے تقاضوں اور نئی نسل کے جذباتی مسائل کا ذکر اس مقالے میں جگہ جگہ آیا ہے بہتر ہے اگر ان مسائل کو جذباتی کرب، اذیت اور درد خود آگہی کے الفاظ میں کسی قدر واضح کیا جائے۔

ہمارے ادب میں نئی شاعری کی ابتدا یا یوں کہئے کہ شاعروں کی نئی پود کا طلوع ایک ایسے دور میں ہوا جسے مناسب اصطلاح کی غیر موجودگی میں بے یقینی دور کہا جا سکتا ہے۔ یہ نسل اپنے دور کے یورپ سے بہت کچھ ملتی جلتی نسل تھی۔ عام طور پر نئی نسل طبیعیات، نفسیات اور عمرانیات کے نئے انکشافات کی بنا پر کچھ نئی حقیقتوں اور ان سے پیدا شدہ تشکیک کا شکار ہو رہی تھی۔ ڈارون انسان کو اشرف المخلوقات کے مرتبے سے ہٹا کر مادے کے عام ارتقائی عمل کی کڑی قرار دے چکا تھا۔ فرائڈ نے انسان کو قادر مطلق کے بجائے لاشعور اور جبلت کے دستور میں اسیر قرار دے دیا تھا اور مارکس نے تمام قدروں کو اضافی بتا کر نیکی اور بدی کے معیار پر نئے سرے سے غور کرنے کی دعوت دی تھی۔ یورپ میں ان تعلیمات کے ساتھ ساتھ صنعتی تہذیب کا سورج اپنے شباب پر تھا۔ شہر کارخانے بن چکے تھے اور شہری زندگی کی برق رفتاری، افراتفری اور بے یقینی نے انسان سے

جذباتی گھٹن اور بے راہ روی کا احساس بھی پیدا کیا تھا جس سے گھبرا کر نئی نسل کرب، تشکیک اور بیزاری کا شکار ہو رہی تھی۔

ہندوستان میں صنعتی اور شہری تہذیب کا وہ تشنج اور افرا تفری نہ تھی لیکن غلامی کی زنجیریں گراں بار تھیں اور انگریزی تعلیم نے جو آدرش نوجوانوں کو بخشے تھے وہ ان کی خانگی زندگی کے سانچے سے ٹکراتے تھے۔ وہ آزادی، جمہوریت اور صنعتی ترقی کے خواب دیکھتے تھے اور ان کے ارد گرد کی صدیوں پرانی چہار دیواری میں عورت، پردۂ نسواں اور قدیم دقیانوسی اور ایشیائی نظام حیات کی اخلاقی قدریں اب بھی سانس لے رہی تھیں۔ ان کے جذبات کچھ چاہتے تھے اور ان کے گرد و پیش کی زندگی کا تقاضا کچھ اور تھا۔ جو کوششیں اس دور میں آزادی اور انصاف کے لئے ہو رہی تھیں ان میں سے اکثر میں انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے جدید اور دقیانوسی تہذیبوں کا یہی تضاد ملتا ہے اور ان کی ناکامی سے تشکیک اور بیزاری پیدا ہوتی تھی اور ذہنی خلفشار پرورش پاتا تھا۔

اس بیان کا یہ مطلب نہیں کہ اس دور کے یورپ یا ہندوستان میں ایسی تحریکیں یا افراد سرے سے موجود ہی نہیں تھے جو تخریب اور نراج سے آگے بڑھ کر کوئی مثبت حل تلاش کر سکتے لیکن اس دور کے نوجوانوں کا غالب رجحان یہی تھا اور اسی نے میراجی اور راشد، منٹو اور احمد علی، عصمت اور حسن عسکری، "انگارے" اور "لحاف" کو جنم دیا تھا۔ اگر اس دور کی سیاست کا غور سے مطالعہ کیا جائے جس میں نوجوانوں کا بڑا حصہ رہا ہے تو اس میں بھی تلاطم اور ذہنی نراج کے نمایاں نشانات ملیں گے۔ بعد کی نسل نسبتاً زیادہ تعمیری اور مثبت انقلابی شعور کی طرف مائل ہوئی اور ذہنی نراج سے تھک کر عقیدہ کی تلاش میں اشتراکیت کی طرف متوجہ ہو گئی لیکن یہ بعد کی داستان ہے۔

نئی غزل کے سامنے اس دور کے جذباتی ردعمل کو بے نقاب کرنے کا فریضہ تھا۔ فراق نے اس کام کو انجام دیا۔ اس کا ثبوت فراق کے تصور حسن و عشق سے ملے گا جس میں بڑی واقعیت اور حقیقت پسندی ہے۔ نئی نسل کے پاس ماورائی تصورات اور مستقل قدریں نہیں تھیں اور ان کی محبت افلاطونی ہونے کے بجائے ارضی تھی تصوراتی یا روحانی بننے کے بجائے حقیقت پسندی کی طرف مائل تھی۔ اسی لئے فراق کے کلام میں جو درد مندی ہے اس میں صرف غم جاناں ہی موجود نہیں ہے بلکہ کبھی غم دوراں کی آمیزش ہو جاتی ہے کبھی ایک ایسے موہوم درد کی جو محبوب کے دل پر ہاتھ رکھ دینے سے بھی نہیں تھمتا۔ یہی موہوم خواہش یہی بے نام درد اس نئی نسل کا نشان ہے۔

جدید غزل میں فراق کے اس کارنامے کے باوجود فراق کے پاس کوئی مربوط فلسفہ حیات نہیں ہے ان کی غزل اس صنف کو پریشاں خیالی سے نکالنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ اصغر کو تصوف کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ فانی کو یاسیات کا امام کہا جاتا رہا ہے۔ یہ دونوں شاعر زندگی کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں اور زندگی کی اسی تصویر کو اپنے سننے والوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اصغر اور فانی کے پاس برا بھلا نظریہ حیات ہے مگر فراق کی شاعری میں اگر کسی مربوط نظریہ حیات کی تلاش کی جائے تو کامیابی دشوار ہے۔ فراق کی غزل میں فکری وحدت کا فقدان ہے اور وہ پریشاں خیالی کے الزام سے بری نہیں ہے جس کے دور کئے بغیر نئے دور کے تقاضوں کو غزل میں سمونا ممکن ہے۔

فراق کے انداز بیان کے بارے میں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ ان کے اکثر اچھے اشعار سادہ ہیں۔ تشبیہ و استعارہ اور مرصع کاری پر ان کا دار و مدار نہیں لیکن یہ سادگی اکثر مقصد بن جاتی ہے ذریعہ نہیں رہتی۔ ایلیٹ نے ایک جگہ شاعری کو ایک ایسا شیشہ قرار دیا ہے جس میں سے وہ ساری چیزیں نظر آتی ہیں اور خود وہ شیشہ محسوس نہیں ہوتا۔ اگر مخاطب کی نظریں شیشے کی مرصع کاری میں الجھ کر رہ جائیں اور اس میں سے ہو کر اصل تصویر تک نہ پہنچ سکیں تو شاعرانہ بیان خیال کے اظہار میں معاون ثابت ہونے کے بجائے رکاوٹ بن جاتا ہے۔

فراق کے سادہ انداز بیان میں بھی یہی کیفیت رہتی ہے ایک تو ان کی غزلوں کی ساری IMAGERY قدیم غزلوں کی ہے پھر اس میں انہوں نے موزوں شعر کہنے کی کوشش میں اصل خیال کی لطافت کو نکھارنے کے بجائے طرز بیان کی سادگی پر ساری توجہ مرکوز کر دی ہے۔ پوربی اور ہندی الفاظ کی جو تلمیحیں اور محاورات انہوں نے استعمال کئے ہیں وہ رباعیوں میں تو مزا دے گئے ہیں لیکن غزل میں پوری طرح نہیں جڑے جا سکے۔ فراق کی غزل

احساسات کا آئینہ ہے اور ان کا سراپا آئینہ خانہ نہیں۔ ان کے فلسفۂ حیات کا کوئی نشان اس میں نہیں ملتا۔ زندگی کے بارے میں عام رویہ یا گھروں کے دکھڑے سے ماورا ہے ان کی آواز بھی محدود ہے لیکن ان کی شاعری میں فلسفیانہ آہنگ اور فکری انفرادیت موجود نہیں ہے۔

فراق کے بعد ایک ہی ساتھ جذبی، مجروح اور فیض کا ذکر آتا ہے۔ جذبی خارجی تجربے کو جوں کا توں نہیں رکھتے بلکہ عام خارجی حقیقت کو تفصیل اور جزئیات سے الگ کر کے اسے مجرد تاثر میں ڈھال لیتے ہیں اور اس تاثر کو غزل کے عام انداز بیان کی شکل دے دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو ان کی غزل میں نئے انداز کے غم کا احساس تو مل جاتا ہے لیکن نئے خیال سے محروم رہ جاتا ہے۔ جذبی کی شاعری اس غم آشنا طبیعت کی غماز ہے جو نئی نسل کو حالات و افکار نے بخشی ہے۔

لیکن اس دکھ میں فکری عنصر سرے سے مفقود ہے۔ جذبی کی شاعری ترسیل کم ہے انکشاف محض زیادہ ہے۔ ان کی غزلوں میں ایسی کوئی بات نہیں ملتی جسے وہ بے اختیار ہو کر دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہوں یہ محض اظہار ذات کا ذریعہ ہیں اظہار حقیقت کا نہیں۔ جذبی کائنات اور حیات انسانی کے عظیم مسائل تک دسترس نہیں رکھتے۔ ان کی چھوٹی سی دنیا ان کی اپنی ذات ہے اور اسی کے جذبے ان کی شاعری کی حقیقتیں ہیں۔ حسرت کی شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حسرت کی شاعری حقیقتوں سے معمور ہے لیکن ان کی حقیقتیں چھوٹی اور سطحی ہیں ان میں گہرائی، بسط اور کائناتی آہنگ نہیں ہے۔ جذبی کی غزلوں کے بارے میں یہ بات اور بھی زیادہ صحیح ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جذبی کی غزلوں میں رچاؤ، ضبط و نظم اور انفرادی تجربے کا سوز و گداز اپنے تمام ہمعصروں سے زیادہ ہے لیکن فکر کی کمی، قدیم غزل کے پیکروں سے بندھے رہنے اور خارجی بیانات کو سادگی اور شعریت کے ساتھ نظم کر دینے کی قدرت نہ ہونے کی وجہ سے جذبی کی غزل بھی اس صنف کے نئے تقاضوں سے قریب ہونے میں ناکام رہی ہے۔

مجروح سلطانپوری نے نئے تقاضوں کو محض سیاسی تقاضے سمجھا اور جس طرح پچھلے دنوں ہنگامی واقعات اور سیاسی حادثات پر نظمیں لکھی جاتی تھیں اسی طرح مجروح نے غزل سے کام لینا چاہا۔ مجروح کی غزل کا سارا اثاثہ ٹھیٹ کلاسیکی اور قدیم ہے۔ وہ مرصع کاری کے بھی قائل ہیں اور تشبیہ و استعارے کی طلسم سازی کے بھی۔ انداز بیان کے رچاؤ اور ندرت ادا کی دولت سے یقیناً وہ قدیم غزل میں نئی زندگی پیدا کر سکتے تھے لیکن انھوں نے دوسرا راستہ چنا اور اس تجربے میں انھیں ناکامی ہوئی۔

غزل میں عصری اور صحافتی مسائل کو پیش کیا جا سکتا ہے یا نہیں، یہ بڑا دلچسپ سوال ہے اور اس کے مختلف جوابات دیے جاتے رہے ہیں۔ مجروح اس کے جواب میں میر کا یہ شعر پڑھیں گے ؎

[illegible]، شاہ و گدا سب خواہاں ہیں
چین سے ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر بھی اک دولت ہے یاں

اور کہیں گے کہ اس میں ہنگامی واقعہ کا بیان شاعری بن گیا ہے لیکن یہ شعر نہ میر کے اچھے شعروں میں شمار ہوتا ہے اور نہ اردو غزل کے اچھے شعروں میں کیونکہ اس میں بھی واقعے سے زیادہ اس سے نکالے ہوئے نتیجے پر زور دیا گیا ہے۔ غزل کو کچھ لوگوں نے رمز و کنایہ کی زبان قرار دیا ہے اور کچھ نے استعارے کی۔ لیکن سچ پوچھئے تو نہ غزل کے لئے استعارہ ضروری ہے اور نہ رمز، اصل شے تفہیم ہے جس کا اظہار رمز اور استعارے کے ذریعے ہوتا ہے۔ غزل روزمرہ کی زندگی کے کسی واقعے یا چند واقعات کو من و عن بیان نہیں کرتی بلکہ ان سے بنیادی تاثر یا عمومی خیال اخذ کر لیتی ہے اور اسے مختصر سے مختصر پیرائے کے ساتھ پیش کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر میر کے شعر کو شاہ عالم ثانی کی آنکھوں میں سلائی پھیرے جانے والے واقعے سے متعلق سمجھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ غزل کس طرح اصل واقعے کے بیان اور اس کی جزئیات و تفصیل سے قطع نظر کر کے صرف عمومی تاثر پیش کرتی ہے۔ شعر یہ ہے ؎

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاک پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

مختصر یہ کہ غزل کا آرٹ تعمیم کا آرٹ رہا ہے وہ محرکات کو پیش نہیں کرتی ۔ ان محرکات سے پیدا شدہ تصور کو پیش کرتی ہے اور تصور کے لفظ سے یہاں وہ فوری اور اعصابی ردِ عمل مراد نہیں ہے جو انسان پر کسی بیرونی شے سے پڑتا ہے بلکہ اس اعصابی ردِ عمل (SENSATION) کے بعد احساس (FEELING) اور ادراک کے امتزاج کے بعد جو مرکب تیار ہوتا ہے اس سے مراد ہے اس کا ترجمہ "جذبہ" بھی ہو سکتا ہے ۔

مجروح کی غزل نے تعمیم کی اس منزل کو نظر انداز کر دیا اور اصل واقعہ کا بیان یا اس کے اعصابی ردِ عمل (SENSATION) پر اکتفا کیا وہ اس تصور تک نہیں پہنچتی جو احساس اور ادراک کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے ۔

یہاں دو باتیں جملۂ معترضہ کے طور پر کہنا ضروری ہیں ۔

پہلی بات یہ ہے کہ بعض لوگ تعمیم کو داخلیت کا مترادف سمجھ لیتے ہیں یعنی ان کے نزدیک غزل گو شاعر کو اوّل تو صرف ایسے واقعات کا بیان کرنا چاہئے جو اس کی ذات پر گزرے ہوں اور داخلی طور پر اس پر بیتے ہوں اور بہتر ہوگا اگر وہ محض ہلکے پھلکے عشقیہ مضامین باندھا کرے اگر وہ بیرونی دنیا کے واقعات کا تذکرہ بھی کرے تو انہیں ذاتی محرومیوں کا رنگ دے کر پیش کرے ۔ ظاہر ہے کہ یہاں جذبے کو خالص داخلی اور غیر فکری عنصر قرار دے دیا گیا ہے اور اسے احساس کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے تعمیم سے نہ تو داخلیت مراد ہے اور نہ احساس محض ۔

روزمرہ کی زندگی میں انسان کو طرح طرح کے واقعات پیش آتے ہیں غیر تربیت یافتہ ذہن کے لئے یہ واقعات بظاہر غیر متعلق اور بکھرے ہوئے ہوتے ہیں ان میں وہ کسی قسم کا تسلسل نہیں دیکھ پاتا ۔ وہ ان سے نتیجہ نکالنے یا کسی ایک بنیادی تصور تک پہنچنے پر قادر نہیں ہوتا ۔ تربیت یافتہ ذہن شے سے مجرد خیال تک پہنچتا ہے اور شاعر اس مجرد خیال کو اس طرح پیش کر دیتا ہے کہ وہ ایک عہد یا ایک فرد کی کہانی ہونے کے بجائے عام انسانوں کی کہانی بن جاتا ہے اور اس میں ایسے مسائل جھلکنے لگتے ہیں جو انسان کو رنگ، نسل یا مذہب کے اعتبار سے نہیں بلکہ محض انسان ہونے کی حیثیت سے پیش آتے رہتے ہیں ۔

یہ مسائل کون سے ہیں ؟ یہ سوال عمرانیات اور نفسیات میں بھی پیش نظر رہا ہے اور تاریخ اور فلسفے میں بھی زیر بحث رہا ہے ۔ اگر محض جمالیاتی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو کم از کم ساری دنیا کے انسان تمام تفرقوں کے باوجود اس بات میں ضرور مشترک ہیں کہ وہ پیدا ہوتے ہیں ان کو بھوک پیاس اور جنسی رفاقت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی قسم کی اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں ۔ انہیں موسم کی سختیوں سے بچاؤ کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سب ایک نہ ایک دن موت سے دوچار ہوتے ہیں ۔ اگر انہی چند باتوں پر غور کیجئے تو عظیم ادب کے اکثر عنوانات اس حد بندی میں آ جاتے ہیں ۔ انسان کے دنیا میں آنے کا سبب، زندگی کی ماہیت، بھوک، جنس، رومان اور محبت، فرد اور سماج کا رشتہ اور موت کے بارے میں انسانیت کا رویّہ ——— یہ ایسے مسائل ہیں جن کا اظہار ہر دور کے ادب میں نمایاں ہے ۔ چونکہ ہر عہد کے بدلے ہوئے حالات میں یہ مسئلے نئے سرے سے حل ہوتے ہیں اس لئے ایک طرف ادب کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے اور دوسری طرف قدیم ادب کی تازگی ہمیشہ قائم رہتی ہے ۔ یہی وہ قدرِ مشترک ہے جو ادب کو تازہ رکھتی ہے اور صحافت اور سیاسی واقعات کو باسی اور بے مزا کر دیتی ہے ۔ ان بنیادی مسائل سے رشتہ استوار رکھنے اور انسانیت سے تفرقے کے بجائے اس اشتراک پر نظر رکھنے کو ادبی انداز نظر کا نام بھی دیا جا سکتا ہے ۔

دوسرا جملۂ معترضہ یہ ہے کہ ہنگامی مسائل پر لکھنا فی نفسہٖ نہ معیوب ہے نہ مستحسن ۔ واقعہ تو درحقیقت شاعر کے لئے اظہار کا ذریعہ ہے مقصد نہیں ہے وہ حسن و عشق کی باتوں کے ذریعے اپنا مقصد واضح کرے یا کارخانے کی ہڑتال پر نظم لکھ کر اگر وہ اس موضوع میں جمالیاتی کیف اور ادبی انداز نظر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تو اس کا فن سچا ہے ۔ عنوان اس کے لئے فوری محرک کے علاوہ اور کوئی اہمیت نہیں رکھتا ۔

مجروح کی غزل کی صرف اس لئے تنقیص یا تعریف کرنا کہ وہ چند ایسے عنوانات سے وابستہ ہے جو فوری، صحافتی اور ہنگامی ہیں، صحیح نہیں ہے ۔ فیصلہ اس بات پر ہونا چاہئے کہ وہ ان وقتی محرکات کو ادبی انداز نظر اور جمالیاتی کیف بخشنے میں کامیاب ہوئے ہیں یا نہیں ۔ اقبال نے "مسجد قرطبہ" اور

..... کی گود میں بچی دیکھ کر" اور "والدہ مرحومہ کی یاد" کو موضوع بنایا ہے اور انہیں شعری تجربے میں ڈھال لیا ہے۔

مجروح کے یہاں دونوں قسم کے اشعار ملتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یا ؎

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا تو چراغ راہ میں جل گئے

اور یہ بھی انہی کا شعر ہے ؎

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹلر کا ہے چیلا مار لے ساتھی جانے نہ پائے

لیکن مجروح کا میلان دوسری قسم کی شاعری کی طرف زیادہ رہا ہے جسے وہ نئی غزل کہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ مجروح کی اچھی غزلیں بڑی رسیلی، تازہ کار اور نکیلی ہیں۔ ان کے اسلوب میں رچاؤ اور شیرینی ہے لیکن اس تجربے میں مجروح کی غزلوں نے لطافت اور مٹھاس دونوں کھو دی ہیں۔

دراصل مجروح کا یہ تجربہ کافی اہم تھا۔ غزل میں آج کی بات کو پوری خارجیت، تسلسل اور ربط کے ساتھ کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ جس طرح نظم میں سائنس، عمرانیات اور علوم انسانی کے کسی خیال کو بھی پورے ارتقاء، تسلسل اور ربط کے ساتھ سموتے ہیں اسی طرح مجروح غزل میں سمونا چاہتے تھے۔ یہ تجربہ ناکام رہا۔ غزل کے مخصوص مزاج نے ان کے "اجتہاد" کو تسلیم نہیں کیا اور ان صحافتی اشاروں کو غزل کے مخصوص ٹھاٹ باٹ کا لباس پہنا کر وہ اپنی بات کو پورے ربط و ضبط کے ساتھ کہہ سکے اور نہ غزل کی فضا کو مجروح ہونے سے بچا سکے۔

فیض نے اس تجربے کو زیادہ ضبط و احتیاط کے ساتھ کیا۔ "دستِ صبا" کی غزلوں میں اشاریت اور رمز کا ایک جواز یہ بھی ہے کہ یہ غزلیں ایسے حالات میں لکھی گئی تھیں جب شاعر کو اپنی بات کو وضاحت سے کہنے کے مواقع حاصل نہ تھے۔ یہ باتیں نہ تفصیل سے سمجھائی جا سکتی تھیں نہ صاف صاف کہی جا سکتی تھیں۔ زنداں کی دیوار کے پیچھے نہ فراغت تھی نہ آزادیٔ اظہار۔ ایسے حالات میں اختصار اور رمز یہ دونوں ضروری تھے اور اس کے لئے غزل موزوں تھی۔

فیض کی غزلوں کی تعریف میں اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اس پر اضافہ کرنا دشوار ہے۔ فیض کے بیان میں ناہمواری نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں مناسب تنظیم ملتی ہے اور وہ ہنگامی واقعات یا سیاسی بیان کو بھی تعمیم کے ساتھ داخلی تجربہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی آواز غزل کے مزاج کے خلاف معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ان کا تخیل تشبیہ اور استعارے کی تلاش میں نئی فضا تلاش کر لیتا ہے۔ فیض کی کامیابی کا راز کچھ تو اس میں مضمر ہے کہ ان کی داخلیت وسیع اور خود آگاہ ہے اور وہ ہر خارجی تجربے، مشاہدے یا واقعے کے بنیادی تاثر کو داخلی اور شعری تجربہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کچھ اس بات میں کہ فیض نے غزل میں تشبیہ و استعارے کے استعمال میں جدت سے کام لیا ہے اور (TRANSFERED EPITHET) کی مغربی تکنیک کو اپنا لیا ہے۔ تصورات اور خیالوں کو زندہ تصور کیا ہے اور ایک شے کی صفت سے دوسری اشیاء اور ان کے تصور کو موصوف کر لیا ہے۔ فیض نے اس طرح غزل کو نئے انداز کی IMAGERY بخشی ہے۔

اس میں بھی کلام نہیں کہ فیض کی غزلوں میں جذباتی وفور ہے۔ وہ نئی نسل کے اس مبہم درد کو جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں، کسی نہ کسی رنگ میں پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا بڑا جمالیاتی احساس اور SENSUOUS شعور ملتا ہے۔ وہ زندگی کی حسین چیزوں سے قوی ربط رکھتے

اور ایلیٹ کے الفاظ میں "سماجی تخیل" سے اس کی لذت کو اسیر کرتے ہیں۔ یہی نہیں فیض نے اس تجربے میں بھی تھوڑی بہت کامیابی حاصل کی ہے جو مجروح نے کی تھی۔ یہ فرق ضرور ہے کہ مجروح بلا واسطہ واقعے کے بیان کو نظم کر دیتے ہیں اور فیض کے یہاں ہنگامی واقعات کی صورت بھی بدل جاتی ہے یہ واقعات شعری تجربے کا مرکزی نقطہ نہیں رہتے بلکہ پس منظر میں موجود رہتے ہیں اور ان سے حاصل شدہ تاثر ہی بنیادی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو مضمون کے اعتبار سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں ان سے فیض اور مجروح کا موازنہ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اسلوب کے امتیازی فرق کو نمایاں کرنا مقصود ہے ؎

ہیں جو سارے دست و پا ہیں خوں میں نہلائے ہوئے
ہم بھی ہیں اے دل بہاراں کی قسم کھائے ہوئے"

* * *

مجروح نے بھی دیکھا اس کو اے کہنہ نظام سرمایہ
تیری ہی جبیں و نگر اب کیا ہے بجلائے زنداں میں
ہر تیغ اثر زنجیر قدم پھر بھی ہیں نقیب منزل ہم
زخموں سے چراغ راہگذر بیٹھے ہیں جلائے زنداں میں

زنداں کی اس بے اثری اور عزم کامران کو فیض نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری — فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں
درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے — تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں

* * *

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ فیض کی غزلوں کو اس صنف کے احیاء کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ کیا ان غزلوں نے نئے دور کے تقاضوں کو پورا کر کے سارے اعتراضات کا مسکت جواب دے دیا ہے؟ پہلے اعتراض پر غور کیجئے کیا واقعی فیض کی غزلوں میں پریشاں خیالی نہیں ہے اور ان میں کسی مربوط تصور حیات کا پتہ ملتا ہے؟ فیض کا نقطۂ نظر یا فلسفۂ حیات کیا ہے؟ فیض کی شاعری کے فکری کردار کا پتہ ان کی غزلوں سے نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ فیض اپنی غزلوں میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کائنات، زندگی، انسانی وجود اور اس قسم کے بنیادی مسائل پر فیض خاموش ہیں۔ جس طرح ہم اصغر یا فانی کے ایک فکری کردار کا تصور کر سکتے ہیں ان معنوں میں فیض کو کسی مخصوص تصور حیات کا علمبردار نہیں کہہ سکتے۔

فیض کی غزلوں میں حلاوت ہے توانائی نہیں ہے، احساس کا حسن ہے فکر کی گہرائی موجود نہیں ہے ان کی دنیا رنگ و نور کی دنیا ہے اس اخلاق کی دنیا نہیں ہے جو اس رنگ و نور کو حسن کا ذریعہ بناتا ہے۔ فیض کی غزل میں انداز بیان ایک شیشہ نہیں ہے جو کسی شے پر توجہ مرکوز کرنے کے لئے استعمال ہوا ہو یہ شیشہ خود مقصود نظر ہوتا ہے اور اسی لئے فیض کی غزل اس سجے ہوئے منقش فانوس کی طرح ہے جس میں فکر کی لو جلانے کے بجائے خود شیشے کی رنگینی سے روشن ہے۔

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ فیض ہر بات کہنے کے لئے حسن و عشق کے معاملات کا سہارا لیتے ہیں اور انہی استعاروں میں سب کچھ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ غزل کے شاعر کی کامیابی یہ ہے کہ وہ خیال کی توانائی اور سادہ روئی میں شعریت پیدا کر سکے اسے کسی اور بیرونی سہاروں کی ضرورت نہ ہو فیض کا تخیل

کی شمعیں روشن کرنے کی بجائے نئی رنگینیوں سے کام لینا چاہتے ہیں۔

جہاں فیض نے کلاسیکی رچاؤ اور تخیل کی آن بان کو پھر سے غزل کا جوہر بنایا وہاں ان کی غزلوں نے سادگی ادا کی طرف سے توجہ ہٹالی اور استعارے اور تشبیہ کی طرف عام شعراء کے ذہن کو منعطف کر دیا۔ فیض نے غزل کو نیا ذہن نہیں دیا البتہ نئے احساس کی رنگینی اور زیادہ وسیع اور نسبتاً بالغ نظر تخیل ضرور ان کا عطیہ ہے۔ فیض کی غزلیں نہ تو غزل پر سے اس اعتراض کو دور کر سکتی ہیں کہ اس میں فکری کردار اور نظریاتی آہنگ نہیں ہوتا اور نہ قدیم مرصع کاری اور روایتی انداز کے بجائے سادگی ادا کو اپناتی ہیں۔ فیض نے غزل کی مسیحائی نہیں کی البتہ احساس کی آگ اور تخیل کی ترنگ سے اس پرانی دنیا کو نئی رنگینی سے ضرور آشنا کر دیا فکری تابناکی ان کی غزلوں سے دور ہے۔

یہاں ناصر کاظمی، ابن انشا اور خلیل الرحمن اعظمی کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو غزل گو شعرا کی نئی پود میں اہمیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ ابن انشا غزل گو کی حیثیت سے زیادہ نمایاں نہیں ہیں البتہ ناصر کی غزلوں میں لطافت تخیل اور نزاکت ادا ملتی ہے۔ ناصر نے غزل کو بیچ کا رنگ شیشہ گراں ہی سمجھا ہے۔ ان کی غزلوں کے موضوع عام طور پر داخلی اور عشقیہ مضامین سے متعلق ہوتے ہیں۔ محروم اداسی کا احساس، ناکامی کو زہر خند کے ساتھ قبول کر لینے کا انداز، برسات اور چاندنی راتوں میں کسک سے مضطرب رہنے کا سلیقہ، سبھی کچھ ان غزلوں میں ہے لیکن یہ شاعری ابھی سن بلوغ تک نہیں پہنچی۔ ہنوز نوعمر اور ناپختہ کار romantic جذبات کا مجموعہ ہے جس میں ہلکا پھلکا درد تو ہے البتہ تجربے کا وزن اور آفاقیت کی گونج نہیں ہے اور صرف فضا یا انداز بیان کے بل پر غزل کو نیا لہجہ دینا ناممکن ہے۔ گو ناصر کی اس خدمت کو سراہنا ضروری ہے کہ ان کی سادگی ادا نے غزل کو سادگی کی لطافت سے قریب کیا ہے لیکن سادگی خیال کا بدل نہیں ہو سکتی۔

خلیل الرحمن اعظمی کی غزلوں میں رچاؤ اور گداز ہے اور میٹھا میٹھا درد اور لطیف کیف بھی موجود ہے اور اس کیفیت کو اعظمی نے مرصع کاری یا سجاوٹ سے حاصل نہیں کیا ہے بلکہ احساس کی شدت اور دھیمے پن سے قائم رکھا ہے۔ ان غزلوں میں عشق کی محرومی سے زیادہ ایک ایسے نوجوان کی محرومی کی آواز بازگشت ہے جو جہاں اس مصروف دنیا میں تنہا رہ گیا ہے اور جذباتی آسودگی کی ناکام تلاش کر رہا ہے لیکن اس تلاش کا دائرہ بھی محدود ہے۔ خلیل اعظمی کی رسائی خیال تک نہیں ہے، وہ محض تاثر پر قناعت کرتے ہیں۔

پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان تینوں شعراء نے میر کی تقلید کی لے اس قدر بڑھائی ہے کہ ان کی شاعری میں داخلیت اور مایوسی کا غلبہ ہونے لگا ہے۔ اسی جوش میں کہیں کہیں وہ بالکل روایتی انداز میں تاثیر پیدا کرنے لگتے ہیں اور پرانی زمینوں میں فکر کرتے کرتے ان کا ذہن گویا ماضی کی فرار اور گریز کا آسرا تلاش کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ انداز غزل کو نئے عہد کے تقاضوں کے لئے استعمال کرنے کے قابل نہیں بناتا بلکہ نئے مسائل سے دامن کشی کی طرف راغب کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ غزل کے بارے میں احیاء کا بھاری بھرکم لفظ استعمال کرنا سوائے خوش فہمی کے اور کچھ نہیں ہے لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ غزل بے کار صنف ہے اور جدید غزل کے الفاظ استعمال کرنا دراصل دو متضاد لفظ استعمال کرنے کے مترادف ہے؟ غزل جدید عہد کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے قطعی غیر موزوں ہے؟ اس سوال کا جواب بہت سے "غزل دشمن" احباب نے نفی میں دیا ہے لیکن یہ کہنا غزل کی "بے تکلف گردن مار دینے" کا مشورہ ہے۔

غزل عہد جدید کے سب تقاضوں کو نہ سہی پھر بھی بہت سے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ غزل کو اس کے پرانے سہاروں سے نجات دلائی جائے یعنی اسے فکری وحدت بخشی جائے اور مرصع کاری کے بجائے سادگی ادا، تاثر کے بجائے خیال، انفعالی احساس محض کے بجائے جذبے کے نور سے اسے آراستہ کیا جائے۔ فکری وحدت کے بارے میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس سے غزل مسلسل مراد نہیں ہے جس میں ایک ہی خیال کو ارتقائی تسلسل کے ساتھ پیش کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے یا پوری غزل میں ایک ہی تاثر کو نظم کیا جائے۔ یہاں مراد صرف یہ ہے

کہ شاعر کا اپنا کوئی زاویۂ نظر حیاتِ انسانی کے بارے میں موجود ہو اور شاعری اس کے نزدیک محض خوش وقتی، پریشان خیالی یا اپنے تاثرات کے بے نقاب کرنے کا ذریعہ ہونے کے بجائے ایک مربوط نظریۂ حیات کی ترسیل کا ذریعہ ہو۔ بڑی شاعری محض احساسات کی فراوانی سے تخلیق نہیں ہوتی اور نئی غزل میں جب تک یہ مربوط فکری آہنگ نہ ہوگا اور پڑھنے والوں کو جب تک یہ احساس نہ ہوگا کہ ان کا مخاطب زندگی کے اعلیٰ ترین مسائل پر چند باتیں کہنا چاہتا ہے، غزل ان کے لئے محض خوش وقتی کا ذریعہ بنی رہے گی۔

فکری وحدت سے یہ مراد ہے کہ ہر غزل کے اشعار میں مختلف مضامین ہی کیوں نہ باندھے گئے ہوں لیکن جب ان غزلوں کو یک جا کر کے پڑھا جائے تو ان سے ایک ایسے نقطۂ نظر کا نشان ملے جس سے انسانی زندگی کے بارے میں شاعر کا مربوط نظریہ سامنے آ سکے۔ اس کی مثالیں میر درد سے لے کر اقبال و فانی تک ملتی ہیں۔

مرصع کاری کہ کچھ لوگوں نے غزل کا بنیادی جوہر سمجھ لیا ہے اور انداز بیان کی سجاوٹ ——— اور سجاوٹ بھی غزل کے قدیم تشبیہ و استعارے اور IMAGERY سے ——— ان کے نزدیک غزل کے لئے ضروری ہے یہ گویا خیال کی ندرت کی کاوش سے بچنے کا سہل طریقہ ہے۔ نیا غزل گو شاعر وہی ہوگا جو غزل میں فکری وحدت قائم کر سکے اور صرف خیال کی ندرت اور لطافت سے شعریت اور تغزل کا جادو جگائے اور اسی وقت غزل کے احیا کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا۔ اس وقت کی غزل گوئی خیال اور زندگی کے بارے میں مطالعہ و مشاہدے اور وسیع النظری سے نتیجوں پر پہنچنے سے گریز کا نتیجہ ہے اور ترقی پسند شاعری نے نفسِ مضمون پر جو زور دیا تھا اس کے ردِ عمل کے طور پر محض اسلوبِ بیان اور روایت پر زور دینے کی خواہش سے پیدا ہوئی ہے۔

(۳)

یہ بات سماجی شعور اور ترقی پسند شاعری کے متعلق ہے۔ ادب میں سماجی شعور تلاش کرنا صحیح ہے یا غلط؟ اس کے بارے میں غور کرنے سے پہلے دو مسئلوں کا تصفیہ ضروری ہے۔ شاعری اور سماج کا باہمی رشتہ کیا ہے؟ اور اس رشتے کی روشنی میں ترقی پسند تحریک نے ہماری شاعری کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچایا ہے؟

ادب کے سماجی رشتے کے بارے میں دو قسم کی رائیں ظاہر کی جاتی ہیں۔ ایک طرف وہ گروہ ہے جو ادب اور سماج کا کوئی واضح رشتہ تسلیم نہیں کرتا۔ اگر سماج کا رابطہ ادب سے ہے تو قطعی غیر شعوری قسم کا ہے اور شاعر کو شعوری طور پر کسی بات کو کہنے یا سماج کو کسی ایک سمت میں لے جانے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔ ان کے نزدیک شاعر صرف آئینہ بردار ہے وہ صرف اپنے عکس پیش کرتا ہے جس کو دیکھنا ہو انہیں دیکھے اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ گویا شاعری کو شعوری عمل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے یا تو اسے تحت الشعور کی بھول بھلیوں میں گم کر دیتے ہیں اور یا متصوفانہ اصطلاحوں اور کیفیات میں۔ ان کیفیات کے اظہار کے لئے اب وجدان، مذاقِ سلیم اور کیف کی مبہم اصطلاحیں استعمال کی جانے لگی ہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ادب کو شعور کی تربیت کا ایک ذریعہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک آرٹ صرف ایک کسوٹی پر کسا جا سکتا ہے کہ وہ کس حد تک سماج کے لئے کارآمد ثابت ہوتا ہے اور اس سے ہمارے ذہن اور جذبات کی تربیت میں کوئی مبارک کام سر انجام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ یہ گروہ عام طور پر تبلیغی ادب پر اصرار کرتا ہے اور تفریحی ادب کو ادبیات کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کی بڑی خدمت یہ ہے کہ اس نے ادب کی سماجی اہمیت کو واضح کیا اور تخلیقی عمل میں شعور کو اس کا صحیح مرتبہ بخشا۔

ایک تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ادب میں سماجی شعور کی اہمیت کو تسلیم کرنے کے بعد بھی اسے محض تبلیغی ادب تک محدود نہ کیا جائے اور مقصدیت سے پہلے اس کے جمالیاتی نکھار اور فنی حسن کو پیش نظر رکھا جائے اور تفریحی ادب کو بھی جائز اہمیت دی جائے۔ ایسے لوگ ہیں جو

ادب کو شعور کی تربیت کا ذریعہ قرار دینے کے بعد بھی ہر ایسے ادب کو جس میں فنی حسن موجود ہو اس امتیاز کے بغیر کہ اس میں تبلیغی عنصر موجود ہے یا نہیں ادب کے دائرے میں جگہ دینے پر آمادہ ہوں گے۔

ترقی پسند تحریک کا تعلق دوسرے گروہ سے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدائی حالت میں ترقی پسند تحریک نے دو بنیادی غلطیاں کیں۔ سارے قدیم سرمایے کو حرف باطل اور جاگیرداری دور کی یادگار قرار دیا حتیٰ کہ اس کے بہت عرصے بعد تک کچھ لوگ غزل کو سامنتی دور کی یادگار سمجھتے رہے دوسرے ترقی پسندی نے ابتدا میں عریانی، مذہب دشمنی اور روایت دشمنی کی اندھی ترویج کی اور صرف چونکا دینے کو ادب کا معیار سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ ترقی پسندوں نے ابتدا میں میراجی کی "آزاد نظم" اور "لحاف" کی جو حمایت کی وہ اسی اعصابی تحیر پسندی کی بنا پر تھی۔ کچھ عرصے بعد ان رویوں میں کچھ اعتدال پیدا ہوا۔ فحش نگاروں کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے چھانٹا جانے لگا اور قدیم سرمایے میں بھی حسن و قبح کی تلاش کی جانے لگی حالی اور اقبال، غالب اور نظیر اکبرآبادی میں ترقی پسند میلانات تلاش کیے جانے لگے۔

اس کے کچھ عرصے بعد ہی ترقی پسند تحریک کا رجحان ہنگامی سیاست کی طرف ہو گیا اور ادب اور شعر کا معیار سیاسی مسلک کی صحت کو قرار دیا جانے لگا۔ شاعری سیاست کی نذر ہو گئی اور ادب کو سیاسی پروپیگنڈے کا آلۂ کار سمجھا جانے لگا۔ نظمیں صرف اپنے نفس مضمون کی سیاسی اہمیت کی بنا پر جانچی اور تولی جانے لگیں۔ انداز بیان اور جمالیاتی حسن تو درکنار شاعری کے ابتدائی ضابطوں کو بھی نظر انداز کیا جانے لگا اور اسی سیاسی بلکہ صحافتی افادیت کو سماجی شعور کا نام دے دیا گیا۔ اس سے شاعری میں بے رنگی، یکسانیت اور سطحیت پیدا ہو گئی اور یہ تحریک ادبی کے بجائے سیاسی تحریک ہو کر رہ گئی۔

یہاں اس بات کو دہرانا ضروری ہے کہ ترقی پسند تحریک نے جو ادبی خدمات انجام دی ہیں ان کا انکار ممکن نہیں۔ اس نے ہمارے افسانوں کو محلوں کے ایوانوں سے نکال کر حقیقی دنیا میں لا کر آباد کیا۔ ادبی تنقید کو ذاتی پسند یا ناپسند کے معیار سے اوپر اٹھا کر زیادہ سائنٹیفک بنایا۔ ناول اور ڈرامے کو عصری زندگی کے مسائل کا عکس بنا دیا۔ شاعری میں افسانہ و افسوں کے بجائے حقیقت پسندی، ارضیت اور سماجی معنویت کی شمعیں روشن کیں اور ایسے ان گنت ادیب اور شاعر پیدا کیے جنہوں نے پوری سماجی ذمہ داری کے ساتھ قلم اٹھایا۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ادبی اہمیت رکھنے والی تحریک کا تاریخی مقام کیا ہے اور اس کی غلطیوں اور کمزوریوں کا تعین کس طرح کیا جائے؟ کیا ترقی پسند تحریک کی غلطی یہ تھی کہ شاعری کے سماجی مقصد پر اس نے اصرار کیا؟ کیا تخلیق میں شعور کے عنصر کو بنیادی قرار دینا غلط تھا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

شاعری اور سماج کا رابطہ باہمی رابطہ ہے اور بہت قریبی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو بنانے اور بگاڑنے میں بڑا کام کرتے ہیں لیکن سماج کی تشکیل میں ادب کا عمل اس طرح کارفرما نہیں ہوتا جس طرح صحافت، اخلاق اور سیاسیات کا ہوتا ہے۔ عام طور پر شاعری اور سماج کے رابطے پر بحث کرتے ہوئے صرف شاعری اور سیاست کے رشتے کو پیش نظر رکھا جاتا ہے لہٰذا اسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ سماج پر سیاست کے اثر انداز ہونے کا عمل ادب کی اثر اندازی سے کئی معنوں میں مختلف ہے۔ سیاست سماج کے خارجی ڈھانچے کو تبدیل کرتی ہے اور اس خارجی ڈھانچے کا اثر داخلی شعور پر پڑتا ہے۔ شاعری اور فن انسان کے داخلی وجود پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جذبات اور شعور کو تبدیل کر کے بالواسطہ سماجی حالات کو بدلتے ہیں۔

شاعری دوسرے شعبۂ علم کی طرح محض ہماری معلومات میں اضافہ نہیں کرتی۔ یہ کام اس علم کا ہے جسے ڈی کوئنسی نے معلوماتی ادب (LETERATURE OF KNOWLEDGE) کہا ہے۔ فن کا کام یہ نہیں ہے کہ زندگی کی خارجی حقیقتوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسے اصول مرتب کرے جو حیات انسانی کا دستور العمل بن سکیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ مجھے لوگوں کے لئے گیت بنانے دو۔ مجھے اس سے سروکار نہیں کہ ان کے لئے قانون کون بناتا ہے۔ گیت بنانے والوں کو قانون بنانے والوں سے بھی سروکار ہوتا ہے لیکن گیت قانون محض نہیں ہو سکتے اور نہ کوئی اس پر اصرار کر سکتا ہے کہ

گیت میں صرف وہی باتیں نظم کی جائیں جو قانون کی دفعات میں موجود ہیں۔

شاعری کا کام قانون بنانے سے کہیں زیادہ مگر اہم اور دور رس ہے۔ قانون بیرونی گرفت کے شکنجے تیار کرتے ہیں، فن اندرونی ڈسپلن کا ضبط و نظم قائم کرتا ہے جس کے لئے جبر کی ضرورت نہیں ہے۔ قانون —— اور سیاست —— انسانی سماج کو بیرونی دباؤ اور خارجی عوامل سے متاثر کرتے ہیں، فن کی اپیل اس جمالیاتی احساس سے ہوتی ہے جو مختلف جذبات، احساسات اور فکر کی متناسب اور موزوں ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ احساسِ جمال کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ حسنِ تناسب کا احساس ہے اور یہ تناسب کا احساس اس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک انسان کے جذبات میں خود ایک خوش آہنگ ترتیب پیدا نہ ہو جائے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک اچھے سماج میں جمالیاتی طور پر تربیت یافتہ انسان عمرانی اور اخلاقی طور پر بھی بہتر انسان ہوگا اور اس تناسب، آہنگ اور توازن کا احساس پیدا کرنے میں چونکہ آرٹ سب سے بڑا محرک ثابت ہوتا ہے اس لئے آرٹ کو بالواسطہ سماج کا معمار، اخلاق کا معلم اور سیاست کا بانی کہا جا سکتا ہے۔

اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر آرٹ میں بنیادی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس کا پہلا کام جمالیاتی احساس کی تسکین ہے اور اسی کے ذریعے وہ انسانوں میں ہم آہنگی، توازن اور حسن کا احساس پیدا کرتا ہے جو سماجی انصاف کی آواز بنتا ہے اور بہتر انسانوں کی تشکیل کرتا ہے لیکن اس جمالیاتی تسکین کے بھی منازل اور مدارج ہو سکتے ہیں جو لوگ حسن کا راز خوش آہنگی اور تناسب کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حسین شے میں ایسے مختلف اور متضاد اجزا کا یکجا ہونا ضروری ہے جن کو تراش خراش کر کے ہم آہنگ کر دیا گیا ہے اور جس قدر یہ اجزا ایک دوسرے سے دور اور مختلف ہوں گے اور تخیل کو انہیں ملانے میں تھوڑی بہت خوشگوار کاوش کرنا پڑے گی اسی قدر احساسِ حسن زیادہ آسودگی بخش اور پُرکیف ہوگا۔ اسی کو کچھ لوگ استعارے کی بنیاد بناتے ہیں اور کچھ ابہام کی ابتدا قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر لیجئے ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہاں پہلے مصرعے میں تین مختلف اشیاء کے ساتھ بزم کے لفظ نے ایک وحدت پیدا کر دی ہے۔ کسی حد تک ذہنِ انسانی مختلف اشیاء میں رشتۂ ربط تلاش کرنے کی کاوش میں خوشگوار مسرت محسوس کرتا ہے اسی بنا پر جدید مصوری نے واضح اشکال کی تصویر کشی کے بجائے ایسے مختلف لکیروں اور اجزا کو پیش کرنا شروع کیا ہے جنہیں ملا کر دیکھنے پر ذہن تھوڑی کاوش اور جستجو کے بعد ایک مکمل تصویر کا روپ دے سکے۔

بہرحال اگر شعر میں آہنگ مکمل ہے تو اس میں مختلف اجزا کا ملاپ ضروری ہے اس میں دو واضح اور بنیادی عناصر خیال اور جمالیاتی اظہار کے ہیں۔ معنی کا اس طرح ظاہر کرنا کہ وہ جمالیاتی دروبست کو مجروح نہ کرے اور بیرونی قانون کے بجائے داخلی جذبہ معلوم ہو —— یہی شاعری کا سب سے بڑا سوال ہے۔ سستی جمالیاتی تسکین وہ ہے جو نچلی سطح پر حاصل ہوتی ہے اور سامنے کی اشیاء اور اجزاء کی ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں نشہ ہوتا ہے بصیرت نہیں ہوتی۔ اعلیٰ تر اور دشوار جمالیاتی آسودگی وہ ہے جو اعلیٰ خیال اور سادہ اظہار کے دشوار امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔

اس منزل میں ظاہر ہے کہ لاشعور کے بجائے شعور زیادہ تخلیقی طور پر رہنمائی کر سکتا ہے اور اچھا اور بڑا شاعر وہی ہے جو خیال کے اس چیلنج کو قبول کرتا ہے۔ سماجی شعور فنِ شعر کا دشمن نہیں ہے وہ نہ تو جمالیاتی تسکین کے لئے زہر ہے اور نہ لازمی طور پر شاعری کو پروپیگنڈہ، صحافت یا تقریر بناتا ہے بلکہ اس کے برخلاف وہ شاعری میں بہتر اور اعلیٰ تر جمالیاتی آسودگی کا امکان پیدا کر دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا برتنا دشوار اور بہت دشوار ہے۔

یہاں سماجی شعور کا لفظ محض سیاسی شعور کے معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اگر سماجی شعور کو محض سیاسی شعور سمجھا گیا تو وہ شاعری میں حکمت کی جگہ سطحیت اور حد بندی قائم کر دے گا۔ سماجی شعور سے یہاں انسانی زندگی کے بارے میں ایک وسیع نقطۂ نظر مراد ہے۔ لکھنے والا خواہ وقت اور حیات

مقصد کے بارے میں لکھ رہا ہو، خواہ حسن و عشق کے سلسلے میں، چاہے اس کا موضوع داخلی ہو یا خارجی، چاہے اس کی نظم کا عنوان مزدوروں کی ہڑتال ہو یا حریم ناز کے پردے ——— ہر حالت میں ان عنوانات میں زندگی کا وسیع و بسیط نقطۂ نظر جھلکنا چاہئے۔ اس کے پاس ایک ایسا بنیادی تصور ہونا چاہئے جو اس کی تمام تر شاعری کی شعوری طور پر سمت مقرر کرتا ہو۔

ہر قسم کا فن لازمی طور پر تشکیل نو ہے۔ وہ ہر دور میں شاعر کی زبان سے صرف یہ بات دہراتا ہے: "میں نے زندگی کو اس طرح دیکھا بھالا اور سمجھا ہے" اور ہر نیا تجربہ ایک عظیم تخلیقی تجربہ ہے جو انسانوں کو ایک بار پھر اپنی تقدیر کا مختار بناتا ہے اور انہیں خلاق کے درجے پر فائز کرتا ہے۔

ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس نے سماجی شعور کو بڑے محدود معنوں میں استعمال کیا۔ ترقی پسند شاعری میں صحافتی ہنگامہ تو ہے لیکن فکری اور فلسفیانہ کردار نہیں ہے۔ ایسے شعراء نے بھی جو مارکسیت کو عقیدے کے طور پر تسلیم کرتے ہیں اس کے فکری اور فلسفیانہ پہلو کو پس پشت ڈال کر محض مارکسیت کے وقتی اور سیاسی پہلو کو پیش نظر رکھا۔ مارکسیت محض کسی پارٹی کی سیاسی حکمت عملی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسے ہمہ گیر نقطۂ نظر کا نام ہے جس نے حیات و کائنات کے بارے میں واضح خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے اکثر اس کی ہمہ گیری کو نظر انداز کر کے اسے یا تو عقیدۂ محض کی شکل دی یا پھر فوری سیاسی پالیسی کے مترادف سمجھ لیا۔ مارکسی ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ شاعر لازمی طور پر مزدوروں کی ہڑتال یا کربلا پر نظم لکھنا ضروری سمجھے بلکہ یہ ہیں کہ فنکار انسانی زندگی کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتا ہے اور ہر عنوان میں اسی میلان کی جھلکیاں دیکھتا ہے۔ مارکسیت کو اسی طرح غلط یا صحیح کہا جا سکتا ہے جس طرح تصوف کو، لیکن دونوں کے مربوط اور ہمہ گیر نقطۂ نظر ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ شاعری کے لئے جامد اور حتمی اصول بنانا دشوار ہے۔ جس طرح اخلاقی تعلیم شاعری نہیں کہلاتی، جس طرح مذہب سماجی زندگی میں بہت کچھ اہم ہوتے ہوئے بھی ادب نہیں بن جاتا مگر اخلاقی نظمیں اور مذہبی نگارشات کے بہت سے نمونے عمدہ اور عظیم ادب کے دائرے میں شامل ہیں اسی طرح سیاست شاعری کی اصل نہ ہوتے ہوئے بھی سیاسی شاعری کے بہت سے نمونے ادبیات کے دائرے میں شامل ہیں۔

یہی نہیں ایسی سیاسی شاعری کا رواج بھی ہمارے ادب میں رہا ہے جسے عظیم تو نہیں کہہ سکتے لیکن ادبیات کے دائرے سے خارج نہیں کر سکتے۔ میری مراد شبلی اور ظفر علی خاں کی ہنگامی نظموں سے ہے۔ گو ان نظموں کا درجہ اوّل کی تخلیقات میں شمار نہیں ہو سکتا لیکن جس طرح شاعری کی اقسام میں اخلاقی شاعری اور مذہبی شاعری شامل ہیں اسی طرح سیاسی شاعری بھی شامل ہے۔ ایک لمحہ زندہ رہنے والے ادب کی بھی ہمارے ادب میں گنجائش ہے لیکن یہ بات اس ایک لمحے میں بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ان تمام اقسام و مدارج کے باوجود شاعری اور ادب کی صرف دو ہی قسمیں ممکن ہیں: اچھا ادب اور برا ادب، اور جو تخلیق اچھے ادب کے دائرے میں نہیں آتی، جمالیاتی آسودگی نہیں بخشتی، عظیم اور انسانیت کی بنیادی قدروں سے رشتہ استوار نہیں رکھتی وہ چاہے کتنی ہی صحت مند اخلاقی، مذہبی یا سیاسی تعلیم کیوں نہ دیتی ہو ادب کے دائرے میں جگہ نہیں پا سکتی۔

اس بات کا ثبوت ہمارے دور کی سیاسی شاعری سے مل جائے گا۔ اس قسم کی شاعری کو خواہ صحافتی اور ہنگامی کہا جائے یا سیاسی اور انقلابی اس میں شک نہیں کہ اس کی روایات ہماری ادبیات میں پہلے سے موجود تھیں۔ شبلی اور ظفر علی خاں کے نام فوراً ہی سامنے آ جاتے ہیں۔ ہمارے اپنے دور میں جوش ملیح آبادی اس کے رہنما ہیں۔ اقبال کا نام اس سلسلے میں اس لئے لینا موزوں نہ ہوگا کہ وہ وقتی حادثے میں بھی عظیم قدروں کی آویزش دیکھ لیتے ہیں اور اقبال نے ہنگامی شاعری کو بھی فلسفیانہ شاعری کا روپ دے دیا۔ جوش البتہ وقت کی بات کہتے ہیں۔

جوش کو انقلابی شاعری کے سلسلے میں جو کچھ کامیابی نصیب ہوئی اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ تصورات جنہیں انھوں نے اپنا موضوع بنایا سارے ہندوستان کے لئے مشترک اور عام تھے مثلاً نسلی منافرت، سیاسی غلامی، قومی نفاق کی مخالفت، یہی ان کے عنوانات تھے۔ اس کے علاوہ ان کی قادر الکلامی نے روایتی انداز بیان سے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور اس طرح ان کی ہنگامی شاعری کو بھی ادبی روپ رنگ مل گیا۔ پھر انھوں نے

اپنی شاعری کو کسی سیاسی پارٹی کے پروگرام سے وابستہ کر دینے کے بجائے عام قومی اُمنگ سے متعلق رکھا جوش کی نادر انقلابی کانگریس یا کمیونسٹ پارٹی کی وقتی سیاست گری کو بھی شاعری کا روپ دے سکتی تھی۔ "وقت کی آواز" اس کا ثبوت ہے۔

لیکن جوش کی انقلابی شاعری محض جذباتیت اور جوشِ بیان سے عبارت ہے اور یہ جذباتیت بھی ایسے نعرہ آفریں تحریک کار کی نہیں ہے جو میدانِ جنگ میں رجز خواں ہو بلکہ اس تماشائی کی ہے جو دور سے کھڑا ہوا لڑنے والوں کے حوصلے بڑھا رہا ہو مگر خود میدان سے دور حفاظت کے پیشِ نظر صف قائم رکھے۔

اسی لئے جوش کے دور ہی سے ہماری شاعری میں انقلابی اور رومانوی شاعری کے درمیان ایک امتیازی لکیر کھنچ گئی۔ گویا انقلاب اور عشق و عاشقی شاعری کی دو الگ الگ شخصیتوں سے متعلق ہوں ایک پر "آتشکدہ" کا عنوان چسپاں کر دیا گیا اور اسے صرف خاص خاص موقعوں پر استعمال کرنے کے لئے محفوظ کر دیا گیا، اور دوسری عام شخصیت کا عنوان خیام کے کسی شعر کو بنایا گیا جس میں سیاسی یا سماجی شعور سرے سے مفقود ہے۔

مجاز کے کلام میں بھی یہ تقسیم موجود ہے لیکن اس کے باوجود مجاز انقلابی نظموں میں بھی اپنے رومانوی پن اور احساس کو راہ دیتے ہیں۔ مجاز کی بہت کم نظمیں سیاسی اور انقلابی کہی جا سکتی ہیں اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان میں سے اکثر کو ان کی بہترین نظمیں نہیں کہا جا سکتا۔ "آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں" "آہنگِ نو" "مہمان" "سرمایہ داری" "بول اری او دھرتی بول" اور "پاکستان کا قومی ترانہ" ان کے مزاج کی بہترین نمائندہ نہیں ہیں۔ ان کا مقابلہ "آج بھی" "رات اور ریل" "نورا" "آوارہ" طلوعِ اشتراکیت سے نہیں کیا جا سکتا۔

سیاسی شاعری کی روایت کو پروان چڑھانے والوں میں مخدوم اور سردار جعفری کے نام نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہاں بہت سے اساتذہ کو نظر انداز کرنا پڑے گا جن میں اقبال، سہیل، سیماب اکبر آبادی اور احسان دانش سے جمیل مظہری تک کئی اچھے اور خوش گو شاعر شامل ہیں لیکن میلانات کا تذکرہ کرتے ہوئے اکثر یہ قربانی دینا ہوتی ہے۔

مخدوم کے کلام میں ایک ستھری اور نکھری ہوئی جذباتیت ہے وہ جوش کی گھن گرج کے قائل نہیں بلکہ سیاسی شاعری میں رومانوی شاعری کی لطافت اور پیار کو اختیار کرتے ہیں اس سے اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ انقلاب کے لئے "رخِ محبوب" کے استعارے اور "بزمِ محفلِ جاناں" کی فضا استعمال کی جاتی ہے جس سے لطفِ بیان میں تو اضافہ ہو جاتا ہے لیکن نفسِ مضمون سے توجہ ہٹ جاتی ہے اس اعتبار سے ان کی مشہور نظم "انقلاب" جہاں شعری لطافت، آہنگ اور لطفِ بیان کے اعتبار سے بڑی کامیاب ہے وہاں اس میں نفسِ مضمون سے انصاف نہیں کیا جا سکا ہے۔ انقلاب کا تصور اردو شاعری کے محبوب کی طرح تشبیہ و استعارے میں چھپ گیا ہے۔

جن معنوں میں جوش اور مخدوم نے سیاسی نظمیں لکھی ہیں فیض نے نہیں لکھیں گو سیاسی محرکات ان کی کئی نظموں میں موجود ہیں وہ ان محرکات اور تأثرات کو تعمیر کی اس سطح سے لکھتے ہیں جہاں ان کا مقصد وقتی اور سیاسی مفاد حاصل کرنا نہیں ہے جذبہ اور احساس میں زیادہ دیرپا اور اہم تغیر کرنا ہے اس طرح سیاسی میلانات وہی صداقت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔

سردار جعفری کی شاعری البتہ سیاسی شاعری ہے ان کی اکثر نظمیں عام طور پر وقتی سیاسی اقدامات کی ترویج و ترغیب کے لئے لکھی گئی ہیں ان کے کلام میں سیاسی کا لفظ محدود معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

سیاست علمِ انسانی کا ایک وسیع شعبہ ہے۔ انسانیت کو کس طرح بہتر سماج کی طرف لے جایا جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کی عملی کوشش اور عمل کی تنظیم اور اس کی مشینری پر مناسب اقتدار حاصل کرنے اور اسے سب کی بہتری کیلئے چلانے کا کام ہی سیاست کہلاتا ہے لیکن یہ سیاست کا وسیع اور دبیز مفہوم ہے اس کو اور محدود کیجئے تو ہر سیاسی پارٹی ایک مخصوص منزل اور طریقہ کار کو انسانیت کیلئے بہتر سمجھتی ہے جیسے کمیونسٹ پارٹی کے نزدیک ملک کی بہتری اسی میں ہے کہ اشتراکی نظام قائم ہو پیداوار اور ذرائع اداروں پر انفرادی قبضے کے بجائے سیاسی یا اجتماعی قبضہ ہو اگر پہلے شعبے کو ہم سیاسیات یعنی (POLILCAL SCIENCE) کہہ سکتے ہیں تو اس پارٹی کے نظام کو آسانی کے لئے (POLICY) کا نام دے سکتے ہیں اور یہ پالیسی چونکہ مقصدِ بعید ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں اس لئے اس مقصدِ بعید کو (STATEGY) کہا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس مقصدِ بعید کو حاصل کرنے کے لئے ہر پارٹی کو چند راستے اختیار کرنے ہوتے ہیں اور عملی زندگی کے ہر واقعے کے بارے میں ایک رویہ قائم

کہ اس سے اپنے مقصد کے لئے فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے مثلاً ہندوستان میں خاتمۂ زمینداری یا مصر میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کا جارحانہ اقدام ایسے نکات ہیں جن کے بارے میں ایک رویہ قائم کر کے اس کی ترویج سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے اور ہر پارٹی اس سے اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کر سکتی ہے۔ اسی قماش کا ایک اور ذریعہ ایجیٹیشن ہے جسے ہر پارٹی وقتی طور پر استعمال کر کے مقصد بعید یعنی طاقت کے حصول کے لئے راستہ ہموار کرتی ہے۔ یہ گویا سیاست کی تیسری اور سب سے محدود شکل ہے جسے عملی سیاست یا وقتی حکمت عملی (TACTICS) کہہ سکتے ہیں۔ عام طور پر ترقی پسند شاعری میں اس تیسرے درجے کی سیاست یا TACTICS کو سیاست کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس فرق کو اگر اردو نظموں کی مثال سے واضح کرنا چاہیں تو سیاست کے وسیع تصور کے سلسلے میں سیاسی آزادی پر لکھی ہوئی نظموں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے تصور کے سلسلے میں جوش کی "شکست زنداں کا خواب" یا مجاز کی "سرمایہ داری" کو پیش کیا جا سکتا ہے اور تیسرے تصور کی نمائندگی سردار جعفری کی ان نظموں سے ہو سکتی ہے جو وقتی TACTICS پر لکھی گئیں مثلاً "ملاحوں کی بغاوت" وغیرہ۔ اسی طرح مجاز کی "طلوع اشتراکیت" کا موضوع عام سیاسی تصور ہے اور "آہنگ نو" میں مخصوص ہنگامی حرکات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

سردار جعفری اپنی نظموں میں خطابت اور پروپیگنڈا کو بہت داخل کر لیتے ہیں لیکن درحقیقت خطابت اور تبلیغ خواہ وہ سیاسی ہی کیوں نہ ہو ہر بڑی شعریت کی تخلیق میں مدد دے سکتی ہے بشرطیکہ اس میں ادبی نقطۂ نظر ضمیر اور جمالیاتی انداز بیان موجود ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو برک کی تقاریر، حضرت عیسیٰ کا وعظ کوہ اور نطشے کی اقوال زردشت کو ادب میں جگہ نہ ملتی لیکن سردار جعفری کی نظمیں وقتی موضوعات کو اعلیٰ زندگی کی سطح تک لے جانے میں ناکام رہی ہیں بلکہ انہوں نے فکری جذبوں کو وقتی موضوعات میں گم کر دیا ہے۔ نظموں سے فوری سیاسی فائدہ حاصل کرنا بنیادی مقصد ہو کر رہ گیا ہے اور جمالیاتی تطہیر اور تربیت کے اس کام کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے جو آرٹ کا حقیقی مقصد ہے۔

اس بحث کا مقصد یہ ہے کہ سماجی شعور یا مقصدیت فی نفسہ شعریت کی مخالف نہیں ہے۔ اگر عصری ترقی پسند شاعری سماجی شعور اور مقصد کو پوری فنی نزاکتوں کے ساتھ سمونے میں ناکام رہی ہے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہماری نئی نسل یا ترقی پسند شاعری کی خدمات سے صریحاً انکار کر دے یا سماجی شعور کو کم درجہ شاعری قرار دے کر محض حسن و عشق کی جنتوں پر قانع ہو جائے۔ نئے دور کی شاعری کو سماجی شعور سے تائب ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ زیادہ وسیع اور بہتر سماجی شعور کی ضرورت ہے جو محض تیسرے درجے کے سیاسی تقاضوں میں الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ ہر جزو میں کل کا جلوہ دیکھ سکے، کائنات اور حیات انسانی کے بارے میں ایک مربوط نقطۂ نظر رکھتا ہو اور اس نقطۂ نظر کو پورے فنکارانہ حسن اور رچاؤ کے ساتھ شاعری میں سمو سکے ـــــ وہ شاعری خواہ آزاد نظم کی صنف میں کی جائے یا غزل کی صنف میں۔

(۴)

صنف خواہ کوئی بھی کیوں نہ استعمال کی جائے یہ ضروری ہے کہ نیا نفس مضمون اپنے ساتھ نئے انداز بیان کا مطالبہ کرے گا اور "طرز ادا" محتاج ہو گا۔ ہمارے شاعروں کو ایسے انداز بیان کی ضرورت ہوگی جس میں تشبیہ و استعارہ کی رنگینیوں اور مرصع کاری کے طلسم پر تکیہ کرنے کے بجائے سادگی ادا اور صدق خیال موجود ہوں اور شاعری خیال کا آئینہ بن جائے خیال کا نقاب نہ بنے۔

یہ اسی وقت ممکن ہے جب تخیل آرائی کی جگہ خیال اور فکر کی گہرائی جدید شاعری کا بنیادی عنصر قرار پائے اور ہمارے شاعر روایتی چیزوں اور پرانے لفظی ہتھکنڈوں سے کامیابی حاصل کرنے کی جگہ حیات انسانی کے مشاہدے اور مطالعے کی کوشش کریں۔ [illegible] پرانے تصورات تازہ کرنے کے بجائے حیات و کائنات کے مسائل پر نئے سرے سے غور کریں اور ذرات کو حریفوں کے لئے چھوڑ کر خورشید پر بڑھ کے ہاتھ ڈالیں۔

تذکرۂ شعرائے اُردو

وحید قریشی

میر حسن کے تذکرۂ شعرائے اردو کا زمانۂ تالیف طبع اول کے دیباچے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "یہ تذکرہ میر حسن نے اس زمانے میں لکھا جب کہ دلی کو خیرباد کہہ کر فیض آباد میں سکونت پذیر تھے چنانچہ خود اپنے حال میں لکھتے ہیں: "شروع جوانی از گردش روزگار...... بطرف لکھنؤ و فیض آباد رسیدم" تذکرہ میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں مثنوی رموز العارفین ہے "گلزار ارم" نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سال تصنیف ۱۱۸۸ھ ہے اور گلزار ارم کا ۱۱۹۲ھ۔ رموز العارفین کی نسبت لکھا ہے کہ وہ مشہور ہو چکی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا۔"
>
> مقدمۂ تذکرۂ شعرائے اردو، طبع اول

طبع اول کی نوبت سنہ ۱۹۲۲ء میں آئی تھی۔ طبع ثانی سنہ ۱۹۴۰ء میں ہوئی اور متن کا مقابلہ بعض دوسرے قلمی نسخوں سے بھی کیا گیا جن میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا نسخہ قابل ذکر ہے۔ طبع جدید میں بھی وہی قدیم دیباچہ من و عن شامل ہے۔ البتہ کتاب کے آخر میں ایک ترقیمہ اضافہ کیا گیا ہے جس میں تذکرے کی تالیف کا کچھ اور حال کھلتا ہے:

> "الحمد للہ والمنۃ کہ این تذکرہ من تالیف فقیر حقیر پر مودہ رنج و محن میر حسن در تاریخ یک ہزار و یکصد و نود و یک ہجری بہ انجام رسید۔"
>
> خاتمہ طبع ثانی صفحہ ۲۰۰

ان اقتباسات پر بحث کرتے ہوئے محمود فاروقی صاحب "میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء" میں لکھتے ہیں:

> "یہ تخمینہ (تصنیف مابین ۱۱۸۸ھ و ۱۱۹۲ھ) اپنی جگہ پر درست ہے لیکن اب یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ میر حسن نے اپنا تذکرہ ۱۱۹۱ھ میں ختم کیا تھا۔" (میر حسن اور ان کے خاندان کے دوسرے شعراء ص ۲۲۵)

رام بابو سکسینہ اپنی کتاب میں تذکرے کے بارے میں رقمطراز ہیں:

THE DATE OF THE COMPOSITION IS NOT MENTIONED BUT AN ENAMATION OF VARIOUS DATES MENTIONED IN THE BODY OF THE "TAZKIRA" POINTS OUT 1194 A.H. (1780 A.D.) AS THE APPROXIMATE DATE OF COMPOSITION, WHEN SANDA WAS SEVENTY YEARS OF AGE.

(A HISTORY OF URDU LITERATURE P. 70.),

مرزا محمد حسن عسکری اس اقتباس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

"اس کا سال تصنیف کہیں مذکور نہیں مگر ان تاریخوں سے جو خود تذکرہ میں موجود ہیں ۱۱۹۴ھ بہت قرین قیاس معلوم ہوتا ہے اور یہ وہ سن تھا جبکہ مرزا رفیع سودا کی عمر ۷۰ برس کی تھی۔"

(تاریخ ادب اردو طبع لاہور ص۱۲۵)

مولانا عبدالباری آسی ۱۱۹۲ھ اور ۱۱۹۶ھ کے حق میں معلوم ہوتے ہیں:

"اگرچہ سنہ تصنیف کا کہیں تذکرہ میں ذکر نہیں تاہم محققین کا خیال ہے کہ یہ ۱۱۹۶ھ یا ۱۱۹۲ھ کی تصنیف ہے۔ تاریخ ادب اردو میں ۱۱۹۲ھ اور مقدمہ تذکرہ میں ۱۱۹۶ھ و ۱۱۹۲ھ لکھا ہے۔"

(دیباچہ مثنویات میر حسن ص۸)

رام بابو سکسینہ کا استدلال سودا کے ترجمے پر مبنی ہے۔ سودا نے ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔ وفات کے وقت اس کی عمر بقول صاحب گلشن ہند و صاحب آب حیات ستر برس تھی۔ تاریخ ولادت ۱۱۲۵ھ ہوگی تو یہ حال ۱۱۹۴ھ میں لکھا گیا ہوگا کیونکہ تالیف تذکرہ کے وقت بقول میر حسن "سن شریفش ہفتاد رسیدہ باشد"۔ لیکن سکسینہ کا یہ خیال غلط ہے کیونکہ میر حسن خود اسی اقتباس میں کہتے ہیں "الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بوسیلۂ شاعری سرفراز است"۔ شجاع الدولہ باتفاق مورخین ۱۱۸۸ھ میں فوت ہوئے اس لئے سکسینہ کا قیاس درست نہیں ہے کہ میر حسن نے سودا کا حال ۱۱۹۴ھ میں لکھا۔

مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے دستور الفصاحت کے دیباچے میں تذکرۂ حسن کی تالیف کا زمانہ متعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خود میر حسن نے تکمیل تذکرہ کا سنہ ۱۱۹۰ھ قائم کیا ہے:

"اس سے یہ قیاس کرنا بجا ہے کہ کتاب کی تالیف و ترتیب کا کام ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) میں ختم ہو گیا تھا۔ البتہ بعد میں بھی مصنف نے اضافے کئے ہیں جن میں سے ایک شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے جو ۱۱۹۲ھ (۱۷۷۸ء) میں واقع ہوئی تھی۔"

اب اس کے سال آغاز کا مسئلہ باقی رہتا ہے۔ کتاب کے مختلف مقامات سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے رموز العارفین مصنفہ ۱۱۸۷ھ (۱۷۷۳ء) کا ذکر ہے۔ جیسا کہ صدر یار جنگ بہادر نے ارشاد فرمایا ہے۔ اس کے ماسوا احسن اور سودا کے حال میں لکھا ہے کہ یہ دونوں نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں ملازم ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ حالات شجاع الدولہ کی زندگی میں لکھے گئے۔ شجاع الدولہ ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ (۲۶ جنوری ۱۷۷۵ء) کو فوت ہوئے تھے۔ لہٰذا یہ حالات اس تاریخ سے پہلے لکھے گئے ہوں گے۔ اسی طرح نواب محمد یار خاں بہادر (متوفی ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ) کو [illegible] قائم بادہ لکھا ہے گویا ان کا حال بھی اس ماہ و سال سے پہلے لکھا ہے۔

اب یہ طے کرنا چاہئے کہ نواب شجاع الدولہ اور نواب محمد یار خاں بہادر کے انتقال سے کتنا پہلے کام شروع کیا۔ میرزا مظہر کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں:

"الحال بطرف سنبھل مراد آباد استقامت دارد و جہاں جادو خطائی فرماید۔"

میرزا مظہر علیہ الرحمۃ کے ایک خط میں ان کے سفر روہیل کھنڈ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس خط کو شاہ نعیم بہرائچی نے معمولات مظہریہ میں نقل کیا ہے۔ میرزا صاحب اپنے مرید میر علی کو لکھتے ہیں:

"آنچہ از عالم تحریر معاش نوشتہ اند بجا است، اما فقیر را طاقت حرکت و دماغ سیر و سیاحت ہرگز نماندہ بلکہ بر داشت یاران طریقہ کہ از اطراف ہجوم کردہ اند آمدہ ام۔ بعد دو ماہ بدہلی می روم کہ متعلقان آنجا ہستند و از ہر طرف فتنہ قصد دہلی می کند۔ یاہی ہمہ زمینداران این حدود با فقیر صدق دارند عقیدت معلوم۔ یاد دارند کہ روز ملاقات این قصہ را باشما گفتہ ام کہ خانساماں و بخشی، یعنی فتح خاں و سردار خاں را در تمام عمر خود گاہی ندیدہ ام و قصد ما کرد ارادہ ملاقات فقیر داشت منع کردم کہ نیایند و حافظ رحمت خاں کہ پیش فقیر حاضر شدہ بود صحبت او با فقیر نادر افتاد و پسران علی محمد خاں را ہرگز نمی شناسم۔ ربط کجا و سفارش معلوم۔"

اس خط سے مقام کتابت پوری طرح متعین نہیں ہوتا لیکن ایک اور خط بنام میر محمد معین صاحب میں فرمایا ہے:

"امروز کہ دوم شوال است، بتقریب تعزیت حضرت خان صاحب یعنی والی فرزند گرامی کہ جامع ہزاراں مناقب بودند و از انتقال ازین عالم فانی یادگار گذاشتہ کہ بس اند آمدہ حاضر ام و بعد توقف سہ شبانہ روز ارادہ مراجعت بہ سنبھل خواہم نمود۔"

ان دونوں خطوں کے پڑھنے سے ہم اس نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں کہ (الف) میرزا مظہر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ سفر نواب دوندے خاں کی حیات میں واقع ہوا تھا۔ (ب) اس زمانے میں چاروں طرف سے فتنہ و فساد دہلی کا رخ کر چکا تھا اس لئے میرزا صاحب دو ماہ کے بعد اپنے متعلقین کی خبرگیری اور حفاظت کے خیال سے دہلی واپس جانا چاہتے تھے۔ (ج) اور وہ ۲۔ شوال تک آنولے میں قیام کر کے گیارہویں تاریخ کو سنبھل کی طرف سفر کرنے کا قصد تھا ـــــ اخبار الصنادید میں نواب دوندے خاں بہادر کی تاریخ وفات ۲۰ محرم ۱۱۸۲ھ (۲۸ اپریل ۱۷۶۸ء) بتائی گئی ہے۔ لہذا میرزا صاحب کا سفر روہیل کھنڈ اس سنہ کے شروع ہونے سے قبل کا واقعہ قرار پاتا ہے۔ جس فتنے کا میرزا صاحب نے اپنے مکتوب میں حوالہ دیا ہے اس سے مرہٹوں کی دلی پر چڑھائی مراد ہے۔ انھوں نے ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) میں بہت بڑے لشکر کی صورت میں دریائے چنبل عبور کر کے دلی کا رخ کیا تھا مگر نواب نجیب الدولہ بہادر نے فرخ آباد کی تسخیر کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ آغاز ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) میں یہ مہم مرہٹوں نے شروع کر کے قلعہ شکوہ آباد روہیلوں سے لینے کے بعد صلح کر لی۔ اسی سال غالباً رجب میں نواب نجیب الدولہ بہادر کا انتقال ہو گیا اور مرہٹے دلی کی طرف بڑھے۔ چنانچہ سنہ ۱۱۸۴ھ میں ضابطہ خاں دلی چھوڑ کر چلے گئے اور اس پر مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ دلی پر قبضہ کر کے مرہٹوں نے شاہ عالم کو الہ آباد سے بلا کر تخت نشین کیا اور نواب ضابطہ خاں پر یورش کر کے سکرتال میں انھیں شکست دی۔ اس سے یہ قیاس کرنا بے جا نہیں کہ ۱۱۸۰ھ میں میرزا صاحب آنولے یا سنبھل میں تھے چونکہ انھوں نے ۲۔ شوال تک آنولے میں قیام ظاہر کیا ہے اور تقریباً اسی زمانے میں مرہٹوں نے فرخ آباد کی مہم سر کی ہے۔ اس لئے یہ سفر شوال ۱۱۸۰ھ (مارچ ۱۷۶۷ء) میں واقع ہونا چاہئے اور اس زمانے میں ان کا یہ لکھنا درست ہے کہ فتنہ دلی کا قصد کر رہا ہے لہذا میں دو مہینے کے سفر کے بعد دلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ اب اگر میر حسن نے ان کے حالیہ سفر کا ذکر کیا ہے تو اس حصے کی تالیف شوال ۱۱۸۰ھ یا اس کے قریب قریب ہونی چاہئے۔ اس کی تائید قیم کے ذکر سے ہوتی ہے۔ میر حسن نے اس کا حال اس انداز سے لکھا ہے کہ ہمیں اس کی زندگی کا یقین ہوتا ہے۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ ہندی گویاں میں لکھا ہے

کرسکرتال کی لڑائی کے بعد یتیم کا انتقال ہوا۔ مولوی قدرت اللہ شوق نے "تکملۃ الشعراء" میں بتایا ہے کہ ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء) میں رحلت کی ہے چونکہ سکرتال کی جنگ بھی اسی سال کا واقعہ ہے اس بنا پر ان دونوں بیانوں میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ میر حسن نے اس کا حال ۱۱۸۶ھ سے قبل لکھا ہے جو بعید نہیں کہ ۱۱۸۵ھ ہی کا واقعہ ہو جب کہ اس نے میرزا مظہر کا حال لکھا تھا۔

مزید تائید میں میر حسن کے اس جملے کو پیش کیا جا سکتا ہے جو مصحفی کے بارے میں لکھا ہے کہ "احوال وے شاہجہان آباد و بہ پیشہ تجارت بسر می برد" میری رائے یہ ہے کہ میر حسن نے جس زمانے میں یہ فقرہ لکھا ہے مصحفی دلی سے نکل کر ٹانڈے اور وہاں سے لکھنؤ نہیں گئے تھے۔ اگر لکھنؤ کا سفر اختیار کر چکے تھے تو ناممکن تھا کہ مصنف اس کا ذکر نہ کرتا۔ مصحفی نے لکھنؤ کا یہ سفر ۱۱۸۶ھ میں سکرتال کی جنگ کے بعد اختیار کیا تھا۔ اس بنا پر یقین ہے کہ ان کا حال بھی ۱۱۸۶ھ کے لگ بھگ لکھا گیا ہے۔ اسی سلسلے میں میر شمس الدین فقیر کے متعلق یہ فقرہ قابل توجہ ہے:

"درینولا بطرف کربلائے معلی تشریف بردہ بود، بجان جان بجوار رحمت ایزدی پیوست۔"

فقیر کا انتقال اس سفر سے واپسی پر ۱۱۸۳ھ (۱۷۶۹ء) میں ہوا ہے۔ "درینولا" ایسے واقعے سے متعلق استعمال کیا جا سکتا ہے جو حال ہی میں ظہور پذیر ہوا ہو۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ان کا حال بھی ۱۱۸۳ھ کے قریب لکھا ہوگا۔

ان دلائل کے پیش نظر میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ میر حسن نے ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) میں یا اس سے کچھ پیشتر تذکرہ شروع کر کے ۱۱۸۶ھ یا ۱۱۸۷ھ میں ختم کر دیا تھا۔ بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات ہے جو ۱۱۹۲ھ میں واقع ہوئی تھی۔"

(دیباچہ دستور الفصاحت ص ۹۲ تا ص ۹۶)

جوشی صاحب نے میرزا مظہر جان جاناں کے سفر روہیل کھنڈ کا سنہ ۱۱۸۳ھ مقرر کیا ہے اور اس کی بنیاد پر میر حسن کے مندرجہ ذیل اقتباس کی تحریر کا زمانہ ۱۱۸۳ھ قرار دیا ہے:

"احوال بطرف سنبھل مراد آباد استقامت دارد و بجان جادو سخنی فرماید"

لیکن کلمات طیبات (رقعہ ۷۰) سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا مظہر جان جاناں کو سنبھل جانے کا کئی سال سے اتفاق ہوتا رہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اقتباس بالا میں میر حسن نے ۱۱۸۱ھ کے سفر کا ذکر کیا ہو۔ اس زمانہ میں مظہر سنبھل ہی میں تھے اور وہاں سے دلی آئے تھے۔ چنانچہ کلمات طیبات کے مکتوب بست و ششم (ص ۲۸) میں نواب ارشاد خان کی شاہ عالم کے ساتھ واپسی (بعد از شکست ضابطہ خان) کا ذکر موجود ہے نیز اسی میں ارشاد خاں کے ۱۲ ربیع الاول (۱۷۷۱ء) میں داخلہ دہلی اور فوری انتقال کا حال بھی لکھا ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں میرزا مظہر کا حال ۱۱۸۶ھ کے لگ بھگ لکھا گیا۔ اسی طرح مصحفی کے حال میں ان کا یہ قیاس کہ ان کا ترجمہ ۱۱۸۸ھ کے لگ بھگ لکھا گیا بغیر کسی شہادت کے قابل قبول نہیں۔ ہم یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ مصحفی کا حال اس کی دہلی میں واپسی کے بعد لکھا گیا ہو۔ یتیم اور شمس الدین فقیر کے بارے میں جوشی صاحب کے بیانات درست ہیں اور اس کا قوی امکان ہے کہ ان دونوں کا ذکر ۱۱۸۶ھ کے لگ بھگ کیا گیا ہو۔ ان شعراء کے ساتھ حیرت کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ حیرت کے حال میں میر حسن لکھتے ہیں:

"مراد علی حیرت تخلص متوطن مراد آباد طبع رسا دارد، سلامت باشد"

(تذکرہ شعرائے اردو طبع ثانی ص ۴۸)

مصحفی تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں:

"فقیر او را در آن ایام کہ بہ دلی تشریف رو دے در شکر دیدہ بود..... درین ایام تسلیم بطرف کوہ برائے کارے
حسب ایمائے رئیسے رفتہ بود کہ آفتاب زندگیش در جای کوہ رو بغروب نہاد"

(تذکرۂ ہندی ص ۸۱)

مصحفی ۱۱۸۶ھ میں آنولہ میں تھے اور وہ خود لکھ رہے ہیں کہ حیرت اسی زمانے میں فوت ہوئے۔ میر حسن نے حیرت کا ذکر بطور زندہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۱۸۶ھ سے قبل یہ حال لکھا گیا ہوگا۔

تذکرہ شعرائے اردو کے باقی شعرا میں سے جن کے سنین تراجم متعین کئے جا سکتے ہیں حسب ذیل ہیں:

(۱) احسن کے حال میں میر حسن بیان کرتے ہیں:

"اوائل استفادہ از میر ضیاء حاصل کردہ الحال شعر خود را پیش میرزا رفیع می گذراند...... بوسیلۂ شاعری در سرکار نواب شجاع الدولہ سرفراز است۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص۱۱)

میر ضیاء؛ اغلب یہ ہے کہ ۱۱۸۲ھ تک وہ اور میر حسن تک فیض آباد پہنچ چکے تھے اور ۱۱۹۱ھ کے لگ بھگ عظیم آباد چلے گئے تھے۔ اسپرنگر بحوالہ عاشقی عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ ضیاء نے چالیس سال ہوئے پٹنے میں سکونت اختیار کی (یادگار شعراء اردو ترجمہ اسپرنگر ص۱۲۹) عاشقی کا تذکرہ بقول عرشی (دیباچہ دستور الفصاحت، ص۱۲۲) ۱۲۲۱ھ اور ۱۲۳۳ھ کے درمیان لکھا گیا۔ اگر ضیاء کا حال ۱۲۲۳ھ ہی میں لکھا گیا ہو تو عظیم آباد کی سکونت ۱۱۸۳ھ کے لگ بھگ اختیار کی ہوگی۔ ۱۱۸۶ھ سے قبل ضیاء کے ترک سکونت کو اس قیاس سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ مصحفی فیض آباد جا کر سودا سے ملتے ہیں (تذکرہ ہندی ص۱۲۶) لیکن ضیاء سے کسی ذاتی واقفیت کا کوئی ثبوت نہیں دیتے۔ اگر ضیاء وہاں ہوتے تو ضرور تھا کہ فیض آبادی شعراء کے استاد سے بھی ان کا ملنا ہوتا۔ مصحفی تو اس کے بارے میں اسی قدر لکھتے ہیں: "بندہ او را ندیدہ" (تذکرۂ شعرائے اردو ص۱۳۲) مذکورہ بالا اقتباس میں شجاع الدولہ کا ذکر بطور زندہ کیا گیا ہے۔ شجاع الدولہ نے ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی۔ احسن کا حال ۱۱۸۲ھ اور ۱۱۸۸ھ کے مابین لکھا گیا۔

(۲) اجمل کے بارے میں حسن رقمطراز ہیں:

"الحال مسند نشین حضرت شاہ خوب اللہ۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص۱۲)

اجمل اپنے بھائی کی وفات پر ۱۱۸۷ھ میں مسند نشین ہوئے۔ چنانچہ تذکرۂ مسرت افزا میں ہے:

"و در صحبت سراسر برکت برادر خود قطب العارفین قطب الدین الٰہ آبادی...... تربیت یافتہ...... بعد تشریف بردن برادر گرامی خود به بیت اللہ و انتقال وے در آں ارض مقدس بر مسند مشیخت نشست و زینت بخش سجادۂ نیاگان خود شد۔"

(مسرت افزا ص۱۲)

"قطب الدین مصیب در عشرۂ اولیٰ ماہ شعبان سنہ یک ہزار و یک صد و ہشتاد و شش...... توکلا علی اللہ از خانہ برآمدہ...... بیت اللہ رسید...... سلخ ذیقعدہ سنہ یک ہزار و ہشتاد و ہفت ہجری بجوار حق پیوست...... شاہ اجمل...... قطعۂ تاریخ وفات وے...... بسلک نظم آوردہ......"

(مسرت افزا ص۱۰۵، ۱۰۶)

اس حساب سے یہ حال ۱۱۸۷ھ کے بعد لکھا گیا۔

(۳) میر حسن افسوس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"الحال در سرکار نواب سالار جنگ بہادر سرفراز است۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص۱۲)

افسوس سالار جنگ کی سرکار میں ۱۱۸۸ھ یا ۱۱۸۹ھ میں داخل ہوئے۔ خود دیباچہ سحرالبیان میں لکھتے ہیں:

> "راقم کو اس میر حسن سے دوستی دلی تھی۔ کبھی رنجش خفگی باہم نہیں ہوئی۔ حالانکہ اسی سرکار میں میں بھی نوکر اور اسی صاحبزادے کا ہم نشین تھا۔ دس برس تک رات دن ایک جگہ رہے۔۔۔۔ آخر جب یہ تفرقہ پڑا زمانے نے باہم تفرقہ ڈالا۔ اتفاقاً میرا روزگار سنہ گیارہ سو اٹھانوے میں صاحب عالم مرزا جواں بخت کی سرکار میں ہوا۔"

(دیباچہ سحرالبیان صفحہ ۱۰)

ان کا حال کم و بیش ۱۱۸۸ھ میں داخل تذکرہ کیا گیا۔ آخری حد ۱۱۸۹ھ ہے۔ ہم نے اوپر تذکرۂ شعرائے اردو کی تالیف کی آخر تک ۱۱۹۲ھ پیش کی تھی جبکہ حسن نے اس کا ترقیمہ لکھا۔ ایک آدھ اضافہ بعد کا ہے۔ لیکن قاضی عبدالودود صاحب کے پاس تذکرۂ شعرائے اردو کا ایک ایسا قلمی نسخہ موجود ہے جس کے خاتمے میں ۱۱۸۸ھ تاریخ تصنیف لکھی ہے۔ بعض نسخوں میں اس کے بعد کی بھی کچھ باتیں مندرج ہیں۔" (حاشیہ تذکرۂ شعرائے ابن طوفان صفحہ ۲ انتخاب) پر معلوم ہوا کہ ان کے نسخے میں افسوس کا حال موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ افسوس کا حال ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۸۹ھ کے مابین لکھا گیا۔

(۴) تذکرۂ شعرائے اردو میں محمد اشرف کے حال میں ہے:

"بہ مدار المہامی اخبار فرنگی جان برسٹو صاحب سرفراز است"

(تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۲۴)

جان برسٹو جوہری گھاٹ پر آصف الدولہ سے بطور ریذیڈنٹ آکر ملے تھے۔ اسی زمانے میں ریذیڈنٹ ہو کر آئے تھے۔ ۱۰ ربیع الاول ۱۱۸۹ھ کو ایک معاہدے پر دستخط بھی کئے (تاریخ اودھ نجم الغنی جلد سوم صفحہ ۴۹)، چونکہ اشرف کا حال قاضی عبدالودود صاحب کے نسخے میں بھی موجود ہے لہٰذا ۱۱۸۹ھ ہی میں داخل تذکرہ کیا گیا۔

(۵) سوز کے بارے میں لکھا ہے:

"الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بوسیلۂ فن شاعری سرفراز است۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۸۰)

شجاع الدولہ نے ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی۔ ظاہر ہے یہ حال اس سنہ سے قبل لکھا گیا ہوگا۔

(۶) فغاں کے بارے میں میر حسن کا بیان ہے:

"فغاں خوش اختلاط بود"

(تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۱۱۸)

فغاں کے بارے میں قطعی طور پر معلوم ہے کہ وہ ۱۱۸۶ھ میں فوت ہوئے۔ اس لئے ثابت ہے کہ یہ حال ۱۱۸۶ھ کے بعد لکھا گیا۔

تذکرہ گلزار ابراہیم میں فرحت کی وفات کا سنہ ۱۱۹۱ھ دیا گیا ہے۔

گویا فرحت کا حال ۱۱۹۱ھ سے قبل تحریر ہوا۔

(۷) تذکرۂ شعرائے اردو کے صفحہ ۱۱۲ پر فرحت کو سلمہ اللہ لکھا ہے۔

(۸) شاہ فصیح کا حال قاضی صاحب کے نسخے میں نہیں ہے گویا ۱۱۸۸ھ کے بعد تحریر ہوا۔ شاہ فصیح کے حال کے بعض فقرے جن میں ان کا ذکر

بطور زندہ شخص کے ہوا ہے اور مطبوعہ نسخے کی طبع ثانی میں شامل ہیں۔ ۱۱۹۰ھ اور ۱۱۹۱ھ کے مابین لکھے گئے ہوں گے لیکن مندرجہ ذیل فقرہ:

"در سال یک ہزار و یک صد و نود و دو بہ رحمت حق پیوست۔"

۱۱۹۲ھ میں یا اس کے بعد لکھا گیا۔

(۹) میر حسن قائم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"الحال در سنبھل مرادآباد است۔"

قرائن ظاہر کرتے ہیں کہ قائم کا قیام سنبھل ۱۱۹۰ھ کے لگ بھگ ہو سکتا ہے۔ یہ حال اسی زمانے میں لکھا گیا ہو تو عجب نہیں۔

(۱۰) گدا کے حال میں ہے:

"در لکھنؤ بہ نظر می آید" (تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۱۹۲)

میر حسن غالباً ۱۱۹۰ھ یا ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ گئے۔ یہ حال اسی تاریخ کے بعد لکھا گیا ہوگا۔

(۱۱) مصیب:

"لیکن از راحت منزل مقصود جاں بہ جان آفریں سپرد۔"

(تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۱۵۱)

تذکرۂ مسرت افزا میں تاریخ وفات مصیب ۱۱۹۱ھ "قطب زماں وفات یافت"۔ حسن نے یہ حال ۱۱۹۱ھ کے بعد لکھا ہوگا۔

(۱۲) معتقین:

"مدتے در الہ آباد بسر بردہ الحال شنیدہ ام کہ بطرف خیرآباد است۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۱۹۵)

معتقین الہ آباد میں شاہ عالم ثانی کے ملازمین میں تھا۔ شاہ عالم نے ۱۱۸۵ھ میں الہ آباد سے دلی کی طرف کوچ کیا اور یہ محفل برہم ہوئی۔ اس لئے میر حسن نے معتقین کا حال ۱۱۸۵ھ کے بعد لکھا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے مسرت افزا صفحہ ۲۳۳)

(۱۳) مذاق کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں:

"از راہ قدرشناسی و نکتہ دانی ۔ ۔ ۔ ۔ عنایت خاں غفر اللہ لہ سہ صد روپیہ ماہوار
می داد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الحال معلوم نیست کہ کجا است۔"

(تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۱۶۲)

یہاں عنایت خاں پسر حافظ رحمت خاں کا ذکر بطور مردہ کیا ہے۔ لازماً یہ حال ۱۱۸۰ھ کے بعد لکھا گیا۔

(۱۴) نواب محبت خاں کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں:

"محبت با صلاح خواجہ حسن یا میاں حسرت جرأت نمودہ۔"

(تذکرہ صفحہ ۱۵۱)

نواب محبت خاں ۱۱۸۹ھ میں مہندی گھاٹ پر آصف الدولہ کے پاس آئے — ان کا حال ۱۱۸۹ھ میں یا اس کے بعد داخل تذکرہ کیا گیا ورنہ خواجہ حسن اور میاں حسرت کے ذکر کا کیا موقع تھا۔

(۱۵) ولایت کے بارے میں میر حسن لکھتے ہیں:

"قریب دوازدہ سال شدہ باشد کہ بہ رحمتِ الٰہی پیوست"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۹)

ولایت کی وفات کے بارے میں ہمیں قطعی طور پر معلوم ہے کہ بعمر ۸۰ برس ۱۱۷۸ھ میں وفات پائی۔ اس سے ان کا حال حسن نے بارہ برس بعد یعنی ۱۱۹۰ھ میں لکھا۔

(۲) مصحفی کے بارے میں میر حسن کا کہنا ہے کہ:

"الحال در شاہجہان آباد بہ پیشۂ تجارت بسری برد"

(تذکرۂ شعرائے اردو ص ۱۴۵)

یہ حال اغلب یہ ہے کہ ۱۱۹۰ھ کے بعد رقم ہوا جب کہ مصحفی سفر سے واپس دلّی جا چکے تھے۔

(۳) میر حسن نے اپنا حال ۱۱۸۸ھ کے بعد لکھا جب کہ رموز العارفین تصنیف کر چکے تھے۔ قاضی صاحب کے نسخے میں یہ حال موجود ہے اس لیے ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۰ھ کے مابین تحریر ہوا ہوگا۔

ان قرائن سے جن کے سنین ایک حد تک متعین ہو سکتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے تذکرۂ شعرائے اردو کی تالیف کا کام اغلب یہ ہے کہ ۱۱۸۸ھ کے قریب شروع کیا۔ زیادہ شعراء کے حالات ۱۱۸۸ھ کے آس پاس تحریر ہوئے۔ پہلا مسودہ ۱۱۹۰ھ میں تکمیل پا گیا۔ پھر خاتمہ ۱۱۹۱ھ میں لکھا گیا۔ بعد ازاں صرف شاہ فصیح کی تاریخ وفات داخلِ تذکرہ ہوئی۔ اس بات کا قرینہ نہیں کہ اس کے بعد اور اضافے بھی ہوئے ہوں۔

صاحب

یہ کتاب ان اسکیچوں کا مجموعہ ہے جو محمد طفیل مدیر نقوش نے وقتاً فوقتاً لکھے۔ ان اسکیچوں میں پورے خلوص اور پوری دیانت کے ساتھ مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تمام اچھی اور بری باتوں کو نقل کر دیا گیا ہے۔ اس میں سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، شوکت تھانوی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، عابد علی عابد اور احسان دانش کے اسکیچ شامل ہیں۔

قیمت ۳/۰

شعلۂ طور

یہ جگر مرادآبادی کا وہ مقبولِ عام مجموعۂ کلام ہے جسے اردو شاعری میں سب سے زیادہ قدر و منزلت حاصل ہوئی۔ ہمارے اس ایڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اسے از سر نو مرتب کیا اور کئی کمزور اشعار کو حذف کر کے کئی ایک غیر فانی اشعار کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

قیمت ۴/۸

ادارۂ فروغ اردو - لاہور

قدیم مشاعرے کی ادبی اہمیت

آفتاب احمد

میں نے عنوان میں صرف مشاعرے کے ساتھ قدیم کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ میرے نزدیک آج کل کے مشاعروں کی ادبی اہمیت محل نظر ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری موجودہ معاشرتی اور کلچرل فضا میں مشاعرہ ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مشاعرہ محفل ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مشاعرہ ایک سستی قسم کے ہنگامۂ ہاؤ ہو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جس میں شعر محض برائے بیت ہی رہ گیا ہے۔ یہ زوال در اصل اس انقلاب کا نتیجہ ہے جو گزشتہ نصف صدی کے دوران میں ہماری ادبی روایت اور ادبی شعور میں رونما ہو چکا ہے۔ بیسویں صدی کی دنیا میں شاعر اور اس کے سامعین یا قارئین کے درمیان ذہنی ربط و یگانگت اور افہام و تفہیم کا وہ بے تکلف وسیلہ جو ہمارے ان مشاعروں کی صورت میں رواج پا گیا تھا، معطل ہو گیا ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے یہی اس مضمون کا موضوع ہے۔

قدیم مشاعرے کا ایک جزمیہ اور تفریحی پہلو ضرور تھا جس سے انکار نہیں۔ یوں دیکھا جائے تو خود ادب و شعر کا تفریحی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور پھر مشاعرہ تو شعری مجلس ہوا۔ اور مجلس کے لوازمات میں تفریح بھی ہے مگر جس طرح شعر کو محض تفریح کا سامان سمجھ لینا کم نظری ہے، اسی طرح مشاعرہ کو محض ایک ہنگامۂ ہاؤ ہو سے تعبیر کرنا بھی اپنی شاعری کی روایت سے بے خبری کی علامت ہے۔ ایسے مشاعرہ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی اس امر سے کہ وہ کسی عہد میں اور کیونکر پیدا ہوا کچھ واقفیت نہیں ہے اور نہ مجھے اس کے آداب و رسوم کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا حال معلوم ہے اس لئے میں اس مختصر سے مضمون میں ان باتوں کے متعلق کچھ عرض کرنے سے قاصر ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ادارہ غالباً خالص ہندی تو نہیں ہے۔ اور ہندی مزاج نے جہاں اپنی عام زندگی کی رسموں اور تہواروں کو رنگینی اور دلکشی بخشنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی وہاں مشاعرہ کو بھی ایک ادبی جشن کی صورت دے دی تھی۔ یہ ادبی جشن مقررہ تاریخوں پر بڑے اہتمام سے منایا جاتا تھا اس کے آداب و رسوم میں جو رکھ رکھاؤ اور سلیقہ برتا جاتا تھا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری قدیم معاشرت میں کلچر کو کیا مقام حاصل تھا اور ادب و شعر سے ہمارے تہذیب یافتہ طبقوں کی دلچسپی کا کیا عالم تھا۔ مشاعرہ کی رسم کا صدیوں تک نبھایا جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ لوگ اپنے شعری کلچر اور اپنی شعری روایت کا کس درجہ احترام کرتے تھے اور انہیں اس کے تحفظ اور فروغ سے کس قدر شغف تھا۔ اردو شاعری کے کسی تذکرے میں اگر اردو مشاعروں کی زندہ اور جیتی جاگتی تصویریں نہیں ملتیں تو وہ ادھورا ہے جو کچھ بھی ہو صحیح معنوں میں ہماری شاعری کا تذکرہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ کیونکہ قدیم اردو شاعری (اور یہاں میری مراد قدیم غزل گوئی سے ہے کہ ہماری شاعری کا مقبول ترین اور شاید بلند ترین حصہ اس

صنفِ سخن میں ملتا ہے، اس کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم مشاعرہ کو ایک ادبی ادارہ کی حیثیت سے اس زمانے کی مخصوص کلچرل فضا کی پیداوار سمجھتے ہوئے پیشِ نظر رکھیں۔ آزاد کی 'آبِ حیات' بطور تاریخ ناقص سہی اس کی تحقیق ہمارے نقطۂ نظر سے غلط اور خام سہی مگر آج نصف صدی کے گزر جانے کے بعد بھی اور نصف درجن سے زائد تذکرے لکھے جانے کے بعد بھی ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ آزاد نے جو کچھ آبِ حیات میں لکھا ہے تاریخِ ادب میں اس کا جواب ذرا مشکل سے ملے گا۔ آبِ حیات، خاص علمی نقطۂ نظر سے تاریخ تو نہیں اس کی اصل خوبی اس میں ہے کہ وہ اردو شاعری کا نگار خانہ ہے۔ آزاد محقق نہیں نقاد نہیں، اردو نثر کا سب سے بڑا نقاش ہے، اور آبِ حیات میں اس کے موقلم نے وہ جادو جگایا ہے کہ بایدو شاید۔

ہاں تو ذکر یہ تھا کہ قدیم مشاعرہ کی ادبی اہمیت کا اندازہ میں یہ کہنے والا تھا کہ اس پر ایک کلچرل ادارے کی حیثیت سے غور ہونا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ اس مخصوص کلچرل فضا پر بھی جس نے مشاعرہ کو نہ صرف عملی جامہ پہنایا بلکہ اسے ایک پوری شعری روایت کے امانت دار ہونے کا درجہ بخش دیا۔ مشاعرہ ہماری ایک اہم ادبی ضرورت کو پورا کرتا رہا ہے جو ہمارے ہاں اس زمانے کی کلچرل فضا سے مخصوص تھی۔ جب وہ صورت بدلی تو مشاعرہ بے رنگ ہونے لگا اور رفتہ رفتہ اس کی ادبی اہمیت کم سے کم تر ہوتی گئی ——

بات یہ ہے کہ مشاعرے کی بدولت ہمارے شاعروں اور ان کے سامعین کو ایک ایسی چیز میسر آ گئی تھی جس کی مثال دنیا بھر کے ادب میں بہت کم ملتی ہے اور وہ یہ تھی کہ ان کے درمیان ایک زندہ رشتہ 'ابلاغ و تفہیم' قائم تھا۔ شاعر اور اس کے سننے والوں کے درمیان کوئی پردے حائل نہ تھے۔ وہ ایک دوسرے سے اس قدر قریب تھے کہ شاعر کو بلا واسطہ ان سے اپنی بات کہنے کا موقع ملتا تھا۔ شاعر کو خوب معلوم تھا کہ اس کے سننے والے اس سے کیا چاہتے ہیں اور سننے والے یہ جانتے تھے کہ شاعر سے کن باتوں کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔ شاعر اور اس کے سامعین کا یہ ربط باہمی بڑی قابلِ قدر چیز ہے۔ جدید شعر و ادب کے بہت سے پیچیدہ مسائل صرف اس لئے پیدا ہو گئے ہیں کہ شاعر اور اس کے سامعین کے درمیان ایسی بے پایاں خلیج حائل ہو گئی ہے جس کا پاٹنا دونوں میں سے کسی کے بس کی بات نہیں۔ شاعر شعر تو یقیناً اپنے داخلی تجربے کی شدت اور دباؤ سے مجبور ہو کر کہتا ہے مگر اسے کوئی ذکی اور کسی دکھی صورت میں ایسی جماعت تو ضرور چاہئے جو اس کی واردات قلبی کا احوال سن سکے۔ مختصر یہ کہ شاعر سامعین کا طالب ہوتا ہے اور جب اسے سامعین اس قسم کے مل جاتے ہیں جن سے وہ بلا واسطہ مخاطب ہو سکتا ہو اور جن سے زیادہ سے زیادہ ذہنی قربت حاصل کرنے کا امکان موجود ہو تو شاعر کے لئے ایک بڑی تسکین بخش صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک ایسا واضح اور حقیقی معیار آ جاتا ہے جس سے وہ بآسانی اپنے آپ کا اندازہ کر سکتا ہے۔ شاعر جتنا اپنے سامعین سے دور ہوگا اسی قدر خود شناسی کے اس معیار سے محروم رہے گا۔ شاعر اور اس کے سامعین کے باہمی رابطہ اور ذہنی قربت سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ادبی اقدار بڑی واضح شکل میں پیشِ نظر ہوتی ہیں اور ان میں ایک خوشگوار توازن اور ہم آہنگی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے —— اگر آپ کو اس بنیادی اصول سے اختلاف ہو تو پھر آپ کے لئے مشاعرہ کی ادبی اہمیت کا قائل ہونا مشکل ہے۔ لیکن اگر اس بنیادی اصول کو مان لیا جائے تو پھر اس میں کوئی شک کی بات نہیں رہتی کہ مشاعرہ نے شاعر اور اس کے سامعین کو قریب لا کر ایک عظیم الشان ادبی خدمت انجام دی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر حال میں شاعر اور اس کے سامعین کے درمیان ذہنی ربط و یگانگت کی یہ صورت قائم رہنا ممکن بھی ہے؟ بات یہ ہے کہ یہ صورت ممکن اسی وقت ہے جب کوئی معاشرت ایک پختہ، واضح اور حقیقی کلچر کے نظامِ اقدار کو اپنا چکی ہو، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ جب معیار باقاعدہ طور پر قائم ہو چکے ہوں اور ایک پوری جماعت کو ان پر اعتماد اور یقین ہو، جب افرادِ جماعت کے نظامِ اقدار کو تسلیم کرتے ہوں، ان کا احترام کرتے ہوں اور ان سے اپنے آپ کو وابستہ سمجھتے ہوں۔ جس کلچر میں فرد اور جماعت کے مابین یہ یگانگت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہو صرف وہیں ممکن ہے کہ شاعر اور اس کے سامعین میں حائل پردے اٹھ جائیں، اور دونوں میں اس ذہنی قربت کا رشتہ قائم رہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے اور جسے ہمارے ہاں مشاعرہ نے فروغ دیا تھا۔

ہماری قدیم سوسائٹی اور اس قسم کے کلچر کے درمیان چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ادبی اقدار اور شعر و سخن کو پرکھنے کے معیار واضح اور متعین تھے کہ سخن گو اور سخن فہم دونوں ان پر ایمان رکھتے تھے۔ شاعری کے موضوعات بھی کم و بیش مقرر تھے، تجربات و محسوسات جو شعر کی شکل میں ادا پاتے تھے شاعر اور سامعین کے درمیان تقریباً ایک سے تھے

تھے، اور دونوں ان کی شعری صلاحیت کو تسلیم کرتے تھے ——— غزل کے مضامین مقرر تھے، ان سے گزر کر اسلوب کی مختلف صنعتیں، تشبیہیں اور استعارے، تلمیحیں اور ترکیبیں سب اپنی ڈھلی ڈھلائی مستند صورت میں موجود تھیں۔ مختصر یہ کہ ادبی روایت نے اپنے آپ کو بڑی صحیح اور منظم صورت میں قائم کر لیا تھا۔ شاعر اور سامعین دونوں اس روایت کے پابند تھے۔ شاعر کے لئے اس سے انحراف کا مطلب یہ تھا کہ اسے شاعر ہی تسلیم نہ کیا جاتا تھا۔ نظیر اکبر آبادی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

اس روایت کی تعمیر و تشکیل میں ایک نہایت اہم حصہ ہمارے قدیم طرز تعلیم کا بھی تھا۔ ہمارا کلچر اپنی مخصوص سماجی اور معاشرتی ماحول کے زیر اثر ایک محدود نوعیت رکھتا تھا ان معنوں میں کہ وہ صرف سماج کے اونچے طبقے کی زندگی سے متعلق تھا۔ اس اونچے طبقے یعنی شرفا کی تعلیم صدیوں سے طے شدہ اور مقررہ نصاب اور انداز سے ہوتی تھی۔ اس تعلیم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں Humanities یعنی ان علوم و فنون کا جو براہ راست انسان کی ذات سے متعلق ہیں عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ اس مقررہ نصاب تعلیم کو اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اس شرفا کے طبقہ کی ذہنی پرورش اور تربیت ایک مخصوص ڈھب پر ہوتی تھی۔ ادب و شعر کے معاملے میں چند تصورات اور اصول جنہیں قدما کی نگارشات سے اخذ کیا گیا تھا معیاری اور مسلمہ حیثیت اختیار کر گئے تھے۔ چنانچہ ادب و شعر کے فنون کو انہی کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جاتا تھا۔ شاعر اور اس کے سامعین کے درمیان ادبی مسلمات کے ضمن میں کوئی بنیادی اختلاف ممکن ہی نہیں تھا۔ اختلاف اگر ہو سکتا تھا تو محض جزئیات میں۔ شاعر اور سامعین دونوں کے لئے قدما کا کلام سند تھا اور دونوں بوقت ضرورت اسی سے رجوع کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ شاعر ایک ایسی کلچر یافتہ جماعت کے سامنے اپنا کلام پیش کرتا تھا جو ذہنی تربیت اور ذوق کے اعتبار سے اس کے لئے اجنبی نہیں تھی۔ شاعر کے لئے اس شکایت کی گنجائش نہیں تھی کہ اس کے سامعین اس کے کلام کی قدر و قیمت پہچاننے سے قاصر ہیں بلکہ اسے ان کی سخن فہمی کی صلاحیتوں پر کامل یقین اور اعتماد تھا اور ان کی داد کی قدر کرتا تھا۔ چنانچہ مشاعرہ محض شعر سننے سنانے اور واہ واہ کرنے کی مجلس نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ذوق کی تربیت اور شعر گوئی اور شعر فہمی کے فن کی تحصیل کے لئے ایک درس گاہ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ اسی میں مشاعرہ کی سب سے بڑی ادبی اہمیت مضمر ہے۔ ہر ہر مشاعرہ جو ہوا کرتا تھا ہمیشہ بے معنی اور بے ہنگم چیز نہیں ہوتی تھی اس کی تہہ میں تسلسل بعد تسلسل کا پتا چلتا تھا۔ ادبی شعور برابر رواں رہتا تھا جو شاعر اور اس کے سامعین دونوں میں مشترک تھا۔ یہ شعور ہمارے ان کے مہذب اور کلچر یافتہ طبقے کے ذہنوں میں اس طرح رچ بس گیا تھا اور اتنی رچی ہوئی صورت میں ملتا تھا کہ اس کے متعلق باقاعدہ طور پر سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی ——— اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ مشاعرہ نے ہمارے ہاں ایک تو شاعر اور اس کے سامعین کے درمیان زیادہ سے زیادہ ذہنی قربت کے رشتے کو برقرار رکھا اور دوسرے وہ ہمارے ادبی ذوق اور شعور کی تربیت کی درس گاہ بھی بنا رہا۔

جب تک ہماری معاشرت اور خصوصیت سے ہمارے کلچر اور ادب کے نظام اقدار میں وہ توازن اور ضبط موجود رہا جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں ہمارے ہاں مشاعرے کو ایک ادبی اہمیت حاصل رہی اور وہ شعری روایت کا حقیقی امانت دار بنا رہا۔ غالب کے زمانے سے یہ صورت حال ذرا بدلنی شروع ہوئی۔ غالب اردو شاعری کی روایت میں پہلا شاعر ہے جس نے تجربات و محسوسات کے اعتبار سے عام روش سے ہٹ کر شاعری کی اور اپنی دل چسپ شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کے بے پایاں احساس کی بدولت اردو غزل کو ایک وسیع تر راہ پر ڈالا۔ غالب اردو شاعری کی کلاسیکی روایت کے خلاف ایک نہایت واضح رومانی بغاوت کا پہلا علمبردار ہے اور اپنی اسی خصوصیت کی بدولت وہ اپنے وقت کے مشاعروں میں کچھ بہت زیادہ مقبول نہ ہو پایا یعنی ان معنوں میں جن میں ذوق اور مومن مقبول تھے ——— غالب کے بعد سے مشاعرہ کا رنگ بتدریج بگڑ گیا۔ اس لئے کہ غالب کے بعد سے ہمارے کلچر کے نظام میں وہ ضبط و ہم آہنگی برقرار نہ رہا۔ ادبی اقدار کے توازن کی بنیادیں ہل گئیں۔ ہماری معاشرتی زندگی میں سکون اور ٹھہراؤ کی جو کیفیت صدیوں سے چلی آ رہی تھی خواب و خیال ہو گئی۔ نئی تعلیم کے ذریعے ایک نئے کلچر اور ایک نئے ادب سے روشناسائی ہوئی تو نئے خیالات ذہنوں میں اضطراب پیدا کرنے لگے اور پرانے مسلمات پر سے یقین اٹھنے لگا۔ ذہنی تربیت اور ذوق کے اعتبار سے جماعت اور افراد میں جو اشتراک اور ربط باہمی فروغ پا گیا تھا وہ رفتہ رفتہ گھٹنے لگا۔ انفرادیت کا زور بڑھا اقدار کے اجتماعی ساجھوں کی مالا ٹوٹ گئی۔ بے یقینی، تشکک، انتشار، نئی ذہنی زندگی پرانی ڈگر سے ہٹ کے نئی راہوں میں سرگرداں نظر آنے لگی۔ اس خصوصیت سے ادبی اقدار کی دنیا میں رفتہ رفتہ اس کشمکش و تجسس نے ہر چیز کی معیاری حیثیت پر کاری ضرب لگائی۔ کوئی کسوٹی، کوئی ایسے اٹل مقررہ معیار نہ رہا جس کی مسلمہ حیثیت

برقرار رہی ہو جتنی تعلیم اور معاشرتی انقلاب کا ایک اثر یہ ہوا کہ کلچر سماج کے اونچے طبقے سے نکل کر متوسط طبقے کی تحویل میں آ گیا۔ پرانی مہذب اور کلچر یافتہ جماعت کی یہ کیفیت جاتی رہی اور انتشار کی کیفیت ہمارے گزشتہ پون صدی کے ادبی شعور کی سب سے نمایاں خصوصیت رہی ہے اور کسی منزل کسی مقام پر ٹھہری نہیں۔ اور اس کا تسلسل آج بھی جاری ہے بلکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ اپنی انتہائی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ کیفیت صرف ہمارے ادبی شعور سے مخصوص نہیں، دنیا بھر میں اسی کا دور دورہ ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ بہت بڑی بات ہے کہ ہمارے ادبی شعور میں دنیا بھر کے ادبی شعور کے عناصر خصوصی کا پرتو نظر آتا ہے۔ وہ اپنے وقت اور اپنے زمانے سے ہم آہنگ ہے اور بھی بڑا کہ اس انتشار میں زندگی اور ایک دم ختم ہونے والی تب و تاب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آپ اسے جو چاہیں سمجھیں مجھے فقط یہ یاد دلانا ہے کہ اس صورت حال کے پیش نظر پرانے ادبی اداروں کی ادبی اہمیت باقی رہنا ممکن ہی نہیں۔ شاعر اور اس کے سامعین ذہنی تربیت اور ذوق کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اس قدر دور جا پڑے ہیں کہ ان میں اس قسم کی ذہنی قربت کا رشتہ قائم رکھنا محال ہے۔ جو مشاعرے کا امتیازی وصف تھا۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے گویا اجنبی ہیں۔ سامعین کا ذوق عموماً غیر تربیت یافتہ ہے۔ یا اگر اس کی تربیت ہوئی بھی ہے تو وہ شاعر کے ذوق سے ہم آہنگ نہیں۔ شاعر اپنے سامعین کی رنگارنگ ذہنی دلچسپیوں سے آگاہ نہیں اور سامعین شاعر کی انفرادی شخصی واردات میں دلچسپی لینے سے قاصر ہیں۔ نئی شاعری مشاعرے کی چیز نہیں۔ کیونکہ اس میں شاعر سے ذہنی قربت حاصل کرنے کے لئے کوشش اور کاوش کرنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی شاعری نئی قسم کی ادبی انجمنوں کی چیز بن کر رہ گئی جہاں نظم کی کاپیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ ہر شخص ان کاپیوں پر اپنی جگہ غور کرتا ہے پھر اس کے بعد بحث مباحثہ ہوتا ہے۔ نظم کا مفہوم متعین کیا جاتا ہے۔ تب کہیں جا کر شاعر اور سامعین کے ذوق کی رسائی ملتی ہے۔ جیسے جیسے بدلے ہوئے ادبی ماحول کے مطابق اس قسم کی نئی انجمنیں قدیم مشاعرے کے بدل کے طور پر پیدا ہو رہی ہیں۔ لیکن عام پسند چیز اب بھی غزل ہی ہے۔ جس میں بہت سے روایتی عناصر موجود ہیں اور سامعین میں شعری ذوق کے انحطاط کے باوجود اس کے چاہنے والے اور اس کو سمجھنے والے اب بھی مل جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے کہ نظم گوئی کے شاعر بھی مشاعروں میں پڑھنے کے لئے غزل کے میدان ہی میں قسمت آزماتے ہیں۔

اُردو غزل گوئی

اردو تنقید میں غزل پر اتنی کام کی کتاب اور نہ ملے گی۔ اس لئے کہ اس کا مصنف فراق گورکھپوری غزل کا بہت بڑا شاعر ہے۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ مغربی تنقید اور مشرقی تنقید کا جتنا رچا ہوا مذاق فراق کا ہے اتنا اردو کے نہ کسی شاعر کو نصیب ہوا اور نہ کسی نقاد کو۔

قیمت ۲/-

اندازے

مصنف فراق گورکھپوری۔ فراق جتنا بڑا شاعر ہے اتنا ہی بڑا نقاد ہے۔ اندازے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ پچھلے بیس برسوں میں اردو کے تنقیدی سرمایے میں اس سے بہتر کتاب پیش نہیں کی جا سکی۔ اب اس مجموعہ کو بڑی اہم تبدیلیوں اور کئی نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

قیمت ۵/-

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور

حیات ڈپٹی نذیر احمد

یسین علی خاں

مولوی نذیر احمد صاحب پر خود ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے فوراً بعد اور اس وقت سے آج تک مختلف زاویوں سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لکھا جا رہا ہے اور جب تک اردو ادب زندہ رہے گا نہ صرف اردو زبان میں بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ان سے متعلق بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا اور ان کی تصنیفات میں سے اکثر و بیشتر شیکسپیئر کے ڈراموں کی طرح ہمیشہ پڑھی اور پڑھائی جاتی رہیں گی۔ قرآن مجید کا اردو ترجمہ تو ایک ایسی یادگار ہے جو دنیا کے قیام تک مٹ نہیں سکتی۔ مولانا عربی اور اردو کے بے مثل ادیب تھے اور بقول حالی مرحوم "خصوصاً قرآن مجید کی خدمت کے لحاظ سے جو امتیاز انہوں نے ہندوستان کے علمائے اسلام میں حاصل کیا ہے اس کا صحیح صحیح اندازہ لوگ اس وقت کر سکیں گے جب ان کی وفات پر معتدبہ زمانہ گزر جائے گا اور معاصرین کا دور ختم ہو کر حب و بغض کے جذبات فرو ہو جائیں گے۔" چنانچہ جیسا جیسا زمانہ گزرتا جاتا ہے اور نئے نئے تراجم قرآن مجید کے ہوتے جاتے ہیں، حالی کا قول پایۂ ثبوت کو پہنچتا جاتا ہے۔ مولانا نذیر احمد کی چند یا سب تصنیفات پر بہ نظر تنقید یا توصیف کچھ لکھنا مجھ جیسے بے بضاعت اور کم علم انسان کے بس کی بات نہیں ہے جس کو عربی اور فارسی کی شد بد کے علاوہ اردو بھی اچھی طرح نہ آتی ہو۔ اس لئے یہاں میں صرف یہ کوشش کروں گا کہ مولانا کی مبارک زندگی کے نمایاں خد و خال مختصراً کچھ اپنی، کچھ ان کے معاصرین اور زیادہ تر خود مولانا کی زبانی بیان کر دئیے جائیں تاکہ اس مختصر مضمون کے پڑھنے والوں کو مولانا کی زندگی کے گرد و پیش کے اہم واقعات و حالات کا ایک گونہ اندازہ ہو سکے جس کے بغیر کسی بڑے آدمی کی بڑائی کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔

ولادت :

مصنف "حیات النذیر" کی تحقیق کے مطابق مولانا ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے لیکن ڈپٹی کلکٹری کے لئے جو تاریخ ولادت مولانا نے سرکاری نقشے میں درج کرائی وہ [illegible] دسمبر [illegible] تھی۔ مولانا ریہڑ پرگنہ افضل گڑھ تحصیل نگینہ ضلع بجنور جیسے غیر معروف قریے میں پیدا ہوئے لیکن وہ یہاں بہت کم رہے، کیونکہ ان کے والد مولوی سعادت علی صاحب خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے اپنی جائداد سے (جو چند بیگھہ اراضی پر مشتمل تھی) دست بردار ہو کر بجنور چلے آئے اور اپنے آبائی مکان میں رہنے لگے تھے۔ اس وقت مولانا کی عمر کوئی چار برس کی ہوگی۔ مولانا فرماتے ہیں: "بجنور میرا مولد نہیں، وطن اقامت نہیں بلکہ

وطن اصلی ہے۔"

اس کے بعد تقریباً ۱۲ برس کی عمر سے مولانا دلی میں رہنے لگے اس لئے دلی کو اپنا وطن قرار دیتے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں: "میں جس بات کو دکھانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دلی کو دوسرے بلاد ہند پر ایک فضیلت ہے۔ یہ امام ہے وہ دوسرے شہر مقتدی۔ یہ مجتہد ہے اور وہ دوسرے شہر مقلد، یہ اصل ہے اور دوسرے شہر نقل ..... میں اس بات کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ میں پنجاب کا رہنے والا نہیں ہوں۔ اگرچہ دلی رہا نہ دلی، جو سینکڑوں برس تمام ہند کا دار السلطنت اور حاجات خلائق کا مرجع، لیاقت اور کمالات کا مرکز، حکومت و دولت کا منبع رہی اب مضافات لاہور میں سے ہے۔ مگر دلی والے تو اپنے تئیں کیوں پنجابی سمجھنے لگے۔ پنجابی بھی ان کو پنجابی نہیں سمجھتے، اور وہ پنجابی ہیں بھی نہیں۔ جغرافیے کی رو سے دلی اور پنجاب کے مواقع مختلف، دونوں کے باشندوں کی زبان مختلف، وضع مختلف۔ خیر تو غرض یہ ہے کہ میں پنجاب کا رہنے والا نہیں ہوں اور اس بات کو اس غرض سے ظاہر نہیں کرتا کہ خدانخواستہ میں پنجاب کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ نہیں بلکہ ہر شخص کو اپنا وطن عزیز ہے، مجھ کو بھی وطن کے ساتھ انس ہے اور ہونا چاہئے حب الوطن من الایمان۔"

گویا مولانا دلی کو اپنا وطن تصور کرتے ہیں اور ہونا بھی چاہئے کہ ۱۲ برس کی عمر سے وہیں کے ہو رہے

خاندان:

مولانا اپنے خاندان کے متعلق لکھتے ہیں: "مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اصلی جدی موروثی مسلمان ہوں۔ اپنے نسب نامہ میں انقراض سلطنت دہلی تک برابر مشائخ صوفی اور علماء کے نام پاتا ہوں۔" مولانا شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے نامور خلیفہ شاہ عبدالغفور اعظم پوری کے خاندان سے تھے جن کے متعلق شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "بسا صاحب کرامات و مقامات بودہ اند روزے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم را در خواب دیدہ و آں جناب ایشاں را درودے تعلیم فرمودہ۔"

بچپن اور تعلیم:

مولانا بچپن میں نہایت چلبلے تھے۔ کبھی ایک نشست میں حجامت نہیں بنوائی، آدھی بنوائی اور بھاگے۔ دوبارہ سہ بارہ گرفتار ہو کر آتے تو وہ آدھی پوری ہوتی۔ ابتدا میں ان کے والد بزرگوار نے مولانا کو بھی قرآن بغیر معنوں کے پڑھایا۔ پھر پنجابی وضع کے مکتب میں داخل کر دیئے گئے۔ مکتب میں انہوں نے کیا پڑھا ہوگا خود ان کے الفاظ میں سُن لیجئے: "مسلمانوں نے یا تو کچھ نہ پڑھا ہوگا یا پڑھا ہوگا تو وہی دیسی مکتب میں اور نتیجہ ہو تو گھر پر پیاز گوشت بیاری سے محمود نامہ کیا، مامقیماں یا دستور الصبیان، اور وہ بھی اس خاص رنگ سے جس کی نقل ابھی کانفرنس کے تھیٹر میں آنریبل محمود نے کی تھی۔ ابتدائی تعلیم تو میری بھی اسی طرز پر ہوئی تھی مگر تعجب ہے کہ وہ تو سید محمود کو ایسی یاد ہے کہ نقل کو دیکھ کر اصل کا سماں آنکھوں میں پھر گیا تھا اور مجھ کو ایسی بھول گئی کہ نقل کا قصد کرتا ہوں تو ابتدا ہی میں ادا نہیں ہوتی۔" مکتب میں زیادہ دن نہیں گذرنے پائے تھے کہ وہاں سے اٹھا لئے گئے اور پدر بزرگوار نے فارسی کی ابتدائی کتابیں مثلاً میاں بار، پنج گنج، مصدر فیوض وغیرہ خود پڑھائیں اور عربی بھی شروع کرا دی گئی۔ اس طرح ۹ برس تک اپنے والد سے تعلیم پاتے رہے اور زینت کے سبق سیکھے۔ اس کے بعد مولوی نصر اللہ خاں صاحب ڈپٹی کلکٹر نے جو ان کے والد کے خاندانی دوست تھے، نذیر احمد صاحب اور ان کے بھائی علی احمد صاحب کو اپنے حلقۂ درس میں لے لیا اور اپنے پاس ہی رکھ بھی لیا۔ ان دونوں بھائیوں کی طبعی شوخی اور ذہانت کی وجہ سے ڈپٹی صاحب بہت خوش ہو کر گھر پر پڑھاتے اور سرکاری دوروں میں بھی ساتھ لے جانے لگے۔ اس طرح مولانا نے پانچ برس کے عرصہ میں عربی شرح ملا تک اور منطق میں تہذیب قطبی اور فلسفہ کی چند درسی کتابیں بھی پڑھیں۔ بعدازاں نصر اللہ خاں صاحب کے کہنے سے یہ دونوں لڑکے دلی بھیج دئے گئے۔ مولانا کے والد نے اب ان دونوں کو دلی کے مولوی عبدالخالق صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ مولوی عبدالخالق صاحب ایک پنجابی بزرگ تھے جو آخر عمر میں حلقۂ درس و تدریس کو خدا حافظ کہہ کر مسجد نشین ہو گئے تھے۔ مولوی عبدالخالق صاحب نے مولانا کو پنجابی کٹڑے کی مسجد میں مقیم کر دیا۔ دلی کے

اس محلے میں زیادہ تر پنجابی سوداگر آباد تھے۔ اس مسجد کا نام اورنگ آبادی مسجد بھی مشہور تھا جس میں بہت سے طالب علم اطراف سے آکر جمع ہوتے تھے۔ ان ہی میں سے بعض ائمۃ المساجد بن جاتے اور بعض یہاں ہی گری اختیار کر لیتے۔ یہ پیشے رفع الوقتی اور متعلقات زندگی کی حد تک محدود ہوتے۔ پنجابی کٹرے کی مسجد میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس محلے کے ہر ایک گھر سے روٹی کے ٹکڑے مانگ لاتا اور پیٹ بھرا کرتا۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں: "اکثر طالب علم باری باری دونوں وقت پنجابیوں کے گھروں سے ٹکڑے مانگ لاتے اور آپس میں بانٹ کھاتے، اور ان ہی میں ایک میں بھی تھا۔" ایک اور جگہ فخراً بیان کرتے ہیں: "یہ لوگ مسجدوں میں رہتے اور صدقات پر گزران کرتے۔ کسی کو عار کا موجب ہو تو ہو مگر میں اس کو فخراً بیان کرتا ہوں کہ میری طالب علمی کا ابتدائی حصہ اسی طرح بسر ہوا ہے۔"

مولانا نے طالب علمی کے زمانہ میں ایسی ایسی صعوبتیں برداشت کی ہیں کہ طلب صادق ہی اس کی متحمل ہو سکتی تھی۔ مولویوں کو طالب علموں کی تعلیم سے زیادہ سروکار نہ تھا چنانچہ اس وقت کی تضییع اوقات کی شکایت مولانا یوں فرماتے ہیں: "مجھ کو تو کسی مولوی نے آپ پڑھایا اور نہ پڑھنے دیا۔ وہ اس طرح کہ مجھ جیسے کم عمر لڑکے مولویوں کے زنان خانوں میں جاتے تھے اور ان سے خدمت گاری کا کام لیا جاتا تھا۔ معاوضہ اس کا مسجد میں رہتے تھے پس مسجد ان کے لئے بھٹیارے کی سرائے تھی اور اس کا کرایہ مولویوں اور مولوانیوں کی خدمت۔ جس جس پہلو سے میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں جب کہ میں پنجابی کٹرے کی مسجد میں تھا تو پاتا ہوں کہ میری ساری عمر میں بدترین وقت تھا اور اگر اس کو چار پانچ برس کا بھی امتداد ہوتا تو میں دنیا اور دین دونوں طرف سے تباہ ہو لیا تھا۔"

دہلی کالج میں داخلہ:

ایک عجیب اتفاق سے مولانا دہلی کالج میں داخل ہوئے۔ پنجابی کٹرے کے طالب علموں کو جمعے کے جمعے نمازیوں کے لئے استنجے کے ڈھیلے بنانے کے بعد چھٹی ملتی تھی۔ ایسی ہی ایک چھٹی کے دن مولانا شہر میں گشت لگانے کے لئے نکلے تو دیکھا کہ لڑکوں کی ٹولیاں بستے باندھے چلی جا رہی ہیں۔ بطور تماشائی کے ایک ٹولی میں جا ملے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ امیروں کی سواریاں کھڑی ہیں۔ کالج کے بڑے ہال میں اساتذہ اور طالب علم جمع ہیں۔ انگریز اور شہر کے امراء ہیں۔ آدمیوں کا ٹھٹ لگا ہوا ہے۔ گھستے گھستے ہال کے دروازہ پر پہنچے۔ بھیڑ میں سے تماشائیوں کو دھکیلتے لوگوں کے ریلے میں مولانا کا پاؤں پھسلا، چاروں شانے چت گر پڑے۔ چوٹ زیادہ آئی تو مولانا رونے لگے۔ کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر کارگل نے سمجھا کالج کا لڑکا ہے، شفقت سے اٹھایا اور کہا: "تم اپنی جماعت کے لڑکوں میں جا بیٹھو!"

مولانا نے کہا: "میں اس مدرسہ کا طالب علم نہیں ہوں۔"

"پھر کیوں آئے اور تم کون ہو؟"

"پنجابی کٹرے کی مسجد کا طالب علم ہوں۔"

"کیا پڑھتے ہو؟"

"شرح ملا اور ابوالفضل!"

پرنسپل کو باور نہیں آیا اور مولانا کو لے جا کر مفتی صدر الدین خاں کے سامنے کھڑا کر دیا کہ وہ امتحان لیں آیا یہ لڑکا سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ مفتی صاحب بڑے بد مزاج تھے۔ تُو سے خطاب کر کے مولانا سے پوچھا: "تو کیا پڑھتا ہے؟"

مولانا نے جواب دیا: "میں نے آپ کا کیا قصور کیا ہے؟"

جو لوگ مفتی صاحب کے قریب بیٹھے تھے ہنس پڑے۔ مفتی صاحب نے ایک الماری سے شرح ملا نکالی اور مفعول لہٗ کی بحث اتفاقی طور پر ان سے کھلی۔ مولانا کو کہیں کہیں سے معنی پوچھے۔ مولانا فر فر ترجمے سے چند سطریں پڑھ گئے۔ پھر ابوالفضل کے دفتر سوم کی جلد نکالی اور کہا اس کو پڑھو۔

مولانا نے وہ بھی پڑھی۔ مفتی صاحب تو امتحان لے کر کچھ نہ بولے لیکن پرنسپل نے جانچ لیا کہ لڑکا ذہین ہے، تو مولانا سے کہا ایک مہینہ بعد آنا نام لکھ لیا جائے گا اور چار روپے وظیفہ ملے گا۔ مولانا نے پوچھا "آپ مجھ سے کیا کام لیں گے؟" پرنسپل نے کہا "پڑھنا"۔ مولانا اُلٹے پاؤں مسجد پہنچے اور اپنے بھائی علی احمد سے کہا: "میں چار روپے ماہانہ کا نوکر ہو گیا ہوں، تم بھی چلو انگریز سے ملا دوں۔" الغرض بھائی کو بھی پرنسپل کے پاس گھسیٹ کر لے گئے اور کہا یہ مجھ سے زیادہ پڑھے ہوئے ہیں۔ ان کو بھی وہی جواب ملا کہ ایک مہینہ بعد آنا۔ یہ خبر جب پنجابی کٹرے کے مولویوں کو ہوئی تو انہوں نے مولانا کو مسجد سے نکال باہر کیا۔ مولانا نے اسی محلے میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی کرایہ پر لے لی اور اسی میں رہنے لگے۔ جنوری ۱۸۴۶ء میں کالج میں داخل ہوئے مہینہ ختم ہوتے ہی چار روپے وظیفہ ملا اور بڑھتے بڑھتے جماعت اول و دوم تک چار سے چوبیس تک پہنچ گیا۔ اس طرح مسجد کی گدایانہ زندگی سے نجات ملی اور تھوڑے دنوں بعد مولانا کرایہ کی کوٹھڑی سے مولوی غلام حسین صاحب کے ہاں اٹھ آئے جو مولانا کے والد کے دوست اور مولوی عبدالقادر صاحب کے دور کے رشتہ دار تھے۔ کھانے پینے کے تین روپے ماہوار دے دیا کرتے تھے۔ مولانا اپنی عمر کے چودھویں سال میں پہنچے ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ جو دکھ درد باپ کے بعد اٹھانا پڑا اسے یوں بیان فرماتے ہیں:

> "کالج کی تعلیم کی ابتدا تھی کہ وطن میں والد کا انتقال ہو گیا۔ دو ڈھائی برس کی چھٹائی بڑائی سے دو متقارب العمر لڑکوں کے وظیفوں پر آٹھ دس آدمیوں کی خانہ داری کا بوجھ پڑا۔ حقیقت میں مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا مگر اس مصیبت نے ہرگز نا امید نہ ہونے دیا کہ خدا عزوجل کے پاس مخفی خزانے ہیں۔ والد کا قبل از وقت انتقال تحصیل علم کے لئے کاری تازیانہ کا کام کر گیا۔ والد کو رو پیٹ کر واپس آیا تو یہ خیال کہ مجھ اکیلے کے نہیں بلکہ سارے خاندان کے TO BE AND NOT TO BE کا فیصلہ ہے۔ چنانچہ تحصیل علم کے میدان میں گیا یا تو قدم قدم چل رہا تھا اب لگا سرپٹ دوڑنے۔"

اوّل تو نصاب ہی مدرسی کیا کم تھا کہ مولانا نے خارج از اوقات مدرسہ مہربان اساتذہ کی مدد سے دو سبق اور شروع کر دئے۔ اس طرح کی دوہری محنت سے استعداد ترقی کرنے لگی۔ چنانچہ علی گڑھ کالج کے طلباء کو مخاطب کر کے مولانا فرماتے ہیں:

> "دنوں کا تو کیا حساب دوں مجھے یاد نہیں کہ زمانہ طالب علمی میں کسی رات نیند بھر کر سویا ہوں۔ میں اسکالرشپ ہوتے ہی ایک پچھیا کو چند پیسے مہینہ دیا کرتا تھا کہ مجھ کو رات کے دو بجے کتاب دیکھنے کے لئے جگا دے۔ میں گرمیوں میں مکان کے اندر گھٹ کر اور جاڑے میں باہر صحن میں بیٹھ کر کتاب دیکھتا تھا تاکہ سو نہ جاؤں اور اب یہ خیال کرتا ہوں کہ (ALL WORK AND NO PLAY) کا یہ نتیجہ ہوا تو تعجب نہیں کہ ساری عمر مجھے ریاضی نہ آئی۔ ساری عمر سائنس سے گریز رہا۔ اس کے دو سبب ہوئے میں نے عربی ادب لیا تھا اور سائنس کو بے وقعت جانتا تھا، دوسرا سبب سائنس کی طرف سے بے رغبتی کا یہ بھی ہوا کہ سائنس نے جو میرے مذہبی خیالات پر حملہ کرنا شروع کیا، سائنس میں توغل کرنے کو طبیعت نے گوارا نہ کیا۔"

مولانا نے ہمیشہ عربی کی حمایت کی۔ کوئی تحریر عربی کے جملوں سے خالی نہیں۔ ایک لیکچر میں فرماتے ہیں:

> "کسی مسلمان کا دل چاہے اور وہ مزے سے عربی کے پڑھنے کو لگے تو اس کا ہاتھ پکڑنے کو موجود ہو جاؤ۔ اگر عربی کی طرف سے یہی غفلت رہی تو الہمد، والحمد پڑھا کریں گے اور کوئی اتنا کہنے والا نہ ہو گا کہ صحیح لفظ الحمد ہے۔ تم بڑے طوطے کیا پڑھ سکتے ہو لیکن آئندہ نسلوں کو کیوں برباد کر رہے ہو۔ اچھا بھائی جو تمہاری سمجھ میں آئے سو کرو۔ اپنا کام تو کہہ دینا ہے۔ وہ بھی اس سبب سے کہ بلا بلا کر کہلواتے ہیں۔"

عقد نکاح:

قبل اس کے کہ مولانا دہلی کالج کی تعلیم سے فارغ ہوں ان کے عقد کا سامان ہو گیا۔ مولوی غلام حسین صاحب کی کوشش سے مفتی صدر الدین خاں نے مولوی عبدالقادر صاحب کی پوتی یعنی اسی لڑکی سے جس کو مولانا بچپن میں بحیثیت خادم لادے لادے پھرتے تھے، سے عقد پڑھوا دیا۔

اب تین چار روپے ماہوار کمانے بیٹے کا خرچ دے کر مولانا سسرال میں رہنے لگے اور نہایت عسرت کے ساتھ گزر بسر کرتے۔ ان دنوں میں مولانا کی جو کچھ بھی آمدنی تھی کالج کا بیس پچیس روپے وظیفہ تھا یا چند روپے ماہوار اوپر کی آمدنی جو لڑکے پڑھانے سے حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ شادی کے بعد بھی مولانا اسی طرح تعلیم حاصل کرتے رہے۔ عربی ادب پر بہت زور دیا اور اس کے ساتھ دوسرا نصاب بھی طے کیا۔ چنانچہ کالج کی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں:

"معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، تحمل، درگزر، گورنمنٹ کی سچی خیرخواہی، اجتہاد، علمی بصیرت، یہ چیزیں جو تعلیم کے عمدہ نتائج ہیں اور جو حقیقت میں شرط زندگی ہیں ان کو میں نے کالج ہی میں سیکھا اور حاصل کیا اور اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا۔ تنگ خیال، متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، برخود غلط

؎ ترک دنیا بمردم آموزند
خویشتن سیم و غلہ اندوزند

مسلمانوں کا نادان دوست، تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا، بہرا۔"

ملازمت :

الغرض ۱۸۴۵ء میں کالج میں داخل ہوئے اور ۱۸۵۴ء میں یعنی ۹ برس ختم کر کے ملازمت اختیار کی۔ مولانا فرماتے ہیں:

"مجھ کو مرحوم دہلی کالج میں اپنا وظیفہ پانا یاد ہے جس دن سے وظیفہ شروع ہوا میں نے اور ہمارے سارے خاندان نے اس کو سلسلۂ ملازمت سمجھا۔"

دہلی کالج کی تعلیم قریب الختم تھی۔ معقول و منقول کی استعداد حاصل کر چکے تھے کہ سرکار نے اپنے ضلع میں بھی سررشتہ تعلیم جاری کرنا چاہا۔ پنجاب گورنمنٹ نے ضلع گجرات میں بھی اسکول کھولے۔ اس وقت دہلی کالج بھی جنرل وزیٹر ریڈ (General Visitor Of Education) کے ماتحت تھا۔ پرنسپل سے ریڈ نے کچھ مولوی مانگے۔ ریڈ صاحب نے پرنسپل کو لکھا۔ مولانا نے بھی درخواست پیش کی۔ پرنسپل کو معلوم تھا کہ مولانا ڈگری کے حاجتمند ہیں لیکن نامساعدت وقت کہئے کہ اور لوگ نامزد ہوئے اور مولانا منہ تکتے رہ گئے۔ اس صدمہ کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

"اس زندگی میں پھر کبھی اتفاق ناملائم پیش آئے مگر جس قدر رنج اس ناکامیابی کا مجھ کو ہوا ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ اس وقت کبھی کبھی مجھ کو خودکشی کا بھی خیال آیا ہے۔"

اتفاقاً چند مدرسین میں سے شیخ ضیاء الدین کو ہیضہ ہوا اور وہ دہلی واپس آ گئے۔ ان کی بجائے مولانا نامزد کئے گئے۔ مولانا دل شکستہ ہو چکے تھے لیکن پرنسپل کی دلجوئی اور اصرار پر کنجاہ جانے کے لئے راضی ہو گئے۔ اس پہلی ملازمت کا حال مولانا یوں بیان فرماتے ہیں:

"گرمیوں میں پنجاب کے سفر کو نہیں بھولا اور بھولنے کی چیز بھی نہ تھی۔ بھری برسات تھی، ندی نالے اور دریا چڑھے ہوئے تھے۔ ٹرنک روڈ جاری تھی مگر پل نہ بننے پائے تھے اور اس پر اپنی ناتجربہ کاری، ناداری اور بے سامانی۔ الغرض کنجاہ میں از سر نو مدرسہ جاری کرنا تھا۔ پنجابیوں اور سکھوں اور کشمیریوں کے لڑکے گھر گھر پھر کر جمع کئے۔ اپنے ہاتھ سے ان کو الف بے کی تختیاں لکھ کر دیں اور درس شروع ہوا۔ الف تا یہ لکھ کر بھی حرف شناس ہو گئے، لڑکے بڑی تقدیر کے تھے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ ایک خط کی آمد و شد میں بارہ آنے خرچ ہوتے تھے اور کم سے کم پندرہ دن۔ لیکن جب چالیس پچاس تنخواہ آئی تھی تو تمام رنج کی تلافی کر دیتی تھی۔"

وہاں ایک کرنل دھیراج کشمیری تھے ان کی رانی کی سرکار انگریزی میں بڑی عزت تھی۔ رانی صاحبہ نے اپنے بچوں کو مولانا سے پڑھوانا چاہا۔ مولانا چاہتے تھے کہ بچے مدرسے بھیجے جائیں۔ رانی صاحبہ نے اسے اپنی عزت کے خلاف سمجھا اور ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہہ کر مدرسہ اپنے ہاں اٹھوا منگایا۔ اس

واقعہ کا ذکر مولانا یوں کرتے ہیں:

> "اب مدرسی میں ذرا خوشحال ہو چلا تھا۔ بہتر سے بہتر مکان رہنے کو ملا۔ کرنل صاحب کے خدمت گار شبلی کو گھوڑے سواری کو، دونوں وقت عمدہ سے عمدہ کھانا رانی صاحبہ کے سر۔"

اس طرح کی فراغت پائی تو سامان تنخواہ گھر بھیجنے کا انتظام کر دیا۔ مگر مولانا کنجاہ میں خوش دل نہ تھے۔ کوشش کی تو اجمیر کے کالج سے ستر روپے ماہوار کی عربی مدرسی پیش کی گئی اور کانپور سے اسی روپے کی ڈپٹی انسپکٹری مدارس۔

کانپور کی ملازمت:

باامید ترقی کانپور کی ملازمت کو پسند کیا اور وہاں مامور ہو کر ٹیلر صاحب سے جو انسپکٹر مدارس تھے خوشگوار تعلقات پیدا کر لئے۔ ایک مرتبہ جلسۂ امتحان میں مولانا پان کی گلوری منہ میں دبائے ہوئے پہنچے۔ ٹیلر صاحب بہت ناراض ہوئے اور تنہائی میں درشت الفاظ میں ملامت کی جس کی مولانا کو برداشت نہ ہوئی اور استعفیٰ دے دیا۔ اسی اثنا میں ۱۸۵۷ء کا غدر واقع ہوا جس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

> "جہاں جاتے پھر کا وہیں پڑے سڑا کیا۔ کنجاہ کی مدرسی کا سا تو حال نہ تھا کہ شلغم کو میٹھے بچے کرا دو مگر یہاں بھی قریب قریب وہاں آش در کاسہ۔ مجھے ڈگری اوپر والے سنتے پھرو۔ اتنے میں قریباں فراموش کردہ کا وقت آ گیا یعنی ۱۸۵۷ء کا مشہور غدر۔ کس کی ڈگری اور کیسا پڑھانا، جینے کے لالے پڑ گئے۔"

ابھی استعفیٰ منظور نہ ہوا تھا کہ مولانا کانپور سے بھاگے تو دلی جا کر دم لیا۔ سسرال والوں میں بعض متوسلان شاہی تھے جنہوں نے خود بادشاہ بیگم نواب تاج محل کو پڑھایا بھی تھا۔ غدر ہوا تو نواب تاج محل نے اپنی پھوپھی بہن کو جو بیرون قلعہ چیلوں کے کوچے میں رہتی تھیں قلعہ بلوا لیا اور ان کا کام مولوی عبد القادر صاحب کے سپرد کیا۔ اس کام کے لئے شاہی گاؤ خانے کے چھکڑے تعینات ہوئے۔ مسجد فتح پوری کے طالب علم اور مولانا کے سسرال کے لڑکے اس کام کے سر انجام پر مامور ہوئے۔ ایک دن اسباب کی آخری کھیپ قلعہ میں پہنچا کر مسجد کے طالب علم (جن میں مولانا بھی تھے) واپس آ رہے تھے کہ دیکھتے کیا ہیں کہ کالج کے سامنے والے میدان میں باغی تلنگوں نے انگریز قیدیوں کو تہ تیغ کر کے پاٹ دیا ہے۔ لاشیں ہی لاشیں بھی تھیں بے حرمتی کی حالت میں بکھری پڑی ہیں۔ ان میں سے ایک عورت (مسز لیسن) پر مولانا کی نظر پڑی جو زخمی پڑی کراہ رہی (WATER WATER) کہہ رہی تھی۔ مولانا کے دو ساتھی لڑکوں میں سے شعیب نے چاہا کہ اس کا کام تمام کر دے لیکن مولانا اور دوسرے ساتھی نے غالباً مذہبی ہمدردی کے جذبے کے تحت ایسا نہ کرنے دیا۔ قریب کے کسی مقام سے پانی لا کر اس کے منہ میں ڈالا۔ رمضان کے دن تھے، اندھیرا ہو چکا تھا۔ لوگ مارے ڈر کے گھروں میں بند ہو چکے تھے۔ ایسے میں میم کو اٹھا کر تینوں طالب علم پنجابی کٹرے کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر ایک خالی گھر میں اس میم کو چارپائی پر لٹا دیا۔ دروازے میں تختے اڑا دئے اور دو ڈھائی بجے مولوی عبد القادر صاحب کو خبر دی۔ مولویوں نے لڑکوں کو رازداری کا حکم دیا۔ میم کے زخموں کا علاج شروع کر دیا اور کھانے پینے کا بندوبست بھی۔ رفتہ رفتہ میم کو زنانہ کپڑے پہنا دئے۔ مہندی لگا دی، چوڑیاں پہنا دیں اور چوٹی بھی گندھوا دی گئی۔ میم کی عمر ۲۲، ۲۳ برس کی بتلائی جاتی ہے۔ مولانا اور ان کے ہم سن لڑکوں کو میم کے پاس جانے کی اجازت نہیں تھی البتہ مولانا کو اپنی بیوی سے اس کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ یہ میم مسٹر لیسن آگرے کے ایک افسر کی بیوی تھی جو اپنے باپ سے ملنے دلی آئی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے باپ اور دوسرے انگریزوں کو گولیوں سے ہلاک ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور اسے یقین تھا کہ اسی طرح اس کا شوہر بھی یقیناً آگرہ میں مارا گیا ہوگا۔ لیکن اس وقت تک انگریزوں نے ایسی بغاوت پنجاب میں نہیں ہونے دی، مشتبہ رسالوں سے ہتھیار رکھوا لئے اور غیر جانبداروں کو ساتھ لے کر دہلی کے محاصرے کے لئے پہنچ چکے تھے۔ باغیوں نے دہلی کے باہر نکل کر علی پور تک مورچہ بندی کر دی۔ طرفین سے گولہ باری شروع ہوئی۔ انگریزوں کے گولے باغیوں پر گرنے لگے۔ میم بہت گھبرانے لگی اور بڑی حکمت عملی سے میم کی چٹھی انگریزوں کے

کیمپ تک پہنچا دی گئی۔ جواب آیا کہ تم جہاں ہو چپ چاپ بیٹھی رہو۔ تم جس مکان میں ہو اس کا اور جہاں تم نے پناہ لی ہے وہاں کے تفصیلی حالات تمہارے مخبر سے دریافت کر لئے گئے ہیں۔ تم ان لوگوں پر سرکار اور تمام سرکاری عہدہ داروں کی عملی و قولی کی احسان مندی کا حقہ ظاہر کر دینا۔ تین چار چٹھیاں اس طرح کی آئیں گئیں۔ انگریزوں کو مخبرہ کا اعتبار ہو گیا تو انگریزوں نے مولویوں کو کہلا بھیجا کہ میم کو ہمارے کیمپ پہنچا دو۔ شاہی رتھ حاصل کر کے اس میں میم کو بٹھایا اور مولویوں کی دوسری بیبیاں بھی اس میں بیٹھ گئیں۔ لاہوری دروازے پہنچے تو باغیوں نے تلاشی لینی چاہی مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ مولویوں کی بہو بیٹیاں قدم شریف منت اتارنے جاتی ہیں تو عذر کیا۔ اس طرح میم کیمپ پہنچ گئی اور کوئی دو ہفتے بعد انگریز کشمیری دروازے سے شہر میں داخل ہوئے۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ نکلسن کمانڈنگ افسر مارا گیا۔ مولانا کا محلہ بھی نرغے میں آ گیا۔ مولوی لوگ گھر میں بند ہو کر دروازوں میں پتھر اڑائے بیٹھے تھے کہ رات کے ڈیڑھ پہر گئے گھوڑے کے ٹاپ کی آواز سنائی دی اور ایک سوار کو چلاتے سنا: "مولویوں کا مکان کون سا ہے؟" کواڑ کے پاس جا کر ڈرتے ڈرتے دریافت کیا گیا تو اس نے کہا۔ جنرل صاحب نے حکم دیا ہے کہ مولوی لوگ کابلی دروازے کی سڑک سے پرے نکل جائیں۔ صبح سے پہلے پہلے اس محلہ پر دھاوا ہوگا۔ بڑی بدحواسی میں مولویوں کا خاندان یہاں سے بھاگ کر پہلے سوئی والوں کے محلے اور وہاں سے ترکمان دروازے پہنچا اور جب انگریزوں کے جامع مسجد پر آ جانے کی اطلاع ملی تو یہ لوگ ہمایوں کے مقبرے کے قریب عرب سرائے پہنچے جہاں بادشاہ بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک دو دن اس سے گزرے تھے کہ بادشاہ اور ان کے ملازمین کی دار و گیر شروع ہوئی تو مولویوں کا خاندان سلطان نظام الدین بھاگا۔ وہاں سے بھی بادل ناخواستہ فیروز آباد کا ارادہ کیا۔ رستے میں گوروں کا گارد ملا۔ سب مرد گرفتار ہوئے عورتوں کو چھوڑ دیا گیا۔ اس گرفتاری میں مولانا بھی تھے جو سب کے ساتھ شہر کی کوتوالی میں حوالات کر دئے گئے۔ یہاں بہت سے لوگ پکڑے ہوئے تھے جن کو قطار در قطار بٹھا کر معمولی پوچھ گچھ کے بعد پھانسی دے دی جاتی۔ انگریزوں کے ساتھ ایک بخشی صاحب بھی تھے جو نشان دہی کرتے جاتے تھے کہ یہ فلاں اور وہ فلاں۔ جب مولویوں کی باری آئی تو خدا نے ان کے دل میں رحم ڈال دیا اور انہوں نے کہا یہ بیچارے تو بھلے لوگ ہیں۔ زندگی باقی تھی سب مولوی مزید تحقیقات کے لئے روک لئے گئے۔ مسز لیسن کی دی ہوئی انگریزی چٹھی تو کسی کی بغچی میں تھی۔ دکھا دیتے تو شاید چھوٹ جاتے۔ انگریزی تو ان میں سے کوئی پڑھا نہ تھا۔ خدا جانے اس میں شکایت نہ لکھ دی ہو گی۔ اس ڈر سے چٹھی پیش نہیں کی گئی۔ جس دوکان میں یہ لوگ قید تھے اس کے کوٹھے پر مسٹر وش فوجی افسر ٹھہرے ہوئے تھے۔ شام کو ہوا خوری کے لئے نیچے اترے تو مولانا کو پہچان لیا۔ وش صاحب نے مولانا سے کچھ اردو پڑھی تھی۔ حالات معلوم کر کے کمانڈنگ افسر صاحب کو لکھ کر راہداری کا پروانہ دلوا دیا۔ بالآخر تلاش بسیار کے بعد خاندان کی عورتیں جو بروالے چلی گئی تھیں مل گئیں۔ مولانا کو معلوم تھا کہ ان کے ایک ملاقاتی کالج کے ریاضی کے استاد مسٹر رام چندر عیسائی انگریزی فوج میں ہیں۔ ان سے ملنے وزیر آباد آئے مگر وہ اس وقت تک شہر دلی میں آباد ہو چکے تھے۔ پروانہ راہداری تو تھا ہی مولانا شہر میں آئے اور ماسٹر صاحب کی سفارش سے عورتوں کو بھی شہر میں لے آئے۔ لوٹ کا بازار گرم تھا۔ سکھ مسلمانوں کو اور ولایتی ہندوؤں کو لوٹتے تھے۔

ڈپٹی انسپکٹر مدارس الہ آباد:

دلی میں ایک بزرگ پیر منشی کریم بخش صاحب سے مولانا کی ملاقات ماسٹر رام چندر کے کوٹھے پر ہوئی اور انہوں نے مولانا کو ہنری اسٹیورٹ ریڈ ڈائرکٹر تعلیمات تک پہنچا دیا جو ان دنوں قلعہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ریڈ صاحب نے مولانا کو الہ آباد کی ڈپٹی انسپکٹری مدارس پر مامور کیا اور کچھ دنوں بعد ریڈ صاحب کے ساتھ ہی فرخ آباد، مین پوری، کانپور ہوتے ہوئے مولانا الہ آباد پہنچ کر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ دلی میں مولانا کے خاندان والوں پر نئی آفت آئی۔ وہابیوں کی سازش کے مقدمے کے سلسلے میں جھوٹی مخبری کی بنا پر مولوی عبدالقادر صاحب بھی پکڑے گئے۔ غرض یہ سن کر مولانا دلی آئے۔ اس وقت لیسن کی میم نے بڑا کام دیا۔ اپنے شوہر کو ساتھ لے کر دلی آئی اور وکالت کر کے سب مولوی

چھڑوا دیا۔ جب قضیۂ غدر ختم ہوا تو مولانا دوبارہ الٰہ آباد پہنچے اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ اس ملازمت کا حال مولانا یوں بیان کرتے ہیں:

"غدر کے دو تین برس بعد سررشتۂ تعلیم ترتیب پا گیا مگر جس چیز کو میری آنکھیں ڈھونڈھتی تھیں کہیں اس کا مذکور نہ تھا۔ وہی اپ ٹون ورام سرن کی تین چار ورق کی کتاب جس میں بجز سود کا حساب تھا، وہی جیوگرافی "دریا، جھیل، پہاڑ" کا گاؤں کا جغرافیہ، یعنی وہی سررشتۂ تعلیم کا انسپکٹر بن کر دورے میں کہیں لڑکوں کے پہاڑے سنتا پھرتا ہوں اور کہیں دریا اور پہاڑ پوچھتا پھرتا ہوں۔"

انگریزی زبان کا اتفاقیہ طور پر سیکھنا:

یہیں مولانا نے اتفاقیہ طور پر انگریزی زبان سیکھی۔ چنانچہ خود مولانا کی تحریرات کے اقتباسات سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ مولانا نے کالج میں کیوں انگریزی نہ پڑھی اور الٰہ آباد پہنچ کر کیونکر پڑھی۔ مولانا ایک لیکچر میں فرماتے ہیں:

"میں ایسے باپ کا بیٹا ہوں کہ دلی کالج کے پرنسپل نے ہر چند چاہا کہ میں انگریزی پڑھوں، والد مرحوم نے جو ایک غریب آدمی تھے اور اپنے وقت کے بڑے دین دار، کہہ دیا کہ مجھے اس کا مر جانا منظور، اس کا بھیک مانگنا قبول مگر انگریزی پڑھنا گوارا نہیں۔ ......

ہمارے سعادت توفیق سے اب میری اپنی تعلیم نے ایک دوسری شان اختیار کی جس نے میری پچھلی تعلیم کی خاطر خواہ داد دی اور مجھ کو ایسے شغل سے لگا دیا کہ وہ مجھے ساری عمر کے لئے بس کرتا ہے۔ ...... تصریح اس اجمال کی یہ ہے کہ طالب علمی کے زمانہ میں تو سوسائٹی کے تعصبات نے انگریزی پڑھنے کی اجازت نہ دی اور خود میں بھی انگریزی کی طرف سے بدگمان ہی سا رہا۔ الٰہ آباد میں عبداللہ خاں مرحوم امین عدالت نے مجھے مکان میں ٹھہرایا۔ چونکہ میری ان کی شرکت تھی معلوم ہوا کہ انہوں نے مشن اسکول میں انگریزی کی تعلیم بھی پائی ہے۔ میں تو کسی قدر ٹھٹکا مگر دیکھا تو ان کو پکا مسلمان پایا۔ علم کے ساتھ صوم و صلوٰۃ کے پابند یا دو پکے انگریزی میں اچھی لیاقت ہے مگر وضع ظاہر، طرز ماند و بود اور گفتگو سے کوئی جان نہیں سکتا کہ ان کو انگریزی چھو بھی گئی ہے۔ میں عبداللہ خاں کو دیکھتا کہ راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر رسالوں کی املیں مفت لکھتے۔ سب سے پہلے شخص جنہوں نے انگریزی کی طرف سے میرے سوءِ ظن کو دور کیا وہ عبداللہ خاں تھے۔ اب انہوں نے کہا میں چٹکی بجانے میں انگریزی سکھا دوں گا۔ غرض انگریزی پڑھنی شروع کی۔ دس دس پندرہ پندرہ صفحے Arabian Nights کے عبداللہ خاں سے دیکھ لیتا اور دو دن میں رٹ لیتا تھا۔ جب ہزار ڈیڑھ ہزار لفظ ذہن نشین ہو گئے تو میں ڈکشنری کی مدد سے آسان عبارتوں کا مطلب نکالنے لگا اور یہ صرف چھ مہینے میں۔ چونکہ عربی خوب بجا کر پڑھی تھی اس نے انگریزی کو میرے لئے ایسا سہل کر دیا کہ جو لوگ برسوں میں کرتے ہیں میں نے مہینوں میں کر لیا۔ اعظم گڑھ میں ایلفنسٹن صاحب سے انگریزی زبان میں انجیل بھی پڑھی تھی۔"

اس طرح مولانا کو جب کبھی اور جہاں کہیں موقع ملا انگریزی کا شوق فرماتے رہے اور اچھی استعداد حاصل کر لی تھی۔ بقول ان کے: "میں نے اپنی انگریزی کو بطور تواضع و کسرِ نفسی، نشست برخاست کہا ورنہ اسی نشست برخاست پر بی۔ اے والوں کے ساتھ پالا لینے کو موجود ہوں۔"

تراجم:

یہ مسلّم ہے کہ مولانا نے انگریزی یا عربی زبان سے جتنے بھی ترجمے اردو میں کئے وہ لفظی طور پر ترجمے نہیں معلوم ہوتے بلکہ اردو زبان کی ایک مستقل تصنیف معلوم ہوتے ہیں۔ یہ صلاحیت ان کی خاص ہے اور اس سے ان کی زبان دانی کا اعلیٰ معیار ظاہر ہوتا ہے۔ جو ترجمے کا اصل مقصود مطلب ہیں جیسی طبیعت مولانا کی لڑتی ہے ویسے بڑے بڑے انگریزی دانوں کی نہیں لڑتی۔

ترجمہ انکم ٹیکس:

اوّل بار انکم ٹیکس جاری ہوا تو میر ناصر علی خاں ڈپٹی کلکٹر کی سفارش سے میور صاحب نے یہ کام اولاً مولانا کے سپرد کیا اور

جب آدھے سے زیادہ ترجمہ ہو گیا تو بابو شیو پرشاد بھی اس میں شریک ہو گئے۔

ترجمہ پینل کوڈ تعزیرات ہند:

سر جارج ایڈمنسٹن لیفٹیننٹ گورنر ممالک متحدہ نے پینل کوڈ کے ترجمے کو اہم و ذی شان سمجھ کر اپنے اہتمام خاص میں رکھا اور اس وجہ سے بھی کہ سر جارج مدتوں طہران میں سفیر رہ چکے تھے۔ فارسی کی اچھی استعداد تھی۔ بلا تکلف فارسی بولتے بھی تھے اور اس وقت کوئی دوسرا یورپین ان سے بہتر فارسی داں نہ تھا۔ سر جارج نے ہنری اسٹیورٹ ریڈ ڈائرکٹر تعلیم کو اس کام میں اپنے ساتھ لیا تو مسٹر ریڈ نے منشی عظمت اللہ انگریزی مدرس بریلی کالج کو اپنے ساتھ کر لیا۔ منشی صاحب ترجمہ کرتے اور ریڈ صاحب کے میر منشی کریم بخش صاحب (جن کی عربی فارسی اچھی تھی) اس کو بہ نظر اصلاح دیکھتے۔ ریڈ صاحب ترجمہ سن کر اس میں تصرف کرتے اور بالآخر یہ ترجمہ لاٹ صاحب کو سنایا جاتا۔ یہ کام اس طرح چل رہا تھا کہ منشی کریم بخش صاحب کی تحریک سے ریڈ صاحب کی چٹھی مولانا کے نام آئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "لاٹ صاحب صرف دو دن الہ آباد ٹھہر کر بنارس چلے جائیں گے۔ عظمت اللہ اور کریم بخش ان کے ساتھ آگے بڑھ جائیں گے اور میں چند روز تمہارے یہاں کمشنر کے ہاں ٹھہروں گا تم کچہری کے وقت منشی عظمت اللہ کا ترجمہ مجھے سنا دیا کرو۔" اب دیکھئے مولانا کس ترکیب سے ترجمے میں شامل ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> "میں تین چار دن تو ریڈ صاحب کا رنگ دیکھتا رہا کہ کیا چاہتے ہیں اور کہاں اٹکتے ہیں۔ جب اس کی اٹکل مل گئی تو میں نے پینل کوڈ میں سے چار پانچ دن کے سنانے کی قدر چھوڑ، اٹھارویں چیپٹر سے توکلاً علی اللہ آپ ترجمہ شروع کر دیا۔ برخاست کرتے وقت ریڈ صاحب سکشنوں کو گن لیا کرتے تھے۔ فی یوم اکثر سات سکشنوں کا اوسط پڑتا تھا۔ اٹھارویں باب پر پہنچ کر میں نے بجائے اپنا ترجمہ پڑھا۔ خدا کا کرنا پہلے ہی دن ۲۱ سکشن پاس ہوئے۔ ریڈ صاحب کو بڑا تعجب ہوا۔ یہی زبانی سمجھے میں نے [illegible] ترجمہ کر لیا تھا۔ ریڈ صاحب کو اور بھی تعجب ہوا۔ ترجمہ تو لے لیا اور لاٹ صاحب کے نام ایک چٹھی میرے حوالے کی اور زبانی ہدایت کی کہ آج ہی کی ڈاک میں بنارس پہنچ کر یہ چٹھی لاٹ صاحب کو دو۔ وہ ترجمے میں تم کو بھی شریک کریں گے اور میں بھی چھ مہینے ان کے کیمپ میں ہوں گا۔"

مولانا نے وہ چٹھی لاٹ صاحب کی خدمت میں پیش کی اور عظمت اللہ صاحب اور کریم بخش صاحب کے ساتھ تیسرے مترجم بنا دیے گئے۔ مگر یہاں بھی مولانا شریک غالب رہے۔ اٹھارویں چیپٹر سے پیشتر تک جو ترجمہ ہو چکا تھا اس کو بھی Criticise کر کے صاف کیا۔ بعض اصطلاحوں کی جگہ بہتر اصطلاحیں وضع کر کے ترجمے میں داخل کیں اور یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو میں قانونی اصطلاحات کو روشناس کرایا۔ چند اصطلاحیں دلچسپی کی خاطر ملاحظہ ہوں۔ مثلاً "آتش گیر اشیا" "اثبات جرم سابق کے بے نام مکاتب" "حبس دوام و عبور دریائے شور" "قتل انسان مستلزم سزا" وغیرہ۔ Combustibli Matter کے ترجمے کے لئے دیگر مترجمین دو دو دن سوچ رہے تھے لیکن عاجز تھے۔ مولانا نے ذرا تامل کر کے فرمایا۔ بھڑک سے اڑ جانے والا مادہ۔ سب دنگ رہ گئے اور یہی ترجمہ تعزیرات ہند میں رکھا گیا۔ اب ترجمہ کی طباعت کا کام بھی مولانا ہی کے سپرد ہوا جس کے اختتام پر انعام ملا اور ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد ہوئے۔ اس سے پہلے مولانا تحصیلدار بن چکے تھے ۱۸۶۳ء تک تحصیلداری کی اور اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہو کر گورکھپور پر متعین ہوئے اور بندوبست کا کام سپرد ہوا۔

لونز ہوز سموات:

گورکھپور سے اعظم گڑھ بدلی ہوئے۔ یہاں ان کی دوستی ایک۔ ایل۔ پیورن صاحب سے ہو گئی جو اسی علاقہ میں بندوبست کے افسر تھے اور بعد کو کشمیر کے ریذیڈنٹ بھی ہو گئے تھے۔ انہوں نے ایک اشتہار نکالا کہ جو کوئی علم ہیئت کی اس کتاب (یعنی لونز ہوز) کا ترجمہ کرے گا ایک ہزار انعام پائے گا۔ مولانا کو بھی ترجمے کے لئے لکھا۔ مولانا نے عذر کیا تو سر ولیم میور لیفٹیننٹ گورنر نے دباؤ ڈالا۔ مجبوراً ترجمہ کرنا پڑا۔

اس کا ذکر مولانا یوں کرتے ہیں:

> "سب مل کر گیارہ ترجمے ہوئے۔ ان میں محاکمہ کرنے کو ٹی پوروں صاحب نے لقمانِ فن کی کمیٹی بٹھائی۔ کمیٹی نے میرے ترجمہ کو سب سے بہتر تو مانا مگر ساتھ ہی یہ پخ لگا دی کہ Up To Mark نہیں ہے۔ ہزار میں سے چار سو کے قابل ہے۔ میرا جی جل کر خاک ہی تو ہو گیا۔ ممبران کمیٹی کے نام پوچھتا ہوں تو نام نہیں بتاتے، انعام دریافت کرتا ہوں تو انعام ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے فرمائشی شاعری سے کان اینٹھا۔"

نکتہ چینیاں ہونے کا سبب تو معلوم نہ ہو سکا لیکن اتنا پتہ چلا کہ سرسید اور مولوی ذکاء اللہ صاحب بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ بہر حال اسی ترجمے نے آگے چل کر مولانا کو بیٹھے بٹھائے پھل دئے۔ وہ اس طرح کہ حیدرآباد کے امیر کبیر شمس الامرا نواب رفیع الدین خاں بہادر علم ہیئت کے بڑے عالم تھے۔ ٹی پوروں صاحب نے مسٹر سانڈرس Sandhers ریزیڈنٹ حیدرآباد کو لکھا کہ اشتہار دے کر جو ترجمہ کرایا گیا ہے اس کو Up To Mark کرانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ امیر کبیر کو اس کی درستی کی طرف متوجہ کر سکیں تو میں دونوں کا ممنون ہوں گا۔ اس طرح مولانا کا ترجمہ ریزیڈنٹ بہادر کے توسط سے امیر کبیر کی خدمت میں پہنچا۔ امیر کبیر نے سر سالار جنگ بہادر و مولوی سید حسین بلگرامی عماد الملک بہادر کو دیا کہ وہ اس کو دیکھیں۔ ایک عرصہ کے بعد سید حسین بلگرامی نے مولانا کو خط لکھا:

> "آپ کا ترجمہ میرے سپرد ہوا ہے۔ مجھ کو اس کمیٹی کی رائے سے اتفاق نہیں جس نے ترجمہ کو اچھا نہیں بتایا۔ ترجمہ بہتر سے بہتر ہوا ہے اور اس میں کچھ کسر ہے تو اس قدر کہ آپ ہی اس کی نظر ثانی کریں اور جہاں ضرورت دیکھیں اصلاح کریں اور میں یہی رائے لکھ کر پوروں صاحب کے ہاں بھیج رہا ہوں۔"

ایک ہفتہ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ پوروں صاحب مر گئے۔ ان کی بیوہ ولایت چلی گئیں۔ کوئی چھ مہینے بعد انہوں نے مولانا کو اطلاع دی کہ وہ ترجمہ اور چھ سو روپے ترجمے کی نیت کے امانت ہیں جو تم کو سپرد کروں۔ مولانا نے روپیہ نہیں چاہا البتہ ترجمہ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ جب ترجمہ آ گیا تو مولانا نے اس مراسلت کو مع ترجمہ گورنمنٹ میں پیش کر دیا۔ یہ ترجمہ مولانا نے سماوات کے نام سے کیا تھا۔ گورنمنٹ نے ایک ہزار بطور انعام بھیج دیے۔

حیدرآباد کی ملازمت:

سماوات دیکھ کر ہی خود سالار جنگ کے دل میں فاضل مترجم کے طلب کرنے کا تقاضا پیدا ہوا۔ چنانچہ اولاً سید حسین بلگرامی نے مولانا کو اطلاع دی کہ سالار جنگ بلانا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی سرسید کو حکومت حیدرآباد کا اس مضمون کا خط پہنچا کہ بالفعل ساڑھے آٹھ سو اور بعد کو ایک ہزار جس ماہوار گورنمنٹ برطانیہ کے سکہ سے ملے گا۔ اس وقت مولانا اعظم گڈھ میں چار صدی ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سرسید نے اس کی اطلاع مولانا کو دی۔ سرسید اور مولانا کی مراسلت تو دستیاب نہیں ہوئی۔ البتہ مولانا نے اس بارے میں جو تحریر اپنے فرزند کو بھیجی تھی وہ یہ ہے:

> "اتنی تنخواہ مجھے سرکار انگریزی میں تمام عمر پانے کی توقع نہیں۔ دربار حیدرآباد ان دنوں بہت ممدوح ہے۔ اختیارات وسیع، عہدہ معزز۔ سو تم لوگ مجتمع ہو کر مشورہ کرو۔ اگر اجازت دو تو بالفعل ایک سال کے لئے رخصت لے کر جاؤں۔ انگریزوں کی ہمت پر نظر کرو کس قدر دور سے سفر دریا اختیار کر کے یہاں آتے ہیں۔ حیدرآباد تو اپنا دیس ہے۔ سو بھائی میرا جی چاہتا ہے لیکن اب وہ دل میں باقی نہیں کہ تم سب کو ناخوش کر کے چلا جاؤں۔ اب صرف اتنی گدگدی دل میں ہے کہ میں نے انکار نہیں کیا۔ اگر ابتدا بارہ سو دیں گے اور آخر عمر کے لئے سامان کر دینے کا وعدہ فرمائیں گے تو ان شاء اللہ جاؤں گا لیکن مجھ کو ایسا احمق مت سمجھو کہ بہت روپیہ جمع کرنے کو زندگی کا ماحصل سمجھوں۔ بشیر دنیا کو خوب دیکھا۔ خوب محتاج تھا خدا نے اور غنی کیا۔

اولاد بھائی، حکومت کے مزے اڑائے، ناموری اور شہرت سے بھی بے نصیب نہیں رہا۔ لیکن انجام ان سب بکھیڑوں کا کیا ہے۔ آخر فنا۔۔۔ آخر فنا۔۔۔ اب خداوند تعالیٰ ایسی توفیق عطا کرے کہ کچھ وہاں کے لئے بھی کروں ۔۔۔

کیا وہ دنیا جس میں ہو کوشش نہ دیں کے واسطے
واسطے واں کے بھی کچھ یا اب یہیں کے واسطے"

الغرض یکم اپریل ۱۹۰۱ء کو مولانا اعظم گڑھ سے فراغت کرکے دہلی روانہ ہوئے۔ دیگر مقامات کی سیر کرتے ہوئے ۱۴ اپریل کو حیدرآباد فرخندہ بنیاد پہنچ کر نواب محسن الملک کی کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ مولانا کے بڑے داماد حاجی احمد حسن اور بھتیجے ربیع الدین بھی ساتھ تھے۔ مولانا کی تنخواہ ہزار اور بھتہ دوامی ۲۰۰ مقرر ہوا۔ دونوں ساتھی بھی ڈیڑھ ڈیڑھ سو ماہوار پر مولانا کی ماتحتی میں رکھ لئے گئے۔ مولانا جب حیدرآباد پہنچے تو ان کے لئے بالکل دوسری دنیا تھی۔ وہاں کے ساز و سامان، تزک و احتشام دیکھ کر حیرت کرتے۔ دہلی اور لکھنؤ کی جو خراب حالت اس وقت ہو چکی تھی اس کا مقابلہ کرتے تو ان دونوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں پاتے تھے۔ شہر میں جاکر جب دیکھتے تھے کہ لوگوں کے ہجوم کے تل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی اور ہجوم بھی کیسا قلی مزدوروں کا اور سپاہیوں کا ہجوم نہیں بلکہ نوابوں، راجاؤں اور سرکاروں کا جن کی اردلی میں پلٹنیں، رسالے اور ہاتھی دوڑتے ہیں، تو مولانا حیرت کے عالم میں رہ جاتے تھے۔ سرکاری محلوں میں جاتے تو ہکا بکا ہو کر رہ جاتے۔ لیکن جب مولانا کی نظر بد نظمی سلطنت پر پڑتی تو بہت افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے:

"عملداری میں اچھا انتظام نہیں۔ اگر خدا لوگوں کو توفیق دے، خیر خواہی دے تو یہ ملک بجائے خود اودھ کا چوگنا ہے۔ لوگوں کی شورہ پشتی کی وجہ یہ ہے کہ موقوفی کا دستور نہیں، جرمانہ کا قاعدہ نہیں۔"

حیدرآباد کی ملازمت اختیار کرنے کے چند دن بعد مولانا نے جو خط ریڈ صاحب کو اردو میں لکھا تھا اس کا اقتباس یہ ہے:

"مجھ کو یہاں صدر تعلقداری کی خدمت سپرد ہے اور یہ انگریزی کمشنری سے بہت ملتی ہوئی ہے۔ تنخواہ وہاں بہت، اور اختیارات یہاں۔ مجھ کو تنخواہ کے بارہ سو ملتے ہیں اور بہ تعلق بندوبست مزید ایک سو چالیس۔ یہاں کا روپیہ تین آنہ کے قریب انگریزی روپے سے چھوٹا ہے اور چیزوں کا نرخ بھی اکثر گراں۔ اس ملک میں بھی پارٹی منقسم ہے یعنی مدراسی اور ان دونوں جتھوں کا دور دورہ ہے۔ نواب مختار الملک بہادر اور نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر ریجنٹ ہیں۔ ان دونوں میں جو باہمی اختلاف ہے وہ آپ اخباروں میں پڑھتے ہوں گے۔ انتظام سلطنت مختار الملک کرتے ہیں باستثنا امور عظیمہ کہ جن میں مشاورت امیر کبیر ضرور ہے۔"

مولانا اپنے علاقے کی تفصیلی رپورٹ سرکار میں بھیجا کرتے اور اصلاح طلب امور کی نسبت دل کھول کر لکھتے۔ یہ رپورٹیں سر سالار جنگ تک بھی پہنچتیں۔ وہ ان کو غور سے پڑھتے اور اکثر و بیشتر مولانا کی رائے سے اتفاق فرماتے۔ ساتھ ساتھ ان رپورٹوں کی ادبی عظمت اور شگفتگی سے لطف اندوز ہوتے۔ مولانا کی تجویزات معقول ہوتیں جن کا اثر سالار جنگ کے دل پر بہت اچھا پڑا۔ چنانچہ مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں:

"یہ صرف خدا کی مہربانی تھی کہ ایک تازہ وارد جو رسم و راہ ملک سے بے خبر، زبان سے ناآشنا، دستور و رواج سے ناواقف ہو، آنے کے ساتھ معقول رائے دینے لگے۔ اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ یہاں فارسی دفتر ہے اور میں نے ساری عمر کبھی فارسی نہیں لکھی۔ مجھ کو فارسی کی تحریر ایک اجنبی بات معلوم ہوئی۔ لیکن چار و ناچار لکھنی پڑی۔ وہ خدا کے فضل سے کچھ ایسی پھبی کہ تمام حیدرآباد میں غل مچ گیا اور لوگ دنگ رہ گئے۔"

فارسی رپورٹوں کے چند دلچسپ ادبی نمونے:

مولانا نے جو رپورٹیں لکھی ہیں وہ زیادہ تر نظم و نسق کی مشکلات اور

TECHNICAL MATTER سے متعلق ہیں اور ان کے حل پیش کئے گئے ہیں لیکن ان رپورٹوں میں ادب کی چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے چنانچہ ایسے ہی دو چار نمونے یہاں پیش کئے جاتے ہیں:

۱ - "دوم تعلقہ دار دورہ کردہ کہ گفتند بطور سیاحت۔ روزنامچہ کردہ وا بسند بطور حکایت۔ دستخطے کردہ گفتند چو زلف محبوباں۔ افتاں و خیزاں۔"

۲ - "تجاویز ایں صدر تعلقہ دار را بینی خود منشیان کم سواد یا مثلیان سیہ اعتقاد وضع میکنند و بوجہ نالیاقتی تحریف اصل تجویز مے شود۔ آئندہ اگر چنیں مرئی و مسموع شود از سزا درگزر نخواہم کرد۔"

۳ - "محرر دفتر مغضوب نگر در تحقیق و دار معروف بودم، ایں بارے بریم پریشان نزار حواس دیا انگاں یا ستشائے خود کہ بچوز بوجہ ضیق فرصت تحقیق آں بہ انجام نرسانیدہ ام۔ دریں ممالک بیمیز کہ چوں حاکمے بر کرسی اجلاس مے فرماید۔ اکثر عملہ گرد او حلقہ مے کنند و مطابق تقسیمے کہ مابین شاں معہود است نوبت بنوبت کاغذات پیش نمایند۔ چوں از نظر بگذشتے رفت چنیں نویس بریں شرح۔ کہ خالد جواب نویس است۔ و سعید احکام نویس است و حامد صاف نویس و محمود روز نویس و فلانے تنگی نویس و آں دیگرے رجسٹر نویس۔ ما حصل انتظام شاں اینست کہ اصلاح کار و امر رشتہ خراب و دفتر تباہ۔"

۴ - "مستقبل بودم بر وانگی اندر مگر مساحت دوم تعلقہ دار با تحصیلداراں بہ یک دیگر عمل نگذاشت کہ شتاب بودم۔ دوم تعلقہ دار مزاج دارد کہ ہر کہ در آمیخت در آویخت۔ کم اختلاطی شیوہ ایست محمود لیکن نہ ایں قدر کہ پنج سال کامل شخصے حاکم ضلع باشد و ہیچ کس را ز اعمال و اوضاع او اطلاع نے بلکہ ہمراں بزرگوار تند در لوح دوم تعلقہ دار نوار۔"

بہر حال مولانا بحیثیت صدر تعلقہ دار و ناظم بندوبست بڑی محنت، دیانت اور دلچسپی سے سرکاری کام کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے سالار جنگ کے دل میں ان کی وقعت دن بدن بڑھتی ہی گئی۔ سرکاری کام کی اتنی کثرت تھی کہ تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملتا تھا تاہم مولانا نے سالار جنگ کے فرمانے سے حضور نظام میر محبوب علی خان بہادر کی واقفیت کے لئے (جن کو اختیارات شاہی سپرد کرنے کا زمانہ قریب آ گیا تھا،) انتظامات سلطنت سے متعلق سات یا گیارہ رسالے لکھے جن کی زبان شستہ اور صاف اور بیان شگفتہ تھا۔ یہ رسالے ایسے عنوانات پر مشتمل تھے: مال گزاری، عدالت، تعلیمات، پولیس، مالیہ وغیرہ۔

نواب سالار جنگ سے متعلق اپنے فرزند کو لکھتے ہیں:

> "نواب صاحب کے دل میں جگہ ہونی شرط ہے پھر تو وہ اس طرح کا کچھ دل آدمی ہے کہ جو مانگو سو لو۔ مثل ہندوستانی رئیسوں کے ہمارے نواب صاحب احمق اور لایعقل نہیں ہیں۔ اپنے وقت کا یہ شخص ارسطو اور افلاطون ہے۔ لیکن کریم النفس اور مروت اس درجہ کی ہے کہ لا اور نہیں اور وہ منہ سے نہیں نکلتا۔ بشیر! یہ بڑا عمدہ اصول ہے۔ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ تم نواب صاحب کے احسانوں پر نظر کرو۔ نواب صاحب کے حق میں صمیم قلب سے دعا کرنی چاہیے۔"

انگریزی خدمت سے استعفیٰ:

مولانا انگریزی حکومت سے دو برس کی رخصت لے کر حیدرآباد گئے تھے۔ یہ مدت ختم ہونے آئی تو محسن الملک کے ذریعے سے سالار جنگ تک یہ بات پہنچائی کہ میں رخصت کے ختم پر واپس جاؤں گا۔ سالار جنگ کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے کسی موقع پر سبب دریافت فرمایا۔ مولانا نے عرض کیا۔ وہاں کے حکام سے میری شناسائی ہے ان کے ذریعے سے میں اپنے اعقاب کی فکر کرنی چاہتا ہوں۔ نواب صاحب کریم النفس نے اعقاب کی فہرست مانگی۔ مولانا نے بشیر الدین (فرزند)، احمد حسن (داماد) اور مولوی شرف الحق (داماد) کی رقم نویسیاں پیش کر دیں۔ یہ فہرست سالار جنگ نے یہ کہہ کر ——— محسن الملک کو دی کہ مولانا سے پوچھ کر ان لوگوں کو خدمات مناسب پر مامور

کریں۔ چنانچہ مولوی بشیر الدین کے نام ۵۰ روپے ماہانہ وظیفہ کار آموزی جاری ہوا اور دو وقتی ماہوار چار سو اور ڈھائی سو ماہوار پر مامور ہو گئے۔ ملازمت حیدرآباد کے زمانہ میں جبکہ صوبۂ شمالی کے صدر تعلقہ دار تھے مولانا نے باوجود کثرتِ کار چھ مہینے کی مدت میں پورا قرآن مجید اپنی بیوی کو سنا سنا کر حفظ کر لیا۔ تراویح بھی سناتے تھے مگر غلطیاں کرتے تھے۔

حیدرآباد کی ملازمت میں انقلاب اور استعفےٰ:

ریاست کی ملازمت کے متعلق ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:

> ”جو یہاں ہے وہ وہاں (ممالک محروسہ میں) نہیں یعنی عزت و آبرو، بیش قرار تنخواہ۔ اور جو وہاں ہے وہ یہاں نہیں یعنی قاعدہ قانون اور کامل اطمینان۔ باقی جو وہاں سو یہاں، جو یہاں سو وہاں۔ دلی میں برائے نام ایک بادشاہ تھے جن کو لاکھ روپے مہینہ پنشن کے طور ملتا تھا۔ میں نے یہاں ایک سلطنت دیکھی کہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ لاکھ سالانہ کے جاگیردار ہیں۔ غرض مسلمانوں کی سلطنت کی ایک یادگار ہے۔“

جب سالار جنگ کا انتقال ہوا اس وقت مولانا مجلس مالگزاری کے ممبر مقرر ہو چکے تھے۔ ۱۱ سو تنخواہ ملتی تھی۔ یہ دور سالار جنگ کے فرزند نواب لائق علی خاں بہادر سالار جنگ ثانی کی صدارت المہامی کا دور تھا۔ ممبروں کی سازش اور آپس کے اختلافات کی وجہ سے مولانا نے مجلس ہی سے استعفےٰ پیش کر دیا۔ نواب لائق علی خاں بہادر نے جو مولانا کے شاگرد بھی رہ چکے تھے مولانا کے لئے مشیر مال کا ایک نیا عہدہ تراشا جو برائے نام تھا۔ تنخواہ پوری کام در اصل کچھ بھی نہیں۔ مولانا کو سب نے روکا زبردستی بہت سمجھانے بجھانے کے بعد بھی مولانا اس عہدہ پر راضی نہ ہوئے تو استعفےٰ قبول کر لیا گیا اور مولانا کبیدہ خاطر ہو کر حیدرآباد سے نکل کھڑے ہوئے۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کب گئے۔ گھر کا سامان، گھوڑا گاڑی سب جوں کا توں چھوڑ گئے جو بعد کو کوڑیوں کے مول نیلام ہوا۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

> ”سر سالار جنگ کے انتقال کے بعد سبھی اُمراؤں کے پائے ثبات ڈگمگا اٹھے اور جو سب سے پہلے بھاگ کھڑا ہوا وہ میں تھا۔“

گورنمنٹ آف انڈیا اور حکومت حیدرآباد دونوں کی مدت ملازمت تیس سال سے کچھ زیادہ تھی اس لئے مولانا کو ان رسائل کا معاوضہ ادا کرتے ہوئے جو حضور نظام کے لئے لکھے گئے تھے چھ سو روپے ماہوار پنشن مقرر ہو گئی جو تا حیات ملتی رہی۔ پنشن کے بعد سے تا زیست مولانا دلی ہی میں رہے۔

منٹو

یہ سعادت حسن منٹو کی افسانوی رنگ میں سوانح ہے جسے منٹو کے بچپن کے دوست ابو سعید قریشی نے لکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سوانح میں بڑی آزادانہ اور شوخ کام کی باتیں ہیں۔ اس میں منٹو کی نہ تو بے جا تعریف ہے اور نہ ہی خدا واسطے کی دشمنی۔ منٹو جو کچھ اور جیسا کچھ تھا اسے ہو بہو قریشی نے پیش کر دیا ہے۔

قیمت ۲/۸

ادارۂ فروغ اُردو۔ لاہور

ضمیمہ

شخصیّات نمبر

یہ وہ مضامین ہیں جو شخصیات نمبر
میں بروقت نہ ملنے کی وجہ سے
شائع نہیں ہو سکے تھے۔

(ادارہ)

علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی

ابوالخیر مودودی

طباطبائی صاحب کا تخلص ان کی شخصیت تھا اور شخصیت ان کا تخلص۔ وہ سراپا نظم ہی نظم تھے۔ سیدھے تنے قدم اٹھتے تھے بول اسی لہجے میں [illegible] لہجے میں نرمی اور دھیما پن، تمام عمر بول چال سے [illegible] صفات، وضع پاک، نہاد تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ اوصاف سے آراستہ، نشست و برخاست کا جو طریقہ اپنے دیرینہ حلقے میں ادبی سرکاروں میں رکھا [illegible] کہیں فرق نہ آنے دیا۔ شعر گوئی کی مجلسوں میں [illegible] شعر پر [illegible] اور [illegible] کہ [illegible] اس میں سے [illegible] اصلاح تھا؟ [illegible] حیدر کو [illegible] نہیں کرتے تھے [illegible] "اچھا [illegible]" [illegible] بات نکالی ہے [illegible] حسب مراتب شفقت اور [illegible] عزت [illegible] ان کا [illegible] خلوص ان کی شخصیت کا ایک [illegible]

اردو شاعری میں تخلص کی جو کچھ بھی وقعت ہو، طباطبائی صاحب کا تخلص [illegible] نہیں [illegible] ہے۔ وہ ایک واضح [illegible] ان کی شخصی اور فنی [illegible] سے [illegible] نظم ان کی [illegible] نہیں [illegible] کرتا ہے۔ اردو شاعری کے پورے دفتر میں شاید ہی کسی شاعر کا تخلص اس کی شخصیت اور اس کے فن [illegible] کا ترجمان ہو جس قدر کہ طباطبائی صاحب کا تخلص [illegible] اخلاق [illegible] حیدر نظم [illegible] علی حیدر صاحب [illegible] خیال [illegible] طباطبائی [illegible] اختیار کرنا۔ اگر وہ غزل کے [illegible] پیدا ہوتے تو [illegible] غزل ان کے قریب [illegible] نہ وہ غزل کے قریب پھٹکتے۔

طباطبائی صاحب مشرقی علوم کے نہایت بلند دست گاہ، عالم، نادر الکلام ادیب اور انگریزی ادبیات کے صاحب کمال رمز شناس تھے۔ عروض و قافیہ کا علم [illegible] کی تکمیل کا لازمی حصہ تھا۔ طباطبائی صاحب نے [illegible] ماحول کے تقاضوں سے اس علم میں [illegible] ادبی [illegible] کے تمام علوم میں استادِ کامل [illegible] شعر گوئی ان کے [illegible] کا محض ایک گوشہ ہے [illegible] عالم شعر و ادب [illegible] سمجھتے تھے۔

حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے مغربی تعلیم کا واحد [illegible] مرکز [illegible] نظام کالج تھا۔ طباطبائی صاحب پہلے شخص تھے جو اس کالج میں عربی فارسی اور اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور [illegible] ان تینوں زبانوں میں جامعہ [illegible] ہے۔ [illegible] پروفیسری کی یادگار ہے اور اسی سے

لکھی ہے اور یہ کیفیت اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اُردو کے ادبی ذخیرے میں نقد شعر پر یہی ایک ایسی کتاب ہے جو ہمیں شاعری کے مطالعے کا علمی طریقہ سکھاتی ہے۔ ہم ایک شاعر کے حسین خیالات اور چیدہ و دلکش ترکیبوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اس کی صناعی کی خوبیوں کو نہیں جانتے۔ ہم ایک شاعر کو سراہتے ہیں مگر انگلی رکھ کر نہیں بتا سکتے کہ اس کے شعر میں کیا خوبی ہے اور اس وجہ سے کہ فن شعر میں درک نہیں ہوتا ایک شاعر کو دوسرے شاعروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ بسا اوقات شاعر اتنا اونچا جاتا ہے کہ فن کے متداول ناپ سے گرد و پیش رہ جاتے ہیں۔ اس کا جذبہ تمام فن کے سانچے کو توڑ دیتا ہے اور اس کی شکست کاری شعر کے سانچے کو صحیح اور فن کو یا شعر خلاق ہے۔ ہم اس شکست و ریخت کے حسن اور شاعر کے اصل کمال کو تبھی سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیں شعر کے آداب میں گہری نظر حاصل ہو۔ شرح طباطبائی اگر ہم شرح غالب سے قطع نظر کریں اور اس کے فنی اور اصولی مباحث سے استفادہ کریں، ہمیں فنی شعر کے بہت سے الجھے ہوئے نکتے سمجھاتی ہے اور اس شعر کی یافت میں ہماری مدد کرتی ہے۔ گو ہم خود طباطبائی صاحب اسیر حلقۂ دام نظم و قواعد ہیں۔

نظام کالج میں معلمی و تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے تو کچھ دنوں ادبی کام پر مامور ہو گئے۔ پھر جب عثمانیہ یونیورسٹی کا شعبۂ تالیف و ترجمہ قائم ہوا تو اعلیٰ حضرت اقدس و اشرف سلطان نے ترجموں کی ادبی اصلاح کے لئے بطور خاص ناظر ادب مقرر فرما دیا۔ اور ہمیں مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ بڈھے شیر کے سامنے ہم بیٹھے ہوں یہ رخ ہی نہیں جس کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا ہو اس کی قدر کیسی ہے جس سے کیا کم ہوگی بھیوں تک سفید اچھو سمجھے سمجھاتے۔ طباطبائی کی ملازمت سے سبکدوشی اور گوشہ نشینی، دفتر میں وقت مقررہ پر پابندی سے آتے اپنے کام کے علاوہ عربی انگریزی سے ترجمے کا بھی کام کرتے اور اصلاح کی مجلسوں میں بھی شریک ہوتے۔ پھر ۱۹۳۲ء میں طباطبائی اس خدمت سے دست کش ہو گئے۔ اگلے سال عمر کا آخری دم تک قائم رہا۔ مئی ۱۹۳۳ء میں وفات پائی۔

حیدرآباد میں یہ عام چلن تھا کہ خطاب میں نام گم ہو جاتے تھے۔ بتایا نہیں جاتا تھا کہ خطاب یافتہ صاحب اپنا کوئی اصلی نام بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ اصل سے خطاب ہی پہلے لوگ ہوتے تھے۔ جہاں دیکھئے جسے دیکھئے آدمی گم خطاب حاضر۔ طباطبائی صاحب بھی خطاب یافتہ تھے مگر انہوں نے اپنے نام کو خطاب سے بالا رکھا۔ خطاب دفتروں ہی میں محدود رہا۔ ایک دفعہ کسی نے ایسی ہی غلطی سے اور اپنی عادت کے مطابق "نواب حیدر یار جنگ بہادر" لکھ دیا۔ فرمایا "اے حضرت! یہ کیا قیامت ہے؟ آپ بھی ناشناسوں کی چال چلنے لگے۔" ان کے پرانے ملنے والے اور وہ لوگ بھی جنہوں نے ان کو حیدرآباد کی ابتدائی زندگی کے زمانے میں دیکھا تھا کہتے تھے کہ شروع سے ہی طبیعت کا جو انداز رکھا تھا وہی آج بھی ہے۔ نہ پہلے کوئی جھوٹ رکھا تھا نہ آج کوئی نیا پندار ہے۔ چلن میں پہلے بھی دستی اب بھی وہی تک اپنی عزت کی استواری ایک مستقل التزام تھی۔

طباطبائی گھرانا اتنا قدیم ہے جتنی کہ اسلامی تاریخ۔ امام حسن علیہ السلام سے چوتھی پشت میں علویوں اور حسینیوں کے ایک بزرگ خاندان ابراہیم کا حال تھا کہ ایک دن انہوں نے خادم سے اپنا لباس طلب کیا۔ کہنا چاہتے تھے "قباء" زبان سے نکلا "طبا طبا"۔ اس دن سے وہ طباطبا ہو گئے اور ان کی اولاد طباطبائی کہلائی۔ عباسیوں اور فاطمیوں کی خلافت میں اس گھرانے کے اکابر نقیبوں کے نقیب بھی رہے اور شریف مکہ بھی۔ اور حقیقتاً یہی شریف بھی اسی گھرانے سے ہیں۔ علم اور تہذیب شرافت میں وہ ہمیشہ یکساں ارجمند رہے اور ہندوستان میں یہ گھرانا نواب وزیر کے جاہ سے پہلے ایران سے آیا تھا، بزرگ وہاں سے آئے بھلے ہی تھے۔

طباطبائی صاحب کی زندگی کا موسم بہار جان عالم واجد علی شاہ کے دربار میں گزرا۔ وہ مٹیا برج کی بزم سخن کے بڑے ارکان میں تھے اور شہزادوں کے معلم و اتالیق تھے۔ واجد علی شاہ کے سالار اور بھتیجے مرزا جہاں قدر نے امرؤ القیس اور عرب کے قصیدوں کو اُردو شعر میں ڈھال دیا۔ مرزا ایک نصیحت کر دوست کو خطاب کر کے کہتا ہے:

لعمرک ما امری علی بعض ریقہ بنعلی ولا نیلی تحلق بسر بہ

نظمؔ نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

شد اطول شب غم سے تو ہی مرد مصیبت ہے ترے سر کی قسم مشکل ہو مشکل میں نہیں ہوں

کم و بیش بیس سال طباطبائی صاحب مٹیا برج کی فضا میں رہے۔ دربار کی خزاں اور ان کی بہار ایک ساتھ آخر ہوئی۔ وہ ان لوگوں میں آخری شخص تھے جو بادشاہ کی وفات کے بعد بھی مٹیا برج کے مکینوں سے وابستہ رہے۔ اور حیدرآباد آنے کے بعد بھی واجد علی شاہ کے پوتے پرنس مرزا ... مقیم ہے ان کی زندگی تک اسی نہج پر تعلق قائم

رکھا ہے

جانِ عالم پیا کا دربار اور یہ اخلاق باطن "عشق جوان کی شان" مرحوم! —— مگر تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ساون بھادوں کی جھڑی کا لطف اس کی رُت میں ہے اور صحیح میدانوں میں کھیتی ہے نہ خانوں میں نہیں گھستی —— پھر ناشر خراجِ تحسین ہے' علم جب کسیتا ہوتا ہے' انسانی فطرت سے نبرد صداقت کرتا ہے اور فطرت جب شائستگی سے نکھار پاتی ہے تو خوش خلقی کے ایجاز نہیں کرتی خوش وقتی کے اعتراض ہے اس کو دیا وہ تاب کا رجحان ہے۔ یہ خاندانی حسن میں داستانیں اس لئے نہیں چھپتیں کہ کوئی عیب مشغلہ ہے۔ اس لئے چھپتی ہیں کہ فطرت کا مسودہ ہوتی ہے' یہ اور نہیں داستان ہی میں کم نگاہی پر ادب کی نگاہیں زندگی کے محدود دائروں کو پوری شخصیت سمجھ لیتی ہے مگر مشغلے اور زندگی کی راہیں فطرت اور فطرت کے اصول بیانے نہیں ہوتے۔ فطرت کے اصلاحات بہت وسیع ہیں۔ اس کا حسن تقویم سے اصل سا عجیب پھیلا ہوا بھی پوری جوان گاہ میں دیکھا جاتا ہے۔

ماوراء میں بھی جا بجا بی صاحب کے مشاغل بہت زیادہ تھے ہی موجود تھا امرار سوا! مرحوم اظہر سے مولانا حالی آتو ایک پہلی دنیا! اور بھی اتفاق سے دونوں کے کرسے اہم روایت وفقیہ، مگر زمانی کا اخلاق اور مشغلے ان کا پورا حرف تھے اور ان کی زندگی کا محدود دائرہ ان کی پوری شخصیت۔ پھر کے غنیمت سے غزل و نظم بے تکلف

ے کلکتہ کے ایک انگریزی پرچہ میں مسٹر کا مضمون سنڈے سٹیٹسمین میں شائع ہوا تھا۔ میں پرنس مرزا انجم قدر کی صحت پر شائع ہوا تھا اس کے اقتباسات میں اضافت کا ہوں ہے۔

اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کے ایک پوتے پرنس مرزا انجم قدر بہادر نے ۸۰ برس کی عمر پا کر اس اپریل کو انتقال کیا —— ہندوستان میں ایسے کتنے آدمی ہوں گے جن کا حال یہ ہو کہ ایک شہزادہ گزرا ہو اور ہم کو خبر بھی نہ ہو؟ مجھے مرحوم شہزادے کے زمرۂ احباب میں داخل ہونے کا فخر حاصل تھا اس لئے دل کہتا ہے کہ جب اس کا جنازہ سامنے سے گزرے تو تعظیم سے اس کے آگے جھک جاؤں۔

۱۹۳۰ء میں جہاں قدر مرحوم ایک مصیبت کے وقت میں جب ملنے آئے تھے کئی سال سے خاندان اودھ کے وظیفے کے سلسلے میں پھنس گیا تھا اور وظیفہ بند ہو گیا تھا۔ شاہی خاندان کی ایک بیگم اپنی جائداد پر کچھ قرض لینا چاہتی تھیں۔ اس ضمن میں میرا مشورہ طلب کیا گیا تھا۔

گارڈن ریچ کے قریب ساحل دریا پر جو عظیم الشان عمارت اپنی عظمت رفتہ پہ ماتم کر رہی ہے میں کئی مرتبہ اس میں جا چکا ہوں۔ لیکن جب کبھی اسے دیکھتا ہوں دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے اور زبان سے آپ ہی آپ ان لوگوں کے حق میں کلمۂ تحسین نکل جاتا ہے، جنہوں نے بڑی بڑی مصیبتوں میں بھی جبین پر شکن نہ آنے دی اور ہمیشہ سر بلند ہی رہے۔

یہ تو سب جانتا ہے کہ انگلستان نے ہندوستان کی حکومت جب اپنے ہاتھ میں لی تھی اودھ کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ سے ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے مطابق انہوں نے اودھ کو خیر باد کہا اور کلکتہ میں سکونت اختیار کی جہاں انہیں وسیع اور شاداب زمینیں دی گئیں۔

میرا مرحوم دوست شہزادوں ہی جیسا وقار کی بہت عمدہ آدمی پر گزر اوقات کرتا تھا۔

اپنی آبادی کے زمانے میں یہاں کتنے شاندار محل ہوں گے! اب یہ علاقہ گارڈن ریچ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے سامنے ندی کے کنارے سے ان علاقوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ ایک زمانے میں یہاں شاہی خاندان کے لئے قصر محل تھے۔ محلوں کے اندر گلاب اور جوہی کے پھولوں کے تختے لگے تھے ....

اب ساحل محلوں کے باہر کا میدان بھی خاندان اودھ کی ملک تھا۔ اس سب کی قیمت معقول لگائی گئی تھی۔ کلکتہ جانے والی سڑک کی طرف جو سڑک جاتی ہے آج بھی اس کے دونوں طرف تنگ و تاریک کوٹھیوں کے کھنڈر خاموش کھڑے ہیں۔ اب ان مکانوں کا کوئی کرایہ دار بھی نہیں پوچھتا۔

ہم محل کی طرف روانہ ہوئے۔ اس کا عظیم الشان صدر دروازہ کسی بھی بڑے شاندار مقبرے کے باعث نادر ہو سکتا تھا۔ گنبد کے پہلو میں ذات خاندانی دہلیز صرف ایک تھا جس سے بڑی شکست سے پہلو بدل دیا۔ اس کا اس شاندار محل کا رنگ اڑ چکا تھا۔ دل سے ایک آہ اٹھی اور آنکھ پر کر رک گئی۔ اس شکستہ دروازے نے شاہی درباروں کے کیسے کیسے جاہ و جلال نظارے دیکھے ہوں گے!

نرم سیج تھی۔ دونوں با کمال بزرگ جب مل بیٹھتے اس قدر شگفتہ باتیں کرتے کہ یوں معلوم ہوتا کہ جیسے آب ہے جو کناروں سے چھلکی جا رہی ہے۔ بڑھاپا پیچھے مڑ کے دیکھتا ہے۔ مگر یہ دونوں خوش مزاج بڑھے پیچھے مڑ کے نہیں دیکھتے تھے جوانی اور بڑھاپے کے سنگم پر چلے جاتے اور وہاں سے ایک آنکھ سے ماضی کو دیکھتے دوسری آنکھ سے حال کو۔ اور اگلے وقتوں کی تہذیب و معاشرت کے دیدہ و شنیدہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر گفتگو کرتے جن کے عیب و صواب کو نئی تہذیب و تعلیم کے تصادم نے محسوس کرایا۔

پھر کلچر کی یہ خوبی دیکھیے کہ جگہ خود ایک نمونہ تھی کہ طباطبائی صاحب جو سن و سال میں مرزا صاحب سے دس پانچ برس بڑے تھے مرزا صاحب اس بزرگی کا لحاظ کھیں پاس و لحاظ کرتے۔ بھری کا ادب نہیں، اپنی اور ان کی مرتبت شناسی کے ساتھ رنگ داشت۔ گفتگو میں مرزا جان کے حلم کا شائبہ بھی نہ آنے پاتا۔

ایسی پاکیزہ شخصیتیں اب ڈھونڈے سے نہیں مل سکتیں۔ یہ اس دور کی یادگار تھیں جب مسلمانوں کی معاشرت پر صنعتی انقلاب کا دیو براہ راست نہ پڑا تھا۔ تہذیب ایک تسلسل کے ساتھ مزاجوں کو معاشرے میں سمویا اور ان سے ایک گہرا رچاؤ پیدا کر رہی تھی۔ اس رچاؤ نے معاشرے کے مختلف گروہوں میں وہ ربط اور میل پیدا کیا تھا جو تہذیب کے تسلسل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ کلچر جیسا کچھ بھی تھا اسی میں ٹھہراؤ تھا، وحشت نہ تھی۔ قدریں متعین تھیں اور مستقل تھیں۔ معاشرتی عناصر اپنا اپنا ایک مستقل اور ہم آہنگ کردار رکھتے تھے اور اپنے رنگا رنگ کرداروں سے معاشرے کو خوش رنگ بناتے تھے ـــ نخلستان کے یہ جزیرے دوبارہ ریگستان میں زندہ نہیں رہ سکتے ـــ انشاء اللہ خاں نے "دریائے لطافت" میں اپنے زمانے کے شہروں اور شہریوں کا جو کلچر اور کیریکٹر لکھا ہے، کلچر کا وہ رنگ ہی کیا، وہ وضعدار کیریکٹر آج کہاں ہے اور پرانے بلند مقامات اور پرشکوہ نقار خانوں میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتا۔ صنعتی انقلاب اور انقلاب فرانس ایک خلا کا اصل ہے جو جدید یورپ اور ایشیائی معاشرہ کی طرح تہذیبی تسلسل کے اس دور کو اپنے ماضی اور حال کے ساتھ سے بالکل جدا کر دیتا ہے۔ انقلاب کی فطرت توڑ پھوڑ ہے، بناؤ اور تدریجی ارتقا نہیں۔ جو کچھ پہلے مقدس و محترم تھا۔ بقول مارکس صنعتی انقلاب کے سرمایہ داروں نے اس کو سرمایہ کے تالاب میں غرق کر دیا۔ اب کوئی چیز مقدس نہیں، کوئی چیز اپنی مستقل قدر نہیں رکھتی، ہر چیز تجارتی مال ہے، علم اور مذہب حتیٰ کہ انقلاب بھی اور دونوں سیاست کے بازار میں چالو، کلچر اور اس کی قدریں اب گئے گزرے وقتوں کی کہانی ہے۔

میں نے طباطبائی صاحب سے کہا: کیا اچھا ہوتا کہ آپ اس جام بادشاہ پر ایک کتاب لکھ دیتے۔ کچھ خیالات بھی اس نئی تعمیر میں مدد ہوں گی۔ طباطبائی صاحب کے چہرے پر حزن و ملال کی ایک لہر دوڑ گئی کہنے لگے: ایسی سادہ باتیں کم سننے میں آتی ہیں۔ آئین دنیا ہمیشہ سے یہی ہے کہ ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند۔ میں نے بہت سا مواد جمع کیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاغذات سے، اور بہت سے سرکاری غیر سرکاری روزنامچوں سے، اور لندن کے اخباروں کے جو نامہ نگار بادشاہ سے ملے تھے ان کے زمانے میں ملے اور انہوں نے اپنے اخباروں کو مضامین بھیجے، یہ سب مواد میں نے جمع کیا تھا۔ کلکتہ میں ایک انگریز وکالت پیشہ تھا، یہ آخر زمانے کی بات ہے، وہ بادشاہ کا بہت گرویدہ ہو گیا تھا، اس نے بھی مواد کی فراہمی میں بہت مدد دی۔ مگر صاحب وہ سارا مواد اور میری لکھی ہوئی کتاب اس طغیانی کی نذر ہو گئی جو ۱۹۰۸ء میں رود موسیٰ میں آئی تھی ـــ

پھر گفتگو واجد علی شاہ کے مذاق اور سیاست پر چل نکلی۔ طباطبائی صاحب کے سینے میں جو تقسیم کا دھیان اور وہ غدر کا گرداب تھا، انہوں نے کہا۔ بادشاہ میں خوبیاں بھی تھیں عیب بھی تھے۔ ہر چیز کی ایک عمر ہوتی ہے، سلطنت کی عمر پوری ہو چکی تھی۔ اسی انیسویں صدی کی ابتدا کی تو بات ہے کہ دیرینہ بادشاہ سلامت آگے کابل اور گئے تھے اور بادشاہ کے سامنے خاص لباسوں کی لڑکیوں کے ساتھ ناچتے تھے اور مدہوش ہوتا تھا۔ اور مدینہ میں تو اب منظر کسی نے نہیں دیکھا۔ یا یہ ہم نے ہی تو نے جنم لیا اور اودھ کی سلطنت مٹ گئی۔ بننے بگڑنے کے بہت سے عوامل ہوتے ہیں۔ ایک چابجا نہیں چھوڑتا۔ سلطنت کی تباہی کا انحصار پورا معاشرہ تھا۔ غیر شیعہ تو مسلمانوں کی ملک داری کا اس ملک میں ہر سال برس سے بکھرتا شیرازہ ہو چکا تھا حضرت عالمگیر بادشاہ کی ذات میں شکست و ریخت پیچھے تھی ان کی آنکھ بند ہوئی شکست ہو گئی ریخت تباہ ہو گئی۔ دلی اور اودھ دو مرکز تھے جو کچھ بھی انہوں نے دیکھا اس کو سنبھال کے۔ کمپنی تو کہاں ہو گی جو سنبھالے نے انتظام بدل دیا۔ واجد علی شاہ نوجوانی میں تخت پر بیٹھے تھے۔ مسندی مستعدی سے طور اطوار شروع کیے۔ دادگستری اور اصلاح لشکر پر خاص توجہ تھی، طور پر ہیں سے دوسرے دن تک ایک رسم کو بھی اصلاحات ذکر کرنے کے بہت کچھ کیا، ان کی کارپردازی کے ثبوت ہیں۔ مگر سب چند روزہ بہار تھی۔ سرکار کو

داغ بھی ملتے ہیں، ہمارے راستے میں، بہت زمانوں سے اپنی جڑیں پھیلائے جا رہا تھا۔ بادشاہ رکھتے تھے لشکر کی اصلاح کرنے، اب جو دیکھتے ہیں عورتوں کی فوج مرتب ہو رہی ہے۔ فقط ایک بادشاہ کی ذات تھی جس میں ملک داری کی استعداد تھی باقی آوے کا آوا بگڑا ہوا۔ شکار گاہوں میں شیر کو جب شکار کرتے ہیں اس کا شکار کیا جاتا ہے اور وہ کی سلطنت شکاریوں کی شکار گاہ بنی ہوئی تھی، بادشاہ کا شکار کیا جا رہا تھا ——— انسانی فطرت طبیعتوں کو دیر میں قبول کرتی ہے۔ جلد ہی پژمردگی محسوس ہوتی ہے۔ نفس کی ادنیٰ خواہشوں کی طرف جلدی لپکتی ہے۔ نشیب کی طرف اترنا سہل ہوتا ہے۔ بادشاہ بہت سی خوبیوں اور عشرتوں میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن انتہائی عیش پسندیوں کے باوجود کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی بادری مخالفت کو دیانی کا موقع ملا ہو۔ وہ اپنی شریعت کے خلاف کبھی کوئی کام نہ کرتے تھے۔ مٹیا برج میں ایک امام باڑہ "بیت البکا" بنوایا تھا جب وہ تیار ہو گیا، اس میں سادات عزاداروں کی ضیافت کی اور حسن عقیدت سے آفتابہ خود ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوئے۔ خود سب کے ہاتھ دھلائے۔ وہ اپنی ذات سے بہت نیک دل اور درگزر تھے۔ کسی عوامی یا اخلاقی بیگانہ و بیگار کے سامنے ملنے میں عادت نہ کی، کسی کے ساتھ بدی نہ کی، کسی مخالف کو ستایا نہ کسی کی جان لی۔ اس میں خود نخوت نام کو بھی نہ تھا جس سے چھوٹوں میں کوئی امیدوار نہیں خالی نہیں ہوتا، ہر فرد بشر کے سلام کا جواب دیتے، خوش خلقی اور خندہ پیشانی سے پیش آتے اور نرمی سے گفتگو کرتے۔ یہ بات سننے کے قابل ہے، بادشاہ کے رہنے والے ایک صاحب امیر علی خان ہائی کورٹ کے وکیل تھے، مٹیا برج میں بادشاہ کے ملازم ہوئے بتدریج ایسا تقرب حاصل کیا کہ وزیر السلطان خطاب ہوا اور تمام اہل دربار ان سے رشک کرنے لگے۔ ہر ایک کو فکر ہوئی کہ انہیں بادشاہ کی نظروں سے گرائیں۔ ان حضرت نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے زمانے میں ہیمز گزٹ [illegible] وغیرہ ایک جھوٹی خبر چھپائی تھی کہ راجہ مان سنگھ لکھنؤ سے چھپ کر آئے اور بادشاہ سے اس مضمون کا ایک فرمان حاصل کر لے گئے ہیں کہ اہل اودھ خدمت کے انگریزی تسلط کا تختہ الٹ دیں۔ ہیمز گزٹ نے فقرہ یہ واقعہ نائب گورنر جنرل کے حضور میں عرض کیا، وہاں سے بادشاہ کو قید کرنے کا حکم صادر ہوا۔ بادشاہ فورٹ ولیم میں قید کر دیے گئے۔ لیکن خبر جھوٹی تھی، معلوم ہو گیا کہ اس روز تو راجہ مان سنگھ لکھنؤ میں موجود تھے۔ ہیمز گزٹ نے پتے کرید، امیر علی کی تحریر اور خبر کی بے اصلی کا سارا واقعہ پشت روزنامچے میں لکھ دیا تھا، امیر علی نے اس کا روزنامچہ منگایا اور شہزادہ مرزا جہاں قدر کی وساطت سے بادشاہ تک پہنچا دیا۔ مگر بادشاہ عجب نفس رکھتے تھے، فرمایا کہ اس زمانے میں امیر علی میرے ملازم نہ تھے ——— مثنوی "دریائے تعشق" بادشاہ کے کلام میں ایک ممتاز چیز ہے۔ اس مثنوی میں جو قصہ ہے، وہ اس کا رہس ہوا کرتا تھا۔ اس پر اہل شہر طعنہ زنی کرتے تھے کہ ہائے غضب، بادشاہ ناچتے ہیں۔ اصل اور بے اصل کی بات تو خدا ہی جانے، وہاں خدا ہی خاص کو بھی بار نہ تھا۔ بادشاہ کے محل میں ایک گروہ رہس والیوں کا تھا۔ وہی اس قصے کا رہس کیا کرتی تھیں۔ ان کے محل میں عورتوں کے گروہ تھے، اپنے اپنے درجے اور رتبے کے مطابق ان کی جدا جدا منزلیں تھیں: جھومر والیاں، لکھنؤ شٹ والیاں، نقطہ والیاں، ننگلی والیاں، سادہ خطا منزل والیاں، لادھا منزل والیاں، رہس والیاں یہ سب متعدد تھیں۔

متعہ! ——— جاہرہ! ——— نکل! ——— نام جو چاہے رکھ دیجئے عورت ایک ہے ——— ذائقہ تنوع چاہتا ہے!

طباطبائی صاحب بہرحال نظم تھے۔ جس قدر طباطبا اسی قدر نظم، حضرت نظم نے فرمایا: "مگر شعر نہ اس درجہ سمجھ کر پڑھا جاتے تھے۔ فکر شعر کے وقت وہ دو تین خوش نویس لکھتے جاتے تھے۔ ایک شعر ان سے لکھنا شروع کیا تھا کہ دوسرا اور تیسرا شعر بھی تصنیف ہو گیا" اور شخصیت نے پتا کا کل کر دیا۔

مرقع اور تشکیلی کے جوہر کمال کو ماں فن کی بزم تادیب سے ہم کنار کیا، طباطبائی صاحب کا ادبی تشخص مٹیا برج کی بزم سخن سے ابھر کر ہوا۔ علم سے ہر در وجدان میں اپنے اظہار کی امنگ ہوتی ہے اور علم بنیادی طور پر صدرانہ استعداد و علم ہوں۔ انفرادیت کا حوصلہ اسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔ ماحول کے ساتھ اسی حوصلہ مند انفرادیت کے عمل و ردعمل نے طباطبائی صاحب کے ادبی تشخص کو جنم دیا اور ادبی تشخص نے ان کی شخصیت کو، پھر اس سے ترکیب پا کر ایک نئی انفرادیت ابھری، کچھ الگ، منفرد، اپنا ایک جداگانہ رنگ، اپنا ایک ممتاز نقطہ نظر۔ ان کا ایک مضمون ہے، "مٹیا برج کے سیاح سیارے" یہ سیاح سیارے واجد علی شاہ کے منتخب شاعر تھے، مضمون میں ان سیاروں کی ایک جھلک دکھائی ہے، اس جھلک میں جگہ جگہ خود طباطبائی صاحب موجود ہیں اور ہیں اپنے حوصلۂ اظہار ذات کی قوت اور مشکلوں سے آگاہ کرتے ہیں۔

—— مرزا رضا برق، ناسخ کے شاگرد و بادشاہ کے استاد تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خاص رنگ ان کا بندش ہے اور شعر میں نئے طرز کی بندشیں کرنا یہ ناسخ والوں کا ایک ممتاز طریقہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مرتے وقت بادشاہ کے پاس یہ شعر لکھ کر بھیجا ؎

برق ہونے سے کہا تھا یہی کر کے اٹھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جان دی آپ کے دروازے پہ مر کے اٹھے

حالت احتضار نے اس شعر میں وہ تعقید پیدا کر دی ہے، یعنی ہونے سے کہا تھا برق وہی کر کے اٹھے۔

—— منشی مظفر علی اسیر نے مجلس میں سلام اور مرثیہ پڑھا، سلام میں یہ مصرع تھا،

سریرِ خلافت او امامت، ایسے ہم سفر ہیں

جب وہ پڑھ کے اترے اور مجلس برخاست ہو گئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ سریرِ خلافت فارسی ترکیب ہے۔ خلافت پر امامت کا عطف "او" کے ساتھ کیا درست ہوگا؟ فوراً سمجھ گئے، کہا کہ اس شعر کو سلام میں سے نکال ڈالوں گا۔

—— میری ایک غزل میں یہ مصرع تھا،

بسانِ نکہتِ گل ساتھ ہم صبا کے چلے

منشی مظفر علی اسیر نے مجھ سے کہا: صاف یہ ہے کہ بسانِ نکہتِ گل کی جگہ برنگِ نکہتِ گل آپ کہتے تو ایہامِ تناسب کا حسن پیدا ہو جاتا۔ میں نے کہا، برنگِ گل اس قدر لوگوں نے کہا کہ اس لفظ نے تو صرف اس معنی کو ترک کر دیا ہے، جس بات کو بڑا ہنر لوگ کہتے تھے اس کے ماننے میں اب کیا لطف رہا۔ اگر اس میں کچھ حسن تھا بھی تو وہ مبتذل ہو گیا۔ اس کے علاوہ آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ بسانے کے معنی میں بھی بوئے گل کے ساتھ ایہامِ تناسب موجود ہے جو کسی نے نہیں کہا۔ بجز اس جواب کے سن کر چپ ہو گئے، جیسے ایک پردہ تھا جو سامنے سے اٹھ گیا۔

—— مرزا مینا عیش ناسخ والوں میں ہیں۔ نازک خیالی کے مرد اور جوش کے استاد ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ سلام کے اس مطلع میں جو بندش کی ہے ملاحظہ ہو

سلامی حالِ عابد جس جگہ میں نے لکھا دیکھا
مرے پائے نگہ نے پی کے چشمِ آبلہ دیکھا

میں نے کہا: یہاں چشمِ آبلہ کا قافیہ کرنا غلط ہے۔ انہوں نے میرا یہ مصرع پڑھا،

رواں جادۂ شمشیر پہ یہ قافلہ دیکھا

یعنی میں نے آبلہ کی ہ کو الف بنا لیا تو آپ نے بھی تو قافلہ کی ہ کو الف بنا لیا۔ میں نے جواب دیا کہ چشمِ آبلہ فارسی ترکیب ہے، فارسی لہجے میں آبلہ کو آبلے کہیں گے نہ آبلا۔ اس سبب سے شعرائے فارس کے کلام میں کہیں ہ کو الف کر کے قافیہ بنایا ہو آپ نہ دیکھیں گے۔ ہاں تنوین کو نون کر کے حافظ نے قافیہ کیا ہے۔

گر وقتِ طلب بسر نیامد ۔ ۔ ۔ ۔ کہ کام و لو ندی فرداً آمد

اس سبب سے کہ ان کا لہجہ اس کے موافق ہے۔

—— منشی اسیر کے ایک شاگرد تھے آغا حسن مذنب، انہوں نے اپنا مطلع میرے سامنے پڑھا ؎

غزل کے شعروں میں دو مصرعے ہلال کی صورت
عیاں ہے ابروئے جاناں ہلال کی صورت

میں نے کہا: قافیہ مکرر ہو گیا۔ اس مطلع میں ایطا ہے۔ انہوں نے مرزا مینا عیش کو یہ مطلع سنایا۔ انہوں نے بھی کہا: ایطا ہے۔ منشی اسیر نے کہا: تکرارِ قافیہ ہرگز نہیں، ایک مصرع میں دو مصرعے ہلال قافیہ ہے، دوسرے میں ہلال ہے۔ فارسی کا شعر ہے ؎

اے دل اول بگو ز بسم اللہ
کی ادا مے شکرِ نعمت اللہ

بعد میں خلیفہ کے پیش کیا۔ یہ جھگڑا دور تک پہنچا۔ لکھنؤ کے شعرا و علما کے پاس استفتے بھیجے گئے کہ اس کی کیا وجہ کہ بسم اللہ اور اللہ کے قافیہ میں ایطا نہ رہ گیا

جلال اور جمال کے تنافی میں ایطا ہو جائے۔

میں نے اس شعر کو اس طرح درج کیا کہ بسم اللہ نام ہے ساری آیت کا اور تسمیۃ الکل باسم الجزء سے علمیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی بسم اللہ علم ہے اور علم کے اجزا میں ہر جزو مہمل ہو جاتا ہے۔ اسی سبب سے اللہ اور بسم اللہ میں ایطا نہ ہوگا۔ اور رہائے جلال علم نہیں ہے عبارت ہے اسی سبب سے جلال اور رہائے جلال میں ایطا ہوگا۔

——— بادشاہ کا ایک شعر ہے ؎

الٰہی عشق ترا میرے دل سے دور نہ ہوگا
گنہ گار ہوں پر اب کبھی قصور نہ ہوگا

میں نے اردو کے بہت سے دیوان قدما و متاخرین کے دیکھے ہیں۔ مجھے خیال نہیں پڑتا کہ کسی نے اس وزن میں غزل کہی ہو۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ اہل اردو کے مذاق میں یہ وزن ثقیل سا معلوم ہوتا ہے۔ اردو والوں نے اس وزن میں سے دو حرف کم کر کے دوسرا وزن پیدا کر لیا ہے اور ہزار ہا غزلیں اس وزن میں کہی ہیں۔ دو حرف کم کر کے شعر پڑھتا ہوں ؎

الٰہی عشق ترا میرے دل سے دور نہ ہو
گنہ گار ہوں پر اب کبھی قصور نہ ہو

بادشاہ کو ان دو حرفوں کا بڑھانا گوارا ہو گیا۔ اس وجہ سے کہ موزوں طبع تھے۔ جانتے تھے کہ گو اردو میں گوارا نہ ہو مگر اصول فن کے اعتبار سے وزن صحیح ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فارسی کے دیوان بھی بادشاہ کے پیش نظر تھے۔ فارسی کے شعرا کو بھی ان دو حرفوں کا بڑھانا مستحسن معلوم ہوتا تھا۔ ان کے دیوانوں میں کثرت سے اسی وزن میں غزلیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب نے بھی اردو میں اسی وزن میں غزل کہی ہے ؎

عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

طباطبائی صاحب نے اصول فن کے اعتبار سے وزن درست کیا اور آگے بڑھ گئے۔ یہ بات ان کی نگاہ میں پیش پا افتادہ ہے کہ کس خیال سے وزن کا حسن گوارا ہو جاتا ہے۔ وزن نے خیال کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ وزن درست ہوا شعر میں جھول آ گیا اتنا فرق پڑ گیا تو شعر کا پیکر ہی گویا بدل گیا ہوگا۔

جدت ادا یا ان کی نگاہوں میں ایک طرح کا نقص ہے۔ مضمون بیچارہ پامال ہو یا تخیل ہی ہو، تشبیہ و استعارہ پامال نہ ہو اور رعایات لفظی و تجنیس لفظی و خطی سے زینت دی جائے۔ کچھ بات الجھی ہوئی سی ہو کہ سب کے سمجھنے میں نہ آ جائے۔ بات کہنے میں نظر کا اور بیان کا اسلوب ایسا ہو کہ ایک مصرع پڑھا جائے سن کر لوگ حیران ہو گئے دوسرا مصرع جب پڑھا تو حیرت جاتی رہی اور لطف حاصل ہوا۔ وہ ممکن مشکل تھی کہ پسند نہیں کرتے تھے کہ شعر سادہ ہو اور سادگی ہی اس کا فن ہو۔ ایک سادہ سا شعر ہے:

اے شاہدِ پردۂ حسن خدارا
انداز حسن نے تیرے مارا

ظاہر اس میں کوئی خاص فنی خوبی نظر نہیں آتی۔ لیکن مخاطب میں ذرا تفہیم ہو رہی ہے، ہلکا سا ایہام جھلک رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تعریف ہو، مگر خدارا کچھ اشارہ کر رہا ہے ہو سکتا ہے کہ تعریض ہو۔ اسلوب کے ساتھ مفہوم کی دونوں پرچھائیاں دکھائی دے رہی ہیں لیکن فن کا اس میں کیا نکتہ ہے اس کی گرفت میں نہیں آتا۔ طباطبائی صاحب سمجھاتے ہیں کہ اس میں بیان و بلاغت کے دو نکتے ہیں:

خیال کیجئے تو اس شعر سے شبہ ایک یہ ہوتا ہے کہ گویا یہ کہتے ہیں کہ تمہارا انداز دیکھ کر ہی میں مر گیا اول ہی میں ہو گیا تو یہ دونوں فقرے جو خبر ہیں بہت شاعر نے غزل کی ادا کے قالب میں ڈھالے ہیں یہ ایک مثال ہے فن بلاغت کے اس نکتے کی کہ خبر کو انشا بنا لینے میں کلام کا اثر کس قدر بڑھ جاتا ہے۔ شاعر و کاتب کا کمال یہ ہے کہ خبر کو انشا بنائے۔ علمائے نحو نے اقسام و انشا کی صورتیں بہت تفصیل و ترتیب سے بیان کی ہیں لیکن یہ تصریح کسی نے نہیں کی تھی کہ خبر کو انشا بنا لینے میں کلام کی بلاغت بہت بڑھ جاتی ہے اس نکتے پر بھی ایک ہی نظر تھی اور انہی نے اس نکتے کو ادب الکاتب والشاعر میں داخل کیا۔

اس شعر میں فن بلاغت کا ایک نکتہ اور بھی ہے جسے علامہ جرجانی نے اسرار البلاغہ میں ذکر فرمایا ہے اور غالباً ان کے سوا کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ حذف سے کلام کی بلاغت بڑھ جاتی ہے۔ جیسا مصنف نے اس شعر میں خدارا کہہ کر کلام کو ختم کر دیا اور مقصود یہ تھا کہ اے شاہدِ حسن! خدارا ایسی شوخیاں نہ کر۔ مقصود میں سے آخر کا فقرہ حذف کر دیا اور اس حذف کر دینے سے کلام کی بلاغت حد اعجاز تک پہنچ گئی۔ اس قسم کی مثالیں دے کر صاحب اسرار البلاغہ فرماتے ہیں کہ اسقاط و حذف ایسے ہیں جیسے اور

اس کے سننے والوں کے دلوں میں اتار دینے پر سحر نہیں ہو گیا ہے:

غزلوں کا رنگ تغزل آدابِ فن سے آراستہ ہے۔ انھوں نے شباب کی مقبول غزلیت سے ہٹ کر اپنی راہ الگ نکالی اور کلاسیکی تغزل کی روایت کو ایک نیا لہجہ اور نیا ڈھنگ دیا۔ متین اور سنجیدہ، سادہ اور یک رنگ، خیال وزن سے جس قدر ہم آہنگ ہوتا ہے اسی قدر اس میں شگفتگی ہوتی ہے۔ طباطبائی صاحب کے کلام میں خیال اور وزن یک جان ہیں۔ ان کے شعر یا ہموار نغمہ ہے، غزلوں کی طرح سنبھلا ٹھہرا، تحت اللفظ۔ یوں معلوم ہوتا ہے خود طباطبائی صاحب شعر کے قالب میں خراماں خراماں چلے جا رہے ہیں:

نظر آتا ہے ابر اس گرد کوہساروں کا　　کہ عالم عالمِ اجسام میں ہے بے قراروں کا
نہ شوخی اے صبا کر صبح میں اب وقت آتا ہے　　غبار اڑ جائے گا جانے کہیں ہم خاکساروں کا
بہت جلدی کی تو نے آ کے وصلت کے بلانے میں　　کہ میں نے اے اجل ماتم نہ دیکھا سوگواروں کا

ضعیفی میں نہیں ہم کو شکایت قد کے جھکنے کی　　زمیں سے کچھ دنوں نزدیک جو آسماں کر لیں
خبر کس کو نہیں تھی دام زیرِ کاہ پنہاں ہے　　ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آشیاں کر لیں
ہمارے ضبط کی گر بردباری دیکھنا چاہے　　تو آ اے برق تجھ کو آشیاں میں ہم جا کر لیں
خزاں کے خوف میں گھلنے سے یہ اچھا ہے یہ بہتر ہے　　تماشائے گل و ریحاں و باغ و بوستاں کر لیں

اردو ادب کو طباطبائی صاحب نے ایک گراں قدر عطیہ دیا ہے۔ یہ عطیہ 'گرے' کی شاہکار 'ایلجی' کا عکس 'گورِ غریباں' ہے — شاعر کا واحد شاہکار جس نے اسے انگریزی زبان کا استادِ شعر بنا دیا۔ گرے عبوری دور کا شاعر تھا اس کی شاعری میں انگریزی کلاسیکی شاعری کی روایت اور انگریزی رومانی شاعری کی ابتدا کے آثار کا بڑا لطیف اور حسین امتزاج ہے۔ اور یہ امتزاج اس کے اس مرثیے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس شکل فنی اور صناعی، بندش کی چستی اور عروض و قوافی کی پابندی کے پہلو بہ پہلو ابھرتی رومانیت کی سی جذبات نگاری، سادگی و پرکاری اور انسان دوستی و متانت۔ طباطبائی صاحب بھی ایک طرح سے عبوری دور کے شاعر تھے۔ ان سے پہلے ہی شاعری کا دور ختم ہو چکا تھا، اس دور نے جو حصہ شعری ادب کو دیا تھا وہ بھی ختم ہو چکا تھا اور خود مٹیا برج میں جہاں ناسخ کا رنگ بادشاہ پسند تھا، اس شاعری کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا۔ اور لکھنؤ میں بھی دلی شاعری کے خلاف ردِّ عمل خود برقؔ و بحرؔ کے شاگردوں میں ابھر رہا تھا[1]۔ طباطبائی صاحب ان دو رنگوں

---

[1] آتشؔ کے نامور شاگرد آغا حجو شرفؔ جو عموماً سیدھے سادے ہی لکھتے ہیں:

جھٹ پٹا وقت ہے چھایا ہے اندھیرا　　صبح سے شام ہوئی دل ہے دبا ٹھہرا
اور
منزلِ عشق کا حال آپ میں آؤں تو کہوں　　دم ذرا لینے دو میں دل کو سنبھالوں تو کہوں
کون ہے جس سے خفا ہو کے رہے دل تیرا　　گھٹنے والا کوئی پہلو میں بٹھا لوں تو کہوں

برقؔ کے شاگرد مرزا اعجاز علی یاورؔ:

دورِ ساقی کو بھی فکرِ کشی مستانہ ہے　　پاؤں تو کام میں نہیں ہاتھ میں پیمانہ ہے
آج تک بانگِ انا الحق کے گلے میں پھنسی ہے　　سر کٹائے ہوئے منصور کا افسانہ ہے

رہ گئی بات کٹ گئی شب بھر　　تم جو آئے تو کیا سحر ہوئی

(باقی اگلے صفحہ پر)

میں پیش پیش تھے۔ اس لئے انھوں نے گرے کی شاعری کی ان تمام خصوصیتوں کا پوری طرح ادراک کیا، اور عکاسی میں اس قدر نمایاں کامیابی حاصل کی۔ چند متفرق بندوں کے تقابلی مطالعے سے نظم کی ان خوبیوں کا اندازہ ہوگا:

*The curfew tolls the knell of parting day,
The lowing herd wind slowly o'er the lea,
The plowman homeward plods his weary way,
And leaves the world to darkness and to me.

وداع روز روشن ہے گجر شام غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق سے اٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے، میں ہوں اور طائر آشیانوں کے

Now fades the glimmering landscape on the sight,
And all the air a solemn stillness holds,
Save where the beetle wheels his droning fight,
And drowsy tinklings lull the distant folds;

اندھیرا چھا گیا، دنیا نظر سے چھپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ اک ہُو کا ہے عالم
مگس لیکن کسی جا بھیرویں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

Save that from yonder ivy-mantled tow'r
The moping owl does to the moon complain
Of such, as wand'ring near her secret bow'r,
Molest her ancient solitary reign.

کبھی اک گنبد کہنہ پہ بوم خانماں ویراں

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)
آنکھوں آنکھوں میں ہوئی وہ چھل بل
کانوں کان ایک کو خبر نہ ہوئی

مالک المدد صرف:

میرا دل تو نہ تھا کسی لائق
نظر لطف آپ ہی کی ہے
اور کچھ تم سے مدعا نہ سہی
جان بے جان زندگی کی ہے
دیں میں دل نہیں ہے بیعدم محروم
واہ کیا خوب بے بسی کی ہے

فلک کو دیکھ کر شگوں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہیں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنج تنہائی میں دھرتا ہے

But Knowledge to their eyes her ample page
Rich with the spoils of time did ne'er unroll ;
Chill Penury repressed their noble rage,
And froze the genial current of the soul.

زمانے نے مگر کوئی ورق ایسا نہیں الٹا
کہ بار فکر سے مہلت یہ پاتے سر اٹھانے کی
مصیبت نے طبیعت کی روانی کو کیا پسپا
کہ بار آنے نہ پائی جوہر ذاتی دکھانے کی

Full many a gem of purest ray serene
The dark unfathomed caves of ocean bear :
Full many a flower is born to blush unseen,
And waste its sweetness on the desert air,

بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشت و در میں ایسے ہی کھلے ہوں گے
کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک و عنبر کی

The struggling pangs of conscious truth to hide,
To quench the blushes of ingenuous shame,
Or heap the shrine of luxury and Pride
With incense kindled at the Muse's flame.

نہ صحبت میں امیروں کی کبھی خوبی جگر کھایا
نہ وہ نکلا لہو اپنا کبھی جھوٹی خوشامد سے
نہ دل کردیں تازہ آتشیں غیرت کو بجھوایا
کہ جس سے خود پسندوں کا تکبر بڑھ چلے حد سے

Far from the madding crowd's ignoble strife,
Their sober wishes never learned to stray ;
Along the cool sequestered vale of life
They kept the noiseless tenor of their way.

الگ ہر ایک وجہ سے دور دنیا کے مکائد سے
گئے بیگانہ وار، اور خلق میں بیگانہ وار آئے
رہے محفوظ اپنے زمانہ کے مفاسد سے
قدم راہِ توکل سے کبھی ڈگنے نہیں پائے

For who to dumb Forgetfulness a prey,
This pleasing anxious being e'er resign'd,
Left the warm precincts of the cheerful nay,
Nor cast one longing ling'ring look behind ?

جو آیا ہے جہاں میں یاں سے جانا ہے اسے اک دن
یہ ہوتا ہے کوئی کہتا ہے کہ دل سے یاد جائے گا
مگر جاتے ہوئے پھر کر نہ دیکھے یہ نہیں ممکن
دلوں سے یاد میں مٹ جائے یہ حاشا نہ جائے گا

اور یہ مکالمہ بھی فرمائش تھی، خود اپنی طبیعت کے اقتضا سے نہیں۔ طبیعت کے اقتضا سے تو انھوں نے کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔ پرنسپل اسٹرتھ نے حضرت نظم سے گرے کے شاہکار اردو نظم کا ترجمہ کر دینے کی فرمائش کی۔ اب یہ خدا ہی جانے کہ حضرت نظم پر شاعر کا سارا جہان طاری ہو گیا یا انھوں نے اپنے ذہن میں "ایلیجی" کو خوب سمجھا۔ بہرحال عکس پیدا ہوا۔ اور پرنسپل اسٹرتھ نے اس کے ترجمے پر جنگ میں ویسا ہی ناز محسوس کیا۔ اس کی ایک نقل انگلستان بھیجی اور انگلستان کے سب ادب دوستوں نے گرے کی "گورِ غریباں" کو "ایلیجی" کے پہلو بہ پہلو رکھ کر "کا مرتبہ تربت بنا دیا۔ اس اعزاز پر پرنسپل اسٹرتھ نے کالج میں جلسہ کیا۔ انگلستان کے ادب دوستوں کی جانب سے حضرت نظم کو تہنیت پیش کی اور اعلیٰ حضرت آصف سابع نے حیدر یار جنگ کا خطاب مرحمت فرمایا۔ یہ پورا واقعہ مجھ سے میرے دوست جانکی پرشاد صاحب نے بیان کیا تھا۔ وہ اسی زمانے میں نظام کالج میں پڑھتے تھے۔

شعر خود خواہش کی [illegible]!

قاضی عبدالودود

مختار الدین احمد

یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے جب قاضی عبدالودود صاحب کا نام میں نے پہلی مرتبہ سنا۔ اس زمانے میں انہوں نے پٹنہ سے ایک بلند پایہ تحقیقی رسالہ "معیار" نکالنا شروع کیا تھا اور ادبی حلقوں میں اس کا بڑا چرچا تھا۔

معیار کی ترتیب اور صوبائی انجمن ترقی اردو کے کاموں کی معاونت کیلئے انہیں ایک مخلص اور ذی علم دوست شرف عالم عزیز جلیلی (مرحوم) مل گئے تھے۔ یہ تھے وہ فلسفے کے استاد لیکن شعر بھی کہتے تھے، ڈرامے اور افسانے بھی لکھتے تھے اور انہیں مغربی زبانوں سے ترجمے میں بھی دلچسپی تھی۔ اس کے علاوہ اچھی شاعری پر مضامین لکھتے تھے، ستار بجاتے تھے، شعبۂ طبیعیات جاکر Sound پر ریسرچ کرتے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ادبی اور تحقیقی کام بھی کیا کرتے تھے۔ میں اس زمانے میں مصحفی کی مثنویوں پر کام کر رہا تھا۔ کتب خانہ خدابخش میں ان سے کسی دن ملاقات ہوگئی تو قاضی صاحب کا ذکر آیا اور ان کی باتیں سن کر ملنے کا اشتیاق اور بڑھ گیا لیکن ان سے ملاقات کی نوبت پروفیسر حسن عسکری صاحب استاد شعبۂ تاریخ جامعہ پٹنہ کی وساطت سے کچھ مہینوں کے بعد ہی آسکی۔

میں ان کی کوٹھی میں ملاقات کے لئے پہنچا تو معلوم ہوا علیل ہیں۔ میں واپس ہونے والا ہی تھا کہ انہوں نے بیمار کے اوپر ہی کی منزل پر اپنے کمرے میں بلا لیا اور اس بات کی معذرت کرکے مجھے شرمندہ کیا کہ علالت کے باعث وہ نیچے ملنے کے کمرے میں نہ آسکے اور مجھے اوپر آنے کی زحمت اٹھانی پڑی۔ جاڑوں کا زمانہ تھا، وہ ایک مسہری پر نیلے رنگ کی سیلنگ کی گرم رضائی لپیٹے بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں الماریاں کتابوں کے بوجھ سے جھکی پڑی تھیں۔ میز پر اور نیچے فرش پر کاغذوں کے پلندوں پر قلم، کتابیں ہی کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ اخبارات اور رسائل کمرے میں بے ترتیبی سے منتشر حالت میں بکھرے پڑے تھے۔ جس مسہری پر وہ بیٹھے تھے اس کے پاس دو تین کرسیاں تھیں۔ ان پر بھی اخبار، رسالے اور کتابیں پڑی تھیں۔ کمرے میں کئی چھوٹے بڑے صندوق رکھے تھے، کوئی کھلا ہوا اور کسی کے پٹ آدھے کھلے آدھے بند تھے۔ ان میں اور کاغذات وغیرہ سے بھی جھانک رہے تھے۔ قریب کی ایک تپائی پر گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیات ہندوئی و ہندوستانی کی دوسری جلد، Swan کی ایک پرانی دوات جس میں کسی زمانے میں اصلی روشنائی ہوگی اور ایک بہت پرانا فاؤنٹین پن رکھا ہوا تھا۔ فاؤنٹین پن تو پہلے رہا ہوگا، اب تو اسے معمولی ہولڈر کی جگہ استعمال کیا جاتا تھا۔ نب پر مختلف قسم کی سیاہیوں کی اتنی دبیز تہ جم گئی تھی کہ اس سے سیدھے طور پر لکھنا ناممکن تھا، اس لئے انہیں نب کو الٹ کر لکھنا پڑتا تھا۔

چند ہی منٹ کی گفتگو کے بعد مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ان کے ذہن اور حافظے کو گرد سے اٹی کتابوں اور کاغذات کے انتشار سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ گفتگو آگے چلی تو اندازہ ہوا کہ انہوں نے اپنے حافظے کی مختلف تہوں اور خانوں میں اپنی دلچسپی کی ساری معلومات نہایت اچھی ترتیب سے جھاڑ پونچھ کر اور اس طرح سجا کر رکھی ہیں کہ جب اور جہاں سے چاہتے ہیں اپنے کام کی چیز نکال کر مخاطب کے سامنے پیش کر کے حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔

اس ملاقات میں سب طرح سے زیادہ جس چیز نے مجھے متاثر کیا وہ ان کی صاف گوئی تھی۔ مصنفین اور ان کے کارناموں پر گفتگو ہوئی اور انہوں نے بغیر کسی جھجک اور مصنوعی مصلحت کے وہ رائیں دیں جنہیں وہ صحیح سمجھتے تھے بغیر اس بات کی پروا کئے کہ ان پر وہ مصنفین ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

مولوی عبد الحق صاحب کے متعلق گفتگو ہوئی تو انہیں صاحب طرز ادیب اور مسلم الثبوت انشاپرداز مانتے تھے لیکن ان کے تحقیقی کاموں کے معیار سے وہ مطمئن نہ تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ انہوں نے قدیم تذکروں اور شعراء کے دواوین کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نسخۂ حمیدیہ جیسے کچھ اور نسخے مولوی صاحب کو مل جاتے تو کتابوں کا معیار اور بھی اونچا ہو سکتا تھا۔

وہ حالی کو شبلی پر ترجیح دیتے ہیں لیکن وہ یادگار غالب کو ایک ادھوری کتاب بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس زمانے میں غالب پر اس سے کہیں اچھی اور مستند کتاب لکھی جا سکتی تھی اس لئے بھی کہ اس وقت جو ذرائع اطلاعات کے حالی کے پاس تھے اب وہ مفقود ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی اردو تحریر انہیں پسند ہے کہتے تھے انشا پردازی میں شبلی کی انہوں نے اتباع کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ان سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ ان کی تصانیف میں خیام کو وہ ان کی بہترین تصنیف مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محققانہ اور علمی اردو میں بھی اعلیٰ درجے کے محقق اور تنقید نگار نہیں ہو سکتے۔ اعلیٰ درجے کے تحقیقی مضامین لکھنے والے ان کے خیال میں خال خال ہیں۔ ان میں وہ ڈاکٹر عبد الستار صدیقی اور حافظ محمود شیرانی کے بڑے معترف ہیں۔

اس ملاقات کو کوئی بیس سال ہونے کو آئے۔ اس کی ساری باتیں اس طرح یاد ہیں جیسے ابھی کل کی ہوں لیکن ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔

قاضی صاحب کی ولادت عظیم آباد پٹنہ میں آج سے کوئی ۷۰ سال پہلے ایک متمول مذہبی خاندان میں ہوئی۔ ان کے والد قاضی عبد الوحید مرحوم شہر کے رئیسوں میں تھے اور مشہور مذہبی عالم۔ انہوں نے ایک مدرسہ، مدرسہ حنفیہ کے نام سے قائم کیا تھا اور وہ ایک مذہبی رسالہ تحفۂ حنفیہ بھی نکالا کرتے تھے۔ وہ ندوۃ العلماء اور علی گڑھ کے سخت مخالفین میں تھے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ صوبہ بہار میں ندوہ کا رد کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔

قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم اسی ماحول میں ہوئی اور وہ عربی فارسی کی تحصیل کرتے رہے۔ قرآن شریف بھی ان سے حفظ کرایا گیا ہو تو عجب نہیں۔ مجھے اس بات کی تحقیق کا ان سے موقع نہ مل سکا۔ انگریزی تعلیم کی ابتدا ان کے والد کی وفات کے بعد ہی ہوئی ہو گی ورنہ شاید وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے۔ کچھ دنوں تک ان کی تعلیم محمڈن اینگلو عربک اسکول میں ہوئی۔ ۱۹۱۸ء میں وہ کیمبرج گئے اور ٹرنٹی ہال کے ممبر ہوئے۔ وہاں سے انہوں نے معاشیات، سیاسیات اور تاریخ میں بی اے کیا۔ ڈاکٹر زبیر صدیقی صدر شعبۂ عربی و اسلامیات جامعہ کلکتہ اور ڈاکٹر محمد نظام الدین ناظم دائرۃ المعارف حیدرآباد وغیرہ کیمبرج میں پروفیسر براؤن کے شاگرد اور قاضی صاحب کے ہم عصر ہیں۔ لندن سے بار ایٹ لا کی سند بھی انہوں نے حاصل کی اور فرانسیسی زبان کی تحصیل بھی کی۔ فرانسیسی ادب سے ان کی دلچسپی اب بھی باقی ہے۔ یورپ کے بعض ممالک کی سیاحت بھی کی۔ اسی زمانے میں وہ سخت علیل ہوئے اور علاج کے لئے سوئٹزرلینڈ کے ایک سینی ٹوریم میں داخل ہوئے جہاں کملا نہرو پہلے سے زیر علاج موجود تھیں۔ پنڈت نہرو سے ان کی پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ وہاں سے وہ شفایاب ہو گئے لیکن علالت کے اثرات ان کی بعد کی زندگی پر دیر تک قائم رہے۔ اب ان کی عمری صحت اور کام کرنے کی طاقت اور ولولہ دیکھتا ہوں تو وہ ۴۰ سال سے زائد کے معلوم نہیں ہوتے ہیں۔ یورپ میں ان کے قیام کی مدت ۷ سال ہے۔ ان کی واپسی کے بعد ان کے چھوٹے بھائی قاضی محمد سعید صاحب جو جامعہ ملیہ کے پڑھے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہم عصر ہیں یورپ پہنچے۔ یہ برلن یونیورسٹی کے طالب علم رہے اور فلسفے کی تحصیل کرتے رہے۔ یہ بہت علیل رہتے ہیں اور وطن میں صوفی مشرب پر اکتفا کئے بیٹھے ہیں۔ جب یہ سات سال یورپ میں گزار کر واپس آئے تو چھوٹے بھائی قاضی محمد رضا صاحب یورپ گئے۔ انہوں نے بھی سات سال قیام کیا اور وہ کیمبرج سے معاشیات، سیاسیات اور تاریخ میں ٹرائی پوس لے کر واپس آئے۔ اب وہ کراچی یونیورسٹی میں انہی مضامین کے استاد ہیں۔

قاضی صاحب نے اردو ادب کا مطالعہ ۱۹۱۳ء سے پہلے شروع کر دیا تھا۔ ان کا سب سے پہلا مضمون الناظر میں شائع ہوا تھا پھر [illegible] کے متعلق ان کی ایک مختصر سی تحریر معارف میں شائع ہوئی۔ شاد عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام "کلامِ شاد" قاضی صاحب ہی نے مرتب کر کے شائع کیا۔ یورپ کے دورانِ قیام میں بھی اپنے مضامین کے علاوہ اردو ادب کا مطالعہ کرتے رہے۔ اس زمانے کی اہم مطبوعات کے جو نوٹس انہوں نے تیار کئے ہیں وہ اس پر گواہ ہیں۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن ادبی دنیا ان سے ۱۹۳۵ء سے پہلے واقف نہ ہو سکی ان کا ادبی شہرہ اس وقت ہوا جب انہوں نے پٹنہ سے ایک بلند پایہ علمی ادبی اور تحقیقی رسالہ معیار شائع کرنا شروع کیا۔ اس کے تحقیقی مضامین اور بلند پایہ تبصروں نے ایک طرف لوگوں کو چونکایا تو دوسری طرف تحقیقی مضامین اور اعلیٰ تنقید لکھنے کا نیا اسلوب اور نیا معیار بخشا۔ مولوی عبدالحق صاحب اور بعض دوسرے مستند اہلِ علم نے اس رسالے کا خیر مقدم کیا اور اس کی بڑی تعریف کی۔

مولوی صاحب سے موصوف کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ موصوف نے مولوی صاحب اور انجمن کے کاموں کے سلسلے میں ایک مضمون لکھا تھا معیار کے پہلے شمارے میں انہوں نے اردو کے مشہور مصنف اور مسلم الثبوت انشا پرداز کی حیثیت سے مولوی صاحب کی تصویر بھی شائع کی تھی اور حالاتِ زندگی اور ان کے کاموں کے متعلق ایک مضمون بھی شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ خیال غالباً رسالے کے بند ہو جانے کی وجہ سے عمل میں نہ آ سکا۔

مولوی صاحب کی فرمائش پر قاضی صاحب نے انجمن کے لئے متعدد کتابیں مرتب کرنی شروع کی تھیں۔ ان میں نثریاتِ مصحفی اور بعض دوسری کتابوں پر کام عمل میں [illegible] لیکن دیوانِ جوشش اور تذکرۂ ابنِ طوفان ہی چھپ سکیں ان کی تصحیح و ترتیب کے بعد شائع ہوئیں۔ دیوانِ جوشش کی ترتیب و تصحیح کے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، اعلیٰ [illegible] مرتب کرنے کے سلسلے میں اسے سنگِ میل کا درجہ حاصل ہے۔ تذکرۂ ابنِ طوفان بھی انہوں نے بڑی دیدہ ریزی سے ایڈٹ کیا ہے۔ افسوس کہ علالت اور مصروفیت کے باعث وہ اس پر جامع اور مقدمہ مکمل نہ کر سکے اور انجمن نے عجلت سے کام لے کر ترتیبِ سابق کا مقدمہ کتاب میں شامل کر دیا اس طرح اردو ادب کے طالب علم قاضی صاحب کے جامع اور مفید مقدمہ سے محروم رہ گئے۔

آج کل وہ مختلف مضامین کے علاوہ دیوانِ قدرت اللہ قدرت ایڈٹ کر رہے ہیں۔ "جہانِ میر" کے نام سے ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ اور مصحفی کے دواوین کا انتخاب۔ اور اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کرانا چاہتے ہیں۔ ان کی زندگی کے معمولات بہت سادہ سے ہیں۔ کچہری جانے کے بعد وہ اپنے مسودات اور کاغذات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ انہیں میز کرسی پر کام کرنے کی عادت نہیں۔ دیکھا یہ ہے کہ وہ مسہری پر بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ وہ جہاں ہوتے ہیں وہاں ایک بڑی مسہری اور اس پاس کی تپائیوں اور کرسیوں پر مطبوعات اور حوالے کی کتابیں منتشر ہو جاتی ہیں۔ دن کا کھانا وہیں ایک تپائی پر مسہری کے پاس لگ جاتا ہے [illegible] کوئی صاحب موجود ہوتے تو ان سے بات بھی کرتے جاتے ہیں۔ کھانا کھانے اور کپڑا پہننے پر وہ کم سے کم وقت خرچ کرتے ہیں۔ [illegible] انہوں نے سوپ پیا ایسے پیالے پھلکے یا پلاؤ مرغ کے ساتھ کھانے [illegible] اس سے متعلق بھی [illegible] اور [illegible] پھل کھانا پسند نہیں کرتے۔ [illegible] کام کی طرف متوجہ ہو جائیں گے [illegible] شروع کر دیں گے۔ [illegible] چار بجے [illegible] کا ایک گلاس [illegible] کا کھانا نہیں کھاتے [illegible] آخر شب [illegible] اور بالعموم دن [illegible] ہیں۔

[illegible] سگریٹ [illegible]

تھے تو طلب جانے کا التزام کرتے تھے اور بڑے شوق سے دیکھتے تھے اب بھی وقت وہ کتب خانہ خدا بخش بانکی پور دیتے ہیں اور علمی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ صبح کی سیر اور روزانہ غسل کرنے کا انہیں کوئی شوق نہیں۔ ان کے کسی خاص شوق کا مجھے علم نہیں۔ نادر کتابیں وہ خریدتے ہیں پڑھتے ہیں نادر اٹھاتے ہیں لیکن انہیں جمع کرنے اور اپنے مکان کو نمائش گاہ بنانے کا خیال کبھی نہیں ہوا۔

میں نے انہیں سخت ذہنی پریشانی یا کرب کی حالت میں بھی نہیں پایا نہ کبھی کسی پر آج تک خفا ہوتے دیکھا۔ ان کو مسلم لیگ کی بولیں اور اماکن کی غیر ذمہ دارانہ حرکتوں کا جب ذکر آیا تو وہ اکثر بیزار اور ناراض نظر آئے۔ زمانہ حال کے مصنفین جو بلا ضرورت اور بغیر تحقیق و توجہ کے کتاب لکھنے کو تیار ہو جاتے ہیں ایسے لوگوں سے وہ بڑے ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں یہ لوگ غول بیابانی ہیں غلط اطلاع پھیلا کر وہ پبلک کو دھوکا دیتے ہیں ان کی سرزنش عام طور پر ہونی چاہئے۔

اپنے معاصرین میں بڑے بزرگ ہونے کے باوجود وہ بڑے خوش خلق ہیں اور ہر قسم کے پڑھے لکھے آدمیوں سے بلا تکلف ملتے جلتے رہتے ہیں۔ آئے دن بھانت بھانت کے لوگ ان کے پاس آتے رہتے ہیں ادبی کاموں سے بھی اور خاص غیر ادبی کاموں سے بھی۔ ایک صاحب ان کے پرانے ملنے والوں میں ہیں۔ اکثر ان کے پاس آتے ہیں دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں پھر حرف مطلب زبان پر لاتے ہیں پچھلے قرضوں کی عدم ادائیگی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے نئے قرض کی رقم طلب کرتے ہیں۔ قاضی صاحب بڑے شوق و ذوق سے ساری باتیں سنتے ہیں پھر یا تو قرض دے دیتے ہیں یا کوئی مفید مشورہ۔

ایک بار ایک بزرگ ان کے پاس آئے اور اپنی تصنیف جو انہوں نے امیر مینائی پر کی تھی رائے کے لئے پیش کی۔ قاضی صاحب نے مطالعہ کے بعد عدم اشاعت کا مشورہ دیا اور انہیں بتایا کہ اس کتاب میں کوئی نئی بات نہیں۔ ماخذ صرف تین کتابیں ہیں اور جن کی نظر سے یہ کتابیں گزر رہی ہیں انہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ مصنف چونکہ ہر قیمت پر اپنی کتاب شائع کرانی چاہتے تھے بولے۔ حضرت میں یہ تصنیف ان لوگوں کے لئے شائع کرانا چاہتا ہوں جن کی نظر سے یہ تینوں کتابیں نہیں گزری ہیں۔ قاضی صاحب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ کتاب کو شائع ہوئے آج چند برس ہو گئے عام طور پر لوگ نہ مصنف کو جانتے ہیں نہ ان کی کتاب کو۔

ایک دوست کرم فرما ایک مرتبہ اپنے رسالے کا پہلا شمارہ لے کر ان کی خدمت میں پہنچے اور خواہش ظاہر کی کہ اس کی قلمی معاونت فرمائیں۔ قاضی صاحب نے حتمی طور پر انہیں رسالہ بند کر دینے کا مشورہ دیا۔ یہ بہت کم عمر اور کم علم سے آدمی تھے معلوم نہیں کن لوگوں نے انہیں رسالہ جاری کرنے کا مشورہ دیا تھا انہوں نے سرورق پر بہت نمایاں طور پر یادگار شیخ الاسلام والمسلمین حضرت علامہ شاہ ...... جیلی قادری فردوسی ...... رحمۃ اللہ علیہ چھپوا رکھا تھا۔ دوران گفتگو میں انہوں نے بتایا کہ ان کے والد فلاں خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں اور اب تک بقید حیات ہیں۔ قاضی صاحب نے کہا اگر آپ رسالہ بند نہیں کرنا چاہتے ہیں تو کم از کم سرورق سے رحمۃ اللہ علیہ نکال دیجئے۔ بہت ہی دانائی کا ثبوت دیتے ہوئے بولے:۔ صاحب اب تو ٹائیٹل پیج کا بلاک بن گیا ہے اسے ضائع کرنا پڑے گا اوّل اوّل اسی طرح چھپنے دیجئے۔ چنانچہ وہ اب تک اسی طرح چل رہا ہے اور ان کے والد اب تک اسی طرح بقید حیات ہیں۔

ان کے یہاں ایک خاص قسم کی سختی اور ڈسپلن ہے۔ وہ ویسے بہت ملنسار، متواضع، خلیق اور دوست نواز ہیں لیکن وہ جب کسی معاملے میں اصولی طور پر متفق نہ ہوں تو انہیں راضی کرنا آسان نہیں ایسے موقعوں پر وہ بڑے سے بڑے شخص کی پروا نہیں کرتے ہیں اور [illegible] کی۔ ان کا دماغ ایک ادیب سے زیادہ ایک ریاضی داں اور قانون داں کا دماغ ہے۔ وہ بات کا وہی مفہوم لیتے ہیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے" باقی لطیف اشارے سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔

ایک بار ایک صاحب نے اپنے یہاں تقریب میں مدعو کیا اور پانچ بجے شام کا وقت دیا۔ قاضی ٹھیک وقت پر جب وہاں پہنچے تو مکان میزبان اور مہمانوں سے خالی تھا۔ قاضی صاحب انتظار میں بیٹھے رہے نوکر آتش [illegible] کرتے رہے اور شہنائی بجانے والے شہنائی بجاتے رہے۔ بجتے بجتے جب قاضی صاحب گھر جانے کے لئے اٹھے تو صاحب خانہ وارد ہوئے۔ وہ جان کر بہت شرمندہ ہوئے کہ وہ پانچ بجے سے انتظار میں ہیں اور بولے:۔ میری مراد پانچ بجے سے پانچ نہ تھی۔ قاضی صاحب نے کہا لیکن میری مراد ہمیشہ پانچ سے پانچ ہی ہوتی ہے اور یہ کہا اور رخصت ہو گئے۔

ایک علمی ادارے نے ان سے ایک کتاب ایڈیٹ کرائی۔ صاحب ادارہ چاہتے تھے کہ مقدمہ بھی وہ روانہ کر دیں۔ قاضی صاحب سمجھتے تھے کہ اصل کتاب کے چھپ جانے کے بعد ہی مقدمہ لکھا جا سکتا ہے اس لئے کہ اکثر مقامات پر کتاب کے صفحات کے حوالے ہیں۔ کتاب چھپ گئی اور ادارے نے مقدمے کا تقاضا کیا۔

قاضی صاحب جس طرح لکھنا چاہتے تھے اس کے لئے ضروری تھا کہ ہندوستان کے مختلف کتب خانوں سے متعلقہ معلومات حاصل ہو جائیں اس میں دیر ہو رہی تھی تو ادارے نے انہیں لکھا کہ آپ فلاں تاریخ تک مقدمہ بھیج دیجئے ورنہ کتاب بغیر آپ کے مقدمے کے شائع ہو جائے گی۔ قاضی صاحب نے لکھ بھیجا، مقدمہ نہیں بھیج سکا کتاب شوق سے شائع کر دیجئے۔ کتاب ان کے مقدمے کے بغیر شائع ہو گی۔

قاضی صاحب کی بعض خاص عادات اور اصولوں کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا۔

وہ خطوط کثرت سے لکھتے ہیں۔ پوسٹ کارڈ زیادہ لفافے کم۔ کبھی کبھی ایک کارڈ میں دو مختلف خط دو مختلف شخصوں کے نام لکھے ہوئے ملیں گے۔ اگر ایسا خط کبھی آپ کو مل جائے تو سمجھئے کہ جو حصہ بلیک روشنائی سے لکھا ہے وہ پرانا خط ہے اور جو سرخ روشنائی سے بین السطور میں تحریر ہوا ہے وہ آپ کے نام ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ دونوں خط آپ کے نام نہ ہوں بلکہ کارڈ پر جو نیلی یا سرخ پنسل سے چند لفظ لکھے گئے ہیں صرف انہی کے مخاطب آپ ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ انہوں نے کوئی خط کسی کو لکھا اب یا تو وہ خط کتابوں میں یا کاغذات میں چھپ کر رہ گیا اور پوسٹ نہ ہو سکا یا ابھی پوسٹ ہونے نہ پایا تھا کہ مکتوب الیہ کا خط آ گیا یا پھر قاضی صاحب کا خیال بدل گیا اور نتیجتاً وہ خط پوسٹ نہ کیا گیا اب کسی اور کو اس کے خط کی رسید دینی ہے یا کوئی اور اہم لیکن مختصر بات لکھنی ہے سامنے کارڈ موجود نہیں ہے وہ اس کارڈ کو قلم زد کر کے دوسرا خط آپ کے نام لکھ دیں گے، یہ عام طور پر سرخ روشنائی سے لکھتے ہیں تاکہ دونوں خطوں کے مضمون میں التباس نہ پیدا ہو۔ اب اگر یہ خط بھی کسی وجہ سے پوسٹ نہ ہو اور کسی شخص کو صرف دو ایک جملے لکھنے ہیں اور جلدی لگی ہے مثلاً یہ کہ آپ کا خط آج ہی ملا یا کل بمبئی کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ پھر صرف حسب ذیل پتے پر بھیجئے وغیرہ وغیرہ) تو پھر یہی کارڈ استعمال کیا جائے گا قلم بھی ٹھیک ہوگا کبھی بہت ہے تو نب بدل گئی ہے تو ٹھیک ہے اس زمانے میں عام طور پر تحریر بہت صاف اور ضبطاً خوش خط ہوگی، جوں جوں نب گھستی جائے گی تحریر اور انداز خط بگڑتا جائے گا لیکن حروف پھر بھی بہت واضح ہوں گے اور نقطوں اور دائروں کا بڑا خیال رکھا جائے گا۔

خطوط زیادہ تر علمی و ادبی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں غیر متعلق باتوں کا وہاں گزر نہیں۔ میرے پاس ان کے ایک ہزار سے زیادہ خط ہوں گے پانچ دس ہی مقام پر انہوں نے اس اصول سے انحراف کیا۔ ہمارے فسادات کے زمانے میں انہوں نے بہت سے خط لکھے تھے صرف ایک خط میں انہوں نے تحریر کیا تھا کہ پٹنہ میں اب سکھ کثرت سے آ گئے ہیں۔ سال گذشتہ میں ایک بار انہوں نے ایک قومی کانفرنس کے بارے میں لکھا کہ ممکن ہے کسی زمانے میں ان کا کردار اعلیٰ رہا ہو لیکن اب تو ادبی اور عام سیاسی لوگوں میں کچھ فرق نہیں رہا۔ میرے آکسفورڈ کے دوران قیام میں ایک بار انہوں نے کیمبرج سے اپنے کالج کی کوئی چیز منگوانے کے لئے لکھا تھا۔

خطوں کا جواب بڑی پابندی سے دیتے ہیں اور عام طور پر ان کے خط طویل بھی ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک سطر کے لیکن عام طور پر جو اختصار اور ایجاز ان کے مضامین میں ہے اس کی جھلک ان کے خطوں میں بھی ملتی ہے۔ مضامین کی طرح کبھی کبھی خطوط میں بھی رموز اور مخففات کا استعمال کرتے ہیں۔ ”ایک شخص معلوم نے معاملہ مسعود کے متعلق کیا کہا؟“ ”جس سے میں نے گفتگو کی وہ جلد ہی اس سلسلے میں خط لکھیں گے“۔ کبھی آخر میں دستخط کی بجائے وہ صرف ”و“ لکھ دیتے ہیں۔

وقت پر جواب آپ انہیں نہ دیں تو وہ برا مان جاتے ہیں اور بعض مرتبہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ انسانی کمزوریوں اور ڈاک کے محکمے کی بدنظمیوں سے اچھی طرح واقف ہیں اس لئے ناراض ہونے سے پہلے وہ اپنے مکتوب الیہوں کو بڑا موقع دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی مسئلے کے متعلق انہوں نے آپ کو خط لکھا آپ نے جواب نہ دیا تو ہفتہ دو ہفتے کے بعد وہ دوسرا خط لکھیں گے اور ممکن ہے کہ پچھلے خط کے مضمون کا اعادہ کریں گے شاید آپ کو ان کا پہلا خط ملا ہو۔ آپ نے اب بھی توجہ نہ فرمائی تو کچھ دنوں کے بعد یاد دہانی کریں گے آپ نے اب بھی تساہل سے کام لیا تو آخری بار خط رجسٹرڈ بھیجیں گے اب اگر اس پر بھی آپ خاموش رہے تو پھر ان کی ناراضی سے دنیا میں آپ کو کوئی نہیں بچا سکتا۔

خطوط اور مضامین لکھنے کے لئے نہ تو خاص کاغذ کی پابندی ہے اور نہ سیاہی اور نب کی پروا۔ میرے پاس ان کے کچھ غیر سادہ پوسٹ کارڈ بھی ہیں جو حالت کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کے اپنے ہاتھوں سے بنے ہیں جن دو کچھی یا ردی کاغذ کے ٹکڑوں کی ایک طرف سادہ تھی دوسری طرف ٹکٹ چسپاں کر دیا ہے پھر ان کو کارڈ کے سائز کا بنا لینے پر اکتفا کیا ہے ہو کہ جب آدمی منزل تک آ جاتا تھا کاغذ نے چھپنے سے اور گوند نے چپکانے سے انکار کر دیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ کارڈ کے پتے والا حصہ بھی

مل گیا لیکن وہ ورق جس پر خط کی ابتدائی عبارتیں درج تھیں راہ میں گم ہو گیا۔

مضامین وہ بڑی تقطیع کے صاف ستھرے کاغذ پر کبھی نہیں لکھتے۔ وہ عام طور پر ردی یا چھوٹی تقطیع کے کاغذوں پر مسودہ تیار کرتے ہیں۔ کاٹ چھانٹ کے بعد وہ دوسری طرف نقل تیار کرتے ہیں۔ یہ واضح ہوتی ہے اور عام طور پر کاپی کے سائز کی ہوتی ہے۔ حاشیہ میں اصلاح کے لئے گنجائش کم ہوتی ہے۔ ایک بار میرے سامنے انہیں ایک مضمون شروع کرنے کا موقع ملا۔ ملازم سے فل سکیپ سائز کے کاغذ منگوائے اس پر لکھنے کے بجائے انہوں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے اور جب اس کی تقطیع رسالے کے صفحوں کی تقطیع کے برابر ہو گئی تو اطمینان سے انہوں نے مضمون لکھنا شروع کر دیا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خیال ان کے دماغ میں آیا سامنے رکھا ہوا جو بھی کاغذ ملا اس پر انہوں نے اپنے خیالات عجلت میں قلم بند کرنا شروع کر دیئے۔ اگر مناسب لفظ نہیں مل رہے ہیں تو اس کی جگہ چھوڑتے ہوئے وہ آگے بڑھ جاتے ہیں بعض مقامات پر وہ اسناد بھی مکمل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میرے پاس ان کے ایسے مسودات بھی ہیں جو کچہری کے کاغذات کی پشت پر لکھے گئے ہیں۔ کسی مضمون کا خیال پیدا ہوتے ہی بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مضمون لکھنا شروع کر دیں۔ رسالوں کے خاص نمبروں یا وقتی طور پر عجلت میں کوئی مضمون لکھنا ضروری ہو تو اور بات ہے ورنہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ مختلف موضوعات ان کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے ہیں کتابوں کا مطالعہ جاری رہتا ہے مواد جمع ہوتا رہتا ہے برسوں کے بعد وہ خیالات اور معلومات ایک مضمون یا مضامین کی شکل اختیار کرتے ہیں۔

[illegible]ء میں انہوں نے 'معیار' کے ایک نمبر میں ایک استفسار شائع کیا کہ 'گلِ رعنا' والے اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کئے ہیں کلیاتِ قدسی کے کئی نسخے دیکھے یہ اشعار موجود نہیں۔ ایک فارسی بحر سے ہیں۔ یہ اشعار حزین کے نام ملتے ہیں اگر کسی صاحب کو اس کی تحقیق علم ہو کہ یہ غزل کس کی ہے تو مجھے مطلع فرمائیں۔

کئی سال کے بعد ایک مختصر سا نوٹ یاد آتا ہے اس موضوع پر انہوں نے معارف [illegible]ء میں شائع کیا۔ آخر ۱۰ سال کے بعد تفصیل سے اس موضوع پر معارف ہی [illegible]ء میں بحث کی اور حق تحقیق ادا کیا اور ثابت کیا کہ وہ غزل حسرت کی ہے جو نصر آبادی اپنا تخلص کیا کرتا تھا۔

یہی حال 'غالب بحیثیت محقق' کا ہے [illegible]ء سے پہلے ان کا مطالعہ غالبیات پر اردو تھا۔ غالب سے بحیثیت فنکار اور بحیثیت انسان کے وہ پہلے سے متاثر تھے لیکن ان کی تصانیف کا باضابطہ مطالعہ انہوں نے اس کے بعد ہی شروع کیا ہے جس زمانے میں وہ غالب پر اردو اور اس حصے کی ساری تصانیف کا مطالعہ کر رہے تھے ان پر یہ حقیقت روشن ہوئی کہ غالب بحیثیت شاعر اور انشا پرداز بہت بلند ہیں لیکن فارسی زبان و ادب پر ان کا مطالعہ اتنا گہرا نہیں جتنا ان کے بعض معاصرین کا ہے۔ یہ نظریہ مسلمات کے خلاف تھا اور بہت دلچسپ۔ جوں جوں ان کا مطالعہ بڑھتا گیا اس موضوع سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ [illegible]ء کے کسی مہینے میں میرا ان سے ملنا ہوا۔ کئی ملاقاتوں میں یہی تذکرہ رہا وہ غالب پر ان کی عبارتیں پڑھتے جاتے تھے اور اس کی تردید میں دلائل اور حوالہ کتابوں سے ڈھونڈ کر پیش کرتے جاتے تھے، فارسی ادب کی شاید ہی کوئی مستند کتاب ہو جو انہیں مل سکی ہو اور انہوں نے چھوڑی ہو۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ آپ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کے لئے ایک مضمون لکھ دیں جس میں یہ ساری مباحث مفصل طور پر آ جائیں۔ انہوں نے فوراً رضامندی ظاہر کی ایک طویل مضمون لکھ کر دیا جو 'نقدِ غالب' میں مزید ترمیم و اضافہ کے بعد طویل تر ہو گیا ہے۔ یہ گویا اس موضوع پر ان کے چند روزہ نہیں سالہا سال مطالعے کا نچوڑ ہے۔

انہیں مضمون میں لمبی تمہید سخت ناپسند ہے۔ اگر ضروری معلوم ہوا تو صرف چند سطروں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ انہیں جو کچھ کہنا ہوتا ہے براہِ راست کہہ ڈالتے ہیں اور پھر بغیر کسی اختتامی پیراگراف کے مضمون ختم کر دیتے ہیں۔

ترجمہ کرنے کے کام کو وہ بہت مشکل کام گردانتے ہیں اور اسے خود مصنف کے معیار سے جانچتے ہیں۔ کہتے ہیں کامیاب ترجمہ وہ ہے جب اصل مصنف کو سنایا جائے اور وہ مطمئن ہو جائے کہ مضمون یا افسانے کی صحیح روح ترجمے میں آ گئی ہے۔ رسالوں میں مغربی افسانہ نویسوں کے افسانوں کے جو تراجم چھپتے ہیں ان سے قطعاً مطمئن نہیں ہیں۔ اس بات سے انہیں اور بھی تکلیف ہوتی ہے کہ بعض رسالوں میں مصنف بچارے مترجم کے برابر بھی نہیں سمجھے جاتے اور ان کے دماغ سوزی کی اس طرح داد دی جاتی ہے کہ بعض افسانوں کے ترجمے کے ساتھ ان کا نام بھی نہیں ہوتا۔

مگر ترجمے کی ذمہ داریوں کا انہیں پورا احساس ہے اس لئے خود ترجمہ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ افسانے اور مضامین تو درکنار اپنے کسی مضمون میں کسی انگریز مصنف کا قول نقل کرنا ہوا تو اکثر دیکھا ہے کہ ترجمے کے بغیر اصل انگریزی کی عبارت انہوں نے نقل کر دی۔ 'معیار' کے دورِ ادارت میں انہوں نے متعدد مغربی افسانہ نویسوں کے ترجمے منصور احمد مرحوم اور بعض دوسرے معتبر آدمیوں سے کرائے تھے لیکن کوئی افسانہ ایسا نہ تھا جس کا اصل سے مقابلہ کرنے پر انہیں یہ احساس نہ ہوا ہو کہ ترجمے میں ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی ہے۔ میں نے ایک دن ان سے ترجمے کے ذکر پر عنایت اللہ دہلوی مرحوم کا نام لیا اور پوچھا ان کے ترجموں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ وہ آنکھیں بند کر کے چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ 'انہیں ترجمے پر خاصی قدرت حاصل ہے اور ان کا ترجمہ رواں دواں ہوتا ہے، لیکن ایسی بات نہیں کہ ان کے ترجمے میں خامیاں نہ ہوں۔' '[illegible]' کا ایک نسخہ ان کی میز پر پڑا تھا جسے شاہد احمد صاحب نے حال ہی میں شائع کیا تھا اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے انہوں نے ایک صفحہ کھولا، اصل فرانسیسی ناول سے مقابلہ کر کے انہوں نے کہا اس ایک صفحے میں دو غلطیاں ترجمے کی ہیں۔ انہوں نے ازراہِ احتیاط یہ بھی کہا کہ اصل کا یہ کہنے سے قاصر ہوں کہ یہ غلطی عنایت اللہ صاحب کی ہے یا انگریزی مترجم کی اس لئے کہ انہوں نے اصل فرانسیسی سے نہیں بلکہ انگریزی ترجمے سے کتاب کو اردو میں منتقل کیا ہوگا۔

انہوں نے طویل مضامین بھی لکھے ہیں، دو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو صفحوں پر محیط ہیں بلکہ ایک مضمون تو ان کا تقریباً ڈھائی سو صفحوں میں ختم ہوا ہے اس پر بھی ان کے الفاظ میں 'بہت سے حق طلب گوشے ناگفتہ رہ گئے'۔ اور بہت سے مقامات میں جہاں تفصیل کی ضرورت تھی اجمال سے کام لینا پڑا۔' ضرورت کی بات دوسری ہے ورنہ عام طور پر ان کی تحریریں بہت مختصر ہوتی ہیں اور ان کے یہاں بڑا ایجاز ہے۔ انہوں نے بعض مقالے ورق یا دو ورق میں ختم کر دیئے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ان کے ذہن میں ہوتا ہے وہ بھی مواد کے لکھنے میں نہیں ہوتے۔ پھر انشاء پردازی پر انہیں پوری قدرت حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ طول نویسی سے بچ جاتے ہیں۔ وہ اپنے مضامین پر پوری توجہ اور وقت صرف کرتے ہیں اور علامہ مرحوم کی طرح انہیں اپنی طول نویسی کی معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی کہ میرے پاس وقت نہیں ہے کہ مضمون مختصر کر سکوں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ لفاظی لغو ہے۔ یہ مغرب کے لوگوں میں پسند کی جاتی ہو آج کل تو وہ غالب کے اس قول پر عامل ہیں کہ اپنی تحریر کو زوائد سے مبرا کرو۔

ان کی تحریر میں حشو کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ الفاظ کا انتخاب سوچ سمجھ کر اور ان کا استعمال ان کے صحیح مفہوم کو جان کر ہی کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ اچھے ادیب اور محتاط لکھنے والے اپنے الفاظ کے انتخاب اور ان کے صحیح استعمال سے پہچانے جاتے ہیں۔ میرے کسی ایک مضمون میں لفظ 'بعید' استعمال ہوا تھا، یہ معلومات بعید تھیں، یہ کتاب بعید کم یاب ہے، وغیرہ۔ انہوں نے اعتراض کیا اس پر بھی جب میں نے یہ مذموم عادت ترک نہ کی تو انہوں نے مجھے لکھا: آپ اس لفظ کو اپنی ڈکشنری سے بالکل خارج کر دیں۔ میں نے ایک بار ان کا ایک مضمون شائع کرتے ہوئے لکھا تھا کہ قاضی صاحب نے ایک تحقیق کو اس پایہ پر پہنچا دیا ہے جس سے آگے متصور نہیں ہو سکتا۔ ان کا فوراً خط آیا کہ آپ کی رائے مبالغہ پر محمول ہے، میرا دعویٰ ہے کہ اس سے کہیں بہتر مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

کلیم الدین احمد کی طرح ان کے خلاف جو مضامین لکھے جاتے ہیں اس کا جواب شاذ و نادر ہی دیتے ہیں۔ وہ پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ مخاطب کس طرف کا آدمی ہے۔ ویسے وہ اختلاف رائے کو پسند کرتے ہیں بلکہ علمی معاملات میں ایسی بحث و تمحیص کو وہ ضروری جانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ جب کوئی تنقید لکھتے ہیں یا کتابوں پر تبصرے کرتے ہیں۔ تو جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ انصاف اور دیانت سے کام لیتے ہیں لیکن وہ معصوم نہیں، نہ معصوم عن الخطا اس لئے عین ممکن ہے کہ بغیر ان کے ارادے کے اس میں دخل ہو انصاف اور حقیقت کے خلاف کچھ باتیں قلم سے نکل جائیں یا واقعات کی غلطیاں ہو جائیں یا یہ کہ مصنف کے نقطۂ نظر کو صحیح طور پر سمجھنے سے وہ قاصر رہیں۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ مصنفین یا دوسرے ذمہ دار حضرات ان کے تبصروں سے اختلاف کریں اور ان کی غلطیوں سے انہیں مطلع کریں۔ جب تک وہ اپنا رسالہ 'معیار' نکالتے رہے اس کا انہوں نے التزام رکھا اور اس ادارے کو کھلا چیلنج دیتے رہے، کسی نے ان سے اختلاف کیا اور اعتراضات لکھے تو ان کا مضمون چھاپنا ضروری ہوا تو جواب یا رد اس کی اشاعت اول اول اور شکریہ ادا کیا۔

تصنیفات پر رائے دینے میں یا تبصرہ لکھتے ہیں وہ بڑے خطرناک ہیں وہ عینی بیانات یا مصلحت وقت پر مبنی رائے کبھی نہیں دیتے اور اسے خالص غیر علمی حرکت جانتے ہیں۔

ان کی تنقیدوں کی تیزی کو برداشت کرنا ہر خاص و عام کا کام نہیں اس کے لئے اگر ایک طرف ضبط اور قوت برداشت کی ضرورت ہے تو دوسری طرف اس سے صحیح طور پر مستفید ہونے کے لئے علم کی تلاش و جستجو کی بھی ضرورت ہے۔ جو لوگ ان کے امتحان میں پورے اترے ہیں ان میں مہیش پرشاد، امتیاز علی صاحب عرشی اور مالک رام صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں مجھے ایک کرم فرما یاد آتے ہیں۔ ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہوا تو قاضی صاحب نے اس پر ریویو لکھنے کا خیال ظاہر کیا وہ بہت گھبرائے اور انہوں نے اس ارادے سے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی اور لکھا کہ مجھ احقر حقیر ہیچمداں کی تحریر آپ کی تنقید کا مستحق کس طرح ہو سکتا ہے۔ پھر جب ان کی دوسری تصنیف ایک اہم موضوع پر شائع ہوئی تو انہوں نے ایک نسخہ قاضی صاحب کی خدمت میں رائے کے لئے پیش کیا۔ انہوں نے پہلے تو بعض مشتبہ باتیں ان سے خط لکھ کر پوچھیں پھر انہیں مطلع کیا کہ وہ اس کتاب پر ایک تفصیلی تبصرہ لکھ رہے ہیں جو تقریباً ۱۰۰ صفحات میں ہوگا۔ اس تنقید پر قاضی صاحب نے اس قدر محنت کی جس قدر انہوں نے اپنی کتاب لکھنے میں کی ہوگی اور تنقید اس قدر پُر معلومات تھی کہ وہ اگر نظر ثانی کے وقت اسے پیش نظر رکھتے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی کتاب اپنے موضوع پر بہترین کتاب ثابت ہوتی۔ لیکن اس اعلان کے ساتھ ہی مصنف نے ان سے خط و کتابت تک بند کر دی۔

تنقید وہ بہت صاف اور کھری اور بے لاگ لکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ وہ تعلقات کا پاس رکھتے ہیں نہ دوستی کا۔ بلکہ بقول شخصے دوستی پر وہ ادبی غیرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ عرشی صاحب جیسے ان کے دیرینہ تعلقات ہیں ان کی جس قدر کتابوں پر انہوں نے تبصرے لکھے ہیں شاید ہی کسی مصنف کی تصنیفات پر لکھے ہوں۔ تبصروں کی ضخامت اور اختصار زیادہ تر کتاب اور موضوع کی اہمیت کی بنا پر ہوتا ہے۔ خطوط اکبر مرتبہ راقم پر ان کا تبصرہ صرف پانچ سطروں کا ہے لیکن خطوط غالب مرتبہ عرشی پر ان کا تبصرہ کوئی پانچ قسطوں میں شائع ہوا۔

تبصروں میں چاشنی اس سے بالکل نہیں ہوتی اور رواج زمانہ کے خلاف تعریفی کلمات بہت کم لکھتے ہیں۔ جن کتابوں پر آج تک انہوں نے تبصرے لکھے ہیں ان میں سب سے زیادہ وہ دیوان فائز سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جس کی ترتیب و تصحیح صاحب مسعود حسن رضوی ادیب نے کی ہے مختلف صحبتوں میں اس کتاب کا ذکر آیا اور ہمیشہ انہوں نے بہت اچھے الفاظ میں اس کتاب کی تصحیح و ترتیب کا ذکر کیا۔ یہی وجہ ہے جب انہوں نے معاصر میں اس پر تبصرہ لکھا تو تعریف میں صرف ڈھائی سطریں لکھیں۔ "فاضل مرتب نے فائز اور ان کے کلام کو سمجھنے کی سعی بلیغ کی ہے اور قدما کے کلام کو پیش کرنے کا جو اسلوب انہوں نے اختیار کیا ہے وہ اس قسم کی اور کتابوں میں جو ابھی تک شائع ہوئی ہیں بہت کم ملتا ہے۔ ترتیب کا یہ بلند معیار قابل تقلید ہے۔"

فارسی اور اردو ادب کا جس قدر گہرا مطالعہ انہوں نے کیا ہے اور جس قدر مسائل ان کے ذہن نشین ہیں اس کا اندازہ عام طور پر لوگوں کو نہیں ہے جو لوگ انہیں قریب سے دیکھتے ہیں انہیں کو کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہر چند گریجویٹ ہیں ان کے مضامین معاشیات، سیاسیات اور تاریخ تھے لیکن چونکہ ادبیات فارسی و اردو کا ذوق انہیں بہت پہلے سے تھا اس لئے دوران قیام انگلستان میں بھی ان موضوعات پر اپنا مطالعہ جاری رکھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ بہت سی قلمی کتابوں کے خلاصے یا نوٹس ان کے پاس اس زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔

یورپ سے واپسی کے بعد غالباً انہوں نے ملازمت کی طرف توجہ نہیں کی ان بیرسٹری کچھ دنوں انہوں نے ضرور کی لیکن یہ پیشہ ان کی افتاد طبیعت کے مطابق نہ تھا۔ خوش نصیبی سے ان کا تعلق ایک بہت ہی متمول خاندان سے ہے اس لئے انہوں نے بہت سے علائق دنیوی سے بہ آسانی پیچھا چھڑا لیا اور ان کی شخصیت جو بہت منفرد ہے یک رخی ہو گئی ہے اس کا بھی راز یہی ہے۔ اس وقت سے اب تک ان کا واحد مشغلہ کتب بینی اور تالیف و تصنیف ہے۔

کتب بینی اور کثرت مطالعہ یہ ہے اگر کسی میں قوت استدلال و استخراج نہ ہو تو اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس میں حافظہ قوی ہو اور نقد کا شعور نہ ہو قاضی صاحب میں یہ ساری خوبیاں جمع ہیں۔ عام طور پر محققین اپنے تحقیقی کاموں کی ابتدا "شک" سے کرتے ہیں قاضی صاحب کی ابتدا "نفی" سے ہوتی ہے۔ لوگ عام طور پر جو بات کہی جاتی ہے وہ فوراً مان لیتے ہیں جب تک کہ اس کا غلط ہونا ثابت نہ ہو جائے وہ ہر بات کو ماننے سے انکار کر دیتے ہیں جب تک کہ آپ اس کی

صحت روایت کر دی۔

ان ساری باتوں کے علاوہ جو وصف انہیں دوسرے محققین سے ممتاز کرتا ہے وہ ان کی قوتِ حافظہ ہے۔

ایک بار ایک مجلس میں جس میں متعدد ادیب اور شاعر موجود تھے ذکر چھڑا کہ اُردو کے ہزاروں شعر ایسے ہیں جو زبان زد ہیں لیکن عام طور پر معلوم نہیں کہ کس کے شعر ہیں۔ لوگوں نے یکے بعد دیگرے کوئی دس شعر پڑھے قاضی صاحب نے فوراً بتا دیا کہ یہ شعر کس کے ہیں۔ جب ان کی باری آئی انہوں نے جو شعر پڑھے ہم لوگ کسی کا جواب نہ دے سکے۔ ان شعروں میں ایک یہ بھی تھا:

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

بعد میں انہوں نے بتایا کہ یہ شعر وزیر لکھنوی شاگردِ ناسخ کا ہے۔ گو بعض تذکروں میں خود ناسخ کے نام درج ہے۔

اپنے وسیع مطالعے اور حافظے ہی کی مدد سے انہوں نے آوارہ گرد اشعار کا ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا ہے جس میں ایسے سارے اشعار درج ہیں جو دوسرے شعراء کی طرف بھی منسوب ہیں۔ اس کی متعدد قسطیں ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں اور جنہوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ ان کی تجسس و تلاش کی داد دیئے بغیر نہ رہیں گے۔ فارسی کا یہ شعر کس نے نہیں سنا ہے:

در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

لیکن یہ شعر اصل میں کس کی ملکیت ہے اس کا صحیح علم کم لوگوں کو ہوگا۔ قاضی صاحب نے اس پر تفصیلی بحث کی اور بتایا کہ نتائج الافکار میں تو جہاں بیگم [illegible] میں عشرتی اور اللغات میں نسیمی کے نام منسوب ہے۔ علاوہ اس کے معزی کا اور غالب اسے قدسی کی غزل سمجھتے ہیں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اسے عرفی کے [illegible] سے متعلق سمجھتے ہیں۔ قاضی صاحب نے ثابت کیا کہ یہ غزل نظیری کی ہے اور انہوں نے غالب کے اس قول کی کہ یہ غزل عرفی کی زبان ہے تصدیق کی اور بتایا کہ اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ موجود ہے جو قاضی صاحب کے ماخذ میں شمار ہے اور جو انہیں [illegible] نہیں۔ نیز [illegible] کی گردونوں میں [illegible] ہیں)۔

ایک دن فنِ تنقید اور تنقید نگاروں کا ذکر تھا۔ وہ صاحب تنقید کے اصل مفہوم سے جس سے خوب واقف نہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ شبلی نے یہ لفظ پہلی مرتبہ استعمال کیا اور یہ اس لفظ کے موجد ہیں۔ اردو میں عام استعمال ان کی بدولت ہوا ہو تو عجب نہیں۔ پھر انہوں نے اس لفظ کی قدیم مثالیں دینی شروع کیں۔ انہوں نے بتایا کہ قدیم ترین مثال جو انہیں معلوم ہے ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں ملتی ہے "در تنقید روایت و تعریف روایت" یہ کتاب ان کے زیرِ مطالعہ رہتی ہے ملنے والوں سے زیادہ تر گفتگو اسی سے متعلق ہوتی ہے۔ میں ایک بار ان سے ملنے گیا اثر لکھنوی صاحب کی چھان بین زیرِ مطالعہ تھی، پوچھنے لگے لفظ رنڈی، عورت کے معنی میں مستعمل ہے یا نہیں۔ میں نے کہا میرا تو خیال ہے کہ یہ لفظ اسی معنی میں موجود ہے پرانے لکھنؤ کے شعراء اور مصنفین کے کلام سے سند چاہیے۔ میں نے کہا یاد آتا ہے فسانۂ عجائب میں بھی یہ لفظ مذکور ہے۔ کہنے لگے۔ اثر صاحب کہتے ہیں لکھنؤ میں عورت کو رنڈی نہیں کہتے، زمانۂ حال کا مجھے علم نہیں لیکن زمانۂ سابق میں لکھنؤ کے متعدد شعراء اور مصنفین نے یہ لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے آج کل میں یہ سند تلاش کر رہا ہوں۔ انہوں نے شاگردانِ وزیر میں سے کسی کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی کا ایک مصرع سنایا۔

کل رنڈیوں سے ہے سب دائرا

میں نے کہا غلط ہے اس سے مراد زنانِ بازاری بھی ہو سکتی ہیں میں نے برق کا کلام دیکھا ہے اس میں واجد علی شاہ کے متعلق لکھا ہے:

ٹکیں مار کریں رنڈیاں ان سے بیاہ
کہ ایسا تو مرد اب ہے دل رُبا

"قبالہ" کے متعلق اثر صاحب نے لکھا تھا: "قسم سے پہلے جو لکھنوی ہونے پر بھی میں نے سنتا ہوں"۔ کہنے لگے فسانۂ عجائب کے علاوہ یہ لفظ برق کے دیوان میں بھی موجود ہے۔

فلک کی چال جو دیکھی رقیب کا مارا

انھوں نے مصحفی سے دعویٰ کیا تھا کہ موسم کو مونث (واقعی) کہنے والے اہل لکھنؤ ہیں۔ قاضی صاحب نے میر کا شعر سنایا:

قفس میں میر نہیں جوش داغ سینے پر
ہوس نکال لی ہم نے بھی گل کے موسم کی

(اس غزل کے قوافی برہم، شبنم، ماتم وغیرہ ہیں)

میں نے ایک بار ان سے پوچھا اس بات کی کیا سند ہے کہ یہ شعر غالب کا ہے:

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی غالب
پاس ہی مے خانہ ہے پی کے ابھی آتے ہیں

مسکرائے پھر بولے کہا جاتا ہے غالب کو خط لکھ کر پوچھا گیا تھا انھوں نے جواب دیا: مجھ پر کیا شامت آئی تھی کہ پاس ہی مے خانہ ہوتے ہوئے مجلس وعظ میں جا کر بیٹھتا۔ پھر بولے یہ شعر دراصل یوں ہے:

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے مے خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

کچھ لوگ اسے قائم چاند پوری کا شعر سمجھتے ہیں لیکن 'قائم' لازماً بطور تخلص نہیں آیا اور یہ شعر دیوانِ قائم، نسخۂ لندن، میں موجود ہے۔

بے پناہ حافظہ اور ادبیات کے مطالعہ کے علاوہ جو وصف ان کو ان کے معاصرین سے ممتاز کرتا ہے وہ بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری کے ہندوستان پر ان کی تاریخی نظر اور بصیرت ہے۔ اس عہد کے مصنفین نظم و نثر میں جن اشخاص کا ذکر آتا ہے ان کی شخصیت متعین کرنے میں انہیں اپنے تاریخی مطالعہ سے بڑی مدد ملتی ہے۔ دیوان اشرف علی والے مضمون میں جو نوٹ انہوں نے تذبذب پر لکھا ہے اسے دیکھئے۔ دستی، الفصاحت، مرقعِ دہلی میں ایک عبارت آئی تھی "بالا خوردہ عاشق تفتہ واسطہ گردید"۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ، محمد عاشق کا تخلص ہے۔ انہوں نے تبصرے میں لکھا کہ تذکرے محمد عاشق تفتہ کے ذکر سے خالی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ محمد عاشق مصور ہیں جن کا ذکر (ق) مصحفی کے اس شعر میں آیا ہے:

واہ رے میاں محمد عاشق شبیہ کش
کھینچی ہے تم نے کیوں مرے دلدار کی شبیہ

سیاسی امور کے متعلق ان کی رائیں صائب ہوتی ہیں اور ان مسائل پر ان کی نظر گہری ہے۔ گو وہ اب عملی سیاست میں حصہ نہیں لیتے لیکن یورپ جانے سے پہلے برسوں وہ اس دشت کی سیاحی کر چکے ہیں۔ یہ زمانہ ۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء کا تھا وہ تحریک خلافت میں شریک ہوئے اور اسی راستے سے وہ کانگریس میں آئے۔ انہیں اس زمانے میں تحریک خلافت اور کانگریس کے تقریباً سربرآوردہ اصحاب کو قریب سے دیکھنے اور ان میں سے بعض کے ساتھ کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ مولانا محمد علی مرحوم کی دردمندی اور خلوص سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یورپ سے واپسی کے بعد انہیں سیاسی امور کی طرف غالباً توجہ کا موقع نہ ملا۔ تقسیم ہند سے کچھ پہلے وہ انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کے سیکرٹری تھے اور اس عہدے پر وہ کئی سال تک رہے اور اردو کے مسئلہ پر وہ مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ لوگوں سے لڑتے رہے۔ مولانا ابوالکلام ہوں یا ڈاکٹر سید محمود انہوں نے حق بات علانیہ کہی اور برملا کہی۔ وہ جناح صاحب کو مخلص اور ایک لائق قانون دان سمجھتے ہیں لیکن اب نہیں کہ انہیں غلطیوں سے منزہ سمجھیں۔ ان پر اور لیگ کے دوسرے لیڈروں پر ان کے بڑے سخت اعتراضات ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق ان اصحاب نے قوم کی باقاعدہ تنظیم کی کوشش بہت کم کی اور صرف نعروں اور بیان بازی ہی تک رہے۔ وہ گاندھی جی کے خیالات سے متفق نہیں ہیں لیکن انہیں ایک بڑا سیاست دان اور اپنی قوم کا کامیاب لیڈر مانتے ہیں۔ ایک بار سوشلزم کا ذکر ہو رہا تھا بولے ہندوستان میں کمیونزم کے ترقی کے امکان ہیں۔ سوشلزم کی بات مجھ میں نہیں آتی اور یہاں اس کا مستقبل بڑی حد تک مشتبہ ہے۔ اس گفتگو کے کچھ ہی دنوں بعد سوشلسٹوں میں انتشار ہوا اور پارٹی کے لیڈروں کا دعویٰ ہے پرکاش نرائن علیحدہ ہو گئے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ وہ کمیونزم کے حامیوں میں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں اب دو ہی صورتیں معلوم ہوتی ہیں یا تو حکومت کمیونزم سے انگریز جیسے اور اس کے خلاف کرے سید کیجئے یا پھر اس تحریک کو عملی طور پر قبول کر لیجئے۔ درمیان کی کوئی راہ نہیں ہے۔

فنونِ لطیفہ میں وہ شعر کو اور فنون پر ترجیح دیتے ہیں۔ موسیقی اور مصوری سے لگاؤ ہے۔ یورپ میں انہوں نے عجائب گھروں میں بھی

ان دنوں کا ذکر ہے۔ وہ ریڈیو کبھی نہیں سنتے۔ فلموں سے انہیں دلچسپی لیتے دیکھا اور نہ کچھ کانوں سے۔ میرا خیال ہے وہ تقریریں بھی شاید ہی سنتے ہوں۔ میں نے دو موقعوں پر انہیں متوجہ کیا اور اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ پروگرام سن کر اپنی رائے سے مطلع کریں۔ ریڈیو ان کے کمرے کے پاس ہی ان کے بیٹے قاضی مسعود کے کمرے میں بجا۔ لیکن وہ متوجہ نہ ہو سکے۔ تاویل یہ کی کہ دونوں موضوع ایسے تھے جن سے ان کی دلچسپی ختم تھی۔ ایک تقریر شعلہ اکبر پر تھی دوسرا غالب پر ایک فیچر تھا۔

فلمیں شاذ و نادر ہی دیکھتے ہیں۔ سال بھر میں ایک آدھ بار کوئی اچھی فلم دیکھ لی تو دیکھ لی ورنہ اس کا بھی غم نہیں پالتے۔ کہتے ہیں ہندوستانی فلمیں دیکھنے میں وقت اور پیسے دونوں ضائع ہوتے ہیں کم سے کم اکثریت ایسی ہی فلموں کی ہے۔ ہاں اب جب کبھی کسی نے کسی فلم کی تعریف کی یا انہیں اپنے ساتھ لے گیا تو ادھر چلے جاتے ہیں۔ ایک بار پٹنہ میں سہراب مودی کی مرزا غالب کی دھوم مچی تو دیکھنے گئے واپس آئے تو بولے۔ وقت ضائع ہوا۔ لوگوں کو اس زمانے کے رسم و رواج معاشرت لباس وغیرہ کے متعلق جب تک اچھی اور صحیح معلومات نہ ہوں تاریخی فلم بنانے کا بیڑا نہیں اٹھانا چاہئے۔

جب سہراب مودی کی فلم غالب بنی تو انہوں نے اس خیال سے کہ فلم غالب سے متعلق ہے مجھے اس کی اطلاع دی اور جب فلم دیکھ چکے تو اپنے تاثرات مجھے اوکسفورڈ لکھ کر بھیجے۔ میں جب یورپ سے واپس آیا تو مجھے دکھانے پر اصرار کیا اور غالب فلم کے ریکارڈ بھی سنوائے۔ اور دیر تک اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ انہوں نے اس ایجی ٹیشن کا بھی ذکر کیا جو اس فلم کے خلاف دہلی وغیرہ میں ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ فلم نگار نے جا بجا بے ضرورت حقیقت سے انحراف کیا ہے غالب کی زندگی پر بہت اچھا ڈرامہ لکھا جا سکتا تھا جو حقیقت پر مبنی ہوتا اور جس میں شاعر کے صحیح حالات پیش کئے جاتے۔

ان کی تنقیدی صلاحیتیں یہاں بھی کارفرما تھیں۔ انہیں کہانی کے ساتھ ساتھ اداکاری اور ہدایت کاری پر بھی اعتراض تھا۔ وہ ثریا کی اداکاری سے خوش تھے لیکن اس کے انتخاب پر ان کے خیال میں نرگس اور مدھوبالا اس رول کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوتیں۔ فلم کے موضوع پر اس سے پہلے اس قدر تفصیلی بات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ فطری طور پر میرے دل میں ان معلومات کے ماخذ جاننے کی خواہش ہوئی معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں انہوں نے فلمی رسالوں اور معیاری انگریزی اخباروں کے فلمی تبصرہ نگاروں کی تنقیدات کا باضابطہ مطالعہ کیا ہے اور غالب فلم پر جو اہم ریویو اور تبصرے شائع ہوئے ہیں ان کے تراشے انہوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ جہان غالب میں جو ایک طرح کی غالب انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں غالب سے متعلق ہر قسم کی معلومات جمع ہوں گی اب انہوں نے سہراب مودی بھارت بھوشن اور ثریا کے ناموں کے بھی اضافے کئے ہیں۔ ان صاحبوں کا ذکر ایک آدھ ہی سطر میں ہو گا لیکن ہو گا ضرور اس لئے کہ ایک نے غالب کی زندگی پر فلم بنائی ہے تو دوسرے نے غالب کا رول ادا کیا ہے اور ثریا غالب کی محبوبہ کی حیثیت سے فلم میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

ادبی ذوق کے باوجود وہ مشاعروں میں جانا پسند نہیں کرتے اور نہ وہ شاعروں کی اتنی عزت افزائی کرتے ہیں کہ انہیں شعر سننے پر مجبور ہو جائیں۔ ہاں وہ خود کوئی ادبی جلسہ منعقد کر رہے ہوں یا ان کے خاص احباب کسی مشاعرے میں شریک ہو رہے ہوں تو دوسری بات ہے۔ میں نے انہیں صرف دو ایک مشاعروں میں شرکت کرتے دیکھا ہے۔ ایک بار ان کے دوست ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی ایک مقامی مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے یہ ان کی سعادت مندی کی بات ہے وہ مشاعرے میں آئے۔ تاختم بیٹھے رہے اور سیگریٹ پیتے رہے۔ دوسری مرتبہ صوبائی انجمن ترقی اردو کی طرف سے انہوں نے اردو کانفرنس منعقد کی تھی آخری دن مشاعرے کا بھی پروگرام تھا۔ مولانا ظفر علی خاں صدارت کے لئے لاہور سے آئے تھے وہ گئے۔ خطبۂ صدارت اور کچھ شعر سن کر چلے آئے۔ ایک موقع پر عندلیب شادانی صاحب پٹنہ کالج کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے آئے اور حسب معمول قاضی صاحب کے یہاں ٹھہرے۔ میں نے ان سے پوچھا آپ نے شادانی صاحب کو کبھی سنا ہے؟ بولے اس کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے سنانے کی فرمائش کی نہ میں نے ان سے کچھ کہا۔ یہ اس کے باوجود ہے کہ وہ ان کی شاعری کے مداح ہیں انہوں نے ان کی کئی نظمیں اپنے رسالے میں شائع کی ہیں۔ اسی طرح ایک بار ڈاکٹر سچیدانند سنہا کے یہاں ساغر نظامی آئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کچھ احباب کو چائے پر مدعو کیا اور ساغر صاحب سے شعر پڑھنے کی فرمائش کی۔ قاضی صاحب موجود تھے۔ دو گھنٹے تک ساغر صاحب شعر سناتے رہے لوگ داد سے چھت اڑاتے رہے اور قاضی صاحب سگار کا دھواں۔

یہ قصہ مشاعرے کا ہے ان کے گھر کی بات کچھ اور ہے کوئی معقول شاعر ان سے ملنے جائے اور شعر سننے کا موقع ہو تو عموماً اس سے شعر سنانے کی فرمائش ضرور کرتے ہیں۔ ایک بار میں پرویز شاہدی صاحب کو لے کر ان کے یہاں گیا ان سے قاضی صاحب کے دیرینہ تعلقات ہیں لیکن ایک مدت کے بعد ان سے سامنا ہو رہا تھا۔ قاضی صاحب بڑے اخلاق سے پیش آئے، پیچھے سے آ کے انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئے اور علمی اور ادبی باتیں کرنی شروع کیں زیادہ تر صنف غزل کے متعلق۔ کلیم الدین احمد صاحب کی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" شائع ہو چکی تھی (یہ اکتوبر ۱۹۴۰ء کی بات ہے)۔ اس پر دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ قاضی صاحب بھی سے غزل کو "نیم وحشی صنف شاعری" نہ سمجھتے ہوں لیکن وہ اس کے مداحوں میں بھی نہیں معلوم ہوتے۔ معیار میں انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ شعرائے حال کی غزلیں شائع کرنا ہماری روش کے خلاف ہے، چنانچہ انہوں نے کبھی کوئی ایسی غزل شائع نہیں کی۔ ایک بار ہندوستان کے ایک مشہور غزل گو شاعر نے اپنی غزل پر نظم کا عنوان لکھ کر اشاعت کے لئے بھیج دیا۔ مشرف عالم آرزو جمیل مرحوم جو معیار کے کاموں میں ان کے معاون تھے مجھ سے کہتے تھے کہ یہ غزل انہیں واپس کر دی گئی اور لکھ دیا گیا کہ براہ کرم غزل کو نظم بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔

پرویز صاحب سے اس دن اصرار کر کے قاضی صاحب نے کئی غزلیں سنیں۔ ایک غزل کا مطلع یاد رہ گیا ہے:

سنا ہے کل تھا ان کے لب پہ ذکر مختصر میرا
تصور دے رہا ہے طول اسی کو کس قدر میرا

قاضی صاحب بہت محظوظ نظر آئے اور ان کے اشعار کی بہت تعریف کی۔

انہوں نے مجھے مختلف ملاقاتوں میں متعدد ناولوں اور افسانوں کے زبانی پلاٹ سنائے ہیں لیکن انہیں کبھی ناول یا افسانہ لکھنے کا موقع مل سکے گا اس کی مجھے زیادہ امید نہیں ہے۔ ان اصناف میں ان کے معیار کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے رسالے میں کبھی کوئی طبع زاد افسانہ یا ڈرامہ شائع نہیں کیا۔ مغربی مصنفین کی چیزیں ترجمہ کرا کے شائع کیں اور وہ بھی سخت جانچ اور احتساب کے بعد۔

یہ بات شاید ہی کسی اور کو معلوم ہو کہ قاضی صاحب شاعری میں بھی بند نہیں۔ انہوں نے موزوں طبیعت پائی ہے۔ اب انہیں شعر کہنے کی شاید ہی فرصت ملتی ہو لیکن برسوں پہلے وہ کبھی کبھی فکر سخن کر لیا کرتے تھے۔ یہ چند شعر ان کی طالب علمی کے زمانے کی یادگار ہیں۔

چشم شب زندہ دار کی حسرت   دل امیدوار کی حسرت
تھی کسی وعدے پہ جان لائی   زندگی آنکھ سے تھی یہاں؟

کبھی دستور اب تقدیر پہ شکوہ بھی   شوق پرواز ہے لیکن پر پرواز نہیں

میں ستم شب اگر شکایت کیا کروں   اک فریاد ناز کر چاہوں تو کیا کروں

بلبل بیچارہ اور گل دشمن کے آگے   یہ سوختنی ہے تو وہ گردن زدنی ہے

مجھے مدد سے منع کرتے ہیں   یہ بھی اک امر اختیاری ہے!

سنے جا رہے ہیں بندہ میں کر کے آئے — مرا حال ہے یہ کہانی نہیں ہے

کب کھو گیا ایک محرم راز — بلبل نہیں گل ہے نغمہ پرداز

تیرے لئے مجھ سے ہیں ہزاروں — میرا تو جہاں میں ایک تو ہے

قاضی صاحب کی کچھ مخصوص کمزوریاں بھی ہیں۔ بے پناہ حافظے کے باوجود انہیں مکمل شعر مشکل ہی یاد رہتے ہیں اور مکمل غزل تو شاید ہی کوئی انہیں یاد ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُردو فارسی کا کوئی شعر اگرچہ وہ کتنا ہی غیر مشہور کیوں نہ ہو آپ کو مکمل یاد نہ ہو۔ آپ صرف چند لفظ ان کے سامنے پڑھ دیں وہ فوراً شعر سمجھ جائیں گے بلکہ یہ بتا دیں گے کہ یہ شعر کس کا ہے مطبوعہ دیوان میں موجود ہے یا کسی خاص قلمی نسخے میں۔ [illegible] بیاضوں اور تذکروں میں اس کا اندراج ہے اور یہ بھی بتا دیں گے کہ یہ شعر صحیح یا غلط طور پر کن کن شعرا کی طرف منسوب ہے۔ یہی حال [illegible] کے پتوں کا ہے۔ کثرت سے خط و کتابت کے باوجود اگر آپ کا پتہ مختصر نہیں ہے تو کبھی یاد نہ رکھیں گے اور ہمیشہ آپ کو تاکید کریں گے کہ اپنا پتہ خط کی پیشانی پر ضرور لکھئے۔ انہیں دوسروں کی سہولت کا بھی اس معاملے میں بہت خیال رہتا ہے۔ وہ اس امر کا التزام کرتے ہیں کہ اپنے خط پر تاریخ اور اپنا پتہ ضرور درج کریں۔ میری ان کی ایک مدت سے خط و کتابت ہے لیکن ان کی تاکید رہتی ہے کہ میں اپنا پتہ ضرور لکھا کروں۔ ایک دفعہ میں پتہ لکھنا بھول گیا۔ انہوں نے خط [illegible] شاہ گنج پٹنہ کے شاہ منزل کے پتہ پر بھیج دیا۔ پتہ غلط تھا لیکن خط مل گیا۔

یہی حال مکانوں کا ہے۔ انہیں کسی مکان کی پوری صورت اور محل وقوع یاد رکھنے میں دقت ہوتی ہے اگر کوئی رفیق ساتھ نہ ہو تو ممکن ہے وہ مطلوبہ مکان پر پہنچ کر تعارف کے بعد بھی پہچان نہ پائیں۔ ایک مرتبہ انہیں پروفیسر قمر الدین صاحب پرنسپل سائنس کالج کے یہاں جانا تھا جہاں ان کے ایک دوست ٹھہرے ہوئے تھے۔ موصوف کی کوٹھی پٹنہ کالج کے سامنے سرِ راہ واقع ہے اور یقین ہے انہوں نے سیکڑوں بار دیکھی ہوگی۔ مگر خود وہیں پہنچ کر انہیں خیال ہوا کہ وہ کسی اور کی کوٹھی پر آ گئے ہیں۔ واپس آئے اور مسعود [illegible] سے [illegible] کی [illegible] کوٹھی پر [illegible] موصوف ہی کی تھی۔

کاغذات اور کتابیں بڑی منتشر حالت میں رکھتے ہیں اور اکثر بھول جاتے ہیں کہ کون سی چیز کہاں ہے۔ انہیں یہ بات تو یاد رہتی ہے کہ مصحفی کے فلاں قصیدے کی نقل جو فلاں صاحب نے رام پور کے کتب خانے سے یا [illegible] شاہ [illegible] صاحب نے [illegible] کے کتب خانے سے بھیجی ہے اس کے مطالب کیا ہیں، کب لکھا گیا، مصحفی کے کس دیوان میں ہے، اتفاق سے اس وقت شاعر کے تعلقات کس طرح کے تھے [illegible] نے کس حد تک مصحفی کا [illegible] ساتھ دیا تھا۔ غرض یہ ساری باتیں یاد رہتی ہیں مگر یہ یاد نہیں رہتا کہ قصیدے کی نقل کہاں رکھی ہے۔ کاغذات ان کے پاس بہت جمع رہتے ہیں اور روز آتے ہی رہتے ہیں یہ فلاں تذکرے سے فلاں شاعر کے حالات مسعود حسن رضوی صاحب نے لکھنؤ سے بھیجے ہیں یہ نقل ڈھاکے سے [illegible] آئی ہے۔ یہ [illegible] سے [illegible] صاحب نے بھجوائی ہے۔ غرض روز بروز نقلوں اور کاغذات میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ خطوں کی بھرمار الگ ہوتی ہے یہ خطوط نقلوں کے ساتھ [illegible] جاتے ہیں اور کبھی دسویں صدی ہجری کے شعرا کے تراجم و اشعار کی نقلیں زمانۂ حال کے ادیبوں کے خطوں کے لفافے میں پہنچ کر [illegible] گم ہو جاتے ہیں لیکن ضائع نہیں ہوتے اس لئے کہ اس طرح کے [illegible] کے بکسوں میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح جستہ جستہ کے بعد یہ کاغذات اور خطوط تکیے کے نیچے سے نکال کر بڑے بڑے صندوقوں اور الماریوں میں ڈال کر بند کر دیئے جاتے ہیں۔ [illegible] کے انتظار میں جب بہت فرصت ہوگی یہ چیزیں نکال کر علیحدہ کی جائیں گی لیکن یہ وقت بڑی مشکل سے آتا ہے اور اسی وقت آتا ہے جب کوئی نہایت اہم کاغذ گم ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت سارے کام بند کر دیئے جاتے ہیں اور صندوقوں کے پٹ اور بکسوں کے منہ کھول دیئے جاتے ہیں لیکن [illegible] کاغذات دیکھ [illegible] ایک ایک کاغذ [illegible] وہ [illegible] سے [illegible]۔ [illegible] کام [illegible] ہوتا ہے [illegible] مقفل ہو جاتے ہیں اور [illegible] کاغذ گم شدگی کی وجہ سے جو مضمون نامکمل پڑا تھا وہ یک بیک اٹھا لیا جاتا ہے اور اس کی تکمیل شروع ہو جاتی ہے۔

کتابوں کا حال اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اکثر کتابیں اور رسالے بھی گم ہوتے رہتے ہیں۔ مخطوطوں اور کاغذات کی طرح ان کے پاس مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اس میں ہمیشہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ نئی مطبوعات کے ساتھ قدیم نادر مطبوعات اور مخطوطات بھی خریدتے رہتے ہیں۔ مختلف کتب خانوں سے قلمی کتابیں مستعار آتی رہتی ہیں۔ ان کی نقلیں کھینچی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کے لئے اب موزوں جگہ باقی نہیں رہی اور ان کے رکھنے میں کوئی ترتیب نہیں۔ قلمی کتابیں مطبوعات کے ساتھ رکھی ہوئی ملیں گی اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مستعار مخطوطات ان کی شخصی مطبوعات کے ساتھ خلط ملط ملیں گی۔ کتابیں احباب اور کتاب خانے مانگ لے جاتے ہیں۔ ان سے مانگ کر قیمتی کتابیں دینے میں بھی کبھی تامل نہیں کرتے۔ اکثر ہوتا یہ ہے کہ کسی موضوع کے لئے خود ہی کوئی کتاب تجویز کرتے ہیں اور خود ہی مہیا کر دیتے ہیں اور پوچھتے ہیں کتب خانے آپ کہاں جائیں گے، معلوم نہیں وقت پر آپ کو ملے یا نہیں۔ میرا ذاتی نسخہ لے لیجئے گا۔ ایسی کتابیں اکثر واپس آ جاتی ہیں لیکن کچھ کو اپنے شغل سے ایسی دلچسپی ہو جاتی ہے کہ وہ واپس نہیں آتیں۔ قاضی صاحب یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ کتاب کوئی مستقل شخص لے گیا ہو گا اور وہیں کہیں رکھی ہوگی۔ اب اگر رسالے کی الماری بالشت پر موجود نہیں تو [illegible] مستعار لوگوں ہی کے پاس بند ہوگی۔

کتابوں کی جلد بندی پر کبھی توجہ نہیں دیتے۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی کتاب جلد ساز کے یہاں سے جلد ہو کر نئی آئی ہو۔ نہ کبھی اس سلسلے میں دلچسپی لیتے ہوئے انہیں پایا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتابیں کثرت استعمال سے بوسیدہ ہونے لگتی ہیں۔ پہلے پرانی دفتیں الگ ہوتی ہیں پھر کتاب سے [illegible] اترتے ہیں اس کے بعد اصل کتاب کے صفحے جدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہی حال خاتمۂ کتاب کا ہوتا ہے۔

آئے دن کتابیں گم ہوتی رہتی ہیں اور گم شدہ کتابیں ملتی رہتی ہیں۔ کاغذات اور کتابوں کی اس گمشدگی کے لئے وہ ایک اصطلاح Misplace بہت استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کسی کتاب کا نام آیا، کہنے لگے میرے پاس موجود ہے لیکن Misplace ہو گئی ہے۔ وہ اکثر فخر سے کہتے ہیں کہ میرے یہاں سے کاغذات یا کتابیں گم نہیں ہوتیں صرف کبھی کبھی Misplace ہو جاتی ہیں اور یہ صحیح ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کتاب کئی کئی برسوں کے بعد ملتی ہے [illegible]۔ ایک زمانے میں [illegible] کا [illegible] نسخہ جو انہوں نے [illegible] سے مستعار لے کر پڑھا تھا وہ Misplace تھا۔ پھر معلوم ہوا دیوان مصحفی کا ایک قلمی نسخہ Misplace ہو گیا ہے۔ [illegible] کے [illegible] اردو کے تذکرے اور غالب کے تصنیفات آئے دن Misplace ہوتی رہتی ہیں۔ آج کل بہت سے مجوزہ مضامین کے مسودات کہیں Misplace ہو گئے ہیں۔

انہیں گھڑی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ نہ وہ اپنے پاس رکھتے ہیں اور نہ گفتگو کے دوران میں وہ کمرے کے کلاک پر نگاہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہیں وقت کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ گفتگو جب شروع ہوتی ہے تو ایسی محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ گھنٹے پر گھنٹے گزرتے جاتے ہیں اور انہیں اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ قاضی صاحب بڑے اچھے محقق ہیں اور اپنی زبان کے مایہ ناز نقاد، لیکن ان کی گفتگو میں وہ خشکی نہیں جو اس قسم کے اہل علم میں عام طور پر ہوتی ہے۔ وہ خوش گفتار ہیں اور اپنے علم اور حافظے کی مدد سے مخاطب پر چھا جاتے ہیں۔ پھر بعض اصحاب کے برخلاف لوگوں کو اپنے پسندیدہ موضوع پر نہیں لے آتے بلکہ انہیں کی دلچسپی کے موضوع پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں۔ ایک بار ایک صاحب برسوں کے بعد ان سے ملنے آئے۔ باتیں شروع ہوئیں۔ دن کا کھانا آیا، دونوں نے کھایا، پھر باتیں ہونے لگیں۔ چار بج گئے، شام کی چائے آئی، پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ آٹھ بجے شب کا کھانا آیا، کھایا گیا۔ باتیں اب بھی ختم نہ ہوئیں۔ آخر جب وہ صاحب رخصت ہوئے اور قاضی صاحب [illegible] اپنی خواب گاہ میں پہنچے تو دیکھا کہ فجر کا وقت ہو گیا ہے اور اذان ہو رہی ہے۔

انہیں اپنی کتاب یا مضمون کی تصحیح کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اس میں وہ جس قدر اہتمام کرتے ہیں اور کاوش کیا کرتے ہیں وہ عام تو عام خاص لوگوں کے بھی بس کا نہیں۔ 'معیار' ان کا اپنا رسالہ تھا جو انہوں نے [illegible] میں پٹنہ سے شائع کرنا شروع کیا تھا۔ اس کی کتابت و طباعت کی نگرانی خود وہ کیا کرتے تھے اور تعجب نہیں کاپیاں اور پروف دیکھنے سے پہلے متعدد بار پڑھ لیتے ہوں۔ لیکن جب پہلا شمارہ نکلا تو فہرست مضامین کے بعد [illegible] کے پہلے [illegible] درج تھا جو پورے ایک صفحے کا تھا۔ دوسرے شمارے میں پھر زیادہ اہتمام ہوا، پہلے شمارے کی تصحیح چھاپی گئی۔ اس شمارے کے بعض مقالات کی تصحیح تیسرے شمارے کے پرچے میں بھی موجود ہے۔ معیار کے دوسرے شماروں کی تصحیحات بھی اسی طرح ہر دوسرے پرچے میں چھپتی رہیں۔ اب بھی جب وہ معیار کی فائل کسی کو دیتے ہیں تو اپنے قلم سے مزید تصحیح و اضافے کے بعد ہی دیتے ہیں۔

غالب نمبر میں میں نے غالب کے ایک فرضی استاد عبد الصمد پر ان کا مضمون شائع کیا۔ مضمون لکھنے کے بعد سے چھپنے تک اس میں وہ تبدیلیاں اور اضافے کرتے رہے۔ اور جب میں نے اسے احوال غالب میں دوبارہ شائع کرنا چاہا تو انہوں نے اس طرح شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ پورا مضمون دوبارہ لکھا یہاں تک کہ انہوں نے عنوان بھی بدل ڈالا۔

غالب نمبر ہی میں ان کا مضمون "غالب بحیثیت محقق" شائع ہوا۔ ان کے انکسار سے تو ان کے ذہن میں یہ تک نہیں آتی تھی کہ [illegible] ہوگی جب مضمون نے یہ قالب اختیار کیا ہوگا۔ مضمون مکمل ہو چکا تو انہوں نے املا کی تصحیح کی، بجا بجا قلم دوڑ گئے، کہیں کہیں مکرر اصلاح کی، بعض باتیں بڑھائیں، بعض نئی لکھیں۔ سب مسودہ میں کاٹ چھانٹ کی مزید گنجائش نہ رہی تو انہوں نے سادہ کاغذ کی چیپیاں مضمون پر چسپاں کیں، کہیں کہیں سطر کی سطر اور پیراگراف کا پیراگراف انہوں نے نئی چیپیوں پر لکھا۔ مضمون جب مجھے ملا اور میں نے کتابت کے لئے کاتب کے حوالے کیا تو ان کا دوسرا خط آیا جس میں انہوں نے بعض امور کی تصحیح کی تھی۔ مسودہ درست کر دیا گیا پھر دوسرا خط آیا اس میں اور یہ خواہش ظاہر کی کہ مسودے میں اس طرح ترمیم کر دی جائے۔ یہ بھی کر دیا گیا ان کی خواہش تھی کہ کاپی کی تصحیح وہ خود ہی فرمائیں گے۔ علی گڑھ میگزین والوں کے لئے یہ بات ناممکن سی تھی لیکن میں نے اپنی ذمہ داری پر یہ وعدہ کیا اور انہیں کتابت شدہ اجزا بھیج دیے گئے۔ انہوں نے املا کی تصحیح کی، کچھ مزید ترمیم و اصلاح کی اور غلطیاں لگائیں۔ کاپی نویس ان غلطیوں کی کاٹ پیٹ کر درست کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس عرصے میں ان کے کئی خطوط آئے اور اس طرح مضمون میں کچھ مزید اضافے اور ترمیمات ہوتی رہیں۔ یہ درست بھی ہو گئیں۔ ان کاپیوں کو انہیں بھیجا نہ گیا اور اس میں بھی کئی اصلاحیں ہوئیں۔ تصحیح کے اس اہتمام اور اس دیدہ ریزی کے باوجود جب غالب نمبر شائع ہوا تو تصحیح کی طرف سے مطمئن نظر نہ آئے اور انہوں نے مجھے بتایا کہ مضمون میں بعض ناحق اغلاط رہ گئی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد ہی انہوں نے اپنے دعووں کے ثبوت میں مزید اسناد و حوالے جمع کرنے شروع کئے۔ تیمور اور عبد القادر کی سینکڑوں کتابیں پڑھیں، ایک ایک لفظ کے لئے شاعروں کے مکمل دیوان دیکھ ڈالے، شاہنامہ کئی کئی بار پڑھا اور انہوں نے نئے سرے سے مواد جمع کیا۔ لیکن جب میں نے نقد غالب میں اس مضمون کو شامل کرنا چاہا تو انہوں نے مضمون اسی طرح چھپنے سے انکار کر دیا اور دوسرا مضمون از سر نو لکھنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ کئی ماہ کی محنت شاقہ کے بعد انہوں نے یہ ڈیڑھ سو صفحوں کا مضمون رقم کیا۔ اس کی تمہید میں انہوں نے لکھا:

> "غالب بحیثیت محقق" کے عنوان سے میرا ایک مقالہ علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں اشاعت پذیر ہوا تھا جو بہت عجلت میں لکھا گیا تھا اور اس میں اغلاط طباعت بھی بہ کثرت تھے۔ میری مستدعا ہے کہ اسے کالعدم سمجھا جائے اور مجھے اس کے متعلق ہر قسم کی ذمہ داری سے بری قرار دیا جائے۔"

اس مضمون کی کاپی بھی اسی طرح لکھی جاتی۔ یہ بھی برابر انہیں علی گڑھ سے پٹنہ بھیجا جاتا رہا۔ مضمون کی تصحیح وہ مصروفیت کی وجہ سے کرانا نہیں چاہتے تھے لیکن یہ کسی دوسرے کے بس کی بات نہ تھی۔ میں بھی اس زمانے میں بہت مصروف تھا، بہرکیف میرے اصرار پر وہ مان گئے اور کاپی کی تصحیح خود انہوں نے کی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ تصحیح شدہ کاپی ان کے پاس بھیجی گئی تھی یا نہیں کہ وہ دیکھ لیں کہ غلطیاں درست ہو گئیں یا نہیں۔ پھر یہ جب کاپیاں چھپیں تو ان کے پروف ان کی خدمت میں بھیج دیے گئے اور میں انتظامات سے مطمئن ہو کر یورپ چلا گیا۔ وہاں سے جب واپس آیا اور چھپی ہوئی کتاب پر نظر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مضمون کے اختتام کے بعد پانچ صفحوں کا "تصحیح و اضافہ" ہے پھر اس کے بعد "تتمۂ تصحیح و اضافہ" ہے۔ انہیں پر بس نہیں، اب مزید پانچ صفحوں کا "غلط نامہ" ہے اس کے اختتام پر پھر "تتمۂ غلط نامہ" درج ہے۔ وہ اب بھی مطمئن نہیں اور جب وہ اپنے کسی دوست کو اپنے اس مضمون کا آف پرنٹ دیتے ہیں تو اپنے قلم سے مزید تصحیح کرنے کے بعد ہی دیتے ہیں۔

کسی بات کے لکھنے اور ناظرین تک اس کے صحیح طور پر پہنچانے کا یہ سارا اہتمام، ان کی ساری جد و جہد اور یہ ساری محنت و ریاضت انہوں نے یورپ اور دوسرے ممالک کے ادیبوں سے سیکھی ہے۔ مشرق میں ایک شخصیت سے وہ بے حد متاثر ہیں اور میں نے اکثر ان کو انہیں بڑے احترام سے یاد کرتے دیکھا ہے۔ یہ شخصیت عبد الوہاب قزوینی کی ہے لیکن قزوینی کی خوش نصیبی ہے کہ ان کی تصانیف کے لئے انہیں یورپ اور ایران کے بہترین پریس ملے۔ اگر یورپ کے مستشرقین کو اپنی کتابیں ہندوستان کے [illegible] پریسوں میں چھپوانی پڑ جاتیں تو یقین جانئے انہیں اپنی کتاب ہی کی ضخامت کا ایک غلط نامہ بھی شائع کرانا پڑتا۔

شفق رضوی عماد پوری

حسن وارثی

نام :۔ سید حسن مرتضیٰ (اسم تاریخی مظہر سعید)
ولدیت :۔ سید حسن رضا (صدر الصدور، اضلاع مغربی و شمالی)
ولادت :۔ سنہ ۱۲۸۹ ہجری مطابق سنہ ۱۸۷۲ء۔
سکونت :۔ موضع عماد پور۔ نزد ریلوے اسٹیشن رفیع گنج۔ ضلع گیا۔
اساتذہ :۔ (۱) طب و شاعری :۔ حکیم سید عابد علی کوثر وارثی غیرآبادی۔ (اس زمانہ میں تخلص حسن کرتے تھے)
(۲) حدیث و شاعری :۔ مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی (آپ ہی کے کہنے سے تخلص شفق اختیار کیا)
(۳) عروض و شاعری :۔ منشی امیر احمد امیر مینائی۔
رحلت :۔ ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۴۲ء روز جمعہ وقت ۹ بجے صبح بمقام عماد پور ضلع گیا۔

چودھویں صدی ہجری کا علم سے چند سال پیچھا چھوڑ رہے تھے منجملہ آخر سعادت شفق ہے جو کہ جس وقت [illegible] سے یہ یادگار تعلیم ضرب ہے اس کے احترام و ادب کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہی الفاظ بیسویں صدی کی نسبت جس ماحول سے جاتے ہیں وہ ہمارے نزدیک مستحق نہیں لیکن اس مرتبہ صدی سے چند سال پیچھا ہونا اچھا لگتا ہے۔ اس بیسویں صدی کا پہلا عشرہ پورا ہو چکا ہے، ابھی دو سال باقی تھے جب کا حال سنا رہا ہوں۔ عنوان وغیرہ رسائل اور گلدستوں میں کلام شفق عماد پوری دیکھ کر اس سے متعارف ہو گیا۔ یوں سمجھئے کہ انتخاب شاعر کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ آپ پوچھیں گے کہ اس قلبی کی وجہ؟ اچھا تو سنئے میری عمر کچی اور عقل بھی خام تھی مگر خاندانی رسم و رسیدہ بزرگوں سے طریقت کی پیروی قائم کرنے کی وراثت یا نسبت حاصل تھی۔ انہی میں حضرت حکیم سید عابد علی کوثر غیرآبادی [illegible] صورت اور سیرت [illegible] اخباروں سے [illegible] بزرگ [illegible] وارثی اور میں بھی وارثی۔ ان کی درگاہ شفقتوں کا یہ عالم [illegible] رمضان کے [illegible] اب

حکیم صاحب اجوائن کے عرق دیں ساماں رہے ہیں۔ یہی حرف سے روائتی جوڑ حق ممدوح مولانا ابھی چولھے پر کڑاہی چڑھائے چھلیاں بیچتے تل رہے ہیں۔ غرض کیا جاہے کہ ایسے شفیق و رنگ میں پیراہل شاگردوں سے متعرف ہونے والے شوق سے قطعی دبرق نہ آیا ہو۔ حکیم صاحب تو آتو کل، چند دن عزیز آباد سے ہمارے شوق کے بعد سے پیرو کیا آنے کا جاتے رہتے تھے۔ اپنے رشتہ داروں میں سے میر شفاعت حسین مرحوم کے یہاں اکثر مقیم ہوا کرتے تھے کبھی نہ کبھی مل ہی جاتے مگر ایک عرصہ تک مراسم صاحب سلامت سے آگے نہ بڑھے۔

سنہ ۱۹۱۲ء کے اواخر میں میری شادی ہوئی۔ میرے سگے ماموں جان کا میرے غریب خانے پر بہت شہر میں ان کی لڑکی کا سلسلہ دبیس کوئی دور دراز تھا۔ امام شریف سید ابوالبرکات عرف عظیم آباد بسنہ ۱۹۱۲ء میں عالی وخوشدامن کی رحلت کا تبادلہ ماموں جان پر ہوا۔ غلام عزیز احمد صاحب ایجنٹ میرے پیرو کے ممدوح اشفاق وحاقت باغ والی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ ممدوح کے مصاحبوں میں منشی دہلی محمد حسینی تخلص شاگرد میر امداد علی صاحب عشرت دبیس گیا تھے۔ انھی کی ترغیب سے میں بھی حضرت عشرت کے تلامذہ میں داخل ہو گیا۔ اب معلوم ہوا کہ میری شادی میں استاد مرحوم نے بھی سہرا نظم فرمایا تھا مگر حضرت شوق کے سہرے کو سب پر ترجیح دی گئی تھی۔ افسوس کہ یہ مخطوطہ سلسلہ صرف ایک ہی مصرعہ یاد رہ گیا ہے " یہ ہے وہ " مخمس کل غلام عزیز کی ہی جاں منشی سید ظہیر الدین خستہ شوق کے شاگرد پرگوشت از ابجد شاعری خوش ذوق دبیس فارسی کی معقول استعداد رکھنے کے علاوہ اوقات بے وقت عمدہ کھانا بھی پکا لینے میں مشاق مقدمہ دبیس دالمر تھے۔ مگر ان کی عزت کا ناجائز فائدہ کچھ ہم چشموں نے اٹھایا تھا۔ چونکہ مجھے ان کی ہمدردی مرحوم ہوئی ابھی سے ذریعہ آغا حشر کاشمیری سے راہ و رسم ہوئی اور جناب شوق سے بے تکلف بڑھے۔ اور بڑھتے بڑھتے اس حد کو پہنچے کہ تفاوت سن وسال بھی بے تکلفیوں میں حارج نہ ہو سکا۔ مولانا ان کے کلام کی ادبی اغیار میں بھی ہو رہا مگر تخلیہ میں مصرعہ مصرعہ پر سخت تنقید کی۔ واضح باد کہ یہ تنقید صرف تخیل سے متعلق ہوا کرتی تھی ورنہ علم عروض سے متعلق تو مولانا اتنا جانتے تھے کہ بار دے بیچے ان کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے میں بھی فخر محسوس کرتے۔ قابل لحاظ بات یہ تھی کہ میری کا صاحب سے اہم شروع گفتگو سے کبھی کبیدہ خاطر نہیں کیا۔ اور آئندہ پھر کبھی اتنی سیدھی باتیں بیٹھتے اور وزن ول وکھ کے ساتھ گوارشات اشعار کی ہوتیں تو ان بھی لیتے۔ بہت دنوں مجھے اس کا راز معلوم نہ ہو سکا کہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ آخر میں بھی سمجھ میں آئی کہ اس ذریعہ وہ مجھے اپنی معلومات سے مستفید فرماتے ہیں کیونکہ خود ہو گیا تو میری دوا بھی ہو اس سے ان کے تخیل میں جو ان کے نزدیک اصلاح یا درد دل شاذ و نادر ہی ہوتا مگر مجھے خوب خوب نکات اس ذریعہ حاصل ہوئے۔ سچ کہا ہے کسی نے

ہمنشیں تو از تو بہ باید
تا ترا عقل و دیں بیفزاید

حالانکہ استاد حضرت عشرت سنہ ۱۹۱۳ء میں سفر آخرت فرما چکے تھے اور مولانا شوق کے علم وواقفیت کا دوسرا استاد فن میرے قریب نہیں تھا۔ مگر ان اصلاحیں جو شاگردوں کے کلام پر نظر سے گزریں وہ بھی بڑھانے میں ممد ہوئیں۔ علاوہ ازیں حقیقت بھی یہی ہے کہ استاد عشرت کے طرز اصلاح کا عادی انحطاط گوئی کے علاوہ کو قبول کر سکتا ہے مگر کسی اور کی اصلاحوں سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ عام طریقہ سے الفاظ "مصارعہ" یا پورا شعر بدل دینے کی اصلاح سمجھا جاتا ہے۔ میرے پاس ایک مسودہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر قلم استاد پھیلا ہو۔ ممدوح کا طریقہ ہی اور تھا۔ نہایت سیدھے ہوئے طریقے کی تنقید ایسی فرماتے کہ غلط الفاظ کی ہر یا تخیل کی اونچ ہو جاتی۔ حتی الوسع ہم قلم خود اصلاح کر لیتے کبھی دو راہ ساتھ نہ دیتا اور اصلاح نہ سوجھتی تو ممدوح صاف اشارات ایسے فرماتے کہ فوراً بات ذہن میں آ جاتی۔ بیچارے شوق صاحب کو ان باتوں سے کیا واسطہ!

مولانا شوق، صوفی صافی طینت، مرنجاں مرنج، خوش گو، بزرگ، ہر صنف سخن پر یکساں قادر، خوش ذوق ہی نہیں بلکہ اردو میں شکستہ کی رفتار سے نستعلیق لکھتے تھے۔ کسی نے دیکھا حسن کی کلاکاری بھی ہوئی۔ ساری کوئی ہیں وہ عمل کی ہی نہیں بلکہ علم عمل کے ماہر تھے۔ خلاصہ یہ کہ خدمت ادب ہی کے لئے وہ پیدا ہوئے تھے۔ ع۔ بایں ہمہ نیستم ہم بری از جرم۔ ان کی حیات مستعار کی زیادہ حاصل تھی۔ چنانچہ ان مشغلوں میں ایسے پڑے کہ دین و دنیا دونوں سے دستبردار ہوئے کے متعلق تو ہم کوئی حکم نہیں لگا سکتے مگر جہاں تک دنیا کا تعلق ہے یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کے کام کے وہ بالکل نہیں رہے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ سرکاری مطالبات یعنی مال، روڈ سیس داخل کرنے کے لئے رقم نہ ہوا کرتی آنے میں اس وقت بہ حیثیت زمیندار ہو چکی۔ ممدوح خیال کی توجہ تو حاصل کر لی گئی مگر باقی خزانے میں جائداد نیلام پر چڑھ

تھی۔ اسی طریقے سے بزرگوں سے ملے ہوئے ٹکڑے پارچے تک بکے جو دو گز نکلتے چلے گئے۔ ورنہ اتنی حیثیت رکھتے تھے کہ خوش اوقات بسر کیجئے۔ ایک دن اسی حال میں پہنچے کہ کلکٹر کی کچہری پر بنگالی بابو سے کہہ رہے تھے ؎

رفیو جی کا اک ٹکٹ دیجئے　　　اور اسٹر کا محصول لے لیجئے

یہ نہیں کہ بابو مطلب نہ پا رہا تھا مگر مولانا کی بات وہ اس ہی سمجھا اس کے بس سے باہر تھا۔ وہ ٹالے جانے چاہتا مولانا کو ٹھکانا کر دینا چاہتا تھا۔ بہ دقت کوئی آگے آیا تو معاملہ سدھ ہوا اور مولانا ٹکٹ خرید کر بیٹھے ہوئے۔

"شعروشاعری" بھی مولانا کے زیر مشق نہیں تھی۔ منظومات ان بھی خوب کر لیتے تھے۔ منظوم واردات کی مثالیں پیش کی جائیں تو طوالت ہوگی۔ گو کہ اپنے معاصرین اساتذہ بہار سے یقیناً بہتر شعر لکھتے تھے۔ ادیب اور العصر الہ آباد، ندیم اصفہان گیا۔ یہ ماہنامے نثر مضامین پیش کر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں مشق کی تالیفات کے چھپے نسخے شائع ہوئے ہیں۔ کچھ کتب اور بہاری صاحب قلمی کتابیں نہ چھاپی گئی ہیں نہ وہ قبول عام حاصل کر سکیں جو مشق کے بجائے ان کے رسائل کو قسمت ہوا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بڑا دلچسپ ہوا تھا جو مولانا خود مزے لے لے کر بیان فرمایا کرتے تھے۔ سرورق کتب کے داخلی صفحہ پر مولانا اپنی بعض تالیفات کا اشتہار دے دیا کرتے تھے۔ "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کی مصداق "المشتہر" کے بجائے اوروں کو خود جناب لکھا تھا۔ تمامت پسندی ان کا جوہر تھا اپنا انکسار کی حد ہے نہ تھی چنانچہ المشتہر کے نیچے اپنے نام کے ساتھ بجائے "لکھنے کے عادی تھے۔ کتابوں کا ایک آرڈر ایسا بھی وصول ہوا جس کے پتہ پر "جناب مولانا بجھیز ...." لکھا گیا تھا۔

جون سنہ ۱۹۱۰ء پٹنہ سے ان کا اپنا گلدستہ نسیم سحر کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں راقم الحروف کے حضرت قبلہ گاہی بیرسٹری پاس کر کے مراجعت فرمائے وطن ہوئے تھے۔ مولانا نے تبریک و تہنیت میں تاریخی قطعات مع قصیدہ جلوں کے شائع فرمائے تھے۔ یہ صرف تبرک نہیں ہیں بلکہ اوراق میں سے بھی نایاب ہیں لہٰذا ان کو داخل تحریر کر کے ضائع ہو جانے سے بچا لینا ضروری ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ ان کی اشاعت کا ایک مطلب یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ اس ذریعہ میں اپنے بزرگوں کا اشتہار کرنے کا مجرم قرار پاؤں۔ لیکن ناظرین با تمکین سے معذرت میں صرف اپنا ایک شعر لکھنے پر اکتفا کروں گا ؎

شہرت اہل فضل بھی ازل کے ساتھ ساتھ　　　کس قدر دست و گریباں میری رسوائی ہوئی

(منقول از) نسیم سحر بابت ماہ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء نمبر ۲ جلد ۱ (باہتمام سید حسن مرتضیٰ عادل پوری، مطبع احسن المطابع پٹنہ)۔

قطعہ　مبارک ہو آنا سفر سے وطن میں

میں سچے دل سے اس بے انتہا مسرت کا اظہار مناسب سمجھتا ہوں جو مسٹر سید علی امام صاحب (خلف مولوی سید ظہیر امام مرحوم وکیل و نواسہ نواب سید ابو صالح خاں بہادر مغفور رئیس جعفر گیا) کے بیرسٹر ایٹ لا ہو کر سفر ولایت سے واپس آنے پر ہوئی ہے۔

جناب مسٹر ممدوح اور ان کے معزز احباب و اقارب کی قدر محبت و اسلامی اخوت سے امید ہے کہ اس ہدیہ مختصر کو قبول فرمائیں ؎

از دست گدائے بینوا ایں ہدیہ　　　جز آنکہ بعشق دل ربائے بکشد

قطعہ تاریخ سال مع تہنیت استقبال بتقریب مراجعت مسٹر سید علی امام بیرسٹر از سفر انگلستان

فصل بہار آئی ہے، لا جلد ساقیا　　　گلشن میں بادۂ گلگوں کے بھر کے جام
مشتاق دیر سے ترے دیدار کے ہیں　　　ساغر بکف کھڑے ہوئے رندانِ تشنہ کام
وہ مے پلا کہ آنکھوں میں روشنی جواز ہو　　　وہ جام دے کہ آتشِ تر سے ہو سرخ فام
وہ مے پلا کہ نشۂ عیش و سرور ہو　　　وہ جام دے کہ جس سے ہو شرمندہ جم کا جام
مجھ پہ کیا اور کیسی ہے عیش بہار　　　کیوں ہے یہ انتظام یہ کیسی ہے دھوم دھام

اسٹیشن گیا میں جو تب سارا ہیں کیوں
کیوں ہے پلیٹ فارم پہ یہ کاندہ اہتمام
یکس کی پیشوائی کو ہیں باادب کھڑے
جاہ و جلال و شوکت و اعزاز و احتشام
وا آگئے وہ جن کا تھا آنکھوں کو انتظار
والا وہ آئے ہو کے مسرور و شادکام
وہ ہو کے انگلینڈ سے بیرسٹر ایٹ لا
اہل وطن سے مل گئے مسٹر علی امام
احباب ذی وقار ہیں سرگرم تہنیت
مصروف عیش و مسرت ہیں خاص و عام
اب یہ دعا ہے خالق لیل و نہار سے
جب تک کہ رات دن سے ہے صبح اور ہے شام
زینے ترقیوں کے کریں طے یہ جلد جلد
ہو جائیں اپنی قوم میں ممدوح خاص و عام
ذی خلق و ذی مروت و ذی جاہ و ذی حشم
ان چاروں وصف سے رہے مشہور ان کا نام
تاریخ سال کی جو ہوئی فکر اے شفق
دل ہو گیا وفور مسرت سے شادکام
دشمنی کا سر گرا کے یہ ہاتف نے دی ندا
مسٹر علی امام ہوئے فائز المرام

١٩ ـــ ١٣

دیگر

گئے تھے ملک ولایت جو ہونے بیرسٹر
وطن کو لوٹ کے وہ فائز المرام آئے
گئے تھے جب سے ہو سب کو یہ فکر و دعا
وہ پھر کے خیر سے باعز و احتشام آئے
ہے ان کی شان میں صادق یہ مصرع سلطاں
کہ نیک نام گئے اور نیک نام آئے
دعا یہ ہے کہ رہے عز و جاہ روز افزوں
ہمائے اوج سعادت پئے سلام آئے
ترقی آپ کی ہو موجب حمایت قوم
عروج آپ کا اسلامیوں کے کام آئے
نہ آئے کس طرح اقبال بہر استقبال
کہ آج صاحب اعزاز و احترام آئے
شفق گئے تھے وطن سے جو ہو کے مستقل
سفر سے آج وہ مسٹر علی امام آئے

١٩ ـــ ١٣

دیگر فارسی در صفت تہنیہ

مرحبا اے ساقی مستانہ رنگین ادا
گلعذار و گلبدن گلپیرہن و گلگوں دہن
مرحبا اے غنچۂ گلہائے صحن بوستاں
مرحبا اے نغمۂ دلکش لحن مرغان چمن
مرحبا اے طائر رطب اللسان عندلیب
مرحبا اے طوطیٔ شکر فشاں شکر شکن
مرحبا اے رونق و نور ملک انگلستان ما
از قدومت رشک گلزار جناں خاک وطن
مرحبا اے آمدن باعث صد انبساط
چشم مشتاقاں شدہ روشن بساط انجمن
چوں شنودم جستجوئے سال تشریف آوری
ناگہاں در جوش آمد بحر طبع موجزن
از لب یہ مصرعہ برخواند شد گوش ہوش ما
آب رفتہ باز آمد بوئے آمد در چمن

١٩ ـــ ١٣

اس لحاظ سے بھی مندرجات بڑے دلچسپ ہونے چاہئیں کہ ایک استاد فن کی اسی سالہ عمر کا نمونۂ کلام ہیں۔ ظاہر ہے کہ تیس سال اور وقت پا کر مولانا اگر نظر ثانی فرماتے تو بہت کچھ رد و بدل کر کے نظموں کو اور بھی [illegible] بنا سکتے تھے مگر پھر ہم اس نادر نمونے کو کہاں پاتے جو مشق سخن کی ارتقا کو واضح کرنے میں بڑے مددگار ہوں گے۔

جب مولانا کو مریدوں سے فرصت ملی تو وہ شیر گڑھی کی طرف مطب کھول کر توکل علی اللہ بیٹھ گئے مگر کام کیا چلتا۔ ہر قسم کے طریقے علاج سامنے کی دنیا میں جاری ہو گئے یہاں تک کہ طب روحانی اور طب اسلامی کے ناموں سے بھی دہشت چشم و گوش ہونے لگی افسوس اس لادینی دنیا کا کہ یہ طب روحانی نام کی کوئی حکمت بھی کسی کا خواب بھی نہیں ملی ورنہ اس کی صحیح تعبیر شاید مولانا کامیابی کے ساتھ دیتے۔ اسی زمانہ میں آستانۂ عالیہ دیوہ شریف کے لئے جو ٹرسٹ کمیٹی عدالت چیف کورٹ لکھنؤ کے حکم سے قائم تھی اس کا سیکرٹری راقم آثم تھا۔ مولانا کو ساتھ لے کر حاضر آستانہ ہوا۔ مولانا ایک مخمس لکھ کر لے گئے تھے۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کی مشہور غزل "اے چہرۂ زیبائے تو رشک بتان آذری" کی تضمین کی تھی جس میں عقیدت اور پرخلوص انداز میں اس نظم کو مولانا نے وہاں پیش کیا اس سے مجمع کا جی متاثر ہوا اور میں بیٹھے آپ سے ایسا ہو گیا کہ اپنی بساط سے باہر بات کہہ [illegible] دیدہ [illegible] بود"۔

حضرت [illegible] بادی کے بزرگ دادا [illegible] جب ہے تھے تو اسی قرب و جوار میں ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے [illegible] جھگیا سے بھی ایک مشارع وارد الہ آبادی ہوتی تھی جس کے کارندہ ہمارے وطن میں بابو عبدالحی وارثی متعلقہ قصبہ ردولی ہے۔ شہزادہ آباد میں [illegible] تھے۔ بابو عبدالحی کو گھر کا چھوڑنا قسمت نہ ہوا تھا لہذا وہ اپنی جائداد فقط آستانہ کو دے دینے کا ارادہ و اعلان کر چکے تھے۔ شفیق ان کے چچا تھے اور قریب ترین حقدار وراثت۔ اسی وراثت کی بشارت میں مولانا کو دے رہا تھا۔ یہ تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ کچھ دنوں کے بعد بابو عبدالحی حاضر آستانہ ہوئے تو حکم خاص لکھا ہوا مسودہ وقف نامہ کا ساتھ لائے۔ ہم سب کو پڑھ پڑھ کر سنایا اور وعدہ کر کے الہ آباد گئے کہ جا کر رجسٹری کرا کر تاریخ اعلان ہو جائیں گے کہیں سے کوئی شبہ بھی اس کا نظر نہیں آتا تھا کہ یہ پورا نہ رہے گا۔ اپنی حماقت کا شدید احساس مجھے تھا مگر اپنی تسلی یہی کہہ کر کیا کرتا تھا کہ اپنے حدود کو نہ پہچاننے کی یہی سزا ہے۔

گئے ہیں [illegible] قیامت کی گھڑیاں پڑتی ہیں۔ پہاڑوں پر جانے میں حالات [illegible] مستفیض [illegible] کرتے تھے۔ ہر مہینے دیوہ شریف کی حاضری کا معمول تھا۔ اسی غرض سے گیا آیا ہوا تھا۔ ان دنوں شدید قسم کا دورہ آنے کے دن ہوا کرتا تھا چنانچہ اس روز بھی اسی دورہ میں مبتلا بعد عصر آرام کر رہے تھے اسی پھاٹک کے سامنے والے صحن میں پلنگ پڑا ہوا تھا۔ عینک بھی اتار رکھی تھی کہ پھاٹک کی طرف سے ایک مانوس سا سایہ میری طرف رینگتا نظر آیا۔ وہ بھی اس رفتار سے کہ بیچارے کی جان بچی ہے چال "قدم ناتواں" کے ہیں۔ طبیعت تو کڑھنے لگی کہ [illegible] میری تکلیف جان رہے ہیں اور مجھ [illegible] انہوں نے اس آتی جا کر بولا کیوں نہیں۔ بہرکیف اب یہ سایہ سرکتے سرکتے پاس آ گیا۔ بڑی غمزدہ آواز میں یاد نہیں کہ آپ نے عرض کیا السلام علیکم۔ [illegible] مولانا ہی [illegible] باہر [illegible] وقت لگے کا کام کر گئی۔ "[illegible]" [illegible] مولانا کا تھا۔ ہر وقت مولانا کے کوئی خیال دماغ میں [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] پہنچ گئے ہیں۔ اسٹیشن کے [illegible] والے اور پولیس کے سپاہی اتنا احسان کرتے تھے کہ "حسینی منزل" کا پتہ جانے والوں کو [illegible] پیدل [illegible] ساتھ کر کے [illegible] کرتے تھے۔

اس سے میں اس خوشی میں [illegible] کسی اور طرف خیال ہی نہ جا سکا۔ تسکین کے لئے مستفسر حال ہوا تو بابو عبدالحی کے رحلت کی خبر سنائی۔ انا للہ پڑھ کر رہ گیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ وقف نامہ تعمیل ہو گیا اور مولانا جہاں کے تہاں رہ گئے۔ اس لئے یہ [illegible] ملال ہے۔ [illegible] کہاں سے ہو سکتا تھا۔ بابو عبدالحی کے ساتھ مجھے اپنا جنازہ [illegible] نظر آ رہا تھا۔ [illegible] وقف نامہ کی رجسٹری کرانے کے [illegible] انتقال کیا۔ [illegible] حضرت کے ساتھ [illegible] وقف نامہ تعمیل نہ ہو سکا۔ اور "جناب والا" پارہ سہام کے مالک قرار پائے ہیں۔ ایسا شعر یاد آتا ہے جو مولانا ہی کی فرمائش کی غزل کا ہے۔

ہنگام بہار آمد و بلبل بفغاں شد   آشفتہ بیانے چو پریشاں خبرم داد

اس وقت تو اس کا بھی خیال نہ ہو سکا کہ اپنی کبھی پوری ہونے کی خوشیاں مناؤں یا مولانا کو مبارکباد ہی دوں۔ دوسرے روز بڑا کام کیا ورنہ ممکن تھا کہ پھر نئی صورت پیدا ہو جاتی کیونکہ اس طرح مولانا کو پریشان کر کے اظہار حقیقت کرانا تو مجھے بری طرح کھل رہا تھا۔

تفصیلی گفتگو کے بعد مولانا رضامند ہو گئے اور میں دیوہ شریف پہنچا۔ وہاں سب یہی کہہ رہے تھے کہ بابو عبدالحئی تو قبول نہ ہوں گی اس لئے وہ جبری لے دینے کی ہمت نہ پا سکے مگر میرا خیال آج بھی یہی ہے کہ جیسی مقبول نذر بابو صاحب کی ہوئی ویسی کسی کی بھی نہیں۔ حالات بہت سے ہوئے گو سب کے اخراجات وثائق وقف نامہ جات کی رو سے مقرر تھے۔ ان کے متعلق میں یہی کہوں گا کہ ہر واقف کا دل رکھ لیا گیا۔ اس کی اس کی منشا کے مطابق خدمت کی اجازت لی گئی بابو عبدالحئی کی نذر ان کی منشا کیا تھی ان کے عمر سے بھی بالا بالا پہنچائی گئی اور مشفق نام شاعر کو اس کی نظم کے صلے میں انعام ہوئی۔

الہ آباد میں مقدمہ بازیاں ہوتی رہیں، خطوط و تار گشت کرتے رہے۔ بارہ ہنگام مرتبہ کہیں سے یاران طریقت کچھ دن کیسے ہی رہے۔ مولانا بیچارے ان جھگڑوں کے تھے ہی نہیں۔ بہرحال جب ان کو پورا استقلال حاصل ہو گیا تو پھر وہ زیادہ تر الہ آباد میں قیام رکھنے لگے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ "چوں بدولت برسی مست نہ گردی مردے" اس امتحان میں بھی کچھ مشق مرزا ہو کر سوجوانوں کا ایک جوان ثابت ہوا۔ سوا اس کے کہ شیروانی ذرا بہتر کپڑے کی ہونے لگی اور وہ اور بہ دانی ذرا صاف ستھری رہنے لگی اور کوئی تبدیلی معلوم نہیں ظاہر نہ ہوئی۔ اصل ان کا جو تھا یہی ہے کہ یہ انقلاب کا میل کیا کچھ سکتا تھا۔ کبر و نخوت وغیرہ مولانا کے پاس جا بھی کبھی نہ گزری۔ یہی وضع قطع انہوں نے ذرا بھی نہیں بدلی۔ دیکھنے والا بہت سے بہت محسوس کرتا تو بس اسی قدر کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی فتوحات کچھ مستقل ہو رہی ہے۔ حالانکہ اب آپ کا شمار رئیسوں اور امیروں میں تھا۔ خلاصہ یہ کہ خادم ادب عالیہ جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ یہی ان کا سب سے بڑا کمال تھا۔

صاحب دولت ہونے سے پہلے وہ اپنی تصنیفات کی اشاعت تا بڑا کرتے رہے مگر الہ آباد کی زندگی میں اس کا سلسلہ رفتہ رفتہ موقوف ہو گیا حالانکہ مکمل دیوان، مراثی کا مجموعہ اور تکمیل شدہ لغت موجود تھا جس کی اشاعت کی بڑی ضرورت تھی۔ اللہ ہی جانے اب یہ قدردانوں کے قبضے میں ہے یا اقربا کے۔

مولانا کو بیعت حضرت امیر شریعت جناب حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحب سجادہ نشین پھلواری شریف ضلع پٹنہ سے تھی۔ مگر ان کو ہم وارثیوں سے ربط خاص تھا۔ برادر طریقت بیدم شاہ، مولانا اور ہم جہاں مل بیٹھتے تو راتیں آنکھوں میں کٹ جاتیں ؎

صد کشادہ داں دل کہ ہم حرمت رخ محبوبہ
خرم داماں دل کہ ہم ذوق خستہ کردہ

رہے نام اللہ کا۔

تذکرہ شعرائے متغزلین

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی۔ یہ تذکرہ غزل گو شعرا کے حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ ہے
یہ مختصر سا جائزہ پہلے نقوش کے غزل نمبر میں شامل تھا۔ اب اسے الگ صورت
میں بھی پیش کر دیا گیا ہے۔   قیمت   ۱/۸

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور

مانی جائسی

سید کلب مصطفیٰ

سید اشتیاق حسین[1] صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے ایک موقع پر بہت صحیح کہا کہ ہم سب بھائیوں میں ایک کامپلکس (Complex) ہے جو ہماری ادبی ترقی میں مانع رہا ہے۔ — یہ رائے ہم سب کے لئے کہاں تک صحیح ہے، اس گفتگو کا محل نہیں، لیکن اگر اس لفظ "کامپلکس" میں مرض کے مفہوم کے علاوہ معانی دو [illegible] کا مفہوم بھی شامل ہے تو یہ لفظ بھائی جان پر حرف بہ حرف درست بیٹھتی ہے — بے تکلف ہوں تو خفا ہو ہی جائیں اور خفا ہوں تو خوش ہو مشکل سے انہیں یاد آئے۔ — اپنا کلام سنانے کا شوق نہیں۔ [illegible] ہی ہو جائے [illegible] کی پروا نہ کریں اور شاعری کے عالم میں ہوں تو غیروں تک کے لئے پریشان رہیں۔ یہ کسی سے محبت کریں گے تو والہانہ انداز سے، اس کے ذرا سے [illegible] احسان رہیں گے اور نفرت کریں گے تو تمام عمر زبان پر نہ آنے دیں گے۔

غرض بھائی جان کی سیرت کا تجزیہ کچھ آسان کام نہیں اور شاید کوشش کرنے سے میں نے جو آتی باتیں نکالی ہیں، یہ وہ چار روز نہیں برسوں کے مطالعے کا نتیجہ ہے کم سے کم پچیس سال کا۔

یوں تو میں نے بھائی جان کو اپنے ہوش میں پہلے پہل غالباً ۱۹۱۱ء میں دیکھا تھا جب وہ بھوپال سے رائے بریلی کے ایک مشاعرے میں تشریف لائے تھے مگر اس وقت کی ان کی کوئی بات اب میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ سوا اس کے کہ ان کا سارا سامان خوش سلیقگی اور نفاست پسندی کا آئینہ دار تھا اور ان کا طرز کلام ان کی خوش اخلاقی پر دال۔ ان کے [illegible] شعر و شاعری کا جو چرچا رہتا تھا اس کی اہمیت کو ہم کیا سمجھتے، ہاں شعر سن کر خوش ضرور ہو بیٹھتے تھے۔ [illegible] ہمارا حصہ تو بس [illegible] کا جز تھا۔

تو ۱۹۱۳ء میں بھائی جان کو [illegible] کی سیرت [illegible] دس سال بعد [illegible] ۱۹۲۳ء سے [illegible] میں گورنمنٹ جوبلی کالج

---

[1] اب یہ لاہور ہائی کورٹ میں جج ہیں۔

میں ایف اے کے آخری سال کا متعلم تھا اور وہ کسی مقامی ادبی انجمن کے زیر اہتمام رفاہ عام کلب میں منعقد ہونے والے ایک بڑے مشاعرے کی شرکت کے لئے آگرے سے لکھنؤ آئے تھے۔

میرے ہم سبق اور معاصر کے رفقاء (مظفر حسن، شوکت علی) آئی سی ایس جو اب پاکستان میں کمشنر ہیں اور محمد عباس صاحب ایڈوکیٹ جو آج کل پاکستانی جناب کراچی میں وکالت کرتے ہیں، نے ان کو چائے پر بلایا تھا۔ بھائی جان کے ساتھ مولانا سید ظفر مہدی صاحب گہر جائسی بھی تھے اور حضرت جوش ملیح آبادی بھی۔ میں بیچارہ اس گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کی صحبت میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ لیکن جب ان کو پہنچانے گیا تو راستے کی گفتگو میں "عزیز دار" نکل گیا۔ اس پر کچھ ایسے انداز سے انہوں نے ٹوکا کہ وہ دن اور آج کا دن اس لفظ سے ڈر کی طرح دور ہی رہتا ہوں۔

اس ملاقات کے بعد جب بھائی جان نے مجھے بی۔ اے پڑھنے کے لئے آگرے بلا لیا اور یک لخت چار سال ان کے ساتھ رہنا ہوا تو ان کو بہت قریب سے بالکل قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پھر جب ۱۹۳۵ء میں انہی کے ایما سے میں رائے بریلی سے منتقل ہو کر لکھنؤ میں وکالت شروع کی تو کئی سال پھر رہنا ہوا۔ ساتھ نہ رہنے کے دوران میں بھی ان کی سیرت و کردار سے متاثر ہونے اور ان کا تجزیہ کرنے کے اکثر مواقع ملتے رہے۔ خصوصاً جب انہوں نے ۱۹۴۸ء میں پیشہ کی مجبوری سے مستعفی ہونے کے بعد لکھنؤ کا مستقل قیام اختیار کیا تو ملنے جلنے کے اور زیادہ اتفاقات ہونے لگے۔

غرض بھائی جان کو دیکھنے برتنے اور ان سے اور ان کے کام سے واقفیت کا جتنا موقع مجھے ملا اتنا ان کے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں میں مشکل ہی سے کسی اور کو ملا ہوگا۔ اور شاید اسی بناء پر میرے عزیز اور دوست سید آل حسن صاحب جو [illegible] پاکستان نے مجھ سے بھائی جان کے متعلق لکھنے کی فرمائش کی۔

"کئی برس ہوئے رسالہ "نقوش" لاہور نے ایک شخصیات نمبر نکالا تھا جو مولانا محمد حسین آزاد سے لے کر اب تک کے قریب قریب تمام اہل قلم کی سیرت اور نجی زندگی کے حالات پر مشتمل تھا۔ مگر اس وقت بہت سی شخصیتوں پر مضامین حاصل نہیں ہو سکے تھے لہٰذا اس کی تلافی کے لئے اب شخصیات نمبر کا حصہ دوم نکالا جا رہا ہے۔ مدیر نقوش کی یہ خاص کوشش رہی ہے کہ مضامین ایسے لوگوں کے شائع کئے جائیں جنہوں نے اپنے موضوع کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہو۔ جیسا کہ پہلے حصے میں چودھری محمد علی صاحب رودولوی پر ان کی صاحبزادی بیگم اخلاق حسین نے اور عظیم بیگ چغتائی پر ان کے بھائی اقبال عظیم نے لکھا تھا۔ اسی طرح اور شخصیتوں پر بھی ان کے مخصوص دوستوں یا عزیزوں کے مضامین شائع ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں حصہ دوم کے لئے مانی صاحب پر کوئی صاحب لکھ رہے ہیں یا نہیں۔ نقوش کا یہ نمبر ایک ادبی دستاویز اور ایک مستقل ریفرنس بک کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس میں مانی صاحب کا شمول انتہائی ضروری ہے۔ میری خواہش تھی کہ ان پر آپ کا مضمون نکلتا۔ آپ سے زیادہ قریب سے ہمدردی سے اور گہری نظر سے انہیں کس نے دیکھا ہوگا۔

مضمون میں مانی صاحب کی ادبی خدمات کے مفصل بیان یا ان پر تنقید و تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ ان کی سوانح حیات و کارنامے جن کے لئے مواد اکٹھا کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ ان چیزوں کا ضمنی تذکرہ تو بہر حال ضرور آنا چاہئے تاکہ ان کے ادبی کارنامے جو ابھی تک گوشۂ گمنامی میں ہیں سامنے آ جائیں۔ لیکن دراصل ضرورت ہے محض ان کے مزاج و عادات، رہن سہن کے طریقے وغیرہ وغیرہ کے ایک ایسے مرقع کی جسے دیکھ کر پڑھنے والے کے ذہن میں ان کی سیرت اور شخصیت کی سچی اور جیتی جاگتی تصویریں ابھر آئیں۔"

مگر یہاں تو دقت یہ ہے کہ اس کا تعارف شوق کے لئے وقت کہاں سے لاؤں اور وقت نکال بھی لوں تو وہ سکون کہیں کہ لازم ہو جو مانی کا دوستوں کے لئے لازمہ خاص ہے۔ خیر خیال خاطر احباب "گو پیش نظر رکھ کر جیسا بن پڑتا ہے لکھے دیتا ہوں۔ "آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے" کا اندیشہ تو یوں بھی رہتا۔ اور حق تلفی کے خطرے سے بچنے کی صورت یہ نکالی ہے کہ بھائی جان کی شاعری پر خود کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے ان کی شاعری کے متعلق دوسروں کی رائیں پیش کر دی جائیں وہ بھی محض چند اہل نظر کی رائیں۔

جناب پیارے لال شاکر میرٹھی اپنے رسالہ "العصر" کی چھبیسویں جلد کے شمارہ فروری ۱۹۱۷ء میں لکھتے ہیں۔

"مولوی سید طالب احمد صاحب مانی .... شاعری کا ذوق آپ میں فطری ہے۔ استعداد بھی اچھی ہے طبع سلیم ....

کلام و فواقِ ادا کے جذبات و حقیقی جمال و حزن و کشش نہایت بلند پایہ اور رنگ میں سب سے جُدا ہے۔ آپ کی فلسفیانہ دل آویز نظمیں اکثر رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اصغر کے اس نمبر میں بھی ایک نظم بعنوان "حسن و عشق" شائع ہوئی ہے۔ جس کی خوبیاں آپ کے حسنِ بیان، بلند پروازی، اثر، قوتِ استدلال، تسلسل اور ناصحانہ افکار کی بیّن اور روشن دلیلیں ہیں۔"

حامد حسن صاحب قادری نے غالباً ۱۹۳۴ء میں غالب کی تضمین کے سلسلے میں بعض دوسرے تضمین کرنے والے شعرا سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"سید قلب احمد صاحب مانی، جائسی شاعری میں نہایت صحیح مذاق اور رنگین ہوئی طبیعت رکھتے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا بہت کم اتفاق ہوا۔ ایک شاعر کی ایک دو باتوں، ایک آدھ تنقیدی فقرے، ایک پسندیدہ شعر سے اس کی طبیعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مانی صاحب کا آگرے کے اور شاعروں سے موازنہ کرنے کا موقع تھا۔ ان کا سا ذوقِ نظر بعض ان سے زیادہ عمر اور زیادہ مشق کے شاعروں میں بھی نہ پایا۔"

اور اب جناب نیاز فتحپوری نے ان کے مجموعۂ منظومات پر بسلسلۂ تبصرہ جو لکھا ہے اسے ملاحظہ فرمایئے (نگار بابت مارچ ۱۹۵۵ء)۔

ان کی شاعری کی عمر کسی طرح پچاس سال سے کم نہیں ہے اور اس نصف صدی کے دوران میں جو کچھ انہوں نے کہا ہے وہ اگر سب فراہم ہو سکتا تو کئی مجموعے اس وقت تک شائع ہو چکے ہوتے۔

ان مجموعوں کی ابتدا میں جناب مانی نے اپنے اور مختلف ادوارِ شاعری کے حالات بھی قلم بند کئے ہیں جس سے ان کے رجحانِ طبع اور ان کی غیر معمولی ذہانت اور فطری میلان پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

جناب مانی کی شاعری اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب دبستانِ لکھنؤ کی خارجی شاعری عروج پر تھی اور اسی ماحول میں نشو و نما پانے کی وجہ سے انہیں بھی قدرتاً یہی رنگ اختیار کرنا چاہیے تھا، لیکن کس قدر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ اس وقت بھی مانی کی شاعری کا انداز یہ تھا۔

کسی کی آنکھ سے افسانۂ غم پر جو نکلا تھا — ہزاروں مدعا کا کام ہے اس ایک آنسو میں
نہیں فرصت ذرا بھی کشمکش ہائے تمنا سے — مگر جی چاہتا ہے یوں کہ تم ہو میرے قابو میں

اجازت دیجیے رونے کی اب تو دل کی حالت پر — بہت دیکھا کیے آمادہ جو تھا ترکِ محبت پر
اُمید افزا کوئی صورت، نہ تسکیں کا کوئی پہلو — تعجب کیا وہ قائم ہی رہا عہدِ محبت پر

زمانہ پوچھتا ہے اب بجرمِ بیتابی سے کیا کہنا — یہی الزام عہدِ وصل میں تھا اور یہیں پر تھا

جناب مانی نے کسی کا انداز اختیار نہیں کیا اور شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ان کے ابتدائی کلام میں بھی کافی پختگی نظر آتی ہے اور ابتدا ہی سے انہوں نے بہت پھونک پھونک کر اس کوچے میں قدم رکھا۔ ان کی شاعری یکسر جذبات و تاثرات لیکن بڑے رکھ رکھاؤ کی شاعری ہے اور اسی لئے ان کی نظمیں بھی بڑے لطیف رنگِ تغزل میں رچی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مانی کی قدرتِ سخن گوئی کا اندازہ ان کی تضمینوں سے ہوتا ہے کہ غالب کی نہایت مشکل زمینوں میں بھی انہوں نے ایسے چست اور متوازن مصرعے لگائے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

مانی نہایت پرکشش و گرفت والے شاعر ہیں اور باوجود انتہائے غزل گوئی کے جذبات کی رو میں متانت و سنجیدگی کا ہاتھ سے نہیں دیتے، اسی لئے ان کے یہاں عمومیت یا سوقیت کا پتہ نہیں اور ان کا ستھرا ذوق ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے۔ حضرت مانی غالب کے پرستار رہے ہیں لیکن اس ذوقِ پرستاری میں بھی ان کا

نے اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اپنا رنگ سب سے علاحدہ پیدا کیا جس میں ان کا سہیم و شریک بہیں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ عرصہ ہوا میرے ان کے ایک مشترک دوست نے مانی کی شاعری کے متعلق میری رائے صرف ایک فقرے میں چاہی تھی اور میں نے بے اختیار کہہ دیا تھا کہ "مانی بڑا شریف شاعر ہے"۔ اور اگر شرافت کے وسیع مفہوم کو سامنے رکھا جائے جس میں شائستگی، اعتدال، رکھ رکھاؤ سبھی کچھ شامل ہے تو ہر وہ شخص جو کلامِ مانی کا مطالعہ کر چکا ہے اتفاقاً بھی اسے قائم کرے گا۔ ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

وہ تو ہے افسانہ سے منسلک ہی کہیں تم تو نہیں — حجابِ عالم یہ تبسم ہی تکلم تو نہیں
نظر بزم میں یہ صاحبِ محفل کیسا — نگراں ہو کے ہی پردے میں کہیں تم تو نہیں
جلوہ گر بھی وہ مگر ہوں دلگیراں حجابِ نظر — طالبِ دید سے چھپ کے کہیں گم تو نہیں
موت اک مژدۂ جاں بخش ہی ہوتی ہے — کون دامن کی ہوا دیتے نگاہ تم تو نہیں

ان تبصروں سے یہ گمان نہ کیا جائے کہ بھائی جان نے محض غزلیں، نظمیں اور مخمس ہی لکھے ہیں۔ انہوں نے تاریخیں بھی کہی ہیں، قصیدے بھی نظم کئے ہیں، سلام بھی لکھے ہیں اور نثر نگاری، افسانہ نویسی اور تنقید عالیہ کے بہترین نمونے بھی پیش فرمائے ہیں۔ مرثیے بھی ہیں نہیں، فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ بھائی جان کے قصیدے سب کے سب اہلِ بیتِ رسول کی شان میں ہیں ان میں سے ایک قصیدے کی ردیف "آج" ہے جس میں تشبیب سے لے کر آخر شعر تک ایک غیر منقطع تسلسل ہے اور اس میں جنگ کا واقعہ تاریخی بھی نظم فرمایا ہے لیکن کہیں "آج" کی ردیف بیکار نہیں، یہی نہیں بلکہ "آج" مضمون مصرع کا جزو لاینفک معلوم ہوتا ہے۔ اکثر ایسے مقامات ہیں کہ پہلا مصرع سن کر سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ دوسرے مصرع میں "آج" کی ردیف کیونکر کھپائی گئی ہوگی۔ خطیبِ اعظم شمس العلماء مولانا سید سبط حسن صاحب مغفور فرمایا کرتے تھے: "بھائی کلب احمد صاحب آپ نے تو "آج" قصیدہ "منقبت" ہی کہا ہے"۔ اس قصیدے کے چند شعر اور بھائی جان کی شاعری اور نثر نگاری کے چند نمونے بھی چند قصیدے ان کے غیر مطبوعہ کلام، تحریروں اور خطوں سے دیئے دیتا ہوں۔ ورنہ ان کی نظم و نثر کی جو ان کے دونوں شائع شدہ مجموعوں "نقوشِ مانی" اور "نگارشاتِ مانی" کے ذریعے سے نظم و نثر دونوں صورتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان مجموعوں کے دیباچے جامعیت اور اختصار کے معجزے ہیں۔ بھائی جان کی قوتِ نقد و نظر کا اندازہ رسالہ "تسنیم" سے کیا جا سکتا ہے جو آگرے سے ان کی ادارت میں نکلتا تھا اور جنوری ۱۹۳۱ء سے جون سنہ ۱۹۳۳ء تک نکل کر بعض حوادث کے باعث بند ہو گیا۔

اشاعت یافتہ مجموعوں کے دیباچوں سے بھائی جان کے سوانحِ زندگی بھی اجمالاً معلوم ہو سکتے ہیں اور ان کی فطرت اور ان کے کردار پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے۔ لیکن کون اس دقتِ نظر کے ساتھ پڑھتا ہے اور ان حالات سے کردار کا اندازہ لگانے کی زحمت کرتا ہے۔ اسی لحاظ سے ان کی زندگی کے حالات اور ان کی فطرت و کردار کی خصوصیات کو ذرا بسط سے لکھنے کی ضرورت ہوئی۔

مقام و سن ولادت بھائی جان سنہ ۱۸۷۹ء میں دیوریا ضلع گورکھپور (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ جہاں بابا مرحوم (مولوی سید کلب عباس صاحب) بہ سلسلہ ملازمتِ انگریزی قیام پذیر تھے۔

وطن اور نسب جائس جو صوبہ اودھ ضلع رائے بریلی کی ایک پرانی تاریخی اور مردم خیز بستی ہے اور جسے ان علماء و فقہاء کے روزگار کا مرکز و مسکن ہونے کے علاوہ ملک محمد جائسی کا وطن ہونے کی بنا پر ایک خاص امتیاز حاصل ہے اسی جائس سے بھائی جان کو وطنیت کی نسبت آبائی ہے۔ لیکن معلوم نہیں کیوں ان کو وطن "۔ اور بعض مخصوص شخصیتوں کو چھوڑ کر وطن والوں سے کوئی ربطِ خاص نہیں بلکہ گویا ایک طرح کی بیزاری سی ہے۔ اور وہاں کے قدردان اور ان کی شاعری و استادی کے مداح خاص وہاں بھی بکثرت ہیں۔ شاید اختلافِ طبع و مزاج کے باعث یہ صورتِ حال ہو۔ وطن کے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کئی جگہ شعر میں بھی فرمایا ہے:۔ مثلاً

میری غربت سے نہیں اہلِ وطن خوش کہ ابھی
بار کوئی نہیں آیا ہے مرے کاشانے پر

اعزا کی محبت کھینچتی ہی لاتی تھی جائس میں
بڑی مشکل سے مانی اب یہ معمول کہیں چھوٹا

مانی سے وطنی بھی ہے مصیبت غالب
پوچھ مانی سے مگر اس کی حقیقت غالب
فاقہ غربت ہو کہ سوزِ جگر ہے غیبت غالب
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں؟

لیکن باوصف اس وطن بیزاری کے بھائی جان نے اپنے کو ”جائسی“ لکھنا ترک نہیں کیا اور عام دستور کے لحاظ سے کسی عالی شہر سے نسبت نہیں دی حالانکہ لکھنوی لکھتے تو تعلقات قرابت کی بنا پر حق بجانب تھا اور لکھنؤ کو بھی ان کی نسبت سے فخر ہو سکتا تھا۔ نسب کے متعلق میں اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ یہ سلسلہ جد اعلیٰ سید نجم الدین علاء جائسی اور عابد شب زندہ دار مقدس بزرگ سے گزر کر حضرت امام علی نقی علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

حلیہ بھائی جان کا قد متوسط، مناسب اور خوش نما اعضا، سینہ کمر کے مقابلے میں بہت چوڑا، اکہرا جسم، بلند پیشانی، چوڑی کلائی، اونچی مگر ذرا چھوٹی ناک، گندمی سے کچھ کھلتا ہوا رنگ ہے۔ ابتدائے عمر میں سر کے بال بہت گھنے تھے۔ مگر سنہ ۱۹۱۴ء سے تو سر کے آگے کے حصے کو اس وبال سے پاک ہی دیکھا۔

تعلیم پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ ہوئی تھی، چند روز سولہ سترہ سال کے سن میں پڑھا لکھا سب چھوڑ چھاڑ دیا۔ دو تین برس اور پڑھنے کا نام ہی نام رہا، اس کے بعد فکر معاش میں لگ گئے۔

مطالعے سے جی چراتے بلکہ گھبراتے ہیں، انتہا یہ ہے کہ بہترین شعرا کے دیوان اور دلچسپ ترین افسانوں کا مطالعہ بھی ممکن نہیں۔ گو اب ستر برس کی عمر میں ترک تعلیم و بیزاری مطالعہ پر ندامت کرتے ہیں۔ ہر شخص اُردو مثل ”دہ اول دہ بے“ کو ہیں یہی پاس ہے اور جو ان مثل سے بھی آگے نہ پڑھ سکا ہو اس کی علمی استعداد جیسی ہوگی ظاہر ہے۔ مگر جب اُردو فارسی اور کسی حد تک عربی ادب کے سلسلے میں، وہ محض اپنی دقتِ نظر، خیالات، ذوقِ سلیم اور ذہانت کے زور سے نہایت مشکل اور اہم مراتب اور مسائل پر اظہارِ خیال کرتے ہیں، اور ایک علامہ، ہر نظر آتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ محض چند کتابوں کا پڑھ لینا تعلیم کا صحیح مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اصل شے ذوقِ نظر اور استعداد ذہنی ہے ــــــ ان کے نہ پڑھنے کے متعلق جناب نیاز فتحپوری نے ایک بار بڑے لطف سے کہا تھا کہ ”مانی صاحب بہت اچھا ہوا آپ نے نہ پڑھا ورنہ آپ کی غیر معمولی ذہانت آپ کو معلوم نہیں کہاں لے جاتی اور پھر ہم لوگوں کو ارزانی روشنی ہوتی۔“ سب صحیح مگر واقعہ یہ ہے کہ جو وسعتِ نظر کتب بینی سے پیدا ہوتی ہے اس کے فقدان نے بھائی جان کو بہت نقصان پہنچایا۔ ان کی شاعری محض ان کی جودتِ طبع اور جذبات و نفسیاتِ انسانی کے تجزیہ و تحلیل کی قوت پر معلق ہو کر رہ گئی۔

خطاطی اور نقاشی شاعری کے علاوہ بھائی جان کو خطاطی اور نقاشی کا بھی بہت شوق ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ یہ میرے تخلص کا اثر ہے۔ ان کا خط نسخ و نستعلیق بہت پاکیزہ اور پختہ ہے۔ قینچی سے کاغذ پر پھول کاٹنا اور پھر دروں میں مختصر عبارتوں کا نستعلیق میں انہی کے حروف قینچی سے کاٹے ہوئے اس قدر باقاعدہ اور ٹھیک سے درست ہوتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ مہاراجہ کمار محمد امیر حیدر خاں صاحب آف محمود آباد نے کیا خوب فرمایا ہے: ”مانی صاحب پر تو صناعی کا معجزہ ہے۔“

ازدواجی زندگی اور اولاد بھائی جان کی کوئی چودہ پندرہ برس کی عمر میں [illegible] ہو گیا تھا۔ حکیم حاذق سید حسن علی صاحب نصیر آبادی المعروف بہ حکیم چھنّے جو بابا مرحوم کے مخصوص احباب میں سے تھے، ”مشورہ دیا کہ ان کی شادی بہت جلد کر دی جائے ورنہ [illegible] بھی ہوں گے“۔ لہٰذا کم سنی ہی میں شادی ہو گئی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ان بھابی کا انتقال ہو گیا۔ تین لڑکے ان کی یادگار تھے جن میں سے دو بھائی کسب معاش کرتے ہوئے سنہ ۱۹۴۹ء اور سنہ ۱۹۵۳ء میں [illegible]

سیّد آفتاب احمد صاحب بریلی میں کامیاب وکیل، دوسرے سیّد رشید احمد خلیل ہائی اسکول والے بریلی کے ہیڈ ماسٹر تھے، تیسرے سیّد اقبال احمد زندہ ہیں۔ ان بھابی کی موت کے تقریباً سال بھر بعد بھائی جان نے دوسرا عقد خورجہ بھوپال میں کر لیا۔ پہلی بھابی سے بھائی جان کی کچھ بنی نہیں اور ستمبر ۱۹۱۹ء تک ان سے علیحدہ ہی رہے۔ پھر جب آخر ۱۹۱۹ء میں ملتفت ہوئے اور ان کو اپنے ساتھ بھوپال لے گئے تو وہ تاب لطف نہ لا سکیں اور بھائی جان کو کہنا پڑا ؎

جس کو ترا ستم نہ شاد کر سکا
وہی دل تاب لطف لا نہ سکا

ان کے انتقال پر جو تاریخ بھائی جان نے کہی وہ ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ قطعہ تاریخ معمولی نہیں ہے جس کو صنعت [illegible] کہا جا سکتا ہے آخری شعر کے دونوں مصرعوں میں بالترتیب سنہ عیسوی اور سنہ ہجری نکلتے ہیں جو یہ ہے۔

منظر کی لحد ہے یا کہ یہ قصرِ حیرت ہے
مرنے ہی گھر کا یہ بجھا ہوا نقشا ہے اے مانیؔ

۱۹۲۱ عیسوی
۱۳۳۹ ہجری

پہلی بیوی کے بچوں کی طرف سے ایک گونہ تغافل کے بعد دوسری بیوی کے بچوں سے کمال محبت و رافت کا برتاؤ کچھ تعجب نہیں جو اسی کمپلکس (complex) کا نتیجہ ہو۔ موجودہ بھابی[1] سے ان کے سات لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

احباب میرے علم میں تو بھائی جان کے لیے دو ہی دوست ہیں جن کا تعلق ادب اور شاعری سے ہے، نیاز فتح پوری، ضیاء عباس ہاشمی، [illegible] پاکستانی، لطیف الدین احمد اکبر آبادی، وحشت، اکبر آبادی، فانی بدایونی، مولانا سید ظفر مہدی، اثر جائسی، جوش ملیح آبادی، [illegible] حال پاکستانی، اختر [illegible]، [illegible] پاکستانی، الفت ذکریا، مائل بھوپالی، سید محمد حسین ٹونکی اور اب حضرت عزیز لکھنوی کے فرزند حیات لکھنوی سلمہٗ شاگردی[2] کے ساتھ ساتھ زمرۂ احباب میں داخل ہو گئے ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے بھائی جان از راہ شفقت فرمانے لگے: "مجھے بہت افسوس ہے کہ کلب مصطفیٰ میرے بھائی ہیں ورنہ میں ان کو دوست بنا کر خوش ہوتا کہ ان کا دوست نہ ہوا اور بھائی ہونے کا اتفاقی شرف مجھے حاصل ہے۔" لیکن جب میں ان کے دوستوں کی فہرست پر نظر ڈالتا ہوں تو بعض ایسے نام بھی ملتے ہیں جو مسلسل اس فہرست میں درج نہ رہ سکے۔ بہت غور کے بعد معلوم ہوا کہ اس تغیر میں بھائی جان کے تلون مزاج کو دخل نہیں ہے بلکہ اس کا سبب ان کا ایک انداز ہے۔ یعنی وہ خلوص و اعتماد اور وہ غیر معمولی جذبات ایثار و قربانی شامل ہوتے ہیں کہ ان کے لئے جگہ [illegible] کے بس کی بات نہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جب کوئی ان کو دوست بنانا چاہے تو انہیں کچھ دینا چاہئے۔

ندیم خویش می سازی مرا لیکن از آں ترسم
نیاری تاب آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

پھر یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ ایسا کرتے تو یہ شعر کیسے کہتے:۔

عمر بھر کھایا فریب دوستی سب سے یہ دل
رسم و راہ اہل عالم سے ہے بیگانہ جنوں

لیکن اس کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ وقت پر ان کے وہی دوست جن سے کچھ رنجش ہو گئی تھی ان کے زیادہ ہمدرد پائے گئے، مثلاً جناب نیاز فتح پوری کو جب معلوم ہوا کہ ان کا تعلق لیڈر سے منقطع ہو گیا ہے تو انہوں نے مجھے لکھا کہ "مانی صاحب سے کہہ دیجئے گا کہ میں ابھی زندہ ہوں"۔ دوسرے خط میں لکھا کہ "مانی صاحب کہاں ہیں، ان کے لئے کچھ سوچنا اور کرنا ہے"۔

مذہب بھائی جان مذہباً شیعہ تو ضرور ہیں، سخت قسم کے متوحد بھی ہیں، ان میں مذہب کا کٹر پن نہیں ہے، دو تین کے سوا باقی سب دوست ان کے حنفی

---

[1] لڑکوں کے نام اور عمریں اس وقت یہ ہیں۔ اقبال المظفر ۳۰ سال، حسن المظفر ۲۸ سال، فیاض احمد ۲۴ سال، مشتاق احمد ۲۱ سال، رضی احمد ۱۴ سال، ذکاء احمد ۱۰ سال، ودود فیض احمد ۷ سال۔

[2] شاگرد بنانے میں بھائی جان بڑی حد تک محتاط ہیں۔

اسباب ہیں۔ وہ نماز قرآن مجید پابندی سے پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھ لیتے ہیں مگر اب زمین پر بیٹھ کر سجدے کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ بھائی رمضان شریف کے متعلق ایک شخص نے کیا خوب بات کہی ہے کہ "ہر گیارہ دن کے بعد یہ تیس سال آ جاتے ہیں"۔ غرض بھائی جان متعصب اور متشدد نہیں ہیں مگر اپنے اعتقادات مذہبی کو چھپاتے بھی نہیں۔ چھپانا کیا معنی چھپانے کی خواہش بھی اگر کسی مصلحت سے کی جائے تو وہ اختیار گوارا نہیں کرتے۔ اگست ۱۹۲۳ء میں کہ بھاگلپور میں بھائی جان منشی سید حشمت علی صاحب میر منشی کے مہمان ہیں۔ تلاش ملازمت جاری ہے۔ منشی صاحب موصوف سنّی ہیں۔ دو چار روز کے بعد منشی صاحب نے کہا:

"بہتر ہوگا کہ آپ اپنے کو شیخ اور سنّی بتلایئے۔"

بھائی جان۔ "کیوں؟"

منشی صاحب۔ "نوکری ملنے میں آسانی ہوگی۔"

بھائی جان۔ "بس سید اور شیعہ اپنے کو بتاؤں تو کیا نوکری نہ دی جاوے گی؟"

منشی صاحب۔ "جی نہیں۔ اس کا تو وہم بھی نہیں۔ مگر سنّی بننے سے نوکری مل جانے کا زیادہ امکان ہے۔"

بھائی جان۔ "تو میں انشاء اللہ کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔ روٹیوں کے لئے جھوٹ بولنا میرے امکان سے باہر ہے۔"

پھر منشی حشمت علی صاحب نے لاکھ روکا مگر بھائی جان وہاں نہ ٹھہرے اور بھوپال چلے گئے۔ جہاں بہت جلد نوکری بھی مل گئی اور دس برس مسلسل اعلانِ شیعیت کے ساتھ انتہا درجے کے ہر دلعزیز بھی رہے۔

ملازمت اور معیشت بھائی جان نے کوئی بیس برس کے سن سے نوکری شروع کی یعنی ۱۹۰۸ء سے کم و بیش پچاس سال تک مختلف مقامات پر نوکری کرتے رہے اور اب حکومت ہند سے اعزازی وظیفہ ادبی پاتے ہیں۔ آگرے اور ٹہرے میں ان کا عہدہ دنیوی اعتبار سے اچھا خاصا معزز تھا۔ لیکن جب وہ ٹہرے کی ملازمت ترک کرنے کے بعد آٹے کی چکی لگا کر گردش تقدیر کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یا جب چکی بھی بیچ چکنے کے بعد پرچون کی دکان کھول کر بیٹھے اور دھیلے دمڑی کا سودا بیچنے لگے اس وقت بھی ان کی آن بان اور خود داری میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہی انداز جو اعزاز و احترام کی ملازمتوں میں تھا اس محنت مزدوری میں بھی قائم رہا۔

اصلاح نظم و نثر بھائی جان میں نظم و نثر دونوں کی اصلاح کا غیر معمولی سلیقہ ہے۔ میری تو ساری نثر نگاری انہی کی اصلاح کی رہین منت ہے۔ ان کی اصلاح کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ۱۹۰۵ء میں بھائی جان حسین آباد ہائی اسکول لکھنؤ کے درجہ انٹرنس میں تعلیم پاتے تھے۔ حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی مرحوم بھی شعر کہتے تھے اور بھائی جان بھی۔ آشفتہ صاحب اس زمانے میں بھائی جان ہی کو اپنا کلام دکھاتے تھے ان کے ترک لکھنؤ کے بعد عزیز صاحب لکھنوی کو دکھانے لگے۔ ایک روز آشفتہ صاحب نے غزل پیش کی اور جو اصلاح دی گئی وہ تو معلوم نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ ایک شعر کا پہلا مصرع آشفتہ صاحب سے درست نہ لگتا تھا بھائی جان نے مصرع قلم زد کر کے دوسرا مصرع لگا دیا اور اسے مطلع بنا دیا۔

کمالِ عشق ہے الفت کا شہرت عام ہو جانا (بھائی جان)
چھلک جاتا ہے جب لبریز ہو جاتا ہے پیمانہ (آشفتہ صاحب)

واضح رہے کہ اس وقت بھائی جان کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی۔

بھائی جان کے ایک بڑے ذی علم شاگرد نے چند سخن فہموں کے مجمع میں غزل سنائی۔ غزل پر اصلاح دی ہوئی تھی مگر سارے شعر بے عیب اور ایک سے ایک بہتر تھے۔ ایک شعر تھا۔

آ چکا تھا لب تک بڑھتا ہوا سیلاب فنا — غش وہ اچھا تھا کہ مرنے کو سفینہ ہو گیا

بھائی جان نے مکرر پڑھوایا۔ جیسے ہی وہ پہلا مصرع پڑھ چکے بھائی جان نے دہرایا۔ "آ چکا تھا لب تک بڑھتا ہوا سیلاب فنا" اس طرح بھی

غزل میں صرف ایک حرف سے اصلاح کر دی اور صاف شاگرد کے کلام کی عزت رکھ لی۔

حیات صاحب لکھنوی کا ایک شعر:-

اب وہ دنیا ہے مری خاموشیوں پر طعنہ زن ۔۔ اے کہ جس دنیا کی خاطر ہونٹ سی لینا پڑے

اصلاح:- اب وہی دنیا ہے خاموشی پہ میری طعنہ زن۔

عاشق صاحب لکھنوی کا ایک شعر:-

شوخیاں دے رہا ہے کیا کیا یہ عشق خانہ خراب دیکھو ۔۔ عوض میں تسکین دل کے اس نے دیا مجھے اضطراب دیکھو
اصلاح:- ستم ظریفیاں کر رہا ہے کیا کیا یہ عشق خانہ خراب دیکھو ۔۔ عوض میں تسکین دل کے مجھ کو عطا کیا اضطراب دیکھو

اصلاح نثر کی بھی ایک مثال دیکھئے:-

...... جناب فاطمہ زہراؑ نے انسانیت کی آبیاری جس مشقت اور عرق ریزی سے کی ہے وہ ارباب نظر کے دلوں پر نقش ہے۔ جناب فضہؑ نے فرض شناسی کی کیسی تفصیل پیش کی ہے اسے کتب سیر میں ملاحظہ فرمایئے۔

اصلاح:- جناب فاطمہ زہراؑ نے انسانیت کی آبیاری جس مشقت اور عرق ریزی سے کی ہے وہ ارباب نظر کے دلوں پر نقش ہے۔ وہ تو خیر رسول کی بیٹی تھیں۔ جناب فضہؑ نے فرض شناسی...... الخ

قوت حافظہ بھائی جان نے بلا کا حافظہ پایا ہے۔ جو کچھ پڑھا اس کا نقش فی الحجر ہو گیا۔ ان کو صرف انیس کے مرثیوں اور میر حسن اور غالب کی مثنویوں کے اشعار حفظ ہیں بلکہ غالب مرحوم کے بعض خطوط اور تقریروں کے صفحے کے صفحے بس ایک مرتبہ سن کر ازبر ہو گئے ہیں۔ اسی قوت حافظہ کا نتیجہ ہے جس سے ایک بار مل چکے ہیں اس کو بھولتے نہیں اور اگر کوئی ان کو بھول جاتا ہے تو برہم ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس قدر قوی الحافظہ ہونے کے باوجود بیوی کی یاد نہیں رکھتے بیوی کی تاکید کو۔

جرأت و استقلال بعض لوگوں نے ان کو سترہ برس کے سن میں جوتی کی ٹو اور دھوپ میں پیدل اور سائیکل پر منزلیں طے کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ لیکن جس لکھنؤ میں نہ صرف ان کے بعض عزیزوں کو لوگ دنیوی حیثیت سے بھی نہایت عزت اور امتیاز کی نظر سے دیکھتے ہوں بلکہ وہ خود بھی کمال عزت و امتیاز کی منزل پر فائز ہوں وہیں کچی چھاؤنی یا یحییٰ گنج کی دوکان پر بیٹھنا اور پھر اسی عالم میں اپنے شاعرانہ اور ادبی تمکین و وقار کے ساتھ ادبی محفلوں میں شرکت کی تیاری جرأت و استقلال اور ہمت مردانہ کا کام ہے۔ جب ایسے نازک اور مشکل موقعوں پر بھی ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی ہو تو ان کے ایسے اشعار کیوں کر دل نشین اور اثر انداز نہ ہوں:-

راہی بہت سے تھے رہ الفت کیلئے ۔۔ کانٹوں پہ جا تو مرا برہنہ پا ہی جب گیا

کھیلتا ہوں ابھی طوفاں سے ورنہ ۔۔ جس جگہ ناؤ ڈبو دوں وہیں ساحل ہو جائے

آنت پہ اصلاح پا ہی آتی ہے تیرا احمد صمد ۔۔ اک تکلوں کی طرح، ایک کمان کی طرح

نازک مزاجی بھائی جان کی نازک مزاجیاں، واسطے معاذ اللہ! کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کب اور کس بات پر روٹھ جائیں گے۔ بعض اوقات تو ان کی اختلاف مزاجی سے ہم کشمکش میں پڑ جاتے ہیں۔ ایک بار میں اور بھائی جان ریاست محمود آباد کے سید بادشاہ حسین صاحب کے یہاں مدعو ہوئے صبح کو گئے

اگر یہاں بھی وہی مقیم تھے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ شروع ہوا۔ بھائی جان سے استدعا کی گئی۔ انہوں نے شعر سنائے اور ہم نے اپنی بساط بھر داد دی پھر بھائی جان جی چاہا انہوں نے وہی آج قصیدہ شروع کیا۔ ابھی اس مطلع قصیدے کے چند ہی شعر سنائے تھے کہ سید محمد صاحب حسب عادت تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہو گئے۔ بس پڑھنا موقوف کر دیا اور کہنے لگے "اب آپ لوگ سننا نہیں چاہتے"۔ بے چارے سید محمد نے کہا "ہم لوگ بڑے شوق سے سن رہے ہیں"۔ "تو کہا "نہیں آپ لوگ سننا نہیں چاہتے"۔ بڑی مشکل ہوئی۔ خیر سے ساعت کچھ اچھی تھی جلد ہی مان ہی گئے۔

ابھی حال ہی کا قصہ ہے میں مراد آباد میں تھا بھائی جان بھی۔ میں نے سید ہادی حسن صاحب کمشنر کے یہاں ایک نشست کی بنا ڈالی۔ بھائی جان خوش خوش گئے مگر معلوم نہیں ایسے آزردہ ہوئے کہ ایک شعر سنانے پر بھی تیار نہ تھے۔ جتنا اصرار زیادہ ہوتا تھا انکار بڑھتا جاتا تھا۔ یاد رہے سید ہادی حسن صاحب کمشنر نے جو بھائی جان کے مزاج سے خوب واقف اور ان کے احباب قدیم سے ہیں، بھائی جان سے کچھ ایسی باتیں کیں اور ایسی فضا پیدا کر دی کہ راضی ہو گئے۔ اور پھر خوب سنایا۔

ایسے کتنے ہی واقعات ان کی زندگی میں گزرے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نہ وہ زیادہ ترقی کر سکے اور نہ عام طور پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا سکے۔ چنانچہ ان کے قدر شناسوں کا شمار صرف انہی لوگوں تک محدود ہے جو ان کی سیرت و کردار سے بخوبی متعارف ہیں۔ مگر صحیح طور پر متعارف ہونا سہل تو نہیں کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک۔

اس میں یہ نہ سمجھئے کہ وہ محض نازک مزاج ہیں اور اشفاق و کرم یا دوسروں کی نازک مزاجی کے احترام کا کوئی جذبہ ان میں ہے ہی نہیں —— ہے اور بھرپور ہے۔

حیات صاحب اپنے وطن لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ بھائی جان کا قیام بھی آج کل وہیں ہے۔ دو بجے کے قریب بھائی جان سے چند منٹ میں واپسی کا وعدہ کر کے میرے مکان کے پاس ہی اپنے کسی عزیز سے ملنے چلے جاتے ہیں اور گھنٹوں تک نہیں آتے، جا کے سو رہتے ہیں۔

بھائی جان شدت انتظار سے بے تاب ہو کر ان کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ مکان نہیں ملتا واپس آ جاتے ہیں۔ میں نے باہر سے آتے ہوئے دیکھا تو پوچھا "کہاں تشریف لے گئے تھے"۔ بولے "حیات صاحب کو ڈھونڈنے گیا تھا"۔ میں نے کہا "میں جا کے لاتا ہوں"۔ کہنے لگے "میں بھی چلتا ہوں"۔ اب چار بجے کا وقت تھا اور صبح کو ظہیر حسین صاحب جعفری واقعی منزلیات بھائی جان کو مع حیات صاحب چائے کی دعوت دے گئے تھے۔ ہر چند میں نے بھائی جان کے آنے کا سرسری وعدہ ان سے نہیں کیا تھا پھر بھی خیال تھا کہ میں انہیں لے جا سکوں گا مگر اس وقت تو رنگ ہی بے رنگ تھا اور ان کو چائے پر چلنے کے لئے آمادہ کرنا "کالے دیو" کا حکم رکھتا تھا۔ جعفری صاحب کا وعدہ دو کا تھا۔ وقت ہو چکا تھا اس لئے مزاج کے پرسکون ہونے کا انتظار بھی کچھ نامناسب ہی تھا لہٰذا حیات صاحب کی طرف جاتے ہوئے راہ میں جی کڑا کر کے میں نے عرض کیا کہ "جعفری صاحب کے یہاں چلنا ہے"۔ بس قطعیت کے لہجے میں فرمایا "میں تو نہ جاؤں گا"۔ میں نے کہا "میں نے تو وعدہ ——" بس اتنا ہی کہا تھا کہ فرمایا "تو چلوں گا"۔ اب حیات صاحب سے ملے تو ان پر برس پڑے "خدا کی قسم آپ کی ان باتوں پر خودکشی کر لینے کو جی چاہتا ہے، ارے صاحب آپ کو مجھ سے جلد واپسی کا غلط وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جو تیور کڑے دیکھے تو ٹل گیا۔

کچھ وقفے کے بعد جعفری صاحب کے یہاں چلا گیا تو راستے میں فرمانے لگے "بھلا مزاج مار کے چائے پینے کا کیا تک ہے"۔ پھر جب ہم اطہر صاحب کے یہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ فلاں صاحب پہلے سے آئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی کہنے لگے "میں ایک مصرع نہ سناؤں گا"۔ مگر جب کمرے میں داخل ہوئے تو ان صاحب سے بڑے خلوص سے پیش آئے اور شعر بھی خوب خوب سنائے، بڑا لطف رہا۔ ساری بدمزگی جاتی رہی۔

حاضر جوابی اور بذلہ سنجی لیکن بھائی جان کی اس نازک مزاجی اور دل کی لگی کو ان کی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور سوجھ بوجھ اکثر خوش گوار بھی بنا دیتی ہے۔ ادھر لکھنؤ میں مسلسل قیام پذیر رہنے کے بعد کچھ دنوں سے بھائی جان کا قیام کراچی میں زیادہ رہنے لگا ہے۔ یہاں تشریف لاتے تو حکیم صاحب عالم کے یہاں ٹھہرا

سید ابن حسن صاحب نوبہروی - جناب شدید - مولانا سید ابرار حسین صاحب پاروی اور اکثر اہل علم کا مجمع تھا۔ کسی نے پوچھا نیاز صاحب آپ کہاں تشریف رکھتے ہیں، نیاز ہی حاصل نہیں ہوتا۔" اس پر حکیم صاحب عالم صاحب نے جو جملہ جوش صاحب جان [illegible] فرمایا۔ بھائی اب یہ دلی والے ہو گئے ہیں، فقرہ اچھا تھا۔ مگر بھائی جان نے برجستہ فرمایا "اور آپ دہلی کے ہو گئے" نیاز فتحپوری نے یہ لطیفہ سنا تو فرمایا "پھر بھی چپ نہیں رہتے" [illegible] مہاراج کمار محمد امیر حیدر خاں صاحب محمود آباد کے چھوٹے فرزند پیدا ہوئے تھے، بڑی خوشی کا موقع تھا۔ بھائی جان بھی جلسے سے تہنیت کیلئے گئے۔ گرمی کا موسم ہے جو دھوپ کی شدت و حدت کم نہیں ہوئی۔ راجہ صاحب محمود آباد اور مہاراج کمار سے واپسی کی اجازت لینے چلے، [illegible] نہیں سکے کہا، اس وقت تشریف نہ لے جائیے۔ دھوپ تیز ہے زحمت ہوگی۔ بھائی جان نے بے تکلف کہا "مقتضی اگر زحمت" کا اطلاق لغت میں ہے تو وہ "رحمت" ہے ایک نقطے کے ہٹانے کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ماشاء اللہ - بات کہاں سے کہاں پہنچی۔

ایک بار دہلی میں جوش صاحب نے شبستان مرغوشی میں کھانے پر مدعو کیا۔ دس بارہ آدمی تھے۔ اتفاق سے صہبا پرست حضرات ایک صف میں اور پرہیزگار مقابل والی صف میں بیٹھے تھے، اتنے میں اجمل خاں صاحب (پرائیویٹ سکریٹری مولانا ابوالکلام آزاد وزیر تعلیمات حکومت ہند) تشریف لائے۔ جوش صاحب بولے "آپ ہمارے ساتھ سوانے میں نہ بیٹھئے" "مقدسات" کی صف میں جائیے۔ بھائی جان نے یہ اضافہ کرتے ہوئے فرمایا "ہاں خاں صاحب آپ "مقدرات" کی طرف نہ جائیے ادھر آئیے۔

صرف زیر و زبر کے جواب دے دینا حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور ظرافت کا معجزہ ہے۔

اخلاق وعادات بھائی جان دوسروں کے حفظ مراتب کا خاص خیال رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اپنے ساتھ نامناسب برتاؤ انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ ان کے دل میں درد محبت ہے مگر اس کا اظہار نہیں کر پاتے جس کی وجہ سے ان کی محبت کی گہرائیوں کا اندازہ لگانا دشوار ہے اور یہی سبب ہے کہ غیروں کا کیا ذکر اکثر عزیز بھی ان سے بدظن رہتے ہیں۔ دراصل ان کے مزاج میں خود کی نامعقولیت اور فقدان انسانیت کے خلاف نفرت کے جذبات کی اتنی شدت ہے کہ سرسری نظر ڈالنے والے کو ان پر کبر و نخوت کا دھوکا ہو جاتا ہے۔

بابا مرحوم کا بے حد احترام کرتے تھے اور جب تک سامنے رہتے ان کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ مگر جب علحدہ ہوتے تو خیریت کا خط بھی نہ لکھتے تھے۔ بابا مرحوم فرمایا کرتے تھے "کلب احمد کا تو یہی حال ہے کہ از نظر دور از دل دور۔"

خودداری، اعلیٰ ظرفی، بلند نظری، بے لاگ، کم آمیزی، محدود دائرے میں فیاضانہ سلوک ان کا مخصوص شعار ہے۔ انگریز کو زیادہ سچا ایماندار اور منصف مزاج جانتے ہیں بشرطیکہ اس کا کوئی ذاتی مقصد درمیان میں نہ ہو۔ شک اور وہم کسی میں پاتے تو اسے تلقین کرتے ہیں اور خود اوہام کو پاس نہیں آنے دیتے۔ لیکن کوئی چلتے وقت چھینک دے یا بلی راستہ کاٹ دے تو کچھ تامل کرتے ہیں اور کبھی کبھی یہ کہہ دیتے ہیں "کیا کہوں، یہ تو ہم جیسے گھٹی میں پڑ گیا ہے ورنہ دراصل محض بیہودہ اور بے بنیاد ہے۔" ابھی کچھ دنوں پہلے تک گھوڑے کی سواری خوب کرتے تھے۔ لباس اور جوتوں کا بھی بہت شوق تھا، اچھی حتی الامکان [illegible] رکھتے تھے۔ سواری میں اول درجہ کا رکھنا پسند کرتے تھے۔ اب یہ سب کالعدم ہے۔ کبھی ذکر آتا ہے تو فرماتے ہیں "ان مصروفیتوں سے آزاد ہو گیا ہوں۔"

صبر بہت کم رکھتے ہیں۔ خدائی قدرت کاملہ کے دل سے قائل ہیں اس سے مستقبل کی طرف سے کبھی مایوس اور پریشان نہیں ہوتے۔ البتہ ادھر جب سے آلام و افکار کا اشتداد ہے یہ بھی فرمایا کرتے تھے "خدا پر بھروسہ رکھنے کی طاقت دل میں کم رہ گئی ہے، ورنہ میں ان پریشانیوں کو کہاں خاطر میں لاتا تھا۔"

خود ستائی اور ستائش پسندی کی کمزوری تو عام طور پر کم و بیش سبھی میں پائی جاتی ہے، بھائی جان میں بھی ہے مگر اس کا مظاہرہ ان کے یہاں بہت خفیف اور بچکانہ انداز میں ہوتا ہے۔ اور ایسے موقعوں پر بھی جو کم ہی پیش آتے ہیں وہ انکساری کو ترجیح دیتے ہیں۔

معقول پسندی بھائی جان جہاں ضد اور بے جا بات کو گوارا نہیں کر سکتے وہاں وہ معقول بات کو فوراً قبول بھی کر لیتے ہیں۔ ان کی ایک نظم "بچہ پیدا"؟ اس میں ایک

۱؎ یعنی [illegible] کر دیجئے۔

مصرعہ یوں "لگی ہو" تھا کسی نے مصرعہ سن کر مصرعہ دہرا دیا۔ یہ اصلاح چھیپے کی مناسبت سے بے حد موزوں تھی۔ انہوں نے فوراً اس اصلاح کو قبول کر لیا۔

ابتدا میں، یا اصل ابتدا میں تو وہ مشاعروں میں پچھلی چھپے شرکت کرتے تھے لیکن تیس چالیس برس سے انہوں نے مشاعروں میں جانا گویا ترک ہی کر دیا تھا۔ اب پھر جانے لگے ہیں مگر بہت کم کسی کے ساتھ البتہ کالج اور یونیورسٹی کے مشاعروں میں جانا ہمیشہ اُردو کی ترقی اور خدمت سمجھتے تھے اور کبھی یا کسی خاص موقع کے جانے سے انکار نہیں کیا۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک انہیں دنیائے علم و ادب سے بالکل بے گانگی رہی مشاعروں میں تو جاتے ہی نہ تھے، رسالوں اور اخباروں کو بھی اشاعت کے لئے کلام بھیجنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ان کی شہرت کو نقصان پہنچا۔ اب تو نئی پود کے لوگ بھی انہیں اور ان کے ادبی رتبے کو جانتے گئے ہیں جو ابھی پانچ چھ سال پہلے تک گویا ان سے ناآشنا ہی تھے۔ لیکن باوجود اس کے ان کا کلام ابھی اس شہرت اور مقبولیت کو نہیں پہنچا جس کا وہ مستحق ہے۔ اس کے اسباب بھی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ اس وقت کے شاعر نہیں ہیں، سو پچاس برس بعد انہیں آنا چاہیے تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کا کلام عوام کے سمجھنے کا نہیں۔

بہر حال جب تک خودداری، اعلیٰ ظرفی، انصاف گری، حق شناسی، بلند نظری اور مستقل مزاجی جیسی اخلاقی خصوصیتیں اہم سمجھی جاتی رہیں گی، بھائی جان کا کلام باقی و درس آموز انسانیت رہے گا۔ اس کے علاوہ جوں جوں علو فکر، حسن بیان، چستی بندش، راستی تخیل اور فلسفۂ جذبات کے محاسن اور نزاکتوں کے سمجھنے والے بڑھتے جائیں گے ان کا کلام مقبول ہوتا جائے گا۔ بھائی جان، انیس اور غالب کے بہت دلدادہ ہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ اُردو شعرائے ماسبق میں سے سب سے زیادہ انہی دونوں کے دل دادہ ہیں۔ یہ چاہتے تو انہی دونوں کے متعلق ایسی کتاب لکھ ڈالتے جو دنیائے علم و ادب میں ایک شاہکار اور ایک اضافۂ گراں بہا ہوتا لیکن یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ماحصل ہیں صرف چند غزلیں، چند قصیدے، چند نظمیں، چند خمس، چند قطعات اور چند افسانے اور وہ بھی اکثر غیر مطبوعہ۔

بقول میرے ایک عزیز دوست اختر حمید خاں، آئی۔ سی۔ ایس، پرنسپل کومیلا کالج، (مشرقی پاکستان)، یہ حقیقت ایک ماتم خیز سانحہ ہے کہ بھائی جان نے وہ نہ کیا جس کے لئے قدرت نے انہیں خلق کیا تھا اور جس کے وہ اہل تھے۔ خیر اب تو "کار از دست رفتہ و تیر از کمان جستہ" پر تاسف بے فائدہ اور مہمل ہی سا ہے۔ جو فیض دنیائے شعر و ادب کو ان سے پہنچ سکا اسی کو غنیمت سمجھئے اور بس۔

خلفائے محمدؐ

ابوالنصر شام کا سب سے بڑا مؤرخ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے
جتنی بھی سوانحی کتابیں لکھیں ان کا ساری دنیا میں کوئی ثانی نہیں ہے
خلفائے محمدؐ میں اس نے ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ پر دنیا جہان
کی کتابیں پڑھ کر ایک ایسی کتاب لکھ دی ہے جو ان خلفاء پر سب سے
معیاری اور مستند کتاب ہے۔

ترجمہ بے حد سلیس   قیمت -/۱۰

ادارۂ فروغ اُردو ——— لاہور

میرزا ادیب

جمیل ملک

کہنے والے کہتے ہیں کہ میرزا ادیب کی کوئی شخصیت ہی نہیں، وہ تو بس ایک شخص ہے۔ ہزاروں لاکھوں اشخاص کی طرح ایک شخص، پھر اسے وہ خواہ مخواہ کیوں سمجھا جائے۔ غالب نے بھی تو کہا تھا کہ ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ سچ ہے کہ آدمی سے انسان تک سیکڑوں مراحل، ہزاروں منازل طے کرنا پڑتی ہیں اور جب تک پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں، سانس نہ پھول جائے منزل قریب نہیں آتی۔ انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ابھر کر سامنے نہیں آتیں، اس کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہو پاتی۔ لیکن آخر یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ دنیا میں جو لاکھوں آدمی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں بس "آدمی" ہیں، انسان نہیں، "اشخاص" ہیں، شخصیتیں نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ تاریخ نے اب تک چند شخصیات کے سر پر ہی عظمت کا تاج رکھا ہے۔ لیکن وہ "آدمی" وہ "اشخاص" کہاں گئے جنہوں نے یہ انسان بنائے، یہ شخصیات تراشیں۔ آخر انہوں نے بھی تو زندگی کے تپتے صحراؤں کی خاک چھانی تھی، گلزاروں میں پھول کھلائے تھے۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار سے محبت کی تھی، ان کے لئے جان دی تھی۔ اگر آج تک مورخ نے ان پر نظر نہیں ڈالی، ان کی عظمت کو صحیح معنوں میں مدون نہ کیا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان کو ناقص "آدمی" سمجھ کر نظرانداز کر دیا جائے اور اپنی تنگ نظری کا ثبوت یہ پیش کیا جائے کہ "صاحب فلاں صاحب کی تو کوئی شخصیت ہی نہیں وہ تو بس ایک شخص ہے۔"

جب انسان کا بچپن ہوتا ہے، جب وہ بالغ النظر نہیں ہوتا تو اسے تیز رنگوں سے، بھڑکیلی چیزوں سے بڑی محبت ہوتی ہے، ہمارے ہاں اردو ادب تو اب منزلیں طے کرتا چلا جا رہا ہے۔ اور میں اس کے مستقبل سے مایوس ہونا کفر کے مترادف سمجھتا ہوں۔ لیکن ادھر جب سے دنیا نے پے بہ پے کروٹیں بدلنا شروع کی ہیں۔ اردو ادب میں بھی یکے بعد دیگرے اتنے متضاد اور باہم متصادم رجحانات در آئے ہیں کہ ہمارے اکثر ادیبوں کی شخصیات لخت لخت ہو کر رہ گئی ہیں۔ ترقی پسند، جدید، جدید تر، نئی پود، نئی نسل کی کتنی ہی ایسی چلیں کہ ذہن تک یہ طے نہیں ہو پاتا کہ یہ سب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں یا ان کے رستے جدا جدا ہیں، یہ ملتے کہاں کہاں ہیں اور جدا کہاں کہاں ہوتے ہیں، کچھ سنجیدہ

اور حسین ادبی شخصیات نے ادبی اقدار متعین کرنے اور ماحول ہموار کرنے کی پُر خلوص کوششیں کی ہیں۔ انھوں نے اعلیٰ اقدارِ ادب کا ساتھ بھی دیا اور اپنے طور پر اس دشت کی صحرا نوردی بھی کی مگر صاحب! ایسی سنجیدہ اور حسین شخصیات کو شخصیات کون مانتا۔ یہاں تو وہی تیز چمکتے ہوئے رنگوں پر مر مٹنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ مگر آپ جانتے ہی ہیں زرق برق اور بھڑک ساز کی پرستش ہزار پر کشش شعلہ سہی مگر یہ آگ کتنی سرعت سے جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمارے ادب میں بیسیوں مل جائیں گی۔ آپ ہی بتائیے ہمارے ہاں اختر شیرانی، منٹو، مجاز وغیرہ پر کیا بیتی؟ یہ درست ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دئے اور ان کو شخصیات ماننے میں بھی مجھے کوئی تامل نہیں لیکن کیا یہ شعلے اتنی جلدی بجھ جانے والے تھے؟ اور یہ جو ہمارے افقِ ادب پر آئے دن بیسیوں ستارے پل بھر چمک کر ڈوب جاتے ہیں اس میں بھی صرف سات آسمانوں کی گردش کا ہی قصور ہے؟ اس معاشرے میں فنکاروں کی بے اعتدالیاں سب بجا لیکن انہیں 'معصوم محض' سمجھ کر ان کا ہر گناہ معاف کر دینے کی جو رسم ہمارے ہاں چل نکلی ہے۔ اور ان کی خامیوں کو خوبیاں سمجھ کر ان کی شخصیتوں کی بیش از وقت بیجا پرستش کی جو وبا پھیل رہی ہے اس نے نہ صرف اچھے اچھے ذہین ادیبوں کو ہی وقت سے پہلے ہم سے چھین لیا ہے بلکہ کئی شریف، نجیب، سنجیدہ و حسین شخصیتیں بھی اس سارے عمل میں بنتے بنتے بگڑ گئی ہیں، بے توجہی کا شکار ہو گئی ہیں یا نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ انہی شخصیتوں میں سے ایک میرزا ادیب کی شخصیت بھی ہے۔

اُڑے اُڑے بالوں، بجھی بجھی آنکھوں، بھنچے بھنچے ہونٹوں، لمبی ناک، لمبوترے چہرے اور گندمی رنگ والا، دراز قد میرزا ادیب۔ جب چلتا ہے تو ہمیشہ کسی مونس و غمخوار کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے۔ انگلیوں میں انگلیاں پھنسائے بڑے پیارے انداز میں ——— آپ سے باتیں کرے گا ——— اس کے ہاتھوں کا مس ——— اس کی لمبی لمبی ترشی تراشی حساس انگلیوں کی گھٹتی بڑھتی دھڑکن ——— ایک چھلکتی لپکتی چھلکتی بڑھتی زندگی ——— بیچ بیچ میں ہاتھوں کا گرم گرم دباؤ ——— ہتھیلی کی تپش ——— نسوں کی اُٹھتی بیٹھتی سانس ——— آپ پر اس کی کم روئی کھلتی ——— صاحب! پر کشش شخصیت کے راز دھیرے دھیرے ——— ہولے ہولے منکشف کرتی جائے گی ——— یہ دھڑکتے ہاتھ۔ یہ گرم مس ——— یہ دھیمی دھیمی ——— میٹھی میٹھی آنچ آپ کو اس کے خلوص اور سادگی کا یقین دلائے گی۔ آپ کو اس کے دل کی نامعلوم پنہائیوں میں ننھے ننھے آتش فشاں پیدا ہوتے محسوس ہوں گے۔ بپھرتے ہوئے طوفان نظر آئیں گے ——— ان طوفانوں و سیلابوں کے کنارے ——— آپ کو یہی صحرا نورد ——— صداقت و انقلاب کا داعی ——— کم رو، کم گو، بے نیاز اور پُر متانت کھڑا نظر آئے گا ——— جس کی گھن گرج والی آواز آج بیس سال سے ادب کے افق پر گونج رہی ہے ——— جوں جوں زمانہ بیت رہا ہے ——— یہ آواز پتھروں و چٹانوں کے سینے چیر رہی ہے۔ اس کی صدائے بازگشت ہمارے نئے ادب میں سنائی دے رہی ہے۔

Taine نے کسی شخصیت کو سمجھنے کے لئے تین چیزوں کو بنیادی قرار دیا ہے۔ Race 'نسل' Milieu فضا یا ماحول اور Momentum یعنی دور یا عصر۔ یورپ کے فنکاروں کی طرح ہمارے ہاں کے نقادوں کو یہ سعادت تو ابھی برسوں حاصل نہیں ہوگی کہ وہ ایک مدت تک فنکاروں کے قریب رہ کر ان کے ساتھ شب و روز گزار کر ان کی زندگی اور فن کا مطالعہ کریں اور نہ مجھے ہی اس بات کا دعویٰ ہے کہ میں نے میرزا ادیب کے ساتھ رہ کر برسوں ریاضت کی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ گزشتہ آٹھ سالوں میں مجھے ان کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے کے بہتیرے مواقع ملے ہیں۔ ان ہی سے میں نے اس فنکار کو سمجھنے اور پرکھنے کی اپنی سی کوشش ضرور کی ہے۔ مگر مجھے یہ میرزا ادیب ایک پہیلی ہے وہ اپنے راز لوگوں پر افشا ہی نہیں کرتا۔ تو کیا اس پر کیا لکھے۔ اور یوں میرزا ادیب کی ذہنی تصویر مرتب کرنا اتنا آسان بھی نہیں تھا لیکن میں نے جن تین عناصر کا ذکر کیا ہے اگر کسی ادبی شخصیت کو ان سے قطعاً مفر نہیں تو یہ عناصر اس کی خوشیوں اور غموں، اس کے قہقہوں اور آنسوؤں، اس کی چال ڈھال اور نشست و برخاست، اس کے فن اور زندگی میں ضرور جھلکیں گے اور یہیں سے کسی فنکار کی زندگی صفحۂ راز سے نکل کر منصۂ شہود پر آنے لگے گی۔

سینٹ بیوے نے کہا تھا، "اگر تم درختوں کی جڑوں کو پہچان لو تو اُن کے پھل پھول کو خود بخود پہچان جاؤ گے"۔ خواہ وہ غالب کی سہ رنگ طبیعت ہو یا میر کی داغ داغ شخصیت ہو یا میرزا ادیب کی لٹی پٹی، کھوئی کھوئی، محروم و تشنہ زندگی ان سب سے اُن کی داستانِ حیات مرتب کی جا سکتی ہے اُن کے قدموں کے نشان تلاش کئے جا سکتے ہیں۔

انسان کی زندگی میں بچپن سے بڑھاپے تک کتنے ہی سنگِ میل آتے ہیں اور فنکار تو بعض اوقات اپنی قدرتِ بیان اور دسترسِ فن سے ازل اور ابد کی حدیں کھینچ دیتا ہے۔ میرزا ادیب نے شاید ابھی یہ عظیم فریضہ سر انجام نہیں دیا لیکن ہر سچے ادیب اور سچے فنکار کی طرح وہ بھی اس کوشش کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ زمانے سے ہمارے کسی ادیب کو شکایت نہیں مگر یہ بات تو اُس کے مخالف بھی مانیں گے کہ اُس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی ستم ہوا ہے۔ زمانہ سب کو اپنی جھولی میں چھپاتا رہتا ہے۔ لیکن ہر غالب کو جھولی نہیں ملتی۔ وہ اُس کے تیروں سے اپنے لئے ڈھال بنا رہے ہوتے ہر ماں، باپ آفات سے محفوظ رکھے۔ جب بچہ جنم لیتا ہے تو ماں باپ اُسی دن سے اُس کے روشن مستقبل کے لئے سنہرے خواب دیکھنے لگتے ہیں لیکن جب اُن کی توقعات بر نہیں آتیں تو اپنا سر پیٹ لیتے ہیں۔ سینٹ بیوے کے قول کو سامنے رکھ کر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات والی ضرب المثل پر غور کریں تو ہر چند ہمیں میرزا ادیب ہونہار بروا ہی نظر آئے گا اور اس کے پات بھی چکنے ہی ملیں گے لیکن اگر ہم اُن کی جڑوں کو بنظرِ عمیق دیکھیں گے تو ہم سے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہے گی کہ اس درخت کی جڑوں کو بچپن ہی کے گدلے اور زہریلے پانی نے سیراب کیا ہے جو سالہا سال سے ہمارے ہاں نچلے اور متوسط طبقوں کا مقدر ہو چکا ہے۔ اگرچہ باپ کے غلیظ شعلوں میں اُس کا احساس جل اور وجود نکھر جھلستا رہا ہے لیکن ماں کی ممتا اور شفقت اُس کی جڑوں میں سمٹے ہوئے زہریلے پانی کو میٹھے امرت میں تبدیل کرتی رہی۔ وہ کہتا ہے جب میں ننھا منا تھا تو ایک دفعہ راستے سے بھٹک گیا۔ میں اس وقت جب میری معصوم آنکھوں میں ستاروں سے آنسو چمک رہے تھے ایک مہرو درویش مجھے اپنے ساتھ ہی بٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ وہاں اُس کی بیوی نے، جو ایک عورت بھی تھی اور ایک ماں بھی مجھے اپنے بچے کی طرح چھاتی سے لگا لیا، مجھے اچھی اچھی مٹھائیاں کھلائیں، سونے کے لئے مجھے نرم بچھونا دیا۔ ماں کی ممتا کی یہ کرن اُسے اپنی ماں کے بعد دوسری بار ایک اور عورت میں نظر آئی انسانیت پرستی کی یہ کرن جو وہ اپنے بچپن میں دیکھ پایا تھا آج تک اُس کے قلب و جگر کو روشن کر رہی ہے۔ پھر جب اس کی مسیں بھیگنے لگیں تو اُس کی شاعرانہ طبیعت نے انگڑائی لی، ابتدائے جوانی میں سبھی شاعر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرزا ادیب نے بھی شاعر بننے کی ناکام سی کوشش کی۔ اختر شیرانی، نیاز فتحپوری، سجاد حیدر یلدرم جیسے رومان پسندوں کا یہ متوالا خود شاعر تو نہ بن سکا۔ ہاں اُس نے اپنی شاعرانہ طبیعت کی تسکین کے لئے ایک ذہنی محبوبہ ضرور بنا لیا ایک کو ناز کا پیکر ضرور تراش لیا۔ عورت کی شفقت اور ماں کی ممتا تو اُسے ورثے میں ملی تھی۔ اب اُس نے عورت کو ذہنی محبوبہ کے روپ میں بھی دیکھنا شروع کر دیا۔ اقبال کو آہِ سحرگاہی سے بہت پیار تھا۔ شب بیداری سے بڑا لگاؤ تھا۔ سوز و سازِ رومی اور پیچ و تابِ رازی کی ساری حکایتیں اقبال کے ہاں اسی سحرگاہی اور شب بیداری کا نتیجہ ہیں۔ مگر میرزا ادیب کو تو بچپن سے بادِ صبا کے نرم جھونکوں سے عشق ہے۔ نسیمِ صبح کا پہلا جھونکا جب اس کے کانوں میں آ کر سرگوشی کرتا ہے اور جو شخص ہزاروں میلوں کا جوا اپنی ساتھیوں میں گھرا رہ گیا ہو اُس کی تحریروں میں رومان کیوں نہیں ہو گا، دلکشی کیوں نہیں ہو گی، زندگی کیوں نہیں ہو گی، صحرا نورد کے رومان میرزا ادیب نے اپنی عمروں کے اجالے میں جامع مسجد کی مروری سیڑھیوں پر بیٹھ کر لکھے۔ اونچی سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ صبح کا نظارہ بھیگے ہوئے چہروں سے کرتا رہا۔ بادِ صبح گاہی کا امرت رس پی پی کر بھیگتے ہوئے جنوں کو عشق سے بچاتا رہا، خون میں تحلیل کرتا رہا، فن کا جزو بناتا رہا۔ اس کی یہی شفقت، یہی عورت پرستی، صحرا نورد کے خطوط اور صحرا نورد کے رومان میں عشق اور زندگی بن کر چمک اٹھی ہے۔ پھول اور کلیاں بن کر مہک اٹھی۔ گلشن گلشن بن کر کھل گئی۔ زندگی و حرارت بن کر رومان میں حلول کر گئی۔ اور اردو ادب کی رومانی تحریک سے بڑھ کر حقیقت نگاری کے میدان میں بھی ہمیشہ کے لئے میرزا ادیب کو زندہ کر گئی ہے۔

پھر اس نے دیکھا کہ ملک میں چاروں طرف انقلاب آفریں آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ وہ چونک کر ان آوازوں کے تعاقب میں چل کھڑا ہوا —— اُسے معلوم ہوا کہ یہ آوازیں سودیشی تحریک، اور تحریک عدم تعاون کی بازگشت ہیں۔ جا بجا جلسے ہو رہے ہیں، سڑکوں پر جلوس نکل رہے —— کہیں ایک عورت جلوس کی رہنمائی کرتے کرتے آگے بڑھ جاتی ہے۔ گوروں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتی ہے، گولیوں کی باڑھ کو اپنی سیسہ پلائی ہوئی چھاتی پر روک لیتی ہے۔ میرزا ادیب اُسے دیکھتا ہے، دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ایک بار پھر عورت مثالی انداز میں اس کی نظروں کے سامنے آتی ہے اور اس کی محبوب ہیروئن بن کر اس کے افسانوں میں بس جاتی ہے۔ کہیں ایک مرد ایک باغی پولیس کی تیز رفتار گاڑیوں کے آگے لیٹ جاتا ہے۔ گاڑیاں اس کو کچل کر آگے بڑھ سکتی ہیں مگر نہیں بڑھ سکتیں۔ میرزا ادیب کی نظریں اس نوجوان پر پڑتی ہیں۔ وہ دل ہی دل میں اسے اپنی ہیروئن کے پہلو میں لا کھڑا کرتا ہے، جو اس کے افسانوں کا عظیم و شکوہ مند ہیرو بننے والا ہے۔ یوں جب وہ صحرا صحرا زندگی کی تلاش کرتے کرتے کسی سرسبز و شاداب پھولوں پھلوں والے جنگل میں جا نکلتا ہے۔ اس کے جسم پر زخم اور ہم عصر قالب کی دنیا اس کے تیروں سے اس کے لئے کوئی ڈھال نہیں بناتے بلکہ اس کے تیروں سے زخمی کر ڈالتے ہیں۔ اُسے جنگل جنگل بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے یہاں پر اس کے ساتھی اس کے ہیرو اور ہیروئن اس کی رہبری کرتے اس کے گلے مرتے دل و دماغ کو کبھی پیار سے تھپکاتے اور کبھی شوخی سے جھنجھوڑتے ہیں۔ اس کی شخصیت کے پہلوؤں کی بکھری ہوئی کڑیاں جڑ جڑ کر اس کا آرٹ بناتی ہیں اور یہ مالا میرزا ادیب کے گلے میں ڈال دیتے ہیں۔

میرزا ادیب نسلی اثرات قبول کرتا ہی الجھا اور گوشہ نشینی کی چکی میں پستا رہا کہ روح عصر کا یہ احساس انسان کا وجود بنا ہوا تھا۔ تعلیم اور جوانی الٹا رہا اور ثقافت انگریزی اور ادبی دور سے بھی واصل ہونے کا کبھی انتظار نہ رہا بیٹھا ہوا پھر سرگرم سفر ہو جاتا ہے۔ قناعت کے بے برگ و بار جنگل کے کسی درخت کے نیچے نہیں بیٹھ جاتا۔ وہ مقصد جاناں میں اپنی تمام زندگی کسی ایک ہی جگہ بیٹھ کر نہیں گزار دیتا —— وہ شکست خوردگی ہو یا بیسیوں ناکامیوں کے بعد بھی ہمت اور ہار نہیں دیتا۔ وہ زندگی کی موجوں کے تھپیڑے کھانے کے باوجود اپنی پوری طاقت پوری توانائی سے جدوجہد کرتا ہے۔ بچپن ہی میں اس نے اس پر جنتی کی اُسے آنکھیں دکھائیں تو وہ ماں کی ممتا سے مرعوب ہوتے ہوئے ذہنی طور پر مرضی عظمت سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ ماں کا پسندیدہ بنا۔ جب کبھی بننے کے خواب تشنۂ تکمیل رہے تو وہ فلم، ریڈیو اور ادب لطیف کی ادارت کے فرائض سر انجام دے دے کر اپنے اور اپنے بیوی بچوں کے پیٹ کے لئے ایندھن جمع کرتا رہا۔ جب وہ ادبی گروہ بندیوں اور ملکی سیاست میں حصہ نہ لے سکا تو ادب و ثقافت کے ہنگاموں سے بے نیاز ہو کر گوشہ نشین ہو گیا اور اگر کہیں دکھائی دیتا بھی ہے تو تنہا اتنا بھی کہ ان ادیبوں میں آیا تو زیادہ تر نوجوان اور نو وارد ادیبوں کے ساتھ —— کبھی چنتا الجھا الجھا اور کبھی سراسیمہ اور حواس باختہ —— مگر جب میرزا ادیب کو نئے ادیبوں کے ساتھ دیکھتا ہوں تو مجھے اس کی شرافت و متانت اپنے تکلفی اور سیدھے سادے پن، جذبۂ ایثار و محبت پر رشک آتا ہے۔ گو میں نے میرزا ادیب کا بچپن نہیں دیکھا۔ ادیبوں میں میرزا ادیب کے مقابلے میں بچہ ہی ہوں لیکن اُسے نوعمر اور نئے رجحانات اپنانے والے فنکاروں کے ساتھ دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے کہ میرزا ادیب ایک بار اپنے بچپن میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ اصل میں وہ اپنے تجربے کا ادبی پختہ دماغ کو بچپن کی شیرینی اور مسکراہٹوں سے ہم آمیز کر کے ہر شخص سے معصوم و سادہ و سرسبز و شاداب رکھنا چاہتا ہے۔ میرزا ادیب کو اپنے بچپن سے اس قدر محبت تو نہیں کہ وہ دنیا کو ٹک ٹک دیکھتا رہے لیکن اس کی جوانی کے گلی کوچوں میں بھی اس قدر شیرینی اور حلاوت، اتنا آرام اور سکون ملتا ہے کہ جی چاہتا ہے اس درخت کے سائے میں بیٹھ کر دم لے لیا جائے اور یوں لگتا ہے جیسے میرزا ادیب صحرا نورد کے کسی دوراہی کا کارواں ہو، معصوم سیدھی سیدھی بات۔ دیکھئے میرزا ادیب کی اپنی خواہشات کس قدر معصوم ہیں۔ اس کی اپنی شخصیت کی طرح کس قدر سیدھی سادی اور بے ضرر ہیں۔ رہنے کے لئے ایک چھوٹا سا مکان، پہننے کے لئے اچھے کپڑے، کھانے کے لئے ستھری اور صحت مند غذا —— ادب میں تو خیر کسے حساب تک جتنی بڑی شخصیت کا لگایا ہوا ہم سب پر کشش ہے مگر تم ہر ہے کا ابھی تک اس کی یہ چند ابتدائی بظاہر بڑی معمولی خواہشات بھی پوری نہیں ہوئیں —— میں نے کہا تھا کہ گرم جاڑے والے جب تک زیادہ تر فرق ابھر کر اور چھلکے رنگوں کی سی قدر ہوتی ہے، جگہ جگہ رنگوں کو چکھنے کی فرصت ہی کیسے ہے۔ اس وادی میں قدم رکھ کر تو وہ سرور کی شخصیت کی خیر لاتے اسے خود خاک ہونا پڑتا ہے اور جب شخصیتوں کا مطالعہ اتنا آسان ہو گیا ہو جتنا ہمارے ہاں ہے اور جہاں فقرہ بازی کا آرٹ سیکھ لینے سے داد و داد کے

پچھلے نقادوں کی جھولیوں میں آگریں تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ صحرا نوردی کرتے پھریں، جنگل جنگل بھٹکیں اور اپنا لہو محنت میں پانی کردیں یا کسی کے "آنسو وستارے" دیکھیں یا کسی کے درد کے "پیوند لگے کمبل" پر نظر دوڑائیں۔ ادیبوں نے بھی اگر میرزا ادیب کی شخصیت پر یہ چند فقرے درست کہے ہیں تو کون سا ادب پر یا میرزا ادیب پر بڑا احسان کر دیا ہے۔ ہاں اگر ہمارے لکھنے والوں کو اس غلط رجحان کا احساس ہو سکے جس کی طرف میں نے ان سطور میں اشارے کئے ہیں تو میں یہی سمجھوں گا کہ چاہے میرزا ادیب کی شخصیت کی تصویر پوری طرح میں نہ کھینچ سکا۔ ایک غلط رجحان کی طرف تو لوگ متوجہ ہو گئے اگر ایسا ہو گیا تو پھر اس کی تلافی بھی کبھی نہ کبھی ہو ہی جائے گی۔

میں نے میرزا ادیب کی زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے جگہ جگہ اس کی شرافت و متانت اس کی رومان پسندی اس کے طبعی رنگین اور معصومانہ حرکات و سکنات کا ذکر کیا ہے لیکن میری اس گفتگو سے کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میرزا ادیب محض بچہ ہی ہے۔ میں آخر میں آپ سے صاف صاف کہہ دوں کہ وہ نرا بچہ ہی نہیں وہ اپنے ارادوں میں جوانوں کی طرح اولوالعزم اور بوڑھوں کی طرح مشّاق اور تجربہ کار ہے۔ اس کی شخصیت رنگینی، جوانی اور بچپن کا حسین امتزاج ہے اس کی رنگینی اور جوانی گھل مل کر اس طرح بچپن کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوگا۔ یوں اس کی رنگینی اور جوانی پر بچپن و تجربہ کی پرچھائیاں ضرور ہیں مگر وہ ادھر کچھ عرصے سے ایک اور معصومانہ ادا دکھا رہا ہے ایک اور کھیل رچا رہا ہے۔ اور جب وہ کوئی ڈرامہ کھیل چکتا ہے تو روح اور دل و دماغ سے بچپن کا غلاف بڑی بے دردی سے اتار پھینکتا ہے۔ وہ پھر بچہ بن جاتا ہے ذہین اور سمجھدار بچہ۔ اگرچہ اس کی شخصیت کی سطح پر کوئی ڈرامہ کوئی تصادم کوئی کشمکش اپنے بھرپور تسلسل کے ساتھ نظر نہیں آتی لیکن اس کی زندگی میں بعض ڈرامائی واقعات ضرور ملتے ہیں۔ جن کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں اور جنہوں نے اس کی شخصیت کی تہوں میں بے پناہ ہلچل، تصادم، کشمکش اور ہنگامہ برپا کر رکھا ہے۔ ابھی تو یہیں وہ اپنی شخصیت کا ایک آدھ سین، ایک ایکٹ دکھا کر ہی چھپ جاتا ہے لیکن ایک روز دنیا کے سٹیج پر وہ اپنی شخصیت کا بھرپور اور مکمل ڈرامہ بھی ضرور پیش کرے گا۔ اور تب اس کی شخصیت پورے طور پر اجاگر ہو جائے گی۔

"تاملاتِ نیاز"

اس مجموعے میں نیاز فتحپوری کے ایسے ایسے نادر مضامین ہیں جو ان کے پرچے "نگار" میں چھپ کر دنیائے ادب میں تہلکہ برپا کر چکے ہیں۔ نیاز نے ہمیشہ کھوکھلے رسم و رواج اور نظریات کی وہ وہ دھجیاں بکھیری ہیں کہ جھوٹے تقدس مآب اور رسم و رواج کے سہارے زندہ رہنے والے بلبلا اٹھے۔

قیمت ۲/۸

ادارۂ فروغِ اردو۔ لاہور

صالحہ عابد حسین

بیگم انیس قدوائی

"زندگی کیا ہے عناصر کا ظہور ترتیب" — لیکن کبھی کبھی یہ ترتیب اتنے حسین اور متضاد عناصر کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے قدرت کے ہاتھ چوم لیں۔

لیجیے ہماری [illegible] قسم کا نام "مصداق" کا نام سنجیدہ قسم کی کہانیاں لکھنا۔ افسانوی نام صالحہ [illegible] کے مترجم کی اہلیہ محترمہ۔ مگر جب پیاری پیاری بولی بولتی ہوئی اتر آتی ہیں تو گفتگو کی محفلوں کا لطف آ جاتا ہے اور دل خوش ہو جاتا ہے۔

اجزائے حیات کا تجزیہ کرنے بیٹھیں تو عناصر اربعہ کے علاوہ صندل، مرمر، ریشم اور ہارسنگھار کے ساتھ نمک اور شگفتہ آنکھوں میں ملا جلا نظر آتا ہے — وہی ہلکا [illegible] سنہری رنگ [illegible] — ہارسنگھار کی خوشبو اور [illegible] — نمک کی ملاحت اور شگفتہ [illegible] کی خوشبو بھری ملاقات — میری خوش قسمتی تھی کہ صالحہ سے ملنے کے بعد ان سے متعارف ہوئی اور میں نے طے کر لیا کہ "مصداق" کہنا "ان کے بھائی جان (خواجہ غلام السیدین) کو مبارک ہے۔ میں تو صالحہ کہوں گی۔

[illegible] میں پہلی بار جامعہ ملیہ کے جانب گئی [illegible] ایک بار ان پر پہلی نظر گئی۔ نام سے پہلے ہی واقف تھی۔ عابد صاحب سے بھی غائبانہ تعارف تھا۔ ان کی کئی کہانیاں اور ایک ناول بھی پڑھ چکی تھی اور نہ جانے کیوں سوچ رکھا تھا کہ کوئی بڑی متین قسم کی بھاری بھرکم عورت ہوں گی — لیکن پاس جا کر دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ بے اختیار دل سے دعا نکلی۔ [illegible] اجزائے حیات کا گلدستہ [illegible] رکھے اور عابد صاحب کا گھر آباد رہے — دبلی پتلی کمزور سی نازک سی عورت — جو اپنی عمر سے چندرہ برس چھوٹی دکھائی دیتی تھیں۔ [illegible] اتنی حیرت تھی کہ گفتگو کم تھیں۔ ہنستی زیادہ تھیں اور [illegible] کبھی کچھ نہیں ورنہ اللہ جانے کیا ہوتا۔

منہ چھپانے کی عادت میری بھی تھی۔ وہ مجھ سے زیادہ دور آشنا تھیں۔ [illegible] اور حیرت [illegible] ایک وہ سب سے [illegible] اپنے آپ کو بچائے رکھیں۔ لیکن آخر ایک دن پہچان ہی لیا [illegible] ملاقات ہوئی ہے۔ تو اب تک ہوتی ہی چلی جا رہی ہے [illegible]

ہے کہ یہ سلسلۂ حیات جاری رہے گا ——— دیکھنے میں ملاقات میں تو وہ ایک تہذیب کا مجسمہ بن کر بیٹھی ہیں کہ ڈر لگتا ہے کہیں کوئی لفظ خلافِ محاورہ یا خلافِ تہذیب منہ سے نہ نکل جائے جو ان پر گھڑوں پانی پڑ جائے لیکن پتہ نہیں کیوں میرے گنوار پن کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتی ہیں۔ شاید یہی ہو ان کی تہذیب ہو جتنی پیاری زبان لکھتی ہیں اتنی ہی بولتی بھی ہیں۔ مشرقی طرز معاشرت اور مغربی شرافت میں کیا خوبصورت توازن انہوں نے پیدا رکھا ہے گھر میں قدم رکھتے ہی انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ کہاں بیٹھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ڈرائنگ روم میں صوفے پر۔ یا صحن میں پڑی ہوئی ان کی گھری ہوئی چارپائی پر۔ یا ان کے کتابوں رسالوں سے بھرے ہوئے کمرے میں مسند تکیہ سے لگ کر ——— نئے ادب کی عریاں پسندی اور بے اعتدالی پر اتنے لطیف انداز میں تبصرہ کرتی ہیں کہ کسی بچے کو برا کہے بغیر سمجھنے والا نفس مضمون کا بیچ اور ان کی پختگی کا قائل ہو جاتا ہے ——— یہی ہاں نئے ادب کی عریاں پسندی اور بے اعتدالی پر اتنے لطیف انداز میں تبصرہ کرتی ہیں کہ کسی بچے کو برا کہے بغیر سمجھنے والا نفس مضمون کی تہی اور ان کی پختگی کا قائل ہو جاتا ہے ——— بہت چھپے چھپے کچھ لکھتی رہتی ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے چھینٹے کرتی رہتی ہیں۔ اور ہولے ہولے زندگی میں مٹھاس گھولتی رہتی ہیں۔

کہتے ہیں "غالب کے انداز بیان اور اردو کے متعلق کہ ایک عالم" پانی پتی انصاریوں کے علاوہ کا رہنے والا وارث کہہ گیا تھا۔" اور اس ورثہ میں صالحہ کے گھرانے کو بھی حصہ ملا تھا۔ بلکہ ان کے نانا (مولانا حالی) خود اس ورثہ میں شریک تھے اور والد باپ کی بیٹی صالحہ کی والدہ محترمہ نے بھرپور ترکہ۔ شرافت۔ اخلاق حمیدہ اور علم و اخلاق کی صورت میں وصول کیا تھا۔ شوہر و عیال سے خواجہ غلام الثقلین کی چھوٹی بہو کی ہوئی ورثہ میں ملا۔ اس کے علاوہ جو ان کو سسرال سے علاقی ورثہ میں حاصل ہو گئی۔ صالحہ نے اتنا قیمتی اثاثہ سمیٹ کر اپنے بھائی جان (سیدین صاحب) کے گھر ہیں، انہیں مثال دیں اور جو کچھ وہ باہر سے لاتے تھے اس سے بھی تحفہ وصول کیا۔

انکشاف ابھی تھی۔ ماں باپ کی سرپرستی تو دو ہی سال حاصل رہی لیکن ان کی آغوش نے وہ سب ریت رسمیں سکھا دیں، جو گھرانوں سے چلی آ رہی تھیں۔ مشرق کی آئیڈیل خاتون نے۔ مذہب۔ تاریخ اور ادب کے سارے سبق اپنی گود میں پڑھا دئے۔ کبھی اسکول کی شکل تو قسمت سے ہی دن دیکھنا نصیب ہوئی۔ ۲۰ سال کی عمر تھی جب جامعہ ملیہ کا عجیب و غریب ماحول میسر ہوا۔ ساتھ ہی بیماریوں کا دور شروع ہو گیا۔ اور کئی برس تک ان کی شخصیت کے جادو اور بیماریوں میں ڈاکٹروں اور دواؤں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ احسان ماننے سے انکار کر دیں۔ اسی دوران اکلوتی بچی کی پیدائش اور اس کی موت نے اور بھی زندگی کو کمزور کر دیا۔ بیماریوں نے ان کے جذبۂ محبت و ہمدردی کو بیدار کیا۔ ڈاکٹروں نے صبر و ضبط کا مادہ پیدا کیا۔ اور دواؤں نے کڑوے گھونٹ پینے کا گر سکھایا۔ اور جامعہ ملیہ نے وہ عملی ماحول عطا کیا جس کی انہیں ضرورت تھی۔ عابد صاحب کی رفاقت نے زندگی پر ایک گہرا نقش ڈالا۔ اور شاید انہی دنوں ان کو صاحبِ قلم بنایا اور جب سے لکھنے کی عادت پڑ گئی۔ اب عادت کے طور پر وہ مختلف سلسلے مذہب کے راستے پر گامزن کر دیا ہے۔ اور جہاں حق ہو وہاں باطل کا گزر کہاں۔

اللہ میاں نے صالحہ کو حسین نظر عطا کیا ہے۔ اس لئے انہیں ہر چیز خوبصورت نظر آتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اپنی افسانوی دنیا میں حسن کا کوئی اونچا معیار اب تک انہوں نے قائم نہیں کیا ہے۔ یا شاید وہ "ہمہ اوست" کی قائل ہیں۔

اپنی ہر کہانی کو المیہ سے بچا کر رکھتی ہیں۔ اور دوسروں کی ایسی کاوشوں کو سر آنکھوں پر جگہ دیتی ہیں۔ بشرطیکہ اس میں کوئی فنی نقص نہ ہو۔

ان سے برسوں ملتے رہئے ان کا خوش مذاق۔ سادگی و پرکاری۔ تہذیب آپ کو مسحور کرتی رہے گی۔ لیکن سالوں کی ملاقات کے بعد بھی ان کو سمجھنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

"نظر آتا ہے آنکھوں سے کسی کا آستاں مجھ کو"

"صالحہ" ورق ورق مصلحت آمیزی کی قائل ہیں۔ وہ رومانی نفرت انگیزی کی اس سے بہت سی کر کے کل کائنات کہتی ہیں۔ اقبال کی طرح سے "خلوت نشیں فردہ" ہی کہہ یوسف سے بھی انہیں کوئی دلچسپی نہیں معلوم ہوتی۔ ان کی عقل؟ جو قصہ اشاعت سے بے نیاز ہو انہیں دیتی ہے۔ بلکہ یہ اندازہ کرتی رہتی ہے کہ اس دنیا میں کتنی بیماریاں ہیں۔ اور کتنا تضاد اس میں پوشیدہ ہے۔ اور دوسروں کی برائی کو بیان کر کے دکھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہاتھ میں اثر بھی ہو۔

نزاعی مسائل میں ان کی عافیت پسندی کوئی ایسا کونہ سنبھال لیتی ہے۔ جہاں بیٹھ کر وہ سب کو دیکھ سکیں۔ سب کی سن سکیں اور دونوں فریق سے بے نیاز ہو کر علیحدہ رہ سکیں۔

اسی عافیت پسندی نے بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنا گوشۂ عافیت ایسا الگ بنا رکھا ہے جس میں جب وہ نہ چاہیں کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ بعض اوقات جب انھیں کسی کی شادی کا جوڑا تیار کرتے، رات بیٹھے یا جلسوں اور تقریبوں کا اہتمام کرتے دیکھو تو بالکل سیدھی سادی اور قصباتی بیوی نظر آتی ہیں۔ کوئی پھیرا اس میں ہے تو کوئی پھیرا بجا جو۔ کوئی بھوکا پیاسا ہے۔ تو کوئی [illegible] کسی کی [illegible] ہے تو کہیں کا یہ عالم ہے۔ کہ کسی کو بیماری کا روگ لگ گیا۔ تو کسی کا بیٹا امتحان میں [illegible] کسی کے لئے دو چار آنسو بہا دئے اور پھر سب کو خدا حافظ کر کے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر لیا۔

باہر کا شور و شغب انھیں پسند نہیں ہے۔ لیکن گھر کے اندر کا ماحول [illegible] ایسا کچھ بھی نہیں لگتا۔ اس لئے اپنے کمرے میں انھوں نے مضبوط چٹخنی لگا رکھی ہے اور الماریوں میں کتابیں بھر رکھی ہیں تاکہ خلوت انجمن بنی رہے۔ اور "فراغت" و "کتاب" سے لطف حاصل ہو سکیں۔ حالانکہ اسے رشک کے مارے میرے دل سے آہ نکل جاتی ہے۔ کاش اس عافیت کوشی کا سلیقہ مجھے بھی ہوتا۔

ویسے ان کا اصول تو پرانی بیویوں کی طرح یہی ہے کہ "آپ بھلا اپنا گھر بھلا" لیکن عابد صاحب کا شوق صحرا نوردی پچھلے دنوں ان کو بھی یورپ گھسیٹ لے گیا۔ اللہ کا شکر ہے جیسی گئی تھیں۔ ویسی ہی لوٹ آئیں۔ اپنی چادر میں وہ اتنی نزاکت سے پاؤں پسارتی ہیں کہ کیا مجال جو ایک انگلی بھی کھلی رہ جائے۔ اور چادر پھٹنے بھی نہیں پاتی یہ کمال ہے۔

اُردو زبان سے عشق ہے۔ ادب سے شدید محبت ہے۔ لیکن فطرت بڑی ٹھیٹھ مشرقی پائی ہے۔ اور ان کی کہانیوں میں ہر جگہ ہندوستانی عورت کا دل دھڑکتا اور آنسو بہتے نظر آتے ہیں۔

کہتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک ماں اپنے بچے کو لائی کہ اسے شکر کھانے کی لت پڑ گئی ہے۔ آپ نصیحت کیجئے۔ حضورؑ نے فرمایا۔ کل آنا۔ اس دن آپ نے خود شکر استعمال نہ کرنے کا عہد کیا۔ کیونکہ اس بچے کو روکنے میں آپ خود مبتلا تھے۔ اور دوسرے دن جب وہ عورت بچے کو آپ کے پاس لائی تو آپ نے نصیحت کی۔ فوائد و نقصانات بتائے۔

سو صالحہ عابد کی کہانیوں پر میں تنقید و تبصرہ کیسے کروں۔ ان پر تبصرہ کرنے والے کو خود بھی معصوم صفت ہونا چاہئے۔ کیونکہ ان کی کہانیوں کے کردار اتنے شریف، سادہ اور عجیب ہوتے ہیں کہ ان پر اوچھی نظر ڈالنا بھی گناہ لگتا ہے۔ اس لئے میں اگلے سال شاید اس قابل ہو سکوں گی۔

کبھی کبھی وہ بھاری چیزوں کو بھی ہلکے پھلکے پیرائے میں ادا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کبھی ایسا تلخ و شیریں محلول بھی تیار کرتی ہیں جسے ہر شخص بہ آسانی نگل سکے لیکن مجھے ان سے صرف ایک شکایت ہے کہ ان کا تیار کیا ہوا شربت حلق سے نیچے اترتے ہی حلاوت پیدا کرتا ہے۔ مگر نیند آنے لگتی ہے۔ جسم میں [illegible] آنکھیں [illegible] ہے۔ پپوٹے بوجھل ہونے لگتے ہیں۔

صالحہ بحیثیت انسان کے قابلِ احترام شخصیت ہیں اور بحیثیت عورت کے ہمدردی و خلوص کا مجسمہ لیکن خلوص ضرورت سے زیادہ ہی کاش ان کا "احساسِ عقل" کسی وقت انہیں تنہا بھی چھوڑ دیا کرتی۔ شاید خراب صحت نے انہیں [illegible] کا شکار بنا دیا ہے۔

اب تک صالحہ عابد کے "عذرا" "نقش ناتمام" اور افسانوی مجموعہ "نقشِ اوّل" "صبحِ زندگی" "نراس میں آس" چھپ چکے ہیں۔ یادگارِ حالی اور کچھ اور کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ماشاء اللہ عمر اور بیماریوں نے رخصت دی تو ابھی بہت کچھ لکھیں گی اور ادب کو مالا مال کریں گی۔ [illegible] گھروں کے اندر جھانکتے ہوئے [illegible] روز بھی مستقل نہیں ہوتیں اور [illegible] کا بال بیکا نہیں ہونے دیتیں۔ [illegible] ——— آج کل پھر بستر علالت پر ہیں۔ [illegible] دعا کرتی ہیں۔ امید ہے ہماری دعاؤں میں نقوش کے قاری بھی شریک ہوں گے۔

قتیل شفائی

ابراہیم جلیس

پچھلی دو صدیوں کے دوران ارض ہند و پاک پر دو مشہور اورنگ زیب پیدا ہوئے۔ ایک اورنگ زیب نے شہنشاہ عالمگیر بن کر اپنی تلوار کے ذریعے [illegible] سے لے کر راس کماری تک سارا ارض ہند فتح کیا تھا تو دوسرے اورنگ زیب نے شاعر قتیل شفائی کا روپ دھار کر اپنے قلم کے ذریعے ارض ہند و پاک اور دنیا کے شعر و ادب کو فتح کر لیا۔

میں نے پہلے اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ اورنگ زیب قتیل شفائی کا اس لئے نام لیا ہے کیونکہ میری نظر میں قتیل شفائی بھی ایک بادشاہ آدمی ہے۔ اس کے سوا اورنگ زیب عالمگیر اور اورنگ زیب قتیل شفائی میں نہ تو شکلی طور پر کوئی مماثلت ہے نہ ذہنی طور پر کوئی مشابہت نہیں ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ تھا اورنگ زیب قتیل شفائی ادیب۔ وہ اورنگ زیب شمشیر بکف، یہ اورنگ زیب قلم بانگشت ـــ وہ اورنگ زیب قرآن مجید کا کاتب، یہ اورنگ زیب کلام قتیل شفائی کا مصنف ـــ وہ حافظ قرآن، یہ صاحب دیوان ـــ اس کی اسلام دوستی اس کی مذہب پرستی ـــ وہ [illegible] ـــ اس لئے بہتر یہی ہے کہ میں پہلے اورنگ زیب کو یہیں رخصت کر کے دوسرے اورنگ زیب کے ساتھ آپ کا تعارف کراؤں۔

آپ دوسرے اورنگ زیب کو نہیں جانتے، میں بھی نہیں جانتا، اگر جانتا بھی ہوں تو بہت تھوڑا سا جانتا ہوں ـــ البتہ قتیل شفائی کو آپ بھی جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں، اور پاکستان اور ہندوستان کا ہر وہ شخص جانتا ہے جو تھوڑی بہت اردو زبان جانتا ہو یا پاکستانی فلمیں دیکھتا ہو۔

قتیل شفائی دراصل اورنگ زیب ہی کی ایک ادبی شخصیت ہے۔

قتیل شفائی کا پتہ چلا اورنگ زیب سے کب آخری بار رخصت ہوا ہے، یہ میں نہیں جانتا کیونکہ قتیل نے اپنے چہرے اورنگ زیب کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ قتیل شفائی کا بچپن اور لڑکپن تھا۔ اس کے بعد جب شباب آیا تو وہ اورنگ زیب نہیں بلکہ قتیل شفائی کہلانے لگا ـــ اب [illegible] ہری پور ہزارہ کی ایک بستی [illegible] ہری پور ہزارہ کے چند لوگ ہی اورنگ زیب کو جانتے ہوں گے [illegible] قتیل کے قریبی رشتہ داروں کی زبان پر ہی اورنگ زیب کا نام شاید ابھی ہو ـــ ویسے اورنگ زیب اب کہیں نظر نہیں آتا۔ وہ بیچارہ آپ کو قتیل شفائی میں ڈھالنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنا کام مکمل کیا اور اب ہمیشہ کے لئے قتیل شفائی کے وجود میں چھپ کے رہ گیا ہے۔

قتیل شفائی جو کہ میرا دوست، ہم سفر، ہم جنس، ہم عصر، ہم مشرب، ہم پیشہ اور ہم جلیس ہے اس نے مجھے کبھی کبھار اورنگ زیب کی باتیں بھی بڑے مزے لے لے کر سنائی ہیں اور میں نے ان باتوں ہی سے پتہ چلا لیا ہے۔ کہ اورنگ زیب کس طرح قتیل شفائی بنا ہے۔ اس تبدیلی کا عمل تقریباً تقریباً ویسا ہی ہے جیسے پانی کے قطرے کا گہر ہو جانا ہے۔ اب یوں سمجھئے کہ اگر اورنگ زیب ایک شخص تھا تو قتیل شفائی ایک شخصیت ہے۔

قتیل نے مجھے بتایا کہ اورنگ زیب اب سے تقریباً تیس سال پہلے ہری پور ہزارہ کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوا۔ ماں باپ کی اکیلی اولاد جس لاڈ پیار اور جس ناز و نعم سے پالی جاتی ہے اورنگ زیب کو بھی ماں باپ کا ویسا ہی لاڈ پیار ملا ——— اچھے ماں باپ، اچھا گھر، اچھی غذا، اچھے لباس، اچھی تربیت اور اچھا ماحول ——— ان ساری اچھائیوں نے ننھے اورنگ زیب پر بڑا اچھا اثر ڈالا۔ چنانچہ گھر ہو یا اسکول ہر جگہ لوگ بڑے پیار سے یہی کہتے تھے کہ اورنگ زیب بڑا اچھا لڑکا ہے ——— لوگ آج کل قتیل شفائی سے ملنے کے بعد یہی بات تو یہی تو کہتے ہیں کہ قتیل نہ صرف شاعر اچھا ہے بلکہ آدمی بھی اچھا ہے۔ یہ اچھائی دراصل اسے ماں باپ کے خون کے ذریعے ورثہ میں ملی ہے اور اسی کو اورنگ زیب نے بیس برس تک اپنے پاس امانت کے طور پر رکھا اور پھر جب قتیل شفائی میں خود آگاہی کی صلاحیت آئی تو اورنگ زیب کو قتیل شفائی کی بے مائیگی پر ترس آیا اور اس نے اپنی ساری اچھائیاں قتیل شفائی کے حوالے کر دیں یہی وجہ ہے کہ عام شاعروں کی طرح ہم قتیل کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ بھئی ـــ شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

قتیل کے آبائی نام اور اس کے وطن کو دیکھ کر ہمیں یہی قتیل کے والد کے دوست یہی اندازہ لگاتے ہوں گے کہ یہ بھی اپنے باپ کی طرح ملازموں سے پاؤں دبوا کے حقہ پیتے اور اپنی طرح کے "اورنگ زیب" پیدا کرتے زندگی کے دن گزار دے گا اور ہری پور ہزارہ کے باہر کسی کو پتہ نہ چلے گا کہ کوئی اورنگ زیب بھی اس دنیا میں آیا تھا۔ قتیل شفائی میں شعر گوئی کا ذوق کب پیدا ہوا؟ اس نے پہلا شعر کب کہا؟ وہ شعر کیا تھا کیسا تھا؟ یہ اب شاید قتیل کو بھی یاد نہیں۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ مجھے جب ملا تو وہ اس وقت ایک بھرپور شاعر تھا اور ایک مشہور شاعر تھا۔

قتیل سے ملنے سے پہلے میں نے قتیل کی آواز سنی۔ اس کی آواز اتنی میٹھی اور اتنی رسیلی تھی کہ میں بے قرار ہو گیا۔ میں نے رسالہ "سویرا" کے مدیر اور اس وقت میرے ساتھی ساحر لدھیانوی کو خط لکھا کہ کل رات میں نے راولپنڈی کے ایک سینما گھر سے ریلے ہونے والے مشاعرہ میں گاندھی جی کے قتل کے عنوان سے قتیل شفائی کی مترنم نظم سنی ہے۔ اس کی آواز اور اس کا کلام سن کر میں اس کے بارے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ کیسا شاعر ہے یہ! قتیل کیا کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی مطلع کرو ہے۔ ساحر لدھیانوی کا جواب آیا کہ تم نے اس کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ وہ جتنا اچھا شاعر ہے اتنا ہی اچھا انسان بھی ہے ——— ساحر کی اس رائے نے قتیل سے ملنے کی خواہش کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ ان دنوں قتیل شفائی لاہور میں تھا اور میں اس سے کوئی چند سو میل دور حیدر آباد دکن میں ——— اس لئے یہ آگ کئی برس تک جلتی رہی۔

عرصہ گزر گیا۔ پھر میں حیدر آباد سے لاہور پہنچا ——— لاہور پہنچنے کے دوسرے دن یا تیسرے دن میں حضرت احمد ندیم قاسمی کے ہمراہ لاہور کے پاک ٹی ہاؤس کی ایک بیٹھک "پیراڈائز پبلیکیشنز" سے باہر نکل رہا تھا کہ قاسمی صاحب نے اپنی مخصوص دھیمی آواز میں پوچھا۔

قتیل شفائی سے بھی ملے ہو؟

میں نے تڑپ کر کہا ——

نہیں کہاں ہے وہ! میں تو کب سے اسے دیکھنے اور اس سے ملنے کے لئے بیقرار ہوں۔

قاسمی صاحب نے کہا ——

تو آؤ پھر ———!

ایک ہی لمحے بعد اپنے آگے ایک سرخ و سفید جوان میں نے کھڑا پایا تھا اور وہ تھا قتیل شفائی ——— گیبرڈین کے ویل پریسڈ سوٹ اور وولن کی بیش قیمت نکٹائی میں ملبوس گوری رنگت، بھرے بھرے چہرے، چمکدار پیشانی، چمکدار آنکھیں، [illegible] قتیل شفائی تھے

قتیل شفائی سے بالکل مختلف تھا جس کا ہیولیٰ میں نے اپنے ذہن میں تیار کیا تھا۔ قتیل سے ملنے سے پہلے اور اس کے پرانے طرز کے ثقیل قسم کے تخلص کو ذہن میں رکھنے سے میرے تصور میں قتیل کا جو ہیولیٰ بنا تھا ویسا، بالعموم پرانے روایتی شاعروں کا ہوتا ہے یعنی دھان پان جسم، اس پر جھولتی ہوئی سیاہ اچکن، پچکے ہوئے گالوں میں دبا ہوا پان کا بیڑا، آنکھوں پر موٹے شیشوں والی عینک، سر پر خشک بے ہنگم بال، ٹانگوں میں تنگ مہری کا پاجامہ اور پیروں میں [illegible] جوتی، دن بھر گھر سے چپ چاپ بیٹھنے والا اور سر شام ہی سے مے نوشی کا آغاز کر کے نصف شب کے قریب مدہوش ہو کر کسی گندی نالی میں پڑے رہنے والا شاعر —— لیکن قتیل اپنے [illegible] تخلص کے بالکل برعکس شائستہ خلیق وضعدار اور نہایت جاذب نظر شخص ہے۔ غزل گوئی کے ساتھ ساتھ وہ جتنا اچھا شاعر ہے اس کی زندگی میں بھی ویسا ہی نظم و ضبط ہے۔ جس طرح قتیل دیکھنے میں شاعر کے بجائے ایم اے کا طالب علم یا سوشل سروس کا کوئی اعلیٰ افسر معلوم ہوتا ہے اسی طرح اس کا گھر بھی شاعر کا کم اور [illegible] ہے۔ لاہور کے ایک [illegible] محلے [illegible] مسجد کے قریب [illegible] پارک کے علاقے میں جدید فرنیچر اور رنگ برنگے حریری پردوں سے آراستہ ایک پختہ مکان ہے جس میں قتیل شفائی اپنی ایک بیوی اور چار بچوں کے ساتھ ایک خاموش زندگی کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ یہ کھاتی پیتی زندگی قتیل کو اس کے خوشحال باپ سے ورثے میں ملی ہے بلکہ وہ اپنے باپ سے ملی ہوئی جائداد اور ذاتی مکان کو اپنے اقرباء کے حوالے کر کے عرصہ ہوا ہری پور سے [illegible] چلا آیا تھا اور اپنی زندگی کے فردوس کی آپ اپنے ہاتھوں تعمیر کے لئے تقریباً خالی ہاتھوں اور خالی جیبوں کے ساتھ لاہور آیا تھا۔

اس سماج میں ایک شاعر کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ ملک کے خزانے میں شاعر کا کیا حصہ ہوتا ہے؟ شعر کہہ کے جینا یا شعر کہہ کر اور مانگ تانگ کے زندگی بسر کرنا شاعر کو ہمارے سماج میں وہ وقار تو بہت مشکل سے ملتی ہے لیکن یہ داد واہ کبھی چائے کی پیالی کے سکوں میں ڈھل سکتی ہے اور [illegible] نوٹوں میں بدل سکتی ہے! اگر قتیل نے اپنی [illegible] گزشتہ تخلیق [illegible] سے یہ ثابت کیا کہ روایتی شاعروں کی اس طرح [illegible] گا کہ واہ واہ صرف آوازیں نہ رہ سکے بلکہ کرنسی نوٹوں میں بدل سکے اور چاندی کے سکے میں ڈھل جائے۔ قتیل پٹھان ہونے کو دھن [illegible] کا بڑا پکا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی جدوجہد اور اپنے وجود سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اردو زبان کا شاعر محض اپنی قوت شعر گوئی سے بھی ایک بڑی باعزت اور خوشحال زندگی کی تخلیق کر سکتا ہے۔

سردیوں میں ڈبل بریسٹ گیبرڈین، ایک [illegible] وغیرہ کے بیش قیمت سوٹ اور ٹریولنگ بیگ رکھنے والا اور گرمیوں میں بوسکی کا سفید براق کرتہ اور اجلا پاجامہ اور بلکی سی چپل پہننے والا صاف ستھرا قتیل شفائی بقول خود اس خوش لباسی کو اس لئے اہمیت دیتا ہے کہ وہ صاف ستھرا ہی رہنے میں عافیت سمجھتا ہے چنانچہ قتیل کی شاعری میں جو پاکیزگی، نفاست اور رعنائی نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ دراصل اس کی اپنی نفاست طبع کی پیداوار ہے۔ جس زمانے میں قتیل اپنے شعر [illegible] کے لئے پہلی بار دنیا کے سامنے آیا اس زمانے میں شاعری کی روایات کچھ عجیب سی تھیں یعنی شاعر وہ ہے جو بے حد شراب پئے۔ جو بادہ خوار نہیں وہ شاعر نہیں۔ زندگی کے سامنے پرانا شاعر ہمیشہ ڈگمگاتا چلے، سید ساغر جیسا چلتا ہے، گرتا پڑتا، آسمان سے بھیک مانگتا —— دیکھو وہ شاعر جا رہا ہے۔ ان دنوں اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی، مجاز، [illegible] اسرار الحق مجاز، عبدالحمید عدم کی بادہ خواری اسی طرح مشہور تھی۔ نوجوان شاعروں پر اس کا بڑا اثر پڑ رہا تھا۔ ہر نوجوان بڑے شاعروں کی تقلید میں ان کے پیچھے لڑکھڑاتے ہوئے چلنے میں فخر محسوس کرتا تھا، اور [illegible] اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی دور میں اپنے استاد رکھنے والا قتیل شفائی اس رستے پر چلنے کے لئے قطعاً تیار نہیں تھا۔ وہ اس دنیا کو ساغر و مینا کی گردش میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس دنیا اور انسان کی زندگی کو براہ راست اور ہوش مندی کی روشنی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ شعروں کے پھول اور بیل بوٹے کھلنے کے لئے "شرابِ ناب" کا قائل نہیں تھا، اس لئے اس نے بہت پہلے ہی غیر شعوری طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ شعر کہنے کے لئے شراب پینا ضروری نہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ قتیل شراب نہیں پیتا —— وہ شراب پینے کو برا نہیں سمجھتا لیکن وہ اس طرح شراب پیتا ہے جیسے کوئی سنجیدہ رنگ کے کپڑے پہننے والا سادہ مزاج آدمی دنیا کی نظروں سے بچ کر بھڑکیلے کپڑے پہن کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر مسکرائے اور پھر جلدی سے انہیں اتار کر چھپا کر رکھ دے —— کبھی کبھی جب آسمان پر گھٹا چھا جاتی ہے اور دلی کی بیاد آتی ہے، یا پھر کسی رات کی شام ہو جاتی ہے تو قتیل تنہائی میں بیٹھ کر اپنے گلاس کو ہلکا سا [illegible] سے تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو جاتا ہے اور جب وہ اس دنیا میں واپس آتا ہے تو اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی [illegible] مسکراہٹ ہوتی ہے۔ پھر

جام رقصاں ہو، ساقی ہو، پھر بھی چھلکتی ہے، پھر قتیل پیتا ہے —— لیکن اتنی ہی پیتا ہے کہ وہ سرور کی حد سے آگے نہ جائے اور نشے کی حد سے دور ہی رہے۔ قتیل کے چاہنے والے دوست اسے کمزوری سمجھتے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کم ظرف نہیں، خوش ظرف ہے۔ وہ روز نہیں پیتا، زیادہ نہیں پیتا اور پینے کو برا نہیں سمجھتا اس لئے میری یہ پیشین گوئی ہے کہ وہ اختر شیرانی، منٹو اور مجاز کی طرح "مرحوم شراب" نہیں ہو گا بلکہ اس کی موت ایک صحت مند زندگی کے طبعی اختتام کی طرح آئے گی۔

ان دنوں میرے قریب روز کا بیشتر حصہ قتیل کے ساتھ گزرتا ہے اور میں قتیل کا بڑا گہرا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، لکھتے پڑھتے، سوتے جاگتے قتیل شفائی کو میں قریب سے دیکھ رہا ہوں —— اور حاصل مطالعہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو عام آدمی کی طرح نہیں بسر کرتا بلکہ وہ زندگی کو ایک بہت بڑی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ زندگی کے لمحے لمحے کا رس نچوڑ لے۔ ایک لمحہ بھی بیکار نہ جانے پائے۔ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا یہ قتیل کا شیوہ نہیں بلکہ وہ روز و شب سے ان کی ساری لذتیں کشید کرنے کو "زندگی گزارنے" کا نام دیتا ہے۔ اسی لئے وہ بڑا سحر خیز ہے۔ گرمی ہو یا سردی ہر صبح تازہ ٹھنڈے پانی کے غسل کے بعد وہ [illegible] "تحفۂ" [illegible] پر مشتمل ناشتے کے بعد وہ ضروری خطوط لکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور جب دس بجتے ہیں تو قتیل گھر سے نکلتا ہے۔ اور سہ پہر تک فلم کمپنیوں، اخباروں اور ناشران کتب کے دفتروں میں اپنے افکار کی سوداگری میں مصروف رہتا ہے۔ شام ہوتی ہے تو وہ اپنے چند منتخب دوستوں کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ رومانی اور تاریخی سڑک مال روڈ پر ٹہلتا ہوا لارنس باغ کا ایک چکر لگا کر ساڑھے آٹھ نو بجے تک ایک شریف گھریلو آدمی کی طرح گھر پہنچ جاتا ہے۔ بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھانے میں لطف محسوس کرتا ہے۔ طبیعت شعر گوئی پر آمادہ ہو تو اس وقت تک جاگتا رہتا ہے جب تک رات کی زلفیں بکھر کر ڈھل نہ جائیں یا اس سے بھی پیچھے نہ رہ جائیں۔ اگر طبیعت موزوں نہیں ہے تو پھر دس گیارہ بجے کے درمیان کسی لمحے نیند کی پری آتی ہے اور قتیل کو ساتھ لے کر خوابوں کے جزیرے میں چلی جاتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرا یہ تجزیہ غلط ہو لیکن جب بھی میں یہ سوچتا ہوں کہ قتیل کی شاعری میں اتنی مٹھاس کیوں ہے تو میرا ذہن [illegible] شہد یا انسب کی طرف چلا جاتا ہے۔ قتیل اپنی میٹھی طبیعت کے لحاظ سے میٹھے کا بڑا دلدادہ ہے۔ ہر کھانے کے بعد ایک سویٹ ڈش اس کے لئے ایک لازمہ ہے۔ کبھی کبھی دفتروں میں جب ہم دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں تو قتیل کھانے کے بعد بالالتزام "حلوہ" کی پلیٹ منگواتا ہے۔ شیرینی کے اس شوق نے یقیناً قتیل کو شیریں دہن، شیریں زبان اور شیریں بیان شاعر بنانے میں بڑی مدد دی ہے۔ (میں پھر کہتا ہوں کہ ہو سکتا ہے میرا تجزیہ غلط ہو!)

جس طرح قتیل کی شاعری میں جدید اور قدیم شاعری کا ایک حسین امتزاج ہے اسی طرح اس کی شخصیت میں بھی جدید اور قدیم تہذیب کی مناسب آمیزش ہے۔ وہ مغربی تہذیب کو بھی پسند کرتا ہے اور مشرقی تہذیب کے اچھے اصولوں سے بھی کنارہ کش نہیں —— دوستوں میں وہ احمد ندیم قاسمی کا بڑا احترام کرتا ہے۔ حالانکہ قتیل قاسمی صاحب سے بے حد بے تکلف ہے لیکن اس پر مشرقی اخلاق کا اس قدر گہرا اثر ہے کہ وہ قاسمی صاحب کی موجودگی میں اپنے آپ کو چند خاص حدوں میں محصور کر لیتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک خاص بات یہ ہے کہ زندگی کے اس روایتی احترام نے قتیل میں کبھی کوئی احساس کمتری نہیں پیدا ہونے دیا۔ یعنی احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی کی محفل ہو یا [illegible] کے زیر صدارت مشاعرہ، احباب کا ہجوم ہو یا [illegible] کا دفتر —— قتیل جہاں بھی جاتا ہے جہاں بھی بیٹھتا ہے اور جہاں بھی بات کرتا ہے۔ وہیں بڑا نمایاں ہو جاتا ہے۔ جیسے اس کا وجود کہہ رہا ہو کہ کوئی بات نہیں۔ آپ لوگ بھی ہیں۔ آخر میں بھی تو قتیل شفائی ہوں۔

قتیل اپنی قیمت آپ پہچانتا ہے۔ اس لئے کسی موقع پر بھی اپنے آپ کو ارزاں نہیں ہونے دیا۔ ان دنوں وہ فلموں کے لئے گیت لکھتا ہے۔ پاکستان کی فلمی صنعت نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ کوئی شاعر ایک گیت کا معاوضہ زیادہ سے زیادہ سو روپے سے زیادہ لے سکے۔ لیکن قتیل وہ شاعر ہے جو فلمی صنعت کی بے زری کے باوجود ایک گیت کا کم سے کم معاوضہ ساڑھے تین سو روپے لیتا ہے۔ ویسے اس نے ایک ایک گیت چار چار سو اور پانچ پانچ سو روپیہ میں بھی لکھا ہے۔ پاکستان کے [illegible] قتیل نے اس کے [illegible] گیت، اس لئے [illegible] فلموں میں اس کے گیت [illegible] ہوتی ہے۔ ویسے [illegible]

کرنے کا تعلق بیکار ہے اس لئے کہ قتیل کا صرف ایک ہی گیت ہے

الفت کی نئی منزل کو چلا تو باہیں ڈال کے باہوں میں
دل توڑنے والے دیکھ کے چل ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں

آج وہ گیت [illegible] اور قتیل [illegible] سے اس کی [illegible] گا رہا ہے۔

قتیل علم کی دنیا سے فلم کی دنیا میں اس لئے داخل ہوا کہ علم کی دنیا میں قتیل کا ایک مجموعۂ کلام جو اوسطاً تیس غزلوں، نظموں اور گیتوں پر مشتمل ہوتا ہے [illegible] ایک ہزار تعداد میں ایک زمانہ جو شاعر کے مرنے تک ایک [illegible] سے زیادہ فروخت نہیں ہوتا جس میں چند ناشروں کی کتابوں کی الماریوں میں منتظر پڑا رہتا ہے، چار پانچ سو روپیہ میں فروخت ہوتا ہے اور اس کے برعکس فلمی دنیا میں اس کا صرف ایک گیت چار پانچ سو روپیہ حاصل کرتا ہے قتیل شاعر کے علاوہ ایک [illegible] ہے، اپنی بیوی کا شوہر، اپنے بچوں کا باپ [illegible] اختر اور شفیعہ کا باپ اور اپنی بوڑھی والدہ کا کفیل ہے اور صورت حال یہ ہے کہ شاعر کی زندگی کی اس [illegible] بنتے ہیں اتنے [illegible] اس لئے وہ علم کی دنیا سے فلم کی دنیا اور فلم کی دنیا سے علم کی دنیا میں صبح سے شام تک محنت میں مصروف رہتا ہے کہ وہ جتنا خود مقروض ہے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی زندگی بھی اتنی ہی مقروض رہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے دوستوں کو اس کے اہل و عیال کے لئے کوئی قتیل فنڈ قائم کرنا پڑے یا اس کی بیوی بچے حکومت کے وظیفے کے محتاج ہوں۔

قتیل بھی دوسری جنگ کے خاتمے پر لاہور آیا تھا [illegible] ترقی پسند [illegible] "ادب لطیف" کا مدیر مسئول رہا تھا ان دنوں اس کی زندگی مالی اعتبار سے بھی ناآسودہ گزر رہی تھی لیکن پھر نئے مصرعوں کے تحت وہ زندگی بسر کرتے ہوئے قتیل کو یقین تھا کہ وہ ایک دن خود اپنے ہاتھوں اسی زمین پر اپنی زندگی کا ایک اچھا سا خوبصورت فردوس تعمیر کرے گا ——— چنانچہ وہ اس فردوس کی تعمیر بڑی حد تک مکمل کر چکا ہے۔

قتیل میں بعض خامیاں بھی ہیں لیکن چونکہ وہ خامیاں اسے قتیل کی شخصیت بننے میں کوئی مدد نہیں دیتی ہیں اس لئے ان کا تذکرہ بھی بیکار ہے اور اب جب کہ وہ شخص سے شخصیت بن چکا ہے تو یہی اور آپ کو اس کی خامیاں بھی اچھائیاں نظر آنے لگی ہیں۔

بعض دوست جو قتیل کی زندگی میں صرف خامیوں کی تلاش کرنا چاہتے ہیں وہ صرف ایک عورت تک پہنچ سکے ہیں وہ عورت [illegible] جو ابھی تک بقیدِ حیات ہے، جوانی کے راستے پر قتیل کی پہلی لغزش ہے اور شاید آخری بھی۔ اب بھی کبھی کبھی قتیل کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھئے تو اس کے نقشِ کفِ پا کے پیچھے ایک سایہ سا دور نظر آتا ہے وہ قتیل ہے کہ رخصت ہو رہا ہے۔ [illegible] جو قتیل کی لغزش کی داستان میں چھپی ہوئی ہے۔ قتیل نے کچھ دن ایسے گزارے جب کہ اس کے تقاضوں پر اس کی بیوی کے علاوہ ایک اور عورت کی زلفیں پریشان ہو گئی تھیں، قتیل اس کی محبت کے بازار میں آوارہ و رسوا گھوم رہا تھا قتیل [illegible] ایک دن جاتا ہوا تھا۔ لیکن اچانک ایک دن اس کی محبت کا چاند غروب ہو گیا، ایک چھناکے کے ساتھ قتیل کا دل ٹوٹ گیا، قتیل پر ایک [illegible] کا عالم طاری تھا، اور اس کی دنیا میں جیسے زمانے بھر کا اجالا بجھ گیا اور قتیل کی شعروں میں [illegible] اور [illegible] دونوں ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں ———!

اب قتیل کبھی کبھی اس عورت کے بارے میں یہ سوچتا ہے کہ اب وہ شمعِ فروزاں کہاں ہے؟ لیکن قتیل اس کی جدائی کو ایک بہت بڑا سبق ایک بہت بڑا تجربہ سمجھتا ہے اور وہ اس سبق اور اس تجربے کو بڑے سلیقے کے ساتھ اپنے شعروں میں گوندھتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں، گیتوں اور غزلوں کے پڑھنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ہمارے آپ کے سامنے سے ایک نہایت خوبصورت عورت چپ چاپ سے گزر گئی ہے صرف اس کے جسم کی خوشبو ہے جو باقی رہ گئی ہے اور مشامِ جاں سے ٹکرا رہی ہے۔

جوانی کی اس پہلی لغزش کے بعد قتیل ایک دم سنبھل گیا ہے ——— آج کل وہ صرف ایک غم ہے۔ وہ غم جو جمہور کی امانت ہے۔ جس میں وہ خون جوان ہے جس سے عظمتِ انسان کی لَو آتی ہے۔ وہ موڑ جس کے پیچھے غمِ حیات کی تاریکی کے دبیز [illegible] ہیں۔ وہ غم جس سے [illegible] شکست کھائی ہے اور اسی لئے قتیل بڑے فخر سے دعویٰ کرتا ہے کہ

میں خود اسیر ہوں میرا فن اسیر نہیں
مرا قلم کسی دربار کا سفیر نہیں

لاہور کی چند شخصیتیں

محمد طفیل

(یہ مضمون میں نے شخصیات نمبر جلد دوم کے لیے لکھا تھا مگر ڈر کے
مارے چھپوایا نہیں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری کسی تحریر سے کوئی بھی ناخوش ہو
اپنی طرف سے میں نے ان دوستوں پر بڑے پیار سے قلم اٹھایا ہے
یوں پیار کی قسمیں مختلف ضرور ہیں۔ کوئی پچکار پچکار کے پیار کرتا ہے اور کوئی گال
نوچ کے ـــــ بدقسمتی سے میں پچکارنے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں گال بھی
نوچ لیتا ہوں ـــــ میرے نزدیک اپنے دوستوں سے عجز و محبت کا اظہار
اسی طرح ممکن تھا۔

اگر کسی دوست نے میری اس صراحت کے باوجود، میرے خلوص پر
شک کیا تو مجھے دلی صدمہ ہو گا۔)

ڈاکٹر محمد باقر

کسی لڑکے کی سفارش مقصود تھی یا اسی قسم کا کوئی اور عجیب مگر بیہودہ سا کام ہے کہ ہم ڈاکٹر باقر کے ہاں ماڈل ٹاؤن پہنچے۔ میرے ہمراہ میرے دیرینہ دوست ملک محمد اسلم تھے۔ ان کی ڈاکٹر صاحب سے پہلے کی خوب سلام دعا تھی۔ اپنی اس سے پہلے ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔

پکارنے پر ڈاکٹر صاحب برآمد ہوئے۔ دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ جیسے انہیں پہلوانی چھوڑے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ جسم پر ململ کا کرتہ اور تہبند باندھے، سلیپر پہنے ہنستے ہوئے السلام علیکم ملک صاحب کہہ کر ہاتھ بڑھایا۔ محبت سے ملے۔ پھر ملتے ہی احساس ہوا کہ یہ صاحب پروفیسر تو ہیں مگر خشک نہیں ہیں۔

جب تک ہم بیٹھے رہے بڑے پیار سے ہمیں اپنا برخوردار سمجھ کر باتیں کرتے اور باتیں بناتے رہے۔ جو راز بھی دی عجائبات بھی کی تعلی معقول اسمائے اس بات کے کہ میرے فلاں گورنر سے تعلقات ہیں۔ فلاں وزیر میرا پانی بھرتا ہے۔

اخباروں کے تراشے رکھنے اور ہر قسم کی ادبی دستاویزوں کو محفوظ کر لینے کا انہیں بڑا ہوکا ہے۔ آپ ان سے آج بھی بیس پچیس برس پہلے کے تمام علمی اور ادبی موضوعات پر ہر قسم کا مواد حاصل کر سکتے ہیں۔

خدا جانے لوگ کہتے ہیں کہ جس سے ان کی ٹھن جاتی ہے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے اور بڑے نگرم باز ہیں۔ اپنا رشتہ ان سے نیاز مندوں والا ہے اس لئے میں اپنی حدود میں رہنا پسند کروں گا۔ ورنہ باقر صاحب سے ملاقات ہوگی تو منہ چھپانا پڑے گا۔

مجھ سے اب جب بھی ملتے ہیں بڑی محبت سے ملتے ہیں اور پہلا فقرہ بغیر سلام دعا کے ان کا یہ ہوتا ہے "سنا بھئی طفیل کیا حال ہے تیرا؟" اس کے بعد ادبی باتوں سے لے کر سیاسی باتوں تک اور سیاسی باتوں سے لے کر نہانے دھونے کی باتوں تک پر ہر بے تکلفی کے ساتھ فقرے پر فقرے چست کرتے جائیں گے۔

پچھلے دنوں ایران گئے تھے۔ میں نے پوچھا کیسی گذری؟ — "خوب گذری یار — ڈاکٹر مصدق سے ملا، شاہ ایران سے ملا، ان کے بھائی سے ملا۔ فلاں سے ملا — فلاں سے ملا — وہ ساری یادداشتیں اور فوٹو لایا ہوں۔ دکھاؤں گا آپ کو۔"

"آپ کا وہ مضمون جو آپ نے وہاں کے عظیم الشان غسل خانوں کے بارے میں لکھا ہے، مجھے بڑا ہی پسند ہے۔"

"ہے نا! — وہ مضمون بہت پسند کیا گیا ہے مگر میں نے اصلی واقعات تو لکھے ہی نہیں۔ اس لئے کہ وہاں ایسے غسل خانے بھی ہیں جن میں لوگ مادر زاد ننگے نہاتے ہیں اور ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں — وہاں نہلانے والوں کا بھی انتظام ہے۔ جس کا جی چاہے ان کی مدد سے نہائے۔ خوب رگڑ رگڑ کر نہلاتے ہیں اور جسم پر سے اتنی میل اتارتے ہیں کہ بالکل یقین ہو جاتا ہے کہ ابھی کالے صاحب گورے صاحب بن جائیں گے۔"

"آپ تو ایسے بیان کر رہے ہیں جیسے خود بھی ننگے نہائے ہوں؟"

"چل ہٹ! بے شرم کہیں کا۔"

ڈاکٹر صاحب بڑے سخت پنجابی ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں انہیں سب سے ترقی یافتہ اور رچی زبان پنجابی ہی نظر آتی ہے۔ پنجاب کی اور اہل پنجاب کی ایک ایک ادا پر واری نثاری ہیں۔ ان کا بس چلے تو یہ مسلمانوں کی تمام مذہبی کتابوں کو بھی پنجابی ہی میں منتقل کرا کے دم لیں۔

ہنستے ہیں تو قہقہے لگا کر ہنستے ہیں۔ دوسروں کی سنتے بھی ہیں۔ اپنی سناتے بھی ہیں۔ مگر سناتے زیادہ ہیں سنتے کم ہیں۔ ہر ایک کا کام پورا کر دیتے ہیں اور اس میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ فقط تعریف پر تو سو فی صد بچھے جاتے ہیں۔ سو میں نوے صد جو کر دیتے ہیں وہ بھی اگر خدانخواستہ نہ ہوتیں تو بے چارے اشرف المخلوقات میں سے خارج ہو جاتے۔

حمید احمد خاں

میرے نزدیک ان کا شمار بھی بزرگوں میں ہے۔

سید وقار عظیم جب باقاعدہ لاہور آ گئے تو میں نے انہیں نقوش کی ادارت کے سلسلے میں پھانسنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ معلوم ہوا وقار صاحب حمید احمد خاں صاحب کے پاس بیگم روڈ پر ٹھہرے ہیں۔ بیگم روڈ پہنچا۔ وقار صاحب سے بھی ملاقات ہوئی اور حمید احمد خاں صاحب سے بھی۔

درمیانہ قد و قامت کے آدمی۔ پنجابی ہوتے ہوئے بھی بڑے شستہ و شفیق۔ کبھی اتنے سنجیدہ ہو جاتے جیسے یقین ہو جائے کہ ابھی فرما دیں گے نکل جاؤ میرے گھر سے، کبھی ایسے باغ و بہار جیسے پہلا یقین واہمہ بن جائے۔

میری ان سے زیادہ واقفیت بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں ان کے باب میں زیادہ باتیں نہیں بنا سکتا۔ اس کے باوجود یہ بات مسلّم ہے جس نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ ان کی بڑی تعریف کرتا ہے۔

جب یہ لندن گئے تو مجھے اس کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ میں نے لاہور کے پتے پر نقوش کا ایک شمارہ بھیجا تو ان کا لندن سے جواب ایک دوستی رقعہ کی شکل میں ملا۔ "آپ کا پرچہ میرے گھر والوں کو موصول ہوا تھا مگر میں تو یہاں ہوں اس لئے پرچہ واپس بھجوا رہا ہوں۔"

مجھے ان کی اتنی احتیاط اچھی معلوم نہ ہوئی۔ کچھ کڑوا سا بھی لگ ہی گیا۔ جب سے لندن سے آئے ہیں ان سے باقاعدہ ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ ملاقات کی آرزو تو ہے مگر جلد پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے کہ میں نے ایک دن انہیں اپنے دفتر کے سامنے سے آنکھیں بچا کے گزرتے دیکھا ہے۔ ارادے کے باوجود اب ملاقات کا حوصلہ ہو تو کیسے؟

لندن سے آنے کے بعد میں نے ان کے ایک مضمون کی بڑی دھوم سنی۔ موضوع تھا "اقبال کی چوریاں"! علامہ اقبال نے مغربی ادیبوں اور شاعروں کے خیالات سے استفادہ کر کے جو نظمیں بغیر حوالے کے لکھی ہوئی تھیں ان پر تھا مضمون۔ خوب چرچے ہوئے اس مضمون کے، اخباروں میں مخالف اور موافق لکھا گیا۔ کسی نے حمید احمد خاں کی اس جرأت کی داد دی۔ کسی نے سنا ڈالیں۔ بہرحال رہا سو کہ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ احتیاط بچا کر چلنے کے باوجود ان میں زندگی کی تمام حرارتیں موجود ہیں۔

غالب ان کا محبوب موضوع ہے۔ ادھر پاکستان میں، غالب پر کام کرنے والوں میں یا تو مولانا غلام رسول مہر ہیں یا یہ۔ نہیں نہیں ایک اور رنگ میں جو سی۔ ایس۔ پی بھی ہیں اور ادیب بھی، شیخ اکرام ——— ویسے تو اور بھی ہوں گے مگر باقی قلم کا ذائقہ بدلنے کے لئے غالب پر لکھتے ہیں۔ ان لوگوں نے تو غالب کو سمجھنے کے لئے اپنی زندگی بتا دینے کی آرزو کر رکھی ہے۔

میں نے ایک بار حمید احمد خاں صاحب سے شکایت کی "آپ نقوش کے لئے کچھ بھی نہیں لکھتے"۔ بات کو اور باتوں کے ریلے میں وہ دھکیلتے گئے اور میں ہکا بکا رہ گیا۔

ایک بار درسی کتابوں کے سلسلے میں ان کے پاس پہنچا۔ مدعا عرض کیا۔ بات سنتے ہی ڈوب گئے اور میں تیرتا ہی رہ گیا۔

جب میں نے دوبارہ وہی بات عرض کر دی تو فرمایا: "میں آپ کے لئے نہ لکھ سکوں گا۔ اس لئے آپ حکومت کے نزدیک خوفناک آدمی ہیں۔ اگر آپ کے ساتھ کام کیا تو میں بھی مارا جاؤں گا۔"

"اوہو!"

"جی ہاں!"

میں انہیں اب تک یہ نہیں سمجھا سکا ہوں کہ میں نے وہ کام بڑی مجبوری میں کچھ دوستوں ہی کی وجہ سے میں خوفناک آدمی بنا تھا۔ بہرحال میں ایک بار

پھر ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے بارے میں رائے دریافت کروں گا کیونکہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان کے قریب ہو جاؤں اور ان سے ادب پڑھوں، اخلاق سیکھوں اور شرافت کا درس لوں۔

میرزا ادیب[1]

دل میں ہزار بدگمانیاں رکھنے والے اپنے میرزا صاحب بے حد شریف النفس اور بڑے بے ضرر دوست ہیں۔ میری طرح یہ بھی دل ہی دل میں گھٹتے اور گھلتے رہتے ہیں، مگر دل کی بات ان سے نہیں کہتے جن سے شکایت ہوتی ہے۔ کبھی دل کی بات کہہ دیں تو اتنے خوفناک طریقہ پر کہ سکتہ طاری ہو جائے۔

میں نے میرزا صاحب کا ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح احترام کیا ہے مگر احتیاط صرف اتنی کی کہ انہیں میرے اس جذبہ کا علم نہ ہونے پائے۔

ان کی شخصیت میں جو چیز نمایاں اور قابلِ قدر ہے، وہ ہے ان کی معصومیت، یہی وجہ ہے کہ انہیں اب تک اپنی بڑائی کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ خدا کرے کہ انہیں اپنی بڑائی کا احساس بھی نہ ہو ورنہ ڈر ہے کہیں ہوش و حواس نہ کھو بیٹھیں۔ یہ تو وہ احساسِ کمتری کے سہارے ہی اس دنیا میں بقائمی ہوش و حواس چل پھر رہے ہیں۔

میرزا صاحب اپنے سے چھوٹی عمر کے بچوں میں بڑا خوش رہتے ہیں۔ جس نے میٹرک پاس کر لیا وہ رزلٹ دیکھتے ہی میرزا صاحب کے پاس ادیب بننے کے لئے پہنچتا ہے اور میرزا صاحب اتنے بھلے آدمی ہیں کہ اسے چھاپ چھوپ کر ادیب بنا دیتے ہیں۔ کئی بار میں نے سوچا میں بھی میرزا صاحب کے نقشِ قدم پر چل کر ہردلعزیز بن جاؤں مگر اب تک اللہ نے مجھے اس کی توفیق نہیں دی۔

میرزا صاحب کے عموماً دو ہی موڈ ہوتے ہیں، یا تو آپ سے مل کر بچھے بچھے جائیں گے، یا پھر بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھیں گے۔ بفضلِ خدا مجھے ان کے دونوں ہی موڈوں سے واسطہ پڑا ہے۔

میں نے ایک بار اپنا کوئی فیچر بڑی محنت سے مرتب کر کے میرزا صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ میرزا صاحب ورق الٹ الٹ کر دیکھتے اور پڑھتے رہے۔ شامتِ اعمال پوچھ بیٹھا: "میرزا صاحب یہ چیز پسند آیا؟"

"ہاں، ٹائٹل اچھا ہے۔"

میں کٹ گیا، جل گیا مگر خاموش رہا۔ بڑے تھے اس لئے احترام لازم تھا۔ کوئی تین چار ماہ بعد میرزا صاحب بھی اپنا سالنامہ لے کر آ نکلے۔ میں ابھی پرچہ ادھر ادھر سے دیکھ ہی رہا تھا کہ میرزا صاحب پوچھ بیٹھے: "کیسا ہے؟"

"اس کا ٹائٹل بھی اچھا نہیں۔"

میرزا صاحب عموماً دو دو میل تک پیدل مارچ کرتے ہیں۔ آپ انہیں اس پیدل مارچ میں اکیلا کم ہی پائیں گے، کوئی نہ کوئی نوآموز ادیب ضرور ساتھ ہوگا۔ یہ بڑے ادیبوں سے ان کے گھر پر اور نوآموز ادیبوں سے سڑکوں پر ملا کرتے ہیں۔

یہ بے حد نیک مگر ضرورت سے زیادہ سادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یار لوگ ان سے دل لگی سے بھی باز نہیں آتے۔ میرزا صاحب کی آرزو تھی کہ وہ بھی لمبی کہانیاں لکھیں۔ مدتوں کی خواہش اب پوری ہوئی ہے۔

سنا ہے کسی ستم ظریف ڈاکٹر نے ایک ایکٹرس سے یہ کہہ رکھا ہے کہ جب میرزا صاحب آئیں تو ان سے ہاتھ ملایا کرو، جب جائیں تو بھی دو چار میٹھی میٹھی باتیں کر لیا کرو —— وہ ایکٹرس اس سے بھی تیز۔ مکتبۂ اردو ٹیلیفون کرتی ہے —— "ہائے میرزا صاحب کہاں ہیں؟ انہوں نے تو یہ وقت مجھ سے ملنے کا مقرر کر رکھا تھا۔"

ادھر کارکنانِ مکتبۂ اردو حیران! —— "ہوں میرزا صاحب!"

---

[1] ان پر ایک صحیح مکمل مضمون اس اشاعت میں موجود ہے اس لئے آپ ان چند سطروں کو درخورِ اعتنا ہی نہ سمجھیں۔

میرزا صاحب خود ہی ناراض ہوتے رہتے ہیں، خود ہی راضی ہوتے رہتے ہیں۔ نہ ان کی کبھی ناراضی کا پتہ چلا، نہ راضی ہونے کا۔ یہ گھڑی کے ٹائم پیس کی طرح دو کے بعد تین بجاتے ہی رہتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ایڈیٹری کی بحث میں سوتنوں والا رشتہ ہے۔ میرزا اس پکار کر چلتے آگے ہی جائیے گا۔ وہ کبھی کبھی اپنے پرچے میں میرے اور میرے پرچے کے خلاف لکھ کر یا لکھوا کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے بھی یہاں واشگاف انداز میں اقرار نہیں کیا کہ میرزا صاحب بے حد مخلص، نیک، پڑھے لکھے، دلچسپ اور قابلِ احترام شخصیت ہیں۔

خدا ہم دونوں پر رحم کرے۔

بلونت سنگھ[1]

اتنا تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ یہ سکھ ہیں۔

ان سے بڑی لمبی سی خط و کتابت ضرور تھی مگر باقاعدہ جان پہچان اس وقت ہوئی جب میں اس خالص پنجابی دوست سے ملنے الٰہ آباد گیا۔ وہ بھی ان دنوں جب پاسپورٹ کے سو جھمیلے ہیں۔

الٰہ آباد اس کے اور میرے پنجاب سے سینکڑوں میل دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بلونت سنگھ سے ملاقات ہوئی تو اس نے مجھ سے جو بات سب سے پہلے پوچھی یہ تھی: "پنجابی دوستوں کا کیا حال ہے؟ فلاں کیسا ہے اور فلاں کیسا ـــــ کیا آج بھی انارکلی میں شام کو ویسی ہی رونق ہوتی ہے؟ کیا لوگ اب بھی شام کو مال روڈ پر ٹہل کر لارنس میں جا کر ٹھنڈک لیتے ہیں؟ اور کیا کوئی ایسی صورت نہیں نکل سکتی کہ میں لاہور کو ایک نظر پھر سے جا کے دیکھ لوں؟"

میں سوائے اس بات کے اور کیا جواب دیتا کہ الٰہ آباد سے امرتسر سینکڑوں میل دور ہے اور امرتسر سے لاہور ہزاروں ہی میل دور!

بلونت سنگھ نے جب مجھے "طفیل جی!" کہہ کر پکارا تو میری روح خوش ہو گئی۔ اس لئے کہ اس سے پہلے مجھے کسی نے بھی اتنی محبت سے نہیں پکارا تھا۔ صرف اس تخاطب ہی میں ان کے جتنا نزدیک پہلے تھا اس سے زیادہ نزدیک ہو گیا۔ اس لئے کہ ان کی محبت اور ان کا خلوص پہلے ہی مجھ پر قبضہ کر کے اپنا چکا تھا۔

یہ سکھ ہیں مگر سکھوں کے جانی دشمن ـــــ خود کہتے ہیں کہ سکھ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔ پھر سکھوں کے نام سے منسوب کر کے وہ وہ من گھڑت اور شاندار لطیفے سناتے ہیں کہ کوئی باور کر ہی نہیں سکتا کہ یہ جو صاحب لطیفے بیان کر رہے ہیں ان کا واسطہ سکھ قوم سے بھی ہو سکتا ہے۔ ابھی تک اپنے کرتار سنگھ کو معلوم نہیں ہے کہ ان کی قوم میں ایک سکھ ایسا بھی موجود ہے جو سکھوں کا سب سے بڑا دشمن ہے۔

بلونت سنگھ بڑے خوبصورت اور وجیہہ ہیں۔ وہ جو منٹو نے موذیل میں ترلوچن سنگھ کے بارے میں لکھا تھا کہ "وہ اگر داڑھی مونچھ منڈوا دے تو کئی لوگ اسے آنکھیں ماریں۔" وہ ان پر بھی بالکل ٹھیک بیٹھتا ہے۔

مجھے اس کا تو علم نہیں ہے کہ یہ آدمی کنجوس بھی ہیں یا نہیں۔ مگر یہ رکشا والوں سے پیسے چکاتے ہوئے بڑا لڑتے ہیں ـــــ "وہاں کا کیا لوگے؟ ـــــ چار آنے۔ ـــــ دو آنے دوں گا ـــــ" رکشا والے کے انکار پر یہ اس منزل کی طرف منہ کر کے چلتے جائیں گے۔ راستہ بھر ہر رکشا والے سے پوچھتے جائیں گے ـــــ "بھئی وہاں کا کیا لوگے؟" ظاہر ہے جب منزل آدھی سے زیادہ پیدل چلتے چلتے ہی کٹ جائے گی تو رکشا والا خود بخود کم پیسوں پر راضی ہو جائے گا۔ تب یہ اس پر بڑے فخر سے سوار ہو جائیں گے اور یہ بھی کہہ دیں گے۔ وہ پہلا چار آنے مانگتا تھا بیوقوف کہیں کا۔

---

[1] انہیں میں نے لاہور کے ادیبوں میں اس لئے شامل کر لیا ہے کہ یہ لاہور کافی عرصہ رہے ہیں اور پہلی بار میں نے انہیں یہیں دیکھا تھا۔

میں نے ان سے شکایت کی: "آپ مجھے اسٹیشن پر لینے کیوں نہیں آئے؟"

"طفیل جی! مجھے تو یہ علم ہی نہ تھا کہ آپ آج آنے والے ہیں!"

"میں نے خط جو لکھا تھا!"

"بھئی معاف کرنا میں نے اپنا پوسٹ بکس لے رکھا ہے میری ڈاک اس میں جمع ہوتی رہتی ہے۔ آٹھویں دسویں دن اُدھر جاتا ہوں تو ڈاک لاتا ہوں۔ اس لئے آپ کا خط اگر بھی مجھے اب تک نہیں ملا۔ اب آپ کے جانے کے بعد فرصت ملے گی تو جا کر ڈاک لاؤں گا۔ اگر آپ کا اس مضمون کا خط مل گیا تو اسٹیشن ضرور چلا جاؤں گا۔ وہاں سے آپ کو لاؤں گا اور اپنے ہاں ٹھہراؤں گا۔ علاقہ بھی تو دیکھنا ہی۔"

ان دنوں ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس لئے یہ پوچھنا ضروری تھا: "بھابی کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟"

"آج کل وہ بےچاری اپنے ماں باپ کے پاس گئی ہے وہ بھی سکھنی۔"

"کیا مطلب؟"

"اس سے زیادہ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ اگر میری والدہ نے میری یہ باتیں سن لیں تو بہت ہی برا ہوگا۔"

"بہت ڈرتے ہیں؟"

"ہاں اس لئے کہ میرا ان کا معاہدہ ہے کہ میں صرف ان کی بہو کے بارے میں کچھ نہ کہا کروں اور دنیا جہان کی سکھنیوں کے بارے میں جو بھی چاہے کہتا رہوں۔"

"اچھا تو یہ موضوع گھر سے باہر زیر بحث آئے گا؟"

"منظور!"

پھر اتنا وقت ہی کب تھا کہ اتنے شاندار موضوع پر بھی گفتگو ہو سکتی۔ بھاگم بھاگ میں جن جن موضوعات پر گفتگو ہوئی اور ان سے میں نے جو نتیجے اخذ کئے وہ یہ ہیں:

محبت کے قابل انسان، مخلص، بھولا بھالا، لطیفے باز، گفتگو میں ذاتی، دوستوں پر بھروسہ کرنے والا، بزدل اور کاہل ہونے کے ساتھ صد درجہ دلچسپ ــــ اور پیارا۔

واپسی پر جب گاڑی کے چھوٹنے میں وقت بہت ہی کم رہ گیا تو میں نے یاد دلا کر جانے کیا اوٹ پٹانگ بات کر دی تو انہوں نے بڑے دکھ میں کہا ــــ "ہو گیا نا آپ پر بھی سکھنی کا اثر؟"

عشرت رحمانی

"جائیے، لے جائیے اپنا کنٹریکٹ، میں مضمون نہیں پڑھوں گا۔"

جن صاحب سے یہ کہا جا رہا تھا جب وہ "بہت اچھا" کہہ کر چلے گئے تو میں نے شوکت تھانوی صاحب سے دریافت کیا: "ان کی تعریف؟"

"عشرت رحمانی۔"

یہ واقعہ ہے لکھنؤ کا، غالباً ۱۹۴۰ء کا، نہ جانے اس وقت میرے دل میں یہ جذبہ کیوں پیدا ہوا کہ جن صاحب کو شوکت صاحب نے یہ زوردار ڈانٹ پلائی ہے وہ بیچارہ بے حد معقول ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں لاہور چلا آیا۔ عشرت صاحب وہیں ریڈیو اسٹیشن پر رہ گئے۔

دوبارہ لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا تو عشرت صاحب کی شوکت صاحب سے پھر گاڑھی چھن رہی تھی۔ اگر عشرت صاحب کی جگہ میں ہوتا تو شوکت صاحب

سے عاری نہ ہوتا۔

انھی دنوں عشرت صاحب نے مجھے لکھنؤ ریڈیو پر آنے کی دعوت دی جسے میں نے منظور کر کے نامنظور کر دیا اس لئے کہ جان بوجھ کر حاضر نہیں ہوا۔ جب میں لاہور آگیا تو انھوں نے مجھے شکایت کا خط لکھا، شکایت قطعی حق بجانب تھی۔ اگر میں کوئی لاٹ صاحب ہوتا تو مجھے ایسے نخرے بھیجتے بھی، اک ذرا سا لوٹتا، اس پر یہ سو سو نخرے، مگر ان ساری باتوں سے مجھے سو آنے یقین ہو گیا کہ عشرت صاحب ہیں پیار کے قابل۔ شوکت صاحب جو انھیں تو بھی یہ دوستی کا دم بھرنے سے باز نہ آئیں۔ مجھے بلائیں اور میں حاضر نہ ہو کر حماقت کروں تو پھر تعلقات جوں کے توں۔

کسا خیال کا یہ ہوا کہ یہ پاکستان بن جانے کی وجہ سے پہلے لکھا کہ تجھے پھر لاہور آگئے۔ لاہور آکر اگر میرے پاس خود نہ آتے تو عشرت عشرت کہاں رہتے ہی نہیں۔ اب میری ان کی گھٹنے لگی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ میں نے انھیں اور انھوں نے مجھے اپنا راز داں سمجھ لیا اور ہم دونوں نے اپنے دیرینہ دوست اور کرم فرما شوکت تھانوی کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ وہ کہتے شوکت صاحب میں یہ خرابی ہے' میں کہتا 'اللہ کی شان کہ ہم دونوں کی اچھی خاصی پر خوب بجتی۔ مگر حاصل کلام ہمیشہ یہی رہا کہ یار شوکت صاحب ہیں جو یہ خوبیاں ہیں' انھوں نے ان کی تمام برائیوں پر پانی پھیر رکھا ہے۔

عشرت صاحب نے ہمیشہ سب سے دل و جان ہی کے ساتھ تعاون کیا ہے۔ میں نے بھی جب ان سے کوئی خواہش کی ہے تو انھوں نے اسے بستر مرگ پر بھی پورا کیا ہے۔ بستر مرگ میں نے اس لئے لکھا ہے کہ پچھلے دنوں انھوں نے ایک بڑی خطرناک بیماری کا آپریشن کرایا تھا۔ بظاہر بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ مگر انھوں نے میری خواہش پہنچنے پر اپنی بے پناہ تکلیف کے باوجود وائے واٹنگ کے لئے میرا الجھا مسئلہ سلجھا دیا۔

اپنے عشرت صاحب کی یہ بڑی خواہش ہے کہ سب لوگ مل کر انھیں علامہ کہیں۔ میں نے کئی بار سوچا ہے۔ اگر اور کم بختوں کو اس بات کا خیال نہیں آتا تو میں ہی اپنے دوست کا دل رکھ لوں۔ ہزار کوشش کے باوجود مجھ سے اب تک یہ نہیں ہو سکا۔ اگر عشرت صاحب کو معلوم ہو جاتا کہ اس قسم کی کوئی میری خواہش ہے تو وہ اپنے ذریعے سے اب تک سرخرو ہو چکے ہوتے۔

جن کے دوست عشرت صاحب ہیں وہ سب خوش نصیب ہیں مگر عشرت صاحب کو ایسے دوست نہیں ملے جن سے ان کی خوش قسمتی کا پتہ چل سکتا۔

پچھلے دنوں عشرت صاحب نے مجھے نئے کھدر کے کپڑوں کا ایک گٹھڑ دے کر کہا کہ اسے اپنے پاس رکھ لو۔ جو میرا رقعہ لائے اسے دے دینا۔ بہت دنوں تک یہ گٹھڑ ادھر ادھر پھٹکتا رہا۔ ایک دن ہمارے محلے کے ایک ڈاکٹر صاحب نے اسے جو میرے کہہ کر پھینکا تو اس میں سے خوشبو کے بھبکے نکلنے لگے۔ دو ساتھ ہی کوئی چیز بہہ نکلی، معلوم ہوا تیل کی شیشی تھی جس کے دو آنچ پورے ہو گئے ہیں۔ تمام کپڑوں کا ناس مار گیا ——— جو صاحب رقعہ لانے والے تھے وہ رقعہ لائے اور کپڑے لے گئے۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے عشرت صاحب سے کپڑوں کی خرابی کا ضرور تذکرہ کیا ہوگا مگر عشرت صاحب کی زبان پر آج تک شکایت نہیں آئی۔ انسان ہو تو اس پائے کا ورنہ نہ ہی ہوتا اچھا ہے۔

ظہیر کاشمیری

پہلے پہل جب دیکھا ایک آدمی موٹر سائیکل پر — موٹر سائیکل کی حیثیت بھی عام موٹر سائیکلوں سے الگ اور سوار کی بھی عام آدمیوں سے مختلف، انفرادیت ہی انفرادیت۔ عموماً بچے موٹر سائیکل کا مذاق اڑاتے ہوئے اور سوار پر ہنستے ہوئے پیچھے بھاگتے چلے گئے ——— مگر وہ سوار ہیں، اعتماد کی آبشار، ظہیر کاشمیری۔

گفتگو کے عام موضوعات میں انھوں نے کسی سے بات کر لی تو عام سی باتوں سے چونکانے کا بھی اور مرعوب بھی ہوگا۔ چونکانے کا اس لئے کہ پھر تحقیق اور کی تفصیلات بتانا شروع کر دیتے ہیں اور اشتراکی نقطۂ نظر سے ہر بات کا جائزہ لینے لگتے ہیں۔ مثلاً اگر سڑک پر ایک مزدور بوجھ اٹھائے ایک صاحب کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے تو ان کی تقریر یہ ہوگی: "محنت جو سرمایہ داری پر اور اس معاشرے پر جس میں ہم لوگ سانس لے رہے ہیں۔ اصل میں چاہتے تو یہ تھا کہ یہ جو صاحب با

آگے آگے جا رہا ہے اس کے سر پر گٹھڑ ہوتا اور جو پیچھے پیچھے جا رہا ہے اسے آگے آگے صاحب بنے جانا چاہئے تھا۔"

لوگ کہیں گے: "بات تو ایک ہی ہوتی۔ پھر بھی ایک مزدور رہتا اور ایک آقا۔"

"ہاں صاحب! بات تو ایک ہی ہوتی مگر ایک بار ایسا ہو تو جاتا۔"

نظیر صاحب کا خیال ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ پڑھ لکھ گیا ہوں اور ان کے نقطہ نظر سے سوچنے والوں میں مجھ جیسا جوہر قابل کوئی اور نہیں ہے۔ ذرا ادھر ادھر۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ اپنے ہی نقطہ نظر کے ادیبوں کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں۔ اگر ہر نقطہ نظر سے لکھنے والے کو اسی ایک لاٹھی سے ہانکنے لگتے تو بڑی مشکل ہو جاتی۔ ہم کہتے اقبال آپ سے بڑا شاعر تھا۔ یہ کہتے چونکہ اقبال مر گیا ہے اس لئے آپ اسے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ جب میں بھی مر جاؤں گا اس وقت اس بات کا فیصلہ کرنا۔

آج کل یہ میکلوڈ روڈ کے چوک میں کرسی ڈال کر اپنے ارد گرد تین چار رسیا بچوں کو بٹھا کر انگلی اٹھا اٹھا کر بازو لہرا لہرا کر تقریر کرتے رہتے ہیں۔ راستہ چلتے لوگ بھی ٹھہر جاتے ہیں مگر ان کی تقریر جاری ہی رہتی ہے۔

حقیقی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے مجھے ہمیشہ سے جاہل سمجھ کر بات ہی نہیں کی ہے۔ اگر بات کی بھی ہے تو میری ان کی بنی نہیں ہے۔ میری بدقسمتی ہے یا خوش قسمتی اس پر میں نے آج تک غور ہی نہیں کیا ہے۔

اگر انہوں نے بات کی بھی تو اتنی کہ راہ چلتے موٹر سائیکل سے اترے اور اپنی تازہ غزل پورے دبدبے کے ساتھ سنا کر چل دئیے "میں ابھی ان کی غزل کے تیوروں پر غور ہی کر رہا ہوں" کہ یہ اپنے رستے لگے [illegible]۔

جب یہ اپنا کلام سناتے ہیں تو بڑے ہی اعتماد کے ساتھ اور یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھ سے بہتر کوئی مائی کا لال لکھ کر تو دکھا دے۔

مشاعروں میں لوگ ان کی صورت دیکھ کر ہنس دیں تو ہنس دیں مگر ان کے کلام سے مرعوب ہی ہو کر جاتے ہیں۔ خوب نکھرے ہوئے پیارے پیارے الفاظ، نئے نئے، کہ دل میں اترتے چلے جائیں مگر ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مشاعرے میں ہوٹ ہو گئے۔

سخت پریشان ہوئے۔ کہنے لگے "دوستو! میں آج تک ہوٹ نہیں ہوا تھا اس لئے کیا آپ لوگ اپنی ہوٹنگ واپس نہیں لے سکتے؟"

"بیٹھ جاؤ!"

"ہائیں!"

قدرت اللہ شہاب

یہ غالباً ۱۹۵۰ء میں محکمہ نشر و اشاعت میں سیکرٹری ہو کے آئے تو میں نیاز مندی کے شوق میں ان کے پاس پہنچا۔ کارڈ بھیجا۔ جواب ملا "انتظار کیجئے۔" انتظار کیا تو بلاوا نہ آیا۔ آہستہ آہستہ خون کھولنے لگا۔ بالآخر یہ رقعہ لکھ کر چلا آیا:

"میں ناچیز آپ ایسے لاٹ صاحب سے ملنے چلا آیا تھا۔ آپ کو فرصت نہیں۔ مجھے بھی
مزید تاب انتظار نہیں۔"

کوئی پندرہ دن کے بعد یہ "لاٹ صاحب" خود میرے دفتر میں آ نکلے اور آتے ہی جو بات کی وہ یہ کہ "میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں مگر میں اس دن مجبور تھا۔ ایک بڑی ہی ضروری میٹنگ ہو رہی تھی جس میں خود متعلقہ وزیر صاحب بھی شامل تھے اس لئے آپ کو فوراً بلانا مشکل ہو گیا تھا۔"

ان کی اس معذرت کے بعد نہ صرف یہ کہ انہیں معاف کر دینے کو دل چاہا بلکہ اپنی ندامت ہوئی کہ اتنے عمدہ آدمی کے بارے میں جو میں نے رائے قائم کر لی تھی وہ کس قدر غلط تھی۔

اس کے بعد یہ دن بدن بڑے افسر بنتے گئے مگر انھوں نے اپنی وضع نہ بدلی۔ جب بھی کراچی سے لاہور آئے، اس خاکسار سے ملے بغیر نہ گئے۔ یہ چھوٹوں کے پاس خود جاتے ہیں، بڑوں کو اپنے ہاں حاضر ہونے کا موقع دیتے ہیں۔

کوئی ڈھائی تین برس پہلے یہ جھنگ میں ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر تھے۔ ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا اس نوکری میں تو بڑے شادماں ہوں گے۔ کہنے لگے حقیقتاً نہیں۔ جو کام کرنا پڑتا ہے، برس ہا برس سے لوگوں کے حقوق سے چل رہے ہیں اور بغیر کسی وجہ کے چل رہے ہیں۔ کوئی بھی افسر اپنے فرائض کو نہیں پہچانتا۔ ناداروں اور غریبوں کے لئے کچھ روپیہ حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ وہ تک کارندے کھا جاتے ہیں۔ عجیب مصیبت میں جان آگئی ہے۔ اب میں نے حکم دے رکھا ہے کہ جس کسی کو شکایت ہو وہ مجھ تک براہِ راست پہنچے۔ چنانچہ سیکڑوں درخواستیں روز پہنچتی ہیں۔ میں ان کی درخواستوں پر متعلقہ افسر کو لکھ دیتا ہوں کہ یہ کام فلاں تاریخ تک ضرور ہو جانا چاہئے۔ اس طرح برسوں کے لٹکے ہوئے کام چند مہینوں میں ہو رہے ہیں ـــــ اب ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ناداروں اور غریبوں کا روپیہ خود لے کر نکلتا ہوں اور جس جس کا حق ہے انھیں خود اپنے ہاتھ سے دے کر آتا ہوں۔ ورنہ اس سے پہلے روپیہ منظور کسی اور کے لئے تھا اور کھاتا کوئی اور تھا۔"

ایک بڑا دلچسپ واقعہ بھی سنایا:

"میں نے ایک مزارعہ کی درخواست پر پٹواری کو یہ لکھ دیا کہ یہ کام فلاں تاریخ تک ضرور ہو جانا چاہئے۔ جب میرے آرڈر لے کر مزارعہ پٹواری کے پاس پہنچا تو اس نے وہ درخواست ہی لے کر پھاڑ دی اور مجھے بھی دو چار سنا دیں۔ اطلاع ملنے پر میں خود اس کے پاس گیا اور اس سے کہا جناب اس غریب کا کام کر دیجئے۔ مجھے بھی اس نے نہ پہچانا۔ جب وہ اخلاق سے گری ہوئی باتیں مجھ سے بھی کرنے لگا تو میرے ساتھیوں میں سے ایک بول پڑا۔ یہ ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر ہیں لہٰذا ادب سے بات کرو ـــــ جہاں حالات ایسے ہوں وہاں آدمی کس طرح شادمانی سے نوکری کر سکتا ہے؟"

"آخر آپ نے اس پٹواری صاحب سے کیا سلوک کیا؟"

"بس ہنس کے چلا آیا تھا۔"

یہ تو ان کی انسان دوستی اور نرم دلی کا حال ہے۔

اتنے نرم دل انسان نے جب بھی قلم سے کام لیا ہے تو اس نے برسائی آگ ہی ہے۔ یہ حکومت کے ہمیشہ بڑے اور اہم عہدوں پر رہے مگر ان کی بیشتر تحریریں حکومت کے خلاف ہی پڑھنے کو ملیں ـــــ معاشرہ کی کسی نہ کسی خرابی پر بلا جھجک لکھیں گے، خواہ کچھ ہو جائے۔

انھوں نے ایک کتاب "ڈپٹی کمشنر کی ڈائری" کے نام سے لکھ رکھی ہے، وہ چھپواتے نہیں ہیں۔ شاید ڈر گئے ہوں۔ اگر بات یہی ہے تو اس کو ان کی بزدلی پر محمول نہ کیجئے۔ وہ کتاب ہی انتہائی خطرناک ہوگی۔

ان جیسے سادہ لوح، انسان دوست، بھولے بھالے، مخلص اور دیانتدار افسر میری ان گنہگار آنکھوں نے کم دیکھے ہیں۔

قیوم نظر

یہ میرے وہ دوست ہیں جن کا کلام سمجھنے کے لئے مجھے کئی کئی ہفتے خمیرہ گاؤ زبان کھانا پڑتا مگر شعر پھر بھی سمجھ میں نہ آتے۔ ان کی اب تک جتنی بھی چیزیں نقوش میں چھپی ہیں وہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ پیش اس لئے کر دیں کہ اگر کوئی چیز میری سمجھ میں نہیں آتی تو ضروری نہیں ہے کہ کسی کی بھی سمجھ میں نہ آئے۔ یہاں چند ایک ادیبوں کا ایک اکھاڑہ ہے اس کے یہ خلیفہ ہیں۔ اس اکھاڑے میں بھی بڑے بڑے تیکھے ہیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر جغادری

٭ مجھے اس اکھاڑے کی افادیت سے انکار نہیں۔

ان سب کے علم کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ دور دور سے لوگ ان کے علم سے استفادہ کی خاطر آتے ہیں مگر اپنی بے علمی کی بنا پر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ میرا مشورہ تو ان دوستوں سے (خاص کر قیوم صاحب سے) یہ ہے کہ اپنے علم کو لوگوں کی سطح پر لے آئیں۔ جیسے جیسے پبلک کا شعور بڑھے خود بھی سیڑھیاں چڑھتے جائیں ورنہ کسی دن یہ ہوگا کہ اس اکھاڑے کے تمام ادیب قطب مینار پر چڑھ جائیں گے اور مجھ جیسے کم علم، ادب کے چٹیل میدان میں کھڑے کے کھڑے رہ جائیں گے۔

قیوم نظر سے میری دوستی بڑی پرانی اور شراب کہنہ کی طرح تیکھی ہے۔ کوئی ناراض ہو تو قہقہے لگانے والا، کوئی خوش ہو تو قہقہے لگانے والا آج کل بہت فکرمند ہے اس لئے کہ حکومت پاکستان نے میرے اس پیارے دوست کو خواہ مخواہ پاکستان کے نمائندہ ادیب کی حیثیت سے یورپ کے دورے پر بھیج دیا ہے۔ ان کی پریشانی کی وجہ میرے نزدیک تو یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے پائے کا باہر کوئی ادیب نہ ہوگا۔ اب یہ بات کریں گے کس سے؟ یہاں تو انھوں نے بہ ہزار دقت چند ایک دوست ایسے ضرور پیدا کر لئے تھے جو ان کے علم سے پوری طرح آگاہ تھے۔

یہ ان تمام ادیبوں کے خیر خواہ نہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ کہتے ہیں ہم پنجابی بولتے ہوئے اردو میں لکھتے ہیں یہ اردو بولتے ہوئے اردو میں کیوں لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بڑے پیار سے اردو بولنے والوں کو ستاتے رہتے ہیں۔ میں بھی سہ لیتا ہوں یہی۔ مگر اتنے تعلقات کے باوجود مجھے اب تک اس کا قائل نہیں بنا سکے کہ میں بھی ان کا ہم زبان ہو سکتا۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ ان کی طبیعت میں بڑی قلندری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تعلق جوڑ توڑ کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ برس ہا برس سے اس ایک اکھاڑے کی سرداری ان کے سر تھوپی جا رہی ہے۔ یہ غریب ہیں کہ اپنے فرض کو نبھا رہے ہیں۔ انتظامی معاملات کی بھی ان میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکھاڑے میں جو کوئی دو ہاتھ دکھاتا ہے اسے بذریعہ ریزولیوشن خارج کراتے جاتے ہیں۔

اگر کسی ہوٹل میں ایک میز کے اردگرد چند وحشی نیازمند بیٹھے ہوں اور دور دور سے قہقہے ہوٹل کے کمرے سے بے تحاشا باہر نکل رہے ہوں تو سمجھ لیجئے اس محفل کا امام قیوم نظر ہے جو اپنا بہترین دوست ہے۔

یہ سب کے سب چائے پئیں گے چاپس کھائیں گے جب بیرا بل لے کر آئے گا تو سب سے مساوی مساوی پیسے اکٹھے کریں گے اور چائے کا بل ادا کر کے بیرے کو ٹپ اپنی طرف سے کریں گے۔

میری بدقسمتی کہ اب یہ زیادہ مصروف ہو گئے ہیں اور میرے پاس کم آنے لگے ہیں۔ بیچ میں تو بالکل ہی آنا بند کر دیا تھا۔ پھر میں نے منت خوشامد کر کے ان کی آمد کو بحال کیا ہے۔ یہ آ جاتے ہیں تو میں بھی دو گھڑی ہنس لیتا ہوں۔

یہ یورپ کا دورہ کر کے آ جائیں تو سوچتا ہوں میں بھی منیری اور رنگوں سے جا کر باقاعدہ ان کا چیلا بن جاؤں۔ دوستی اپنی جگہ یہ سلسلہ اپنی جگہ۔ اگر میرے کسی بدخواہ نے میرے اس ارادے کو فسخ نہ کرا دیا تو میری دنیا ضرور سنور جائے گی۔

قیوم صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ باہر جا کر مجھے ضرور خط لکھیں گے۔ اگر انھوں نے مجھے خط لکھا تو میں جواب ضرور لکھ دوں گا کہ میں نے آپ کی زندگی کا مطالعہ کر کے اب یہ عہد کر لیا ہے کہ باقی زندگی میں آپ ہی کے نقش قدم پر چلوں گا۔

ابراہیم جلیس

یہ حیدرآباد دکن کی یادگار ہیں۔ جب پولیس ایکشن ہوا تو ریڈیو اسٹیشن پر اس وقت بھی ہندوستانی سامراجیوں کے رضاکاروں کے مقابلہ میں پیش پیش رہے تھے۔ اسی بہادری کی بنا پر انھیں پاکستان آنا پڑا۔

انھوں نے آتے ہی اپنا رونا بڑے دلچسپ انداز میں لکھ کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی میٹنگ میں پڑھا۔ اللہ اللہ خوب واہ واہ ہوئی، قطب بن گئے

ادیبوں نے انہیں سر پر چڑھا لیا۔ جب سے سر پر چڑھے اب اترے ہیں۔

سو خوبیوں کی ایک خوبی ان میں یہ ہے کہ انہیں اپنے ملنے والوں کو یوں بے وقوف ہی بنانے کی دھن سوار رہتی ہے۔ کوئی سنجیدہ بات ہو رہی ہوگی تو یہ فقرے بازی پر اتر کر اس گفتگو کی اہمیت ہی کو ختم کر کے رکھ دیں گے۔ موضوع اگر شعر و غزل کا ہو تو ایک دم سنجیدہ ہو جائیں گے، جیسے معنویت ان پہ ختم ہو۔

جب یہ لاہور سے کراچی چلے گئے تو خیال تھا کہ حیدرآبادی ہیں، بدل گئے ہوں گے مگر ملاقات ہوئی تو یہ وہی جلیس تھے جو اس سے پہلے لاہور میں تھے۔ وہی زندگی وہی ہنسی مذاق اور وہی سنجیدگی۔ مگر اتنے پر انہیں ضرور لگ گئے تھے کہ چین ہو آئے تھے۔

مجھے چین کی ہر چیز دکھائی، وہ چیز دکھائی، سامان دکھایا، فوٹو دکھائے، ان میں سے ایک فوٹو نکال کر اور ایک لڑکی کی تصویر پر انگلی رکھ کر "خوب لڑکی تھی یہ بھی۔ کاش میرے ساتھ آ سکتی۔ مجھ سے تو جدا ہونا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جب سے یہاں آیا ہوں اس کے چار خط آ چکے ہیں۔ میں نے فوراً جواب دے کر یہ لکھ دیا ہے کہ فوراً یہاں آ جاؤ، میرا بنگلہ حاضر ہے، میری گاڑی حاضر ہے۔"

میں ان کے اس انکشاف پر حیرت زدہ ہو گیا کہ یہ خود تو ہوٹل میں کرایہ پر رہتے ہیں، سواری کے لئے رکشا والے کی منت خوشامد کرتے ہیں۔ آخر ماجرا کیا ہے؟

"کیا یہ دونوں چیزیں بھی آپ کو چینی حکومت نے دی ہیں؟"

"ابھی نہیں۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اب بنگلہ ضرور ہو گا، موٹر ضرور ہو گی۔ اس لئے اسے بلا رہا تھا کہ آ کر اپنی چیزیں سنبھالو۔"

"اچھا تو جناب یہ بنگلہ اور موٹر تو بعد میں خرید لیجئے گا۔ مجھے آج کل میں ایک افسانہ ضرور لکھ دیں۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔ آج کل میں پیسوں کے ہاتھوں بہت پریشان تھا۔"

"روپے ضرور ملیں گے، مگر جیسا افسانہ ہو گا اتنے۔"

"طے۔"

دوسرے دن شام کو ایک افسانہ لائے۔ "بھئی طفیل افسانہ سنو۔ ایک سو روپے والا افسانہ لایا ہوں۔" افسانہ سنانے کے بعد پوچھا۔ "کہو کیا قیمت لگاتے ہو؟"

"پوری ایک اکنی۔"

بے اختیار قہقہہ لگایا جسے اڑوس پڑوس میں سب نے سنا۔

اسی دن کسی کالج میں مشاعرہ تھا مجھے ساتھ لے گئے۔ میں نے ان سے کہا، "میرا کسی سے تعارف نہ کرائیے گا۔ جو مجھے جانتا ہو گا اس سے میں خود مل لوں گا۔ نئے تعارف نہیں چاہتا۔"

"بہت اچھا۔"

مشاعرہ شروع تھا۔ اب جس شاعر کا نام پکارا جاتا اس کے بارے میں ان کے اس قسم کے ریمارک سننے پڑتے۔ مثلاً اس شاعر کی بیوی بڑی خوبصورت ہے اس لئے اس کی اور اس کی نہیں بنتی، اس کی ساری شاعری بیوی کے فراق میں ہوتی ہے ——— دیکھنا یہ شاعر جو اٹھ رہا ہے چارج لے کر کے آیا ہے کہ پبلک ہی کو ہوٹ کر کے جاؤں گا۔ اس لئے کہ اس سے پہلے اس بے چارے کو پبلک ہی ہوٹ کرتی چلی آئی ہے۔

مشاعرہ ختم ہوا تو اس کے بعد کالج کی طرف سے کھانے کا بھی انتظام تھا۔ چونکہ ایک میرے جاننے والے تھے ان سے چوری چوری مل ہی چکا تھا ——— کھانا ایک بڑا دھرا تھا، سب ہکال ہکال کر بڑے انہماک سے کھا رہے تھے۔ صرف مجھے چھپکلی کی آوازیں آ رہی تھیں اور نہ کھانا کھا سکتا کہ یہ

پھٹ سے میری طرف اشارہ کر کے بول پڑے۔ ”حضرات! یہ صاحب جو بہت تیزی سے کھا رہے ہیں ان سے میں نے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں ان کا کسی سے تعارف نہیں کراؤں گا۔“

جلیس صاحب بڑے اچھے آدمی ہیں۔ بس اتنا چاہتے ہیں کہ سب لوگ انھیں بڑا لکھنے والا مانیں اور میری چھوٹی باتوں پر بھی یقین کر لیں۔ ان دو خواہشوں کے علاوہ ان کی کوئی تیسری خواہش نہیں ہے۔ وہ بنگلے، موٹر اور لڑکی والی بات ان کی خواہش میں شامل نہیں ہے۔ ہو جائے تو ہو جائے ورنہ انھی دو باتوں پر ساری زندگی گزار دیں گے۔

کوئی چھ برس کراچی رہنے کے بعد آج کل پھر لاہور آئے ہوئے ہیں۔ کوئی چار پانچ مرتبہ مجھے ملنے بھی آئے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں ابھی تک ان کے ہتھے نہیں چڑھا۔

سیف الدین سیف

میری ان سے آج سے کوئی پندرہ برس پہلے، جب یہ کالج میں پڑھتے اور خاکسار تحریک سے عملاً تعلق رکھتے تھے، امرتسر میں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ان کی شاعری کا بسم اللہ کا دور تھا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے مجھے اپنی دو تین چیزیں بڑی ہی بے یقینی کے ساتھ سنائی تھیں اور یہ بھی بتایا تھا کہ میں شاعری کی پہلی کوشش اپنی دنیا میں کر رہا ہوں، اب دیکھیے کچھ چلتی ہے یا نہیں۔

مجھے آج بھی اردو شاعری اور اس کی تمام تر نزاکتوں اور لطافتوں کا کچھ پتہ نہیں ہے اور اس وقت خاک ہوتا۔ اس کے باوجود مجھے سیف صاحب کے شعر بہت اچھے معلوم ہوئے تھے۔ مجھے خوشی تھی تو اس بات کی کہ زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے کسی شاعر نے اپنا کلام سنایا تھا۔ ان کا سنانا ایسا مہنگا ثابت ہوا کہ آج تک شعری شعر سنتا چلا آ رہا ہوں۔ مجھے تو اب اس حد تک یقین ہو گیا ہے کہ ادھر میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی ہو گی اور ادھر شاعر میرے سرہانے بیٹھا کہہ رہا ہو گا۔ ”طفیل صاحب! ذرا ایک منٹ رک جائیے اور یہ مقطع ضرور سن جائیے۔“

اب سیف صاحب تو مجھے شعر سنانے کی ”تیاگ“ لگا کر خود کسی کو سنانے کے قائل ہی نہیں رہے۔ بہت ہی زیادہ اصرار پر کسی کو دو ایک شعر سنا دیے تو سنا دیے ورنہ نہیں۔

سیف صاحب کا شمار اب ان لوگوں میں ہے جن کی آواز پر دس پندرہ آدمی ایک بلاک میں اکٹھے بھی ہو سکتے ہیں اور جو یہ کہیں وہ حکم کی بجا آوری میں اپنی سعادت بھی سمجھتے ہیں۔

یا غالباً چھ برس کی بات ہے کہ ری ہیبلی ٹیشن والوں نے ان سے مکان خالی کرانا چاہا۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ وہ پولیس لے آئے تو بھی یہ مرعوب نہ ہوئے۔ ایک ہنگامہ ہو گیا۔ دو چار سو آدمی ان کے اکٹھے ہو گئے۔ پولیس کی بھی لاریوں پہ لاریاں آنی شروع ہو گئیں۔ پولیس مردہ باد اور ری ہیبلی ٹیشن مردہ باد کے نعروں میں ہزاروں ہی آدمی شریک ہو گئے۔ ٹریفک بند ہو گئی۔ پولیس کو متنبہ کر دیا گیا۔ اگر زبردستی کی تو نتائج کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔ شورش کاشمیری ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر حکومت کے خلاف تقریر کرنے لگے۔ ہجوم کے نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ اس وقت کے گورنر جناب عبدالرب نشتر کو بذات خود مداخلت کرنی پڑی۔ پولیس لاریوں میں بیٹھ کر اسی جگہ چلی گئی جہاں سے آئی تھی —— لوگوں نے آخری نعرہ جو لگایا وہ یہ تھا: سیف الدین سیف زندہ باد!

اب یہ ادب سے زیادہ فلم کی طرف متوجہ ہیں۔ پہلے انھوں نے فلمی گانے دوسری فلم کمپنیوں کے لیے لکھے، اب اپنے لیے لکھتے ہیں اور اپنے ہی پیسے سے فلماتے بھی ہیں۔

ایک شام کا ذکر ہے کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری موٹر سے اترے اور مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ جہاں پہنچے وہ سیف صاحب کا گھر تھا۔ جوہر

دیکھتا ہوں اُدھر ایک سے ایک ایکٹرس اور ایک سے ایک ایکٹر نظر آ رہا ہے۔ طبیعت ایک دم خوش ہو گئی۔ روز ادیبوں اور شاعروں کی پریشان صورتیں دیکھ دیکھ کر جو کوفت ہوا کرتی تھی وہ ان دمکتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر کافور ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد شاہی پر تکلف کھانا ملا۔ ایکٹروں ایکٹرسوں کے بیچ میں بیٹھ کر اور کبھی انہیں دیکھ کر اور کبھی کھانے کو دیکھ کر جو چیز تھے کھائے اس کا لطف آج بھی نہیں بھولا۔

اس کے بعد حفیظ صاحب نے اپنا کلام جم کے سنایا۔ کچھ ماحول ایسا تھا اور کچھ حفیظ صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا۔ حفیظ صاحب نے اپنا کلام ترنم سے بھی پڑھا، گا کر بھی پڑھا، پڑھا اور خوب پڑھا۔ سامعین سے داد بھی انہیں مل رہی تھی کہ سننے والوں کا بھی دل خوش ہوا جا رہا تھا۔ یہ محفل کوئی صبح تین بجے تک رہی ہوگی۔

سیف صاحب غزل میں اپنا بڑا اونچا مقام سمجھتے ہیں اور شعر و شاعری کو خالہ جی کا گھر نہیں سمجھتے۔ ہر شاعر کی ذہنی اڑان سے لے کر لفظوں کے انتخاب اور غزل کے مزاج پر گھنٹوں بڑی عمدہ باتیں کر سکتے ہیں۔

نقوش کے کسی نمبر کے لئے سیف صاحب نے وعدہ کر رکھا تھا کہ غزل دوں گا۔ حاضر ہوتا تو ملاقات ہی نہ ہوتی۔ تیسری یا چوتھی بار ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ نئی غزل کوئی ہے ہی نہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر انہوں نے کچھ سوچا، نوکر سے پان اور سگریٹ منگواتے اور مجھے آدھ گھنٹہ بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ چنانچہ میرے بیٹھے بیٹھے سات شعر کی ایک خوبصورت سی غزل لکھ کر میرے حوالے کر دی۔

سیف صاحب کی سب لوگ تعریف کرتے ہیں اور ہیں بھی تعریف کے قابل۔ مگر منہ پھٹ بہت زیادہ ہیں، کسی کا دل رکھنے کے لئے بھی ذرا بات نہیں کرتے۔

اے حمید

گلاب کے پھولوں اور رومانی داستانوں کے تذکرہ نگار اے حمید کو نہ تو میں زیادہ جانتا ہوں اور نہ زیادہ پہچانتا ہی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اکثر ایک دوسرے کو جانتے چلے آ رہے ہیں۔ اکٹھے بھی بیٹھتے ہیں، باتیں بھی کرتے ہیں، خوش ہونے والی باتیں بھی اور لڑنے والی بھی۔

ابھی انہوں نے افسانے لکھنے شروع ہی کئے تھے کہ خوب بنے ٹھنے ہمارے دفتر کے سامنے سے گزرے۔ ان دنوں ہمارے ہاں ایک ایسے صاحب کام کرتے تھے جو ان کے واقف تھے۔

وہ صاحب ان سے مل کر واپس آئے تو مجھ سے پوچھا — "انہیں جانتے ہیں؟"

"جی نہیں!"

"اے حمید ہیں، ادب لطیف کے افسانہ نگار۔"

"ہوں گے! یہاں افسانہ نگاروں کی کون سی کمی ہے۔ کمی ہے تو اچھے افسانہ نگاروں کی۔"

غالباً میری یہ بات اللہ میاں نے سن لی اور انہیں اچھے افسانہ نگار کی تمام صلاحیتوں سے نواز دیا۔ بعد میں اس خوبصورت سے نوجوان افسانہ نگار نے بڑے بڑے خوبصورت افسانے لکھے جو لڑکپن سے نکلی ہوئی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو بہت بھاتے۔ اے حمید "رنگوں اور جگنوؤں" کا افسانہ نگار نہیں ہے۔ یہ تو ۱۲ برس سے لے کر ۲۰، ۲۵ برس تک کی الہڑ جوانیوں کا افسانہ نگار ہے۔

یہ آپ کے سامنے سے گزر جائیں تو بڑے ہی سنجیدہ معلوم ہوں گے۔ سلام دعا ہو گی تو بھی بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ مگر اصلی اے حمید آپ کو اس وقت نظر آئے گا جب اس کے سامنے بیئر کھلتی جائے اور باتوں کی زعفران کیاری ہو اور ساتھ ہی اس قسم کے دو چار دوست ہوں، باتیں لگتی ہوں۔ اس وقت ان کی زبان تلوار کی کاٹ کا کام دے گی اور دل فرہاد و مجنوں کی یاد دلائے گا۔

ویسے بھی قہقہے لگانے کے عادی ہیں مگر روح بڑی حسین اور مزاروں سے بچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اگر نظر آنے لگیں گے تو دن میں چار بار بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔ غائب ہونے پر آئیں گے تو چار مہینے میں ایک بھی ملاقات نہ ہوگی۔

لوگ گرمیوں میں پہاڑوں پر جاتے ہیں یہ سردیوں میں۔ سردیوں میں جب برف پہاڑوں پر گرتی ہے تو ان کا دل سنبھلنے لگتا ہے۔ یہ ان دنوں میں جب لوگ مارے سردی کے ٹھٹھر ٹھٹھر جاتے ہیں تو یہ شدید برف باری میں بھی اپنا سینہ تان دیتے ہیں۔ خوش قسمتی جوانی میں نیا خون بھرا ہوا ہے اس لئے یہ ساری کھیلیں انہی کے دم سے ہیں ——— میرا دل کہتا ہے کہ وہ کوئی دو برس سے سردیوں میں کسی بھی پہاڑ پر نہیں گئے ہوں گے۔ اس لئے کہ اپنے افسانے کا ہیرو بن کر جب انہوں نے خود ہی شادی کر لی ہے تو اب وہ برف باری ان پر گرتی ہوگی۔

انھوں نے اپنی زندگی میں کئی پلان بنائے مگر سوائے ناول لکھنے کے ان کا کوئی پلان سرے نہ چڑھا۔

غیلا کاشمیری اور انتظار حسین کی طرح میں نے انہیں کبھی اپنی تعریف کرتے نہیں سنا۔ افسانہ لکھ کر اپنی بیٹھکوں میں سنایا تو چپ، دوسرا افسانہ لکھ کر رسالے میں چھپوایا تو چپ، کسی نے تعریف کر دی تو چپ، کسی نے ناک بھوں چڑھائی تو چپ، ورنہ ادھر میں نے کئی ادیب اور شاعر ایسے بھی دیکھے ہیں کہ وہ کوئی چیز بعد میں لکھتے ہیں، ہنگامہ پہلے کرا دیتے ہیں۔

اشفاق احمد

جب یہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اس وقت یہ بڑے ہی اچھے آدمی تھے۔ البتہ اس وقت اتنے اچھے افسانہ نگار نہ تھے۔ اس کے بعد جب یہ خود ایک کالج میں اردو کے لیکچرار مقرر ہوئے تو خود کہنے لگے "اب ذرا میں معقول آدمی بننا چاہتا ہوں۔" یہ معقول آدمی تو ضرور بنے مگر جو چیز دوستی کی طرح ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ خارج ہونے لگی۔

ان کا اپنی ذات کے بارے میں جو یہ خیال ہے کہ میں بڑا بیوقوف قسم کا انسان ہوں، بجا غلط ہے۔ بیوقوف زمانے کے باوجود بہت سارا پیار اور بہت مخلص ہی مخلص، محبت ہی محبت قسم کا برانڈ۔ خوبصورت باتوں کا بادشاہ۔ باتیں افسانوں ہی کی طرح سے دلکش اور پیچ در پیچ اتنی کہ تسلسل ٹوٹتے ہی نہیں پاتا۔ ریکارڈ کی طرح بجتے ہی چلے جائیں گے۔ لیکن کبھی ایسی غضب کی کہ ہاتھوں کے سارے طوطے اڑ جائیں اور مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

ان کا یہ انداز ہر ایک کے سامنے نہیں ہوتا۔ نئے ملنے والوں سے دلہن کی طرح شرماتے ہیں۔ پرانا ملنے والا مل جائے تو بازار میں کھڑے کھڑے اتنا ہنسائیں گے، اتنا ہنسائیں گے کہ راہگیر کم از کم ان دونوں میں سے ایک کو تو ضرور پاگل سمجھے گا۔

یہ اپنے زیادہ قریبی دوستوں کو بڑی محبت کے ساتھ کمینہ، حرامزادہ، الو کا پٹھا ضرور کہیں گے۔ اگر یہ تینوں القاب کسی پر صرف نہ ہوئے ہوں تو وہ ان کے بے تکلف دوستوں میں سے نہیں ہے اور یہ انداز تخاطب ہر کسی کو نصیب بھی نہیں ہو سکتا۔ اب میرے ان کے کوئی آٹھ برس کے تعلقات ہیں۔ انھوں نے مجھے اب تک اس قابل نہیں سمجھا کہ ان میں سے ایک آدھ خطاب کا مستحق سمجھا جاؤں۔

قد درمیانہ، جسامت میں پست ہے۔ بے حد سادہ پہنتے ہیں۔ گہرے رنگ کا سیدھا سادہ کرتہ، شلوار اور دونوں پاؤں میں ایک ایک چپل۔ اسٹالن نما مونچھیں اور بھورا بھورا چہرہ۔ لیکن اسٹالن سے انہیں تشبیہ نہیں دینا چاہئے تھی۔ اس لئے کہ اس بیچارے پر وہ وہ الزامات ان کے دوستوں نے لگائے ہیں کہ اشفاق صاحب بھی شرمانے لگ گئے ہوں گے۔ اس لئے ان میں چہرے مہرے کے علاوہ ایک عیب بھی اسٹالن والا نہیں ہے۔

مکان کی تیسری منزل پر ان کے گھر والوں نے انہیں ایک کونہ دے رکھا ہے۔ گرمیوں کے دنوں میں جب ان کے بدن پر پھنسیاں نکل آتی ہیں تو بیٹھ کر افسانہ لکھنا شروع کرتے ہیں۔ پسینہ بہتا جاتا ہے، لکھتے جاتے ہیں۔ اگر گرمیوں میں سارے مکان میں کہیں بھی جگہ نہ ملے تو ایک کونے میں بیٹھ جائیں گے، افسانہ لکھنا شروع کریں گے، نوٹ بک پر جھکے ہوئے دونوں ہاتھوں سے کاغذ پر لکھتے جائیں گے۔ جب افسانے کا آخری لفظ لکھ لیں گے تب ایک دم چوٹی کو انگلیوں میں مسل کر کہیں گے حرامزادی، کمینی، الو کی پٹھی!

انتظار حسین

مجھے ماننا کہ انتظار حسین سے جب میری پہلی ملاقات ہوئی تو ان کے قد اور حلیے نے حیرت میں ضرور ڈالا۔ باتیں ہوئیں تو یہ انکشاف بھی ہوا کہ آدمی تو پڑھا لکھا ضرور ہے کہ مجھ ایسے جاہل کو مرعوب کر سکتا ہے۔ باتیں ہی تو اس کا سارا آرٹ ہیں۔ اپنے مضمونوں میں بھی تو بغیر دلائل کے باتیں ہی کرتے چلے جاتے ہیں۔ باتیں ہوتی ہیں بامحاورہ اور چٹپٹی۔ جس دن کسی نقاد نے ان کے مضمونوں سے ان کی باتوں کو الگ کر دیا اس دن انتظار حسین گوشہ نشین ہو جائیں گے۔

نہ جانے یہ کیا بات ہے کہ پیار محبت کے باوجود میری ان کی ٹھنی ہی رہتی ہے۔ ہم ایک دوسرے پر فقرے چست کر کے دلی سکون حاصل کرتے ہیں۔ وہ اہل زبان اور میں بے زبان کا ہے کو پیش پاتا ہوں گا۔ مجھے جو غصہ آتا ہے تو وہ یہی کہ اگر اس ذرا سے آدمی سے مات کھالی تو محلے کے لونڈے بھی مجھ پر بہ آسانی فقرے چست کر لیا کریں گے۔

انتظار صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ جتنے ادیب چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ان میں ایک بھی ادیب نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ان کا ریکارڈ بڑا اچھا ہے جو بھول کر بھی انہوں نے کسی کو ادیب مانا ہو۔ ایک دن بیٹھے انتظار صاحب یہی باتیں کر رہے تھے کہ سب کے سب ادیب جاہل ہیں تو میں نے ان سے بہ ادب درخواست کی کہ تب تو آپ ان سب کے امام ٹھہرے۔

یہ وضعدار آدمی ہیں۔ دوستوں سے بھی ہنس ہنس کے بات کریں گے اور دشمنوں سے بھی۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ باتیں کس کھاتے میں سے پیش کی جا رہی ہیں۔ لوگ ان کے جانی دشمن ہوتے ہوئے بھی ان سے علیک سلیک ختم نہ کریں گے۔ اگر دوسرا ختم کر دے گا تو یہ ختم نہ ہونے دیں گے۔

ویسے بیچارے بھی میری ہی طرح بے ضرر اور غیر مفید انسان ہیں۔ ان کی دشمنی سے نہ کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے نہ ان کی دوستی سے کوئی فائدہ۔ دشمنی میں زیادہ سے زیادہ یہی کریں گے کہ کسی کے خلاف ریویو لکھ دیں گے۔ دوستی پہ اتریں گے تو اسے ایک کپ چائے پلا دیں گے۔

یہ اپنے گھر بیٹھے میرٹھ کو روتے رہیں گے۔ وہاں کے کیا لوگ تھے وہ بھی اور کیا زمانہ تھا وہ۔ اب تو گڑ کی ریوڑیاں نہیں ملتیں، گوٹے کے پارچے نہیں ملتے، [illegible] نہیں ملتی، [illegible] نہیں ملتے۔

سو خوبیوں کی ایک بات ان میں یہ دیکھی کہ انہوں نے کبھی حالات کی ناسازگاری کا رونا نہیں رویا۔ بیکار رہے تو چپکے رہے۔ بھوکے رہے تو چپکے رہے۔ ویسے یہ کوئی نہ کوئی ہنگامہ ضرور چاہتے ہیں۔ ماحول پرسکون ہو تو انہیں بے چینی ہوتی ہے۔ چاہتے ہیں کہ کچھ کریں تاکہ لوگ متوجہ ہوں۔ خواہ اس کے لیے انہیں کوئی ناشائستہ حرکت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

جن سے مل کر میرا دل خوش ہوتا ہے ان میں ایک انتظار حسین بھی ہیں۔ اگر مجھے کسی پریشانی نے نڈھال کر رکھا ہو، اداسی کا کوئی پہاڑ سامنے ہو تو میں انتظار حسین کی تلاش میں نکلتا ہوں اور انہیں ڈھونڈ لینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی ہوٹل میں مل جائیں گے، کسی پنساری کی دکان پر مل جائیں گے، کسی کالج کے طالب علم کو مرعوب کرتے ہوئے مل جائیں گے۔ گھر ملیں گے ضرور۔ ان کے گھر والے دن میں ان کی شکل دیکھ لیں تو دیکھ لیں، رات کو ان کے [illegible] اور ہوں گے۔

ناصر کاظمی

میری ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب یہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے اور [illegible] رہتے تھے۔ کالج میں دو لڑکوں کا بڑا چرچا تھا۔ ایک ان کا دوسرے حمید نسیم کا۔ کالج میں جن لڑکوں کے چرچے ہوتے ہیں ان کی وجہ عجیب و غریب ہوتی ہیں۔ ان کا چرچا کیوں تھا بات سمجھ میں نہ آئی۔ شکل و صورت نہ ذات، شکل و صورت بھی تو ایسی جیسے کوئی بالی ورکا جا رہا ہو اور ذہانت بس اتنی کہ کام چل جائے۔

ان دنوں بس یونہی سرسری سا ہی تعارف ہوا تھا۔ اس وقت انہوں نے چڑھی پتنگ کی طرح تنانے بلا بلا کر کچھ مرعوب کرنا چاہا۔ اپنی امارت کی طرف اشارے بھی کئے اور دوسرے لوگوں سے اپنے آپ کو الگ سا بھی بتایا۔

پاکستان ہی کی بدولت یہ کھاتا پیتا شاعر وادی لاہور میں آگیا جس میں اس کی امارت سے بہت سے مرعوب تھے۔ مگر اب امارت ادھر رہ گئی تھی اور یہ ادھر آگئے تھے۔ برسوں سے ملتے کھا رہے ہیں اور شکر کر رہے ہیں۔

ان کی استطاعتیں بڑی کمزور ہیں۔ اکیلے ہوں تو یہ انہیں اور وہ انہیں ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ جب دونوں اکٹھے ہو جاتے ہیں تو کسی ٹی ہاؤس میں بیٹھ جاتے ہیں ورنہ ایک دوسرے کو ساری ساری رات ڈھونڈتے ہی میں گزار دیتے ہیں۔

ویسے ایسا ہوتا کبھی کبھی ہی ہے۔ جب تک ان دونوں کے مشاغل آپس ہی میں نہ الجھیں یہ نوبت نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے اب دونوں نے کچھ وعدے وعید کر رکھے ہیں کہ اگر مشاغل ٹکرا بھی جائیں تو بھی ایک دوسرے کو صورت دکھانا ہے ضروری۔

ناصر صاحب بلاشبہ بڑے وارفتہ آدمی ہیں، 'بور' قطعی نہیں ہیں۔ وہ دو شاعر جنہیں ایک کو چھوڑ کر جس تو ہم دو اپنے اوصاف سمیت پہچان لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے ملنے والوں میں ضرورت کی حد تک ہر دلعزیز ہیں۔ اگر ہر دلعزیز نہیں ہیں تو صرف ان میں جو خود کو بھی غزل کا شاعر سمجھتے ہیں۔

ان کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں، پوری معصومیت لئے ہوئے۔ اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فلاں آدمی سے فلاں ادیب کی خوب بنتی تو اس رعایت سے ماشاء اللہ کہا اور سگریٹ پر سگریٹ پیتے ہوئے پوچھیں گے۔ وہ چیز دیکھی، بات ہی نہیں بنی، اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر مخاطب کی رائے کی چیز پر تبصرہ ——— واہ واہ سبحان اللہ۔ بات ہوئی نا کوئی! بھلا جو لطف اور ڈھنگ آپ کو لکھنے کا ہے اس کا عشر عشیر بھی اُسے نہیں پہنچا۔ دیکھئے جب پندرہ برس ہو جائیں گے تو اسے کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

یہ دن کو سوتے ہیں اور راتوں کو جاگتے ہیں۔ جب میں بھی ان کا تھوڑا بہت ہمراز تھا تو مجھے معلوم تھا کہ یہ رات کے اتنے بجے کس سمت پر کہاں ملیں گے اور اتنے بجے کس سمت پر کہاں۔ جیسے جیسے سورج کے نکلنے کا وقت قریب آتا ان کے ٹھکانے غیر یقینی ہوتے جاتے۔

ان دنوں ان کی جیب میں ایک بچھو کی شکل کی پنسل ہوتی تھی۔ چائے پی، بل پر دستخط کر کے رفو چکر ہو گئے۔ اس طرح ان کی ساری رات بلوں پر نکلتے نکلتے گزر جاتی تھی۔ ہوٹل والوں کے سیکڑوں روپے ہو گئے تو بھی وہ مطمئن اس لئے کہ ان کا یہ کام ایک اور شاعروں کی طرح کا نہ تھا۔

بزرگوں کا احترام کرنا، عام زندگی میں شاعری سے کام لینا، صرف غزل کی کتابیں پڑھنا، نثر کی کتابوں سے دور بھاگنا ان کا دستور ہے۔

(نامکمل)

صاحب

(مدیر نقوش کے اسکیچوں کا مجموعہ)

جس میں بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کا شخصی تجزیہ بڑے فنکارانہ انداز میں کیا گیا ہے۔

نیاز فتحپوری نے اس کتاب پر یوں تبصرہ کیا ہے:

"صاحب کے چند خطوط صاحب دیکھ کر بڑا لطف آیا۔ یہ صرف چہرہ نگاری نہیں بلکہ گہرا نفسیاتی مطالعہ بھی ہے جس میں ہر جگہ آپ کا طرزِ انشاء کا نشتر، اسلوب کا PARADOX اور تحریر کی چٹکیاں بھی کچھ کام کر رہی ہیں۔"

قیمت تین روپے

ادارہ فروغ اردو۔ لاہور

کُھلے خط

اس عنوان کے تحت ہم آئندہ بھی ضروری خط پیش
کیا کریں گے۔
(ادارہ)

مکرمی طفیل صاحب۔ آپ نے جون ۶۵ء کے نقوش میں حضرت فراق گورکھپوری کا خط چھاپا جس میں ۔ بھی چھپتے آگئے ہیں۔ یہ مکتوب اُسی کا جواب ہے۔ التجا ہے اس کو بھی اپنے مقتدر رسالے میں جگہ دیجئے۔ اگر آپ نے چھپنے والے کے اور نہیں چھاپا تو گفتگو ”یک طرفہ“ ہو جائے گی۔

فراق صاحب اپنی نظم ”حدیثِ حسن“ کا سبب جانے کی ان کی شان نزول ایک جیتی جاگتی عورت کو قرار دیتے ہیں جو ان کی زندگی میں داخل ہو گئی ہے، لکھتے ہیں۔

”میری زندگی کرب انگیز محرومیوں اور ناکامیوں کی زندگی رہی ہے۔ میری عمر ایک پاگل بنا دینے والی بیوی اور تباہی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں گزر رہی ہے۔“

(زندگی کے آلام و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے والا اور اپنے منہ میاں مٹھو بنے! ایں چہ بوالعجبی است۔ آخر یہ بار بار کی مجہت؟ مرحبا فراق!) (ق)

اور زندگی کو کرب انگیز محرومیوں اور ناکامیوں کی آماجگاہ بنانے کا ذمہ دار کون؟ خود حضرت کی بیاہتا بیوی! جیسا اپنے خطوں میں جو کہ اکتوبر ۶۳ء کے نقوش میں شائع ہوئے تھے اعلان کر چکے ہیں۔ یہاں نہیں خود فراق صاحب کے کلام کا مجموعہ جو ”مشعل“ کے نام سے شائع ہوا ہے اور جس کو فراق صاحب نے ”حاشیہ“ سے مزین کیا ہے اس کے صفحہ ۹ ملاحظہ کیجئے جہاں یہ عبارت درج ہے:۔

”خود میری گھریلو اور ازدواجی زندگی تمام تر تلخ ناخوشگوار اور کڑوی رہی ہے۔ مجھے گھر کا سکھ کبھی نہیں ملا۔“

مجھے یاد پڑتا ہے کہ نقوش کے پچھلے خطوں میں بیوی کی بد صورتی کا بھی دکھڑا رویا ہے۔

اس وقت حضرت کا سن شریف ساٹھ سے متجاوز ہوگا۔ دیکھئے کس دھڑلے سے ”پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است“ کا سہرا اپنے سر بندھوانا چاہتے ہیں۔ سنئے اور وجد کیجئے:۔

”اب جا کے میری زندگی میں ایک ایسی عورت داخل ہوئی ہے جس نے میری پچھلی پوری زندگی کے خلاؤں کو بھی پُر کر دیا ہے۔ یہ نظم اسی دیوی کو نذرِ عقیدت ہے۔“

اس صاحب دیوی کی نذرِ عقیدت تھی تو اس کا مشعل کی پیشانی پر درج ہونا تھا۔ اگر اس کا محرمی اظہار مقصود تھا اور اس میں جذبۂ احترام شامل تھا تو دیوی کے نام کا اعلان کئے

میں ترمیم ہونا چاہیے تھی۔ شاعر کے مشرقی لڑکی ہی کر دیے۔ اعلان میں متعلق ایک بات تو نہیں ہوا۔ دیوی جی اور ان کے شوہر کی تصویر بھی جزو کتاب ہے کیونکہ دونوں دھیر پک وصاف تھے۔ مگر جہاں دال میں کچھ کالا کالا ہو ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہاں سے اس حقیر سراپا تقصیر کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

"امید ہے کہ جناب اثر لکھنوی لوگوں کی نظروں سے ہو کے یہ نظم پڑھ رہیں گے اور سیاق۔ اس کا جواب لکھنے کی سعیٔ لاحاصل فرمائیں گے یا ان کی پہلی قوتِ نقد ہے بے ہنگام و اصلاحات بلاغت نظام سے نوازیں گے۔

اثر نے یہ کار سے گا دیوی کی تخلیق کا راز افشا کرنے کی کوشش کرے گا کچھ برس اُدھر تک یہ دیوی جی ایک چھوکری تھیں۔ مجھے یہ الہام نہیں ہوا بلکہ خود فراق صاحب کے ایک شعر سے مطلب نکالا۔ سنئے کیا خوب فرماتے ہیں ؎

لڑکپن کی ادا ہے جان لیوا غضب یہ چھوکری ہے ہاتھ بھر کی

کئی برس ہوئے رسالہ نگار دہلی میں فراق صاحب کی ایک غزل چھپی تھی جس میں مندرجہ بالا شعر بھی تھا اور مقطع میں مجھ غریب کو نوازا تھا ؎

فراق اپنی غزل پڑھتا تھا جس وقت اثر بیٹھے ہوئے کرتے ہیں ہی ہی

پھر نثر میں اس کی توضیح کی تھی:۔

"مرزا جعفر علی خاں اثر کی طرف اشارہ ہے جنھیں میرے اچھے برے تمام اشعار پر اعتراض ہے۔"

چونکہ تحریر کا آخری حصہ سفید جھوٹ تھا مجھے اس کی تردید کی ضرورت ہوئی اور میں نے بھی فراق صاحب کی زمین میں ایک نظم موزوں کر ڈالی اور نثر میں بھی مثالیں دے کر فراق صاحب کے جھوٹ کا انداز چاک کیا۔ یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نگار سے ضروری اقتباسات دے دیے جائیں۔

یہ نگار دہلی جلد ۹۔ اکتوبر ۴۷ سے لیے گئے ہیں۔ بسبب طوالت پورے درج نہیں۔ وہ یہ ہیں:۔

"فراق صاحب اگر کھل کر میری تنقیدوں کا جواب تو نہیں دے پاتے تاہم اندر اندر کڑھتے ہیں۔ بہت سیدھے سادے ہیں تو دل کی بھڑاس نکالنے کو اپنے کسی چیلے چاپڑ سے کبھی کبھار کچھ گالیاں لکھوا دیتے ہیں۔ رسالہ تہذیب پٹنہ اس کا شاہد ہے۔ مگر اب اپنی غزلوں کے مقطعوں میں مجھے مخاطب کرنا شروع کر دیا ہے۔ ملاحظہ

"بحمد اللہ لکھنؤ مقتدائے اول"۔ رسالہ تہذیب پٹنہ میں اس کی پہلی ہوائی (ملاحظہ ہو جون جولائی کا مشترکہ نمبر)۔ غزل میں ایک قطعہ شامل کر کے فرماتے ہیں ؎

وہ میرے اشعار اثر صاحب ہیں جن پر معترض کچھ سمجھ میں آ تو سکتے ہیں لیاقت چاہیے
میر و سودا پڑھ کے بھی کورے کے کورے رہ گئے شاعری سے کچھ نہیں ہوتا بصیرت چاہیے
جیسی تنقیدیں اثر لکھتے ہیں ایسی تو ہر ایک پھینک دے کاغذ کے ٹکڑے توفیق طاقت چاہیے

اب رسالہ نگار دہلی جلد ۱ کے صفحہ ۹۹ پر اپنی غزل کے مقطع میں لکھتے ہیں:۔

فراق اپنی غزل پڑھتے ہیں جس وقت اثر بیٹھے کیا کرتے ہیں ہی ہی"

نثر میں اس کی توضیح کرتے ہیں:۔

مرزا جعفر علی خاں اثر کی طرف اشارہ ہے جنھیں میرے اچھے برے تمام اشعار پر اعتراض ہے۔

اسی وقت اس سفید جھوٹ کا پردہ چاک کرتا ہے۔

میں نے جہاں "روپ" کی تحسین اور قابلِ مذمت رباعیوں کی مذمت کی ہے۔ زبان و بیان کی خامیاں دکھائی ہیں، سرِ رشتۂ شعری کا پیوند اکھیڑا ہے، وہیں اچھی رباعیوں کی تعریف بھی کی ہے...... (مثلاً)

انگڑائی بھری بھری جوانی دمِ صبح آنکھوں میں سکوں کی کہانی دمِ صبح
آنگن میں سہاگن اٹھائے ہر گاہ عکس اس پہ جو صادق ہے اپنا دمِ صبح

تنقید ۔ روزنٹ کا اثر دیکھئے کہ نوری منظر اس پیکر حسن میں یہی رعنائیاں بھر کر زمیں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ اب یہی "سہاگ بھری سہاگن" "مکھ دیپ" ہے جس کے چہرے کی بشاشت ، آنکھوں کا سکون اور اطمینان ، راتوں کی میٹھی نیند ، دل کی یکسوئی ، صاف ستھری معصوم زندگی اور پاک خیالات کا آئینہ ہے یعنی دیا میں کے "فیضان گناہ" ۔ "وہ جان سیاہ کار" اور دوسرے جذبات کے پیشتاروں سے اس کا موازنہ کیجئے کس میں آرٹ اور جاذبیت ہے کس میں وہ خلوص اور سچی ترنگ ہے جو خواہشات نفسانی کو برانگیختہ کرنے کے بجائے شبستان جمال میں روحانیت کی شمع روشن کر دے کس میں عفونت اور گندگی ہے ۔ کس میں نزہت اور سنجیدگی ہے کس میں حقی تصویر کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا کس میں افسانے کی رنگینیاں حقیقت میں تحلیل ہو گئیں اور ایک کی چوٹ ایک پر پڑنے لگی ۔۔۔ تیسرے مصرع میں یہ بات کہیں نہیں لگی لیکن "اٹھانے پہ سے ہاتھ" کا ٹکڑا بتا رہا ہے کہ اس ہاتھ سے نور کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں جس کے پرتو سے نظر کا مقدس پیار جیسے چمکے نور کا شاداب ہو جانا ہی کہ اسپیئر کے Queen of garden اور بی جانسن کے The plant of flower of light کو شرمانے لگا ۔" (منقول از جہاں ہیں صفحات ۳۲۰ — ۳۲۱)

٭ فراق صاحب کی نشتری ، شیطان کی آنت کی طرح لمبی غزل کی طرح میں چند اشعار جو فی البدیہہ منظوم ہو گئے وہ بھی حاضر ہیں :۔

اڑ کر کس نے دیکھا رستہ ہی ہو ! کوئی صحبت فراق اس چوٹ کی بھی[1]
تمہارا راست روی کے ہیں حضور جو ہیں یہیں ہی ہو ہو ' وہ کچھ بھی[2]
بہی خواہ ادب کی حیثیت سے تمہاری بد مذاقی کا ہوں شاکی
عفونت میں بھی ہو شاعری ہو تمہاری ہو گئی ہو جو قصہ الفت کی
جب آئی سامنے میری نظر کے عفونت کیسی عفونت ہی سے بھی
پسند یہ کسی کا شعر دیکھا قریں ہے وہ میں ہی گھر کر دکا
مری تنقید ہے درس بصیرت سمجھتے ہیں جو تم کو خود پسندی
بہائم کی صفوں میں سے لگی ہے تمہیں یہ جنبۂ بہت دونٹ کی سی
پچھاڑو خوب یاروں کو پچھاڑو یہ ساری چاندنی ہے چار دن کی
اندھیرا یاکہ ہے پھر اور تم ہو بجے جب ڈ ابھی ہا چوب ہی
معاذ اللہ یہ کیسی بیباکی کبھی سمجھتا ہے فہم کے خشک ترچے[3]
بہاتے "کام" "منفعل" سے وار خوشی ہی کام آتی ہے نہ غم ہی[4]
ادا کی جھوری اچھا جینا ! ہے گھر جا بھی ہے ذرا عمر بھر کی[5]

---

[1] فراق صاحب کا مقطع ہے — فراق اپنی غزل پڑھتا ہے جس وقت ؛ اثر بیٹھے ہوئے کرتے ہیں یہ بھی۔

[2] فراق صاحب کی ایک غزل مشہور (مشغول) کا مطلع ہے — جو کچھ بھی ہے دل میں سب کہیں ہم ؛ وہ پوچھ دیکھے تو کیا کریں ہم۔
اسی میں یہ شعر ہے — کبھی ہم پو نہیں تری عنایت ؛ یہ پوچھنے والے کون ہیں ہم۔
یہی کریں یہ (داکھرا) پڑھئے رد قافیہ غائب !

[3] شعر فراق — ثنا خواں وقت ناز و نعم کے ؛ کبھی سمجھا ہے غم کے خشک و تر بھی

[4] شعر فراق — محبت میں کریں کیا حال دل کا ؛ خوشی ہی کام آتی ہے نہ غم ہی

[5] شعر فراق — وہ کیں کی ادا سے جان لیا ؛ غضب یہ جھوری ہے ذرا عمر بھر کی

کنول آنکھوں کے مکھڑا گل رخسار — بنایا جن کو جب انساں میں سے بجلی[1]
جہاں کو کہہ کے اب شاید یہی کہنا — غنیمت ہے جہاں ذات آدمی کی[2]
ہجوم یاس میں بھی بزم دل کے — کہاں پر کے کی آنکھ تا تنگ جیسی[3]
کہاں کی ہے زباں سیدھے کتا ہے — نکالو یار مونچھ اپنی زباں کی[4]
بیک وقت، غالب اور چکبست — سبھی کی جیب تو ہے تم نے کتری
اگر گنوا دئے جائیں نام سب کے — تو ہو فہرست خاصی لمبی چوڑی
بہار خوشے جو کھا یہ نکالا — کمی اردو میں ہے کمّاقیت کی

بہت کچھ اور کہہ سکتا ہوں لیکن
"جواب جاہلاں باشد خموشی"

شاید میرا استنباط غلط بھی ہو سکے کہ کچھ برس اُدھر کی جھلک کی جس کی ہوتی بولی اُس وقت بھی پھوٹ رہی تھی۔ اب وہ آگ کے اس مطلع کی مصداق ہو گئی ہے۔

؎ ہر ادا استاد مرے یار کی گھاتی ہوئی — اُف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

اور یہ سستی کی چڑیا فراق صاحب کے ہاتھ لگ گئی ہے اور "اُن کی شخصیت ہوتی زندگی کے خاردار کو چمن کر دیا ہے"۔ وہ اسے بڑی بہادری کے ساتھ عقیدت بعنوان "حدیث حسن" پیش کرتے ہیں۔ مگر یہ دانی مادی میں کہیں بچھ گئی ہیں، وہی مثل ہے کہ چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔ اس پر یہ عقیدت میں اس قسم کے اشعار بھی شامل ہیں۔

ان انکھڑیوں میں جلیں بزم رقیب کے چراغ — پلک گلاوٹ کے شعلوں کی ہو گئے خمدار
... فراز سینہ پہ دو شستہ وہ مہر کامل — وہ جسم چاندنی میں جیسے چھوٹتا ہو انار
... شب وصال گئے پھر بھی یہ کُندا ہیں — تمام غنچہ صفت ہے کھلا ہوا گلزار
... کنار میں بھی اُسے سو کے ڈھونڈتے ہیں — ہر اک گل کے بھی پہلو میں صد ادائے ناز

واہ صاحب! اچھی دیوی جی ہیں اور اچھا پجاری۔

مگر میں نے غصہ کیا تو یقین ہوا کہ وہ دی ہی کے پہچاننے میں فراق صاحب کے روحانی تصرف کو دخل ہے۔ وہ کیونکر؟ سنئیے۔

کچھ عرصے اُدھر فراق صاحب کی ایک غزل رسالہ "بیسویں صدی" دہلی میں اُن کی خود نوشتہ تمہید کے ساتھ شائع ہوئی۔ تمہید حسب ذیل ہے:

"میری غزلوں میں سہل ممتنع کی بہت سی مثالیں ہیں۔ انہیں ایک عمر کا مشق اور ریاضت فن کا نچوڑ سمجھئے۔ ایسے خیالات کی دولت جاری

---

[1] شعر فراق ؎ کنول دو دو کھلے جیسے گل رخسار — خوشا اُن انکھڑیوں کی نیم خوابی
[2] شعر فراق ؎ بسا لو کیا خدا اُجڑے جہاں کو — غنیمت ہے یہاں ذات آدمی کی
[3] شعر فراق ؎ ہجوم یاس میں بھی بزم دل کے — تنی ہے کرن قبا دوش سحر کی
[4] شعر فراق ؎ کہیں کرو دام سیدھے کتا ہے — کر نمک پر کے وہ جاتی ہے دہری
(زیادہ "استاد" فراق کے تحسین میں ہو گیا۔ ادارہ)

میں ہاتھ نہیں آتی"۔

اور پہلا ہی مطلع یہ ہے۔

؎ زندگی کی خوشی نہ درد نہ یاس
وصل کی رات اور اتنی اداس

فاعتبروا یا اولی الابصار!

مگر صاحب "پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است" باوجودیکہ یہ نوبت پہنچی ہے کہ جنس مقابل کا شب وصال کے بعد بھی کنوارا پن برقرار رہتا ہے۔

شب وصال کٹے پھر بھی یہ کنوارا پن
تمام غنچہ صفت ہے کھلا ہوا گلزار

پہلے مصرعہ کو بطور استعجاب پڑھئے تو وہ لطف آتے ہیں۔ ع شب وصال کٹے۔ پھر بھی یہ کنوارا پن! اور خود فراق صاحب کی اس تحریر میں شریک ہونا چاہیے تو "پھر" کو "پر" سے بدل کر یوں پڑھئے ع شب وصال کٹے پر بھی یہ کنوارا پن! کبھی فراق صاحب قلقاریاں مارتے اور بغلیں بجاتے معشوق سے کہتے تھے ؎

شب وصال بنا آئینہ تو دیکھا تھا بہت
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

پھر "افسانۂ آں شبے کہ با یار گزشت" یوں کہا ؎

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بقدم
رچے رنگ کے ہے جیسے کنوارپن کی ہنسی

یوں بھی کہا ع ہنگام وصال پلنگ بنا ہوا جسم —— کبھی تو حسین عورت کو اس طرح بیان کیا: ع "کنڈل پہ کنڈل کے جیسے بیچ کا ڈسے سانپ" دکیا ماں جنتی ہوگی جسے پھر زیر لب کہہ کر ع "یوں بھی اسے مہربان ہوتا ہے" اچھا یہ شعر گنگنا کر ترنم پڑھا ؎

زندگی کی خوشی نہ درد نہ یاس
وصل کی رات اور اتنی اداس

مگر پھر کسی نے سمجھا دی اور یہ پھر چہکنے لگے ؎

شب وصال کٹے پھر بھی یہ کنوارا پن
تمام غنچہ صفت ہے کھلا ہوا گلزار

آپ کہیں گے ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند اور یہی کہیں گے کہ انہیں طبیعات کے تاجداروں کو ایسا ہی ہونا چاہیے اور جب شعر میں ترنم نہیں آ رہا تو ایسی شاعری میں ع شرم چہ کتیست کہ پیش مرداں بیاید اور کیا نہ ہو سکا تو مُردے ہو کر ہی رہنا دیا اور سمجھے کہ ع

"ہم امتحانِ عشق میں پورے اتر گئے" (شفیق لکھنوی مرحوم)

(اثر لکھنوی)

---

(۲)

ع جو چاہو اپنے انداز سے تم تحریر کر ڈالو

"نقوش" کا شخصیات نمبر شخصیات کے موضوع پر کم و بیش ایک تذکرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس زاویۂ اعتبار سے یہ از بس لازم ہے کہ تذکرہ نگاروں کی جزئیات کے ساتھ ساتھ صحتِ واقعات کا خیال رکھنے کی بھی اس میں پوری پوری کوشش کی جائے اور کہیں کوئی ایسی بات سپردِ قلم نہ کی جائے جس کی صحت محلِ نظر ہو اور غلط فہمی پیدا کرنے کا باعث ہو سکتی ہو۔ لیکن ایک دو مضامین پر طائرانہ نظر ڈالنے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کہیں کہیں معاملہ مندرجہ بالا کلیے کے بالکل برعکس ہے۔ میرے عزیز اور محبوب دوست جناب شاد عارفی (ع مگر زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا) جنھوں نے کمال التفات اور خاص وقت

نفرت سے راقم الحروف کی حقیر اور معمولی شخصیت کا اشارۃً استعمال غیر ضروری دلچسپ سکینڈل مرتب کرتا ہے۔ میرے متعلق اپنے ذاتی خیالات و تاثرات کا اظہار کرنے کے پوری طرح مجاز ہیں اور اُن کے اس سوئے ظن پر جائز حق پر حرف زنی کر سکنا نہ تو مجھے اور نہ ہی کسی اور کو مجال ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ اُن کے تحریر کردہ کا اختیاری حیثیت کے عنصر کے ساتھ ساتھ الف لیلے کے کیریکٹر کی کتنی چیزیں اس مضمون کی ذہنی اختراع (Inferiority Complex) کی کتنی بڑی مثال ہے، ایک بالکل غیر متعلق سوال ہے۔ لیکن شاد صاحب نے اپنے مضمون میں میرا شعر حافظے کی مدد سے نقل کرنے کی جو "سیف اللسان" فرمائی ہے، وہ عمل کے مبادی مقتضیات کی نفی کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی۔ اس لئے میں اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں کہ نقوش کے قارئین کی واقفیت کے لئے اس کی تصحیح کر دوں۔

شاد صاحب نے شعر یوں نقل کیا ہے ؎

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا حضرتِ یزداں کبھی کبھی

حقیقتاً شعر یوں ہے ؎

تخلیقِ کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

قریب قریب اسی قسم کا حادثہ میرے فاضل "باذوق" اور جونگ دوست حکیم نیّر واسطی صاحب کے مضمون (جس میں انھوں نے اختر شیرانی کی شخصیت پر قلم فرمایا ہے) میں بھی سرزد ہو گیا ہے۔ میرا ایک "بدنام" شعر صاحب موصوف نے اپنے مضمون کے اختتام میں بلا تکلف غلط نقل کر دیا ہے۔

اس حادثے کا پس منظر قطعی میرے احاطۂ علم سے باہر نہیں۔ میرے نہایت محبوب اور جامع الصفات دوست جناب شورش کاشمیری مجھ سے والہانہ درجہ قلبی شغف رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے میرا شعر میری موجودگی میں یوں پڑھ دیا تھا ؎

میں میکدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

ہم "چٹان" ہی کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ اس پر مجھے فی البدیہہ ایک لطیفہ گھڑنا پڑا۔

میں نے عرض کیا۔

"آغا صاحب! ہنود تو آدمی کو اس وقت جلاتے ہیں جب وہ بیچارہ مر جائے — لیکن یہ مسلمانوں نے جیتے جاگتے اور زندہ ابنائے آدم کو اُن کی زندگی ہی میں جو دیا سلائی لگانی شروع کر دی ہے یہ میرے خیال میں اپنی قسم کا پہلا اجتہاد ہے۔

آغا نے مسکرا کر کہا: "بابا آدم! کس کو دیا سلائی لگ گئی؟"

میں نے کہا۔ "میاں میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں مجسم شعلہ کی طرح جل گیا ہوں۔ شعر سن کر خدا کے واسطے غور سے سن لو اور آئندہ اس شعر کو یوں پڑھا کرو ؎

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کتنا طویل تھا!؟

لیکن معلوم یہ ہوتا ہے کہ نیّر واسطی صاحب کے بلالی ڈرائنگ روم میں جہاں کبھی راقم الحروف، شورش کاشمیری اور نیّر واسطی اکٹھے مجلس آرائیاں کیا کرتے تھے یہ شعر اپنی بگڑی اور غلط صورت ہی میں گردش کر رہا ہے۔ اور نیّر صاحب اس کے مرض کی تشخیص کرنے سے قاصر ہیں۔ قارئین کرام تصحیح فرما لیں۔

میں اپنے فاضل اور جمیل القلب احباب سے بکمال معذرت یہ درخواست کروں گا کہ ایسے صحیفہ اہم اور نازک قسم کے معاملات اور نگارشات جن کی صداقت سے مستقبل کے نتائج نکلیں اور شعرائے قوم کے آئندہ نسلوں تک پہنچ جانے کا "اندیشہ" ہو، اُن میں محض نقل کو حافظے کی مدد پر چھوڑ دینا مناسب نہیں۔ یہ کوتاہی کار دیانت داری اور تاریخ نگاری دونوں کی روایات کے منافی ہے۔ ایک عظیم اور معمولی شعر میں صرف احساس کا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں سے کسی ایک شعر کا اگر کوئی لفظ حذف کر کے اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو شعر کی تمام تعمیر و تشکیل آنِ واحد میں منہدم ہو جائے گی :-

؎ تازگی ہے تری جدائی کی
آئینے تو بہت بچا سکتے ہیں

بیٹھیے! اشرف سے قسم لے کر   یہ فقیروں کے آشیانے ہیں

اُٹھ بھی جاؤ دم میں کا صلہ ہی کیا   زندگی درد سے ان بنتی ہے   جز درد کچھ نہیں رہا باقی   کس حسین نے مجھے پکارا ہے

جل بھی جائے نصیب پروانہ   شمع کی زندگی دراز نہیں

ہم بھی مرتے ہیں اسی کی صورت پر   کس کو اپنے ہنر پہ ناز نہیں   پھول کر وہ حسین جو چال گیا   آگ پر اور تیل ڈال گیا

آہ وہ انسان جو نیکیاں کر کے   نیکیوں کو کنویں میں ڈال گیا

ہم تو غیر اخلاق کے قائل ہیں   آپ اب بھی کوئی خیال نہیں   کھول دیجے کرم کے دروازے   بارگاہوں کے در نہیں ہوتے

اک نظر ڈال دو خدا کے لئے   زندگی دلکشی سے خالی ہے

کاش وہ کاکلیں بکھر جائیں   آج گرمی بہت زیادہ ہے   رنجشیں مستقل نہیں ہوتیں   دیکھ! قطع تعلقات نہ کر

آئیے کوئی نیک کام کریں   آج موسم بڑا گلابی ہے

کچھ تو شر کی معافی کرو   ہو گئی میکدے سے ہی رات ہے   وہ پہ زرے جو انگور رکھتے ہیں   سب سے پہلے امیر ہوتے ہیں

ہم سے وہ نہیں بیگانہ اپنی   دوستوں کی کمی نہیں لگتیں

کیسے کیسے عظیم بندوں سے   کیسے کیسے گناہ ہوتے ہیں   آپ سے عرضِ حال کیا معنی   آپ سنتے ہی مسکرا دیں گے

ابھی خرد کے خواب دھانے ہیں   چند ناداریاں ضروری ہیں

یہ جو تازگی ہے شبنم کی   اس میں کچھ جرم آفتاب بھی ہے

عدم

حسینیں لُٹتی ہیں جو راہوں میں   آبرو بکتی ہے بازاروں میں
بنتِ حوا کی یہ تذلیل کرو جو   شیخ کا قول ہے وہ جو اہلوں میں
(زرّین)

کے۔ زرّین نے اپنے انوکھے انداز میں تحریر کیا ہے

مسلے پھول

ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ سرورق دیدہ زیب
کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت ۴/-

مسلے پھول — سماج کے منہ پر ایک زوردار چپت ہے۔ سماج کے مکروہ چہرے سے نقاب نوچنے کی ایک کامیاب کوشش۔ ایک ایسا آئینہ جس میں سماج کے صحیح خدوخال نظر آئیں گے اور جسے پڑھ کر کوئی بھی حساس ذہن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسلے پھول — جس کے ہر ورق پر آپ کو معصوم جوانیوں کے خون کے چھینٹے نظر آئیں گے جسے پڑھ کر آپ کی نظروں میں وہ بیگناہ دوشیزائیں اور بھولی بھالی لڑکیوں کے خاکے ابھریں گے جو [illegible] ذلت سے ہمکنار ہوئیں۔

مسلے پھول — جس میں طوائف کی زندگی کے [illegible]

[illegible]

ملنے کا پتہ: کتاب منزل کشمیری بازار لاہور یا زرّین میڈیکل ہال قائد آباد ضلع سرگودھا سے طلب کریں

تصانیف

حجاب (امتیاز علی) و امتیاز علی تاج

ننھی بیبیاں : پہلی کتاب جو بیگم حجاب امتیاز علی نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہے۔ یہ کتاب مغربی کلاسیکی میں شمار کی جاتی ہے اس لئے یورپ کی تقریباً ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ مغربی ممالک میں کوئی عام لائبریری یا طلبا کی لائبریری اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک اس میں یہ کتاب موجود نہ ہو۔ نوجوانوں کو انعام یا تحفے میں دینے کے لئے خصوصیت سے منتخب کی جاتی ہے۔ کتاب میں انسانی اقدار ایسی ہیں کہ پاکستانی پڑھنے والے مارچ خاندان کے شہرۂ آفاق کرداروں کے غموں اور خوشیوں سے کچھ لطف اندوز ہو سکیں گے۔ ترجمہ ایسا شگفتہ، سلیس اور رواں ہے کہ ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ ضخامت ۵۰۰ صفحے، جلد کی بھی نہایت بارونق رنگین تصویریں جو مصر کے عربی ایڈیشن میں سے لی گئی ہیں اور وہیں سے چھپوا کر شامل کی گئی ہیں۔ سرورق نامور مصری فنکار اقبال حسن کا بنایا ہوا ہے۔ قیمت ۸/۵

ظالم محبت : حجاب امتیاز علی کا شاہکار جس کا چوتھا ایڈیشن اب شائع ہوا ہے۔ ہر ادبی رسالے، ہر ادیب اور ہر ناول پڑھنے والے نے اسے اردو کی ایک زندہ جاوید تصنیف قرار دیا ہے۔ ظالم محبت کا پلاٹ جس میں تین انسانی آوازیں ایک وقت چلا اٹھتی ہیں کہ زندگی کی یہ رات جاودانی نہیں، انسان کا یہ رعنا خواب جگنو کی چمک ہے۔ صبح سے پہلے یہ طلسم ٹوٹ کر رہے گا۔ لیکن طلسم ٹوٹتے ہیں، روشنیاں مدھم پڑتی ہیں اور زندگی کی راتیں فانی ثابت ہوتی ہیں اس کے باوجود انسان اور اس کی محبت ابدی معلوم ہوتی ہے۔ مجلد مع گرد پوش قیمت ۴/۸

اندھیرا خواب: اگر صوفی کے خواب اندھیرے تھے تو اس کی وجہ تھی۔ اگر ریحان کی کشتی کا رنگ سرخ تھا اور صوفی اسے دیکھ کر وحشی درندے کی طرح اپنے عاشق پر حملہ آور ہو گئی تھی تو اس کا مقصد تھا۔ اگر ایک طرف ریحان کی پاکیزہ محبت اور دوسری طرف شرابی کی سرخ آنکھیں اسے دعوت دیتی تھیں تو اس کے گہرے معنی تھے۔ زندگی کا کوئی لمحہ اور انسان کی کوئی حرکت بے معنی یا بے مقصد نہیں ہوتی۔ یہ حجاب امتیاز علی کا وہ معرکۃ الآرا ناول ہے جسے پڑھ کر دو عالمان تجزیہ نفس ڈاکٹر [illegible] مینٹل کلینک پاکستان، اور نیورو سائیکولوجیکل ریسرچ سوسائٹی (انڈیا) نے متفق الرائے ہو کر کہا کہ یہ تجزیۂ نفس اور فساد اعصاب پر ایک ایسا عجیب اور اچھوتا ناول ہے جو کسی یورپین زبان میں بھی نظر سے نہیں گزرا۔ مجلد مع گرد پوش قیمت ۴/۸

انارکلی : سید امتیاز علی تاج کا شہرۂ آفاق ڈرامہ ایک طویل مدت کے بعد چھپ گیا ہے۔

قیمت ۵/-

ملنے کا پتہ

ادارۂ فروغ اردو۔ لاہور

Regd. L. No. 5312

تذکرہ

شعرائے متغزلین

مرتبہ

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

ولی دکنی سے لے کر عہد حاضر تک کے تمام غزل گو شعرا کے حالات بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ اس مختصر سی کتاب میں جمع کر دئے گئے ہیں۔

یہ حالات اصل میں غزل نمبر کے لئے ترتیب دئے گئے تھے۔ وقت پر مکمل نہ ہونے کی وجہ سے اب انہیں الگ بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ اسے آج ہی حاصل کریں اس کے بغیر غزل نمبر نامکمل رہے گا۔

قیمت ۱/۸

ادارہ فروغ اردو۔ لاہور

ASHRAF PRESS - LAHORE